Title - TAREEKH ADABIYAAT-E-IRAN

Creator - Edward G. Brown.

Publisher - Anjuman Taraqqi Urdu (Delhi).

Date - 1939

Pages - 577.

Subject - Tareekh Adab - Iran; Farsi Adab

Tareekh

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۵

تاریخ

ادبیات ایران

در عہد جدید

سنہ ۱۵۰۰ء - سنہ ۱۹۲۴ء

تصنیف

پروفیسر ایڈورڈ گ - براؤن

ترجمہ

سید مہاج الدین احمد کنتوری

مددگار نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مؤلف نفسیات ترغیب و مترجم مکالمات جیمس

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء
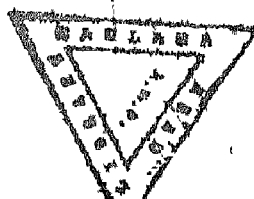
تہدیہ از مصنّف

میں اس جِلد کو فرطِ محبّت سے

اور

اپنے جذبۂ احسان مندی کی یادگار

کے طور پہ

اپنی والدۂ محترمہ کے نام پر معنون کرتا ہوں :-

ہمانم کہ از چشم نگزاشتی ۔ مدامم در آغوش برداشتی
گرامی ترت بودم از جان خویش ۔ نبودت زمن ہیچ کس بیش بیش
مرا ہوش و جان وروان یا توہست ۔ دلم آشکار و نہاں یا تو است

(فردوسی: یوسف و زلیخا طبع ایتھے، صفحہ ۲۴،
اشعار ۲۴۲۱ء - ۲۴۲۲ء - ۲۴۲۶ء)

گویند مرا چو زاد مادر ۔ پستان بدہن گرفتن آموخت
شب بر سر گاہوارۂ من ۔ بیدار نشست و خفتن آموخت
لب خند نہاد بر لب من ۔ بر غنچۂ گل شگفتن آموخت
دستم بگرفت و پا بپا بُرد ۔ تا شیوۂ راہ رفتن آموخت
یک حرف و دو حرف بر دہانم ۔ الفاظ نہاد و گفتن آموخت

پس ہستی من ز ہستی اوست
تا ہستم و ہست دارمش دوست

(از ایرج مرزا جلال الممالک)

فہرست مباحث

حصۂ اول

موضوع باب

حصۂ دوم

حصۂ سوم

دیباچہ مصنف

الحمدللہ کہ جلد ہذا سے اس کام کی تکمیل ہوتی ہے جو میں نے بائیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا شروع کیا تھا اور جسے درصل میری کل زندگی کا کارنامہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ جب ۱۸۸۰ء کے موسم بہار میں ۱۸ سال کی عمر میں، میں نے فارسی کا مطالعہ شروع کیا اسی وقت سے ایران کی ادبی تاریخ لکھنے کی آرزو میرے دل میں روز افزوں شدت کے ساتھ موجود تھی۔ اس کی پہلی قسط بعنوان "ازمنۂ قدیمہ[1] سے فردوسی تک" گیارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے تک تھی اور ۱۹۰۲ء میں شایع ہوئی اور اس کا سلسلہ یعنی وسط تیرھویں صدی عیسوی میں حملۂ مغول تک کی تاریخ ۱۹۰۶ء میں شایع ہوئی۔ ان دونوں جلدوں کے ناشر مسٹر فشر آن وِن Mr. Fisher Unwin تھے۔ جلد سوم بعنوان تاریخ ادبیات ایران در عہد تاتاریہ[2] (از ۱۲۶۵ء لغایتہ ۱۵۰۲ء) جلد دوم کے پورے چودہ سال بعد عرصہ شہود پر آئی۔ وہ وجوہات جن کی بناپر اس جلد کی ظاہری حیثیت، نیز اس کا عنوان پہلی دو جلدوں سے مختلف کردیا گیا تھا، میں اس کے

---

[1] A Literary History of Persia "from the earliest times until Firdausi"
اس کا ترجمہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے تاریخ ادبیات ایران جلد اوّل کے نام سے کیا ہے۔ ۱۲ مترجم

[2] A History of Persian Literature under Tartar Dominion

دیباچہ کے ص ۹ پر بیان کرچکا ہوں، لیکن اس جزئی اختلاف کے باوجود یہ کتاب اصل میں تاریخ ادبیاتِ ایران کی جلد سوم ہی ہے جس طرح سے کہ یہ موجودہ جلد جس میں گزشتہ چار صدیوں (سنہ ۱۵۰۰ء – سنہ ۱۹۲۴ء) کی بحث ہے اور جس کا عنوان میں جلد سوم کے دیباچہ (ص ۹) میں "تاریخ ادبیات ایران در زمانۂ جدید" قایم کرچکا تھا، اس سلسلے کی چوتھی اور آخری جلد ہے۔

اگرچہ کیا بہ لحاظ ترتیب اور کیا بہ لحاظ دلچسپی میں اس موجودہ جلد کو کسی طرح اس سے پہلے کی تین جلدوں سے افضل و بہتر نہیں سمجھ سکتا اور میرے دل میں اس کی خامیوں کا پورا پورا احساس موجود ہے، تاہم میرے خیال میں اس میں نیا مواد کسی قدر زیادہ ہے اور سابقہ جلدوں کے مقابلے میں اصل ماخذ کا استعمال اور نئی تحقیق و تدقیق کا دخل بھی اس میں زیادہ ہے۔ نہ صرف یورپ، بلکہ بڑی حد تک ترکی، نیز ہندوستان میں یہ خیال عام طور پر موجود ہے کہ نظم اور شاعری ہی ادبیات فارسی کا وہ شعبہ ہے جو توجہ کا زیادہ مستحق ہے اور یہ کہ جامی کے بعد سے ایسا کلام جو قابلِ مطالعہ ہو فارسی زبان میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ اس خیال کی وجہ سے گزشتہ چار صدی کے ادبیات کی طرف سے ان ممالک میں بہت زیادہ غفلت برتی گئی، چنانچہ جن ماخذ سے میں نے کام لیا ہے وہ تقریبًا سب کے سب فارسی میں ہیں اور انیسویں صدی تک یعنی جب طباعت اور پتھر کی چھپائی کا ایران میں بتدریج استعمال ہونا شروع ہوا، زیادہ تر قلمی صورت میں ہیں۔ اپنے فارسی کتب خانے کے لیے

ذخیرہ فراہم کرتے وقت میں نے تذہیب، تصاویر اور خوش خطی کے مقابلے میں اپنے کام کی ضروریات کو زیادہ مدِّ نظر رکھا ہے اور خوش قسمتی سے سر البرٹ ہوتم شنڈلر Sir Albert Houtam Schindler آنجہانی کا بغایت دلچسپ ذخیرۂ کتب، نیز حاجی عبدالمجید بلشاہ مرحوم کے فراہم کردہ کئی نایاب اور قیمتی قلمی نسخے میرے ہاتھ آگئے۔ میں مسٹر اے۔ جی۔ ایلس A. G. Ellis کا بھی نہایت ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی فیاضی سے کام لے کر کئی ایسی نایاب کتابوں کے نسخے جن تک میری رسائی محال تھی، کئی کئی سال کے لیے مجھے مستعار عنایت فرمائے نیز ان کے جانشین، موجودہ نائب مہتمم شعبہ کتبِ مشرقی برٹش میوزیم یعنی مسٹر ای۔ اڈورڈس E. Edwards اور ڈاکٹر ل۔ بارنٹ L. Barnett صدر شعبہ مذکور نے ہمیشہ جس خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے میری اعانت فرمائی اس کا بھی میں حد درجہ شکر گزار ہوں۔

مجھے اس بات کی حسرت ہے کہ میں اس تصنیف کے دوران میں اپنے ایرانی احباب، خصوصاً مرزا محمد خان قزوینی اور حاجی مرزا یحییٰ دولت آبادی کے مفید مشوروں سے جتنا چاہیے اتنا مستفید نہ ہو سکا لیکن اپنے محب قدیم حسین دانش بے (ملازم محکمہ قرض عامّہ دولت عثمانیہ ترکی) کا جو فارسی اور ترکی دونوں زبانوں کے مشہور عالم اور ادیب ہیں، میں بہت مرہونِ منت ہوں کہ انھوں نے مجھے کئی قابلِ قدر توضیحات اور مشوروں سے سرفراز فرمایا۔ خوش قسمتی سے عین اس وقت جب کہ اس تصنیف کے آخری اوراق مطبع میں تھے،

میرے ایک اور قدیم کرم فرما سید حسن تقی زادہ، چودہ سال بعد حسنِ اتفاق سے دوبارہ اس ملک میں تشریف لائے اور اپنی عنایت سے انھوں نے پروف کا مطالعہ کیا اور مفید مشوروں کے علاوہ کئی نصیحات بھی کیں جو ناظرین کو "غلط نامہ واضافہ جات" کے ذیل میں ملیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ وسیع المطالعہ اور ذہین ایرانی حضرات سے فارسی زبان کے ہر یورپی محقق کو بہت سی ایسی نئی معلومات حاصل ہوسکتی ہے جو کتابوں میں یا کم از کم ان کتابوں میں جن تک اس کی دست رس ہے، نہیں مل سکتی اور خواہ وہ کلیتًہ ان کا ہم خیال نہ بھی ہو تاہم ان کی تنقید اور ان کا ذوق ہمیشہ قابلِ لحاظ ہوتا ہے اور اس سے اُس کی رہبری ہوتی ہے۔ مثلًا ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ عالم متبحر شیخ کاظم الدجیلی، جو عراق کے شیعہ ہیں اور عربی بولتے ہیں اور ابھی حال میں لندن کے مدرسہ علوم شرقیہ School of Oriental Studies کے عملۂ اساتذہ میں شریک ہوئے ہیں مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ میں نے برسبیل تذکرہ ان سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں عقائدالشیعہ پر عربی کی بہترین کتابیں کون کون سی ہیں؟ انھوں نے اس کے جواب میں فورًا ہی حسب ذیل پانچ کتابوں کے نام لیے جو اگرچہ سب کی ایران میں طبع یا لیتھو ہوچکی ہیں، لیکن میں نے ان کے نام تک نہ سُنے تھے، دیکھنے کا تو کیا ذکر ہے:

(۱) کشف الغطا فی اخبار علی المصطفٰی از شیخ جعفر الکبیر۔

(۲) کتاب القوانین از القمّی۔

(۳) کتاب رسائل الشیخ مرتضیٰ الانصاری۔

(۴) جواہرالکلام از شیخ محمد حسن۔

(۵) کتاب الوسایل از حاجی مرزا حسین النّوری۔

میں فرداً فرداً ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش نہیں کروں گا جنھوں نے اپنی ہمدردی اور دلچسپی سے اس تصنیف میں میری ہمّت افزائی فرمائی ہے، یا اپنی چابک دستی اور صناعی سے اس کو حسنِ ترتیب اور صورت بندی سے مزیّن کیا ہے۔ اس کا لکھنا میرے لیے سرمایۂ مسرت و انبساط تھا، تو اس کی تکمیل میرے لیے وجہ شکرگزاری و امتنان ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی غلطیاں اور خامیاں بھی نقّادوں کی قوت تنقید کو اُبھار کر اور تحقیق کا شوق پیدا کرکے اس موضوع پر ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ کا بالواسطہ سبب بنیں گی۔ اور اگر جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ میری سعی بے لاگ اور مخلصانہ رہی ہے، تو میں لایق محققین کی مدلّل تنقید کو، ضرورت سے زیادہ جوشیلے احباب کی غیر مبصّرانہ تقریظ پر ترجیح دوں گا، بقول سعدیؒ

کفیتَ اذیً یامن نعدّ محاسنی

علانیتی هذا ولم تدرِ باطنی

(اے تو کہ میری بھلائیاں گنواتا ہے تو مجھے نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ میری ظاہری حالت ہے لیکن تو باطن کا حال نہیں جانتا)

۱۲ جون ۱۹۲۴ء　　　　　　اڈورڈ۔ گ۔ براؤن

غلط نامہ و اضافہ جات

(قوسین میں "تقی زادہ" لکھنے سے مطلب یہ ہی کہ یہ تصحیح تقی زادہ نے کی ہی)

ص۲۶۹ ۔ سطر ۹ ۔ "مقابر" کی جگہ "معابر" پڑھا جائے، ورنہ مطلب خبط ہو جاتا ہی۔ (تقی زادہ) وضو میں پیر دھونا سُنّیوں کا طریقہ ہی۔ شیعہ صرف نم ہاتھ سے مسح کرتے ہیں۔ مصرع ثانی میں ہاتھ باندھنے کا جو ذکر ہی وہ بھی سُنّیوں کے ساتھ مخصوص ہی۔ شیعہ ہاتھ لٹکائے رکھتے ہیں۔

ص۲۸۴ ۔ سطر ۶ ۔ متن میں "مرد" غلط تھا اس کی بجائے صحیح لفظ "خلق" درج کر دیا گیا ہی۔ اگر کوئی شیعہ ایسا شعر لکھتا تو اس پر کفر کا الزام عاید ہو جاتا (تقی زادہ)

ص۲۸۶ ۔ سطر ۱۰ ۔ "اسرار شہادت" عموماً مُلّا آقائے دربندی الملقب بہ "مروج عزاداری اہل بیت" سے منسوب کی جاتی ہی (تقی زادہ)[1]

---

[1] لیکن اڈورڈس Edwards نے اپنی فہرست کتب فارسی برٹش میوزیم کالم ۳۰۲ ۔ ۳۰۳ میں میری ہی طرح اسے اسمٰعیل خان سرباز کی تصنیف کہا ہی مُلّا آقائے دربندی (جن کا انتقال بہت ضعیفی میں ۱۸۴۳ء سے پہلے ہوا) کی سوانح عمری قصص العلماء (طبع طہران ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء ص۸۵ ۔ ص۸۹) میں دی ہوئی ہی۔ اس میں ان کی فہرست تصانیف میں ایک کتاب "اکسیر العبادات فی اسرار الشہادات" کا بھی ذکر کیا گیا ہی۔ ۱۲ مصنف

ص۳۱۶ - آخری سطور، صفی علی شاہ کے کلام، نیز ان کی منظوم فارسی تفسیر قرآن کا ذکر بھی کرنا چاہیے" (تقی زادہ)۔ (مجھے مجمع الفصحا، ریاض العارفین، بستان السیاحت غرض کہ کسی فہرست کتب میں جو میری نظر سے گزری، ان کا حال نہیں ملا)

ص۳۱۷ - "رودگی" اور ص۳۴۷ "رودکی" دونوں کے بجا ایک سے ہونے چاہییں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رودکی بالکاف ہی زیادہ صحیح ہے۔

ص۳۱۸ "وی۔ ژوخوفس کی (V. Zhukovski) کے مجموعۂ تصانیف فارسی کا ذکر بھی کرنا چاہیے جو روسی ترجمہ کے ساتھ ۱۹۰۲ء میں سینٹ پی ٹرس برگ سے شایع ہوا تھا۔ برزین (Berezine) نے بھی وہ تصانیف مع انگریزی ترجمے کے جو پیانو پر جمایا گیا ہے شایع کی ہیں" (تقی زادہ) (اول الذکر کتاب تو میرے پاس نکلی، لیکن ثانی الذکر کتاب کا میں پتہ نہیں چلا سکا)

ص۴۵۶ سطر ۳ - "مصرع اول کے بعد دو مصرعے سہواً رہ گئے ہیں۔ یہ دو شعر یوں ہونے چاہییں (تقی زادہ)

عکس تو فتادہ است در آئینۂ عالم

(زاں روئے ہمہ زن قحبہ گشتہ است پدیدار

زن قحبہ محال است ز تو دست بدارم)

تا آں کہ بہ زن قحبگی خود کنی اقرار

ص۴۷۴ سطر ۱۲ - "تنکابن کے صحیح اعراب کے متعلق اختلاف ہے تقی زادہ کی رائے ہے کہ یہ بضمہ نون اول ہونا چاہیے، لیکن رضا قلی خان نے انجمن آرائے ناصری میں اسے تنکابن بفتح نون اول لکھا ہے

ص۴۹۹ "محقق اردبیلی" اور "مقدس اردبیلی" یہ دونوں القاب ملّا احمد ہی کے ہیں لہٰذا سطر ۱۱ کو یوں پڑھنا چاہیے "انھیں اردبیلی مجتہد نے جنھیں محقق بھی کہتے ہیں ......"

ص۵۰۱ سطر ۲۶ "حاجی مرزا حسن شیرازی اور حاجی مرزا حسن آشتیانی دونوں کا ذکر مساوات کے ساتھ نہ کرنا چاہیے۔ اول الذکر کو ثانی الذکر سے وہی نسبت ہے جو ایک شاہنشاہ کو ایک معمولی درجے کے حاکم سے ہوتی ہے" (تقی زادہ)

ص۵۰۵ سطر ۱۱ "آقا جمال خوانساری ایک مشہور کتاب "کتاب کلثوم ننہ" کے مصنف ہیں جو ایرانی عورتوں کے توہمات پر ہے۔ ان کے والد آقا حسین خوانساری "استاد الکل فی الکل" کہلاتے تھے اور کئی مطائبات کے علاوہ انھوں نے شہید ثانی کی لمعہ پر شروح لکھے ہیں" (تقی زادہ)

ص۵۱۲ آخری پیراگراف الخ "اس قسم کے سوال و جواب کی کئی کتابیں مثلاً رسالہ عملیہ، مسئلہ، نخبہ وغیرہ گزشتہ صدی میں تصنیف ہو چکی ہیں اور ان میں سے کم از کم ۱۰ تو چھپ بھی چکی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور ترین کتاب جامع الشتات ہے جو مرزا ابوالقاسم ابن الحسین الرضوی القمیؒ مصنف کتاب قوانین کی لکھی ہوئی ہے" (تقی زادہ)۔ (اس آخر الذکر مصنف کے حالات کے متعلق ملاحظہ ہو اڈورڈس (Edwards) کی فہرست مطبوعات فارسی برٹش میوزیم کالم ۶۰ و ۶۱)

ص۵۳۲ سطر ۸ "اپنے والد حضرت حسینؑ کے بعد حضرت علی اوسط

امام ہوئے، نہ کہ حضرت علی اکبر، جو شیرخوار صاحبزادہ علی اصغر کے ساتھ میدانِ کربلا میں شہید ہوئے تھے۔" (تقی زادہ)

ص۵۵۵ سطر ۲: "جامع عباسی ۲۰ ابواب میں مکمل ہو چکی تھی اور کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، لیکن بچوں کو ابتدائی مذہبی مسائل سکھانے کے لیے اس کے پہلے پانچ ابواب اکثر علیحدہ چھاپے جاتے ہیں" (تقی زادہ)

اڈورڈس Edwards (فہرست مطبوعات فارسی برٹش میوزیم کالم ۴۰۷۔ ۴۰۸) کا خیال ہے کہ شیخ بہائی کی یہ تصنیف غیر مکمل تھی اور باب ششم تا بستم کا اضافہ بعد کو نظام بن حسین ساوجی نے کیا ہے)

ص۵۵۵ سطر ۱۷ و ص۵۹۷ سطر ۱۸: "ابواب الجنان ملا محسن فیض کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، ملا حسین واعظ کاشفی یعنی مشہور کتاب انوار سہیلی کے مصنف کی تصنیف ہے" (تقی زادہ)

(اس کے اصل مصنف غالباً محمد بن فتح اللہ رفیع الدین المعروف بہ واعظ قزوینی ہیں۔ ملاحظہ ہو اڈورڈس کی فہرست کتب کالم ۴۰۵۔ ۴۰۶۔)

ص۵۵۹ (نمبر ۲۳): "سید محمد باقر رشتی تو تیسرے بلکہ چوتھے درجے کے عالم تھے اور ملا احمد نراقی (ص۱۲۵، نمبر ۲۴) صرف دوسرے درجے کے۔ ان سے کہیں زیادہ مشہور اور بلند پایہ علما جن کا ذکر اس کتاب میں نہیں کیا گیا ہے، یہ تھے:۔

(۱) آقائے بہبہانی، اصولی و مجتہدی مذاہب کے بانی جو اواخر بارھویں صدی ہجری میں گزرے۔

(۲) شیخ جعفر عرب المعروف بہ الکبیر، جو فتح علی شاہ کے ہم عصر تھے
(۳) شیخ محمد حسن مصنف جواہر الکلام جو چھ جلدوں میں فقہ شیعی پر ہے۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ مصنف صح)۔
(۴) شیخ مرتضی الانصاری جو موجودہ شیعہ شریعت اور فقہ کے مدوّن ہیں اور گزشتہ ۶۰ سال کے تمام مجتہدین کے استاد ہیں، باستثنائے
(۵) شیخ ہادی طہرانی جو خود درجہ اول کے مجتہد تھے۔

ص۵۸۹۔ سطر ۱۲: "شیخ احمد الاحسائی، ملا صدرا کے معترف اور مقلد نہیں بلکہ ان کے سخت مخالف تھے۔ جدید فلاسفہ ایران کے زمرے میں مرزا ابوالحسن جلوہ کا ذکر بھی کرنا چاہیے تھا جن کا انتقال تقریباً بیس سال پہلے ہوا ہے۔" (تقی زادہ) (میں ان سے ۱۸۸۷ء۔۱۸۸۸ء کے موسم سرما میں طہران میں ملا تھا، ملاحظہ ہو میری Year among the Persians ص۱۴۹)

ص۵۹۵ سطر ۱۸: "ملا محسن فیض کی مشہور ترین تصنیف "کلمات مکنونہ" ہے، جس کا ذکر بھی یہاں ہونا چاہیے تھا۔" (تقی زادہ)

ص۶۰۵۔ "ڈاکٹر محمد کرمانشاہی المعروف بہ کفوی (متوفی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء) امراض قلب کے ماہر خصوصی تھے، انھوں نے ہی سب سے پہلے اس خاص قلبی گنگناہٹ کی طرف توجہ مبذول کرائی جو عروق و شرائین میں رخنہ پیدا ہوجانے کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور اس پر انھوں نے فرانسیسی زبان میں ایک رسالہ بھی لکھا[۱]۔ علی ہذا انھوں نے فارسی زبان میں امراض اللہ

[۱] مجھے اس ادعائے "الکشاف" کی تحقیق کسی ذریعہ سے اب تک نہیں ہوئی، حالانکہ میں نے اس کے متعلق دو ماہر اطبا سے استصواب بھی کیا۔ ۱۲ مصنف

والصبیان پر کئی طبّی رسالے تصنیف کیے"۔ (تقی زادہ)

ص۶۲۸ سطر ۴ و ۵ ۔ "بجائے اعتمادالدولہ کے اعتماد السلطنہ پڑھنا چاہیے"۔ (تقی زادہ)

ص۶۵۱ سطر ۱۱ ۔ "ایران میں اخبارات ۱۸۵۱ء سے پہلے، یعنی بعہد محمد شاہ (۱۸۳۵ء - ۱۸۴۸ء) موجود تھے، بلکہ اس کے پیش رو فتح علی شاہ کے آخر عہد میں ہی نکلنا شروع ہو گئے تھے، ملاحظہ ہو اخبار کاوہ خصوصاً "دورۂ جدید" کا شمارہ ۶"۔ (تقی زادہ)

(یہ مضمون اخبار مذکور کی ۸ رجون ۱۹۲۱ء کی اشاعت کے ص۱۲ ص۱۶ پر شایع ہوا ہے۔ اس میں کسی قدر مشکوک حوالہ دیا گیا ہے کہ ایک فارسی اخبار ۱۷۹۰ء میں دہلی سے نکلتا تھا، البتہ طہران سے ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء - ۱۸۳۸ء میں ایک اخبار کے اجرا کی جو اطلاع ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔)

ص۶۷۱ سطر ۱۵ ۔ "جن مضامین کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے، وہ مرزا محمد خان کے نہیں، بلکہ میرے تھے اور "محصّل" (طالب علم) کے نام سے شایع ہوئے تھے"۔ (تقی زادہ)

ص۶۷۳ "مرزا کاظم زادہ، سید جمال زادہ، "تقی زادہ خان وغیرہ کہنا فارسی محاورہ میں اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ انگریزی میں سر اڈورڈ گرے کی بجائے سر گرے کہنا وغیرہ۔ مرزا، سید حاجی وغیرہ کے القاب صرف ذاتی ناموں مثلاً حسین، علی، محمد، وغیرہ کے پہلے آتے ہیں، جس طرح کہ خان بیگ وغیرہ ان ناموں کے آخر میں آتے ہیں۔ یہ الفاظ ولدیت کے

قبل یا آخر میں استعمال نہیں ہوتے۔" (تقی زادہ)[1]

---

[1] اگرچہ تقی زادہ کا خط مجھے وقت پر مل گیا تھا اور جو تصحیحات آخرالذکر دو حواشی میں کی گئیں ہیں، وہ میں کتاب میں کرچکا ہوں، تاہم میں نے ان کے حواشی کو علی حالہ نقل کردیا ہے، اس لیے کہ پہلے سے مضامین محولہ بالا کے اصل لکھنے والے کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے میں ایک ایسا اصول بتایا گیا ہے جس سے میں اب تک ناواقف تھا۔ ۱۲ مصنف

حصّہ اوّل

گزشتہ چار صدی کی ایرانی تاریخ پر اجمالی نظر

باب اوّل

خاندانِ صفویہ کے متعلق ایک عام تبصرہ

خاندانِ صفویہ کی تاریخی اہمیت

(سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں خاندانِ صفویہ کو جو عروج ایران میں نصیب ہوا، وہ نہ صرف ایران اور اس کے قریبی ہمسایوں کے لیے بلکہ عام طور پر سارے یورپ کے لیے ایک اہم ترین تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے) اس زمانے سے صرف اسلامی سلطنت کا عود اور ایرانی قومیت کا احیا ہی شروع نہیں ہوتا جس کا ستارہ آٹھ سو پچاس برس سے گہنایا ہوا تھا، بلکہ انجمن اقوام میں ایران کا داخلہ اور دوسرے دول کے ساتھ اس کے اُن سیاسی تعلقات کا پیدا ہونا جو آج تک بھی بہت کچھ باقی ہیں، اس کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ مسٹر آر جی واٹسن (R. G. Watson) نے اپنی لاجواب تصنیف[1] History of Persia from the beginning of 19th century to 1858

---

[1] London Smith and Elder 1866 ۱۲ مصنف

(انیسویں صدی کے آغاز سے ۱۸۵۰ تک کی تاریخ ایران) کے شروع میں جو مختصر سا تبصرہ لکھا ہے اس میں انھوں نے اسی زمانے کو اپنی تاریخ کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے اور یہ ان کی اصابتِ فہم کا ثبوت ہے۔ اس لیے کہ ازمنۂ وسطیٰ کو نسبتًا جدید تر زمانے سے متصل بنانے والا دراصل یہی عہد (صفویہ) ہی ہے (ساتویں صدی عیسوی کے نصف میں جو فتوحات عربوں کو حاصل ہوئیں انھوں نے زردشتی مذہب اور ساسانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ایران کو صرف خلافت کا ایک صوبہ بنا چھوڑا تھا، تا آنکہ تیرھویں صدی کے نصف میں مغلوں یا تاتاریوں نے خود اس خلافت کا قلع قمع کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس زبردست واقعے کے پہلے سے اور اس کے بعد بھی ایران میں کچھ خود مختار، یا نیم مختار خاندان حکومت کرتے رہے لیکن یہ خاندان زیادہ تر ترکی یا تاتاری الاصل تھے؛ جیسے خاندان غزنویہ، سلجوق، خوارزم شاہی یا چنگیز اور تیمور کے خانوادے اور اگر کچھ ایرانی الاصل خاندان تھے بھی جیسے بویہ تو ان کی حکومت صرف قدیم سلطنت ایران کے ایک چھوٹے سے خطے تک محدود تھی۔ ایران کو نئے سرے سے ایک قوم بنانے کا سہرا خاندان صفویہ ہی کے سر ہے۔ یہ شرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ اس نے اسے ایک کامل، متحد الاجزا، زبردست اور معزز سلطنت بنا دیا، جس کی حدود بڑھتے بڑھتے شاہ عباس کے زمانے میں (۱۵۸۷ — ۱۶۲۸) تقریبًا اتنی ہی وسیع ہو گئی تھیں جتنی ساسانیوں کے زمانے میں تھیں۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں اصفہان جو قزوین کے بدلے

پایۂ تخت بنایا گیا تھا، "نصف جہاں" یا بقول ایرانی ڈان جوان (Don Juan) کے نام سے (نصف ارض) Medio Mundo کے مشہور ہوا؛ اس میں عالی شان عمارتوں کی کثرت اور چابک دست صناعوں کا ہجوم ہوگیا؛ دور دور سے تاجر یہاں آنے جانے لگے اور صرف ہندوستان، ماوراء النہر اور ترکی ہی سے نہیں بلکہ روس سے لے کر ہسپانیہ اور پرتگال تک ہر یورپی حکومت کے سیاسی وفد اس کا دورہ کرنے لگے۔

اس خاندان کی مکمل اور اطمینان بخش تاریخ کی کمی ہے۔

لیکن، باوجودیکہ یہ خاندان اتنا اہم ہے، اور تاریخی مواد بھی کثرت سے مل سکتا ہے پھر بھی خاندان صفویہ کی کوئی اچھی اور مکمل تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی ہے[1] سرجان میل کم (Sir John Malcolm) اور سرکلی منٹس مارکہم (Sir Clements Markham) نے اپنی اپنی "تاریخ ایران" میں جو خاکے دیے ہیں ان کی وسعت ناکافی اور صحت غیر تشفی بخش ہے۔ نیز جس مواد پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ بہت کچھ محدود ہے اور پھر کچھ ایسا زیادہ مستند بھی نہیں ہے۔ مواد کی کثرت اور اس کی بوقلمونی، اکثر اہم ذرایع معلومات کی عدم دستیابی اور اکثر متعلقہ کاغذات کا کمی کمی

(۱) کروسن سکی (Krusinski) اور ہین وے (Hanway) نے صفویہ کے آخری دور کے جو قابل تعریف حالات لکھے ہیں، ان کا ذکر میں باب دوم میں کروں گا۔

۱۲ مصنف

زبانوں میں ہونا ـــــ یہ چیزیں ہر اُس شخص کے لیے جو اس دوْر کے متعلق پوری پوری بحث کرنا چاہے، شدید موانعات کا حکم رکھتی ہیں۔ اس دوْر کے ابتدائی حصّے کے متعلق (یعنی شروع سے شاہ عبّاس کبیر کی وفات تک) اس زمانے کے چار اہم ترین فارسی صحائف یہ ہیں۔

فارسی کی چار اہم غیر مطبوعہ ماخذ صفوۃ الصفا[1]۔ اس میں شیخ صفی الدین کے سوانح درج ہیں۔ یہ تیرھویں صدی کے ایک بڑے مشہور بزرگ تھے اور خاندان صفویہ کا یہ نام انھیں کی وجہ سے پڑا ہے۔ نسب[2] نامہ سلسلہ صفویہ[3]۔ یہ اس خاندان کے شجرے کے متعلق ہے اور اس کے قدیم ارکان کی سوانح کے متعلق جو قابل قدر تفصیلیں اس کتاب میں ملتی ہیں وہ کہیں اور نہیں پائی جاتیں۔ احسن[4] التواریخ۔ یہ ۱۵۷۷ء میں یعنی شاہ طہماسپ کی وفات کے ایک ہی سال بعد مکمل ہوئی ہے اور اس میں اس بادشاہ نیز اس کے باپ اور پیش رو شاہ اسماعیل بانی دور صفویہ کی حکومتوں کا حال درج ہے۔ تاریخ عالم آرائے عباسی۔ یہ شاہ عباس کبیر کے عہد حکومت کے متعلق ایک زبردست تصنیف ہے۔ ان چاروں

---

[1] اس حصّے کے لکھے جانے کے بعد مجھے اپنے ایک ایرانی نامہ نگار کے توسط سے صفوۃ الصفا کا ایک اعلیٰ درجہ کا لیتھو کا چھپا ہوا نسخہ ملا ہے۔ یہ بمبئی میں ۱۳۲۹ھ ہجری م ۱۹۱۱ء عیسوی چھپا ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] یہ کتاب بھی کاظم زادہ ایران شہر نے مطبع شرکت کاویانی برلن سے طبع کرکے شایع کی ہے۔ ۱۲ مترجم

کتابوں میں سے کوئی بھی اب تک نہیں چھپی ہے ترجمہ کا تو کیا ذکر ہے۔ اور آخرالذکر کے سوا اور سب کے قلمی نسخے بھی بہت نایاب ہیں۔ خوش قسمتی سے میرے پاس "نسب نامہ" اور عالم آرائے عباسی کے نسخے موجود ہیں جو پہلے سر البرٹ ہوٹم شنڈلر آنجہانی (Sir Albert Houtam Schindler) کے پاس تھے اور بقیہ دو نسخے بھی مسٹر اے جی۔ ایلس (A. G. Ellis) نے اپنی بے نظیر فیاضی سے کام لے کر مجھے استعمال کرنے کے لیے عنایت کیے ہیں۔ اگرچہ بعد کی بعض فارسی تاریخوں

بعد کی فارسی تالیفات غیر مستند ہیں۔ کے مصنفین نے، مثلاً رضا قلی خاں نے میر خواند کے روضۃ الصفا کے ضمیمے میں مذکورۂ بالا کتابوں میں سے کچھ سے کام لیا ہے، لیکن ان لوگوں نے صرف ان کے مطالب کی تلخیص ہی نہیں کی ہے، بلکہ ان کی جو عبارتیں نقل کی ہیں انھیں بھی بری طرح مسخ کر دیا ہے۔

تاریخ کو مسخ کرنے کی ایک بیّن مثال اس طرح جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کرنے کی ایک مثال حسب ذیل ہے:-

جولائی ۱۵۹۹ء میں شاہ عباس کبیر نے اپنا ایک وفد یورپ بھیجا تھا اور اس کو دول روس، پولینڈ، جرمنی، فرانس، ہسپانیہ، انگلستان اور اس کاٹ لینڈ، نیز پاپائے روم اور حاکم وینس (بندقیہ) کے نام کے تعارف نامے دیے گئے تھے۔ یہ وفد ان ارکان پر مشتمل تھا:-

حسین علی بیگ[1] جو سفیر ایران کی حیثیت سے شریک تھا، بسار ایرانی اعیان یا "نائٹ" (Don Juan of Persia) نے اپنے بیان میں انھیں (Caballeros) کہا ہے؛ پندرہ ایرانی ملازمین، مشہورِ زمانہ سر انتھونی شرلے (Sir Anthony Sherley) مع پندرہ انگریز ملازمین کے؛ دو پرتگالی راہب، اور پانچ مترجمین۔ یہ لوگ (Caspian Sea) (بحیرہ خزر) اور ولگا ہوتے ہوئے پہلے ماسکو گئے اور پانچ یا چھ مہینے تک یہاں مقیم رہے۔ وہاں سے جرمنی ہوتے ہوئے اٹلی پہنچے، لیکن یہاں سے انھیں وینس کی طرف جانے کی اجازت نہ دی گئی، اس لیے کہ عین اُسی زمانے میں دولت عثمانیہ کا ایک سفیر بھی وہیں موجود تھا اور اندیشہ تھا کہ اس وفد کا پہنچنا کہیں اس کی ناراضی کا باعث نہ ہو۔ لیکن روم میں جہاں یہ اپریل ۱۶۰۱ء میں پہنچے تھے اور دو مہینے تک مقیم رہے، ان کا اچھی طرح خیر مقدم کیا گیا۔ وہاں سے وہ جے نووا (Genoa) سے جہاز میں سوار ہو کر جنوبی فرانس گئے اور ادھر ہی سے ہسپانیہ کی طرف چلے گئے۔ ہسپانیہ پہنچ کر چار ایرانی "نائٹوں"

[1] ڈان جوان انھیں (Uzen Ali Bech) کہتا ہے، لیکن انٹونیو ڈی گوویا (Antonio di Govea) کے یہاں "Usseni Ali Beg" ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا پہلا حصہ حسین ہی ہے اور جیسا کہ پہلے میرا خیال تھا، اوزون (Uzun) نہیں ہے ۱۲ مصنف

(Knights) میں سے تین نے کیتھلک مذہب اختیار کرلیا اور ان کے نام ڈان فلپ (Don Phillip) ڈان ڈی گو (Don Digo) اور ڈان جوان ایرانی (Don Juan of Persia) رکھے گئے۔

ڈان جوان ایرانی | سر این تھونی شرلے نے جن کے تعلقات اپنے ایرانی شرکاء کار کے ساتھ شروع ہی سے کشیدہ تھے، روم میں وفد سے علیحدگی اختیار کرلی تھی ؛ لیکن اس وقت تک کے جو حالات انھوں نے اور ان کے بعض ہمراہیوں[۱] نے اپنے طور پر لکھے ہیں، اُن سے ہمیں ڈان جوان کے بیان کی تحقیق کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بہر حال جب ڈان جوان اسلام سے منحرف ہوگیا، تو اُسے ایران واپس آنے اور مرتد کی موت مرنے کی ہمّت نہیں ہوئی لہٰذا اگر ہم اس کے المناک انجام کا حال معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں ایرانی مورخین کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ عالم آرائے عباسی میں ہم کو ۱۰۱۲ھ م ۱۶۰۳-۴ء[۲] کے واقعات کے ذیل میں شاہ ہسپانیہ کے بعض سفیروں کے اصفہان

[۱] اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ کتاب پڑھنی چاہیے :

The Sherley Brothers......by one of the same house

(طبع چسزوک Chiswick ۱۸۴۸ء) ص۲۲ - ۲۵ - ۲۵ - ۱۲ مصنف

[۲] دیکھو میرے قلمی نسخے نمبر P. H. 14 ص ۲۳

۱۲ مصنف

آنے کا ذکر ملتا ہے، ان کے ساتھ کئی عیسائی پادری اور ایک ایرانی سفیر بھی تھا جو یورپ سے واپس آرہا تھا[1]۔ ان میں سے آخرالذکر کو جو عتاب شاہی کا مورد ہوا تھا فوراً ہی بُری طرح قتل کردیا گیا اور اُسے اپنی بریت میں کچھ کہنے سننے، یا معافی مانگنے کا بھی موقع نہیں دیا گیا۔ شاہ نے اس کے قتل کی جو وجہ ہسپانیوں کو بتائی وہ یہ تھی کہ اس سے اپنے وفد کے سلسلے میں متعدد غدارانہ اور خلاف ادب حرکات سرزد ہوئی تھیں: مثلاً اُن خطوں کو کھول لینا جن پر مہر شاہی ثبت تھی اور ان کے مضمون افشا کرنا، ملکۂ ہسپانیہ کی وفات پر ماتمی لباس پہننا، پاپائے روم کے نام کے جو تعارف نامے اسے دیے گئے تھے اُنھیں ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کردینا تاکہ وہ اپنے کو سفیر ظاہر کرکے پاپائے روم سے اپنی مطلب براری کرے۔ اس کے بعد شاہ نے کہا" لیکن جو سب سے بڑی وجہ اس سزا کی محرک ہوئی وہ یہ تھی کہ اس نے ان ملازمین کے ساتھ جو اس کے ہمراہ تھے اس قدر بدسلوکی کی اور اُنھیں اتنا دق کیا کہ ان میں سے اکثر تبدیل مذہب کرکے عیسائی بن گئے اور اس کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے

[1] اگرچہ اس کتاب میں سفیر کا نام دنگیز بیگ شاملو بتایا گیا ہے اور اسے یوز باشی (کپتان) کا لقب دیا گیا ہے اور حسب بیان ڈان جوان اسے حسین علی بیگ نہیں کہا گیا، لیکن اس کی شناخت کے متعلق میری رائے میں کسی قسم کا کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔۱۲ مصنف

یورپ ہی میں ٹھیرے رہے۔ پس جوش اسلامی کا تقاضا یہی تھا کہ اسے سزا دی جائے چنانچہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا؛"
اب اگر رضا قلی خاں کے ضمیمہ روضۃ الصفا کو (جو ایران کی ایک عام تاریخ ہے اور ۱۸۵۰ء کے قریب لکھی گئی ہے) دیکھا جائے تو وہاں بھی اسی واقعہ کا ذکر ملتا ہے جو خفیف رد و بدل کے ساتھ عالم آرائے عباسی ہی سے نقل کیا گیا ہے، لیکن اس میں ایک نہایت اہم اور جسارت آمیز تصرف کر دیا گیا ہے، یعنی وہاں شاہ عباس نے اپنے سفیر کا جو سب سے بڑا قصور بتایا ہے وہ یہ ہے "کہ کئی لوگ اسلام قبول کرنے اور ایران آنے کے لیے تیار تھے، لیکن سفیر ایران نے ان کے ساتھ اتنی بدسلوکی کی کہ وہ اپنے ارادے سے تائب ہوکر پھر عیسائی ہوگئے" اور اپنے ہی ملک میں رہ گئے۔ اسی طرح دیدہ و دانستہ تاریخ کو مسخ کرنے کی جو وجہ میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ رضا قلی خاں کو یہ گوارا نہ ہو سکتا تھا کہ کسی ایرانی مسلمان کا عیسائی ہونا دکھایا جائے۔ بہر حال اس قصّہ کے بیان کرنے سے میرا مطلب صرف یہ دکھانا ہے کہ بعد کی ایرانی تاریخوں کو بڑی احتیاط سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور جہاں تک ہوسکے ان کے ہر بیان کی اسی زمانے کے دوسرے وقائع سے تصدیق کرلینی چاہیے۔

سر جان میل کم کی غلطی | اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں سر جان میل کم کے ایک سہو کو بھی بتانا چاہتا ہوں جو فارسی ماخذ سے پوری طرح کام نہ لینے کی وجہ سے ہوا ہے۔ سنہ ۱۰۰۲ھ

م ۹۴-۱۵۹۳ء میں جو شاہ عباس کبیر کی حکومت کا ساتواں سال تھا، شاہی منجم جلال نے پیشنگوئی کی کہ مالک تخت و تاج کا ستارہ نحوست میں آگیا ہے اور یہ مشورہ دیا کہ شاہ چند دنوں کے لیے تخت و تاج سے دست بردار ہوجائے اور اپنی جگہ کسی ایسے شخص کو بٹھادے جس کا مرنا زیادہ مناسب ہو تاکہ ستاروں کا اثر نحس اسی پر پڑے، چنانچہ یہی کیا گیا۔ اور یوسفی نام کے ایک شخص کو تین دن کے لیے شاہ بنادیا گیااوراس کے بعد اُسے مارڈالا گیا اور شاہ عباس پھر تخت پر بیٹھا۔ سرجان میل کم[1] لکھتے ہیں "کہ یہ شخص یوسفی جسے ایرانی مصنفین ہمیشہ کافر بتاتے ہیں، غالبًا کوئی عیسائی تھا" لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک ملحد فرقے یعنی فرقہ "نقطویہ" کا فرد تھا۔ یہ فرقہ مسئلہ تناسخ اور اسی قسم کے دوسرے ملحدانہ عقیدے رکھتا تھا اور اس کے ظہور اور بربادی کا پورا حال عالم آرائے عباسی میں درج ہے[2] اور وہیں سے روضۃ الصفا میں نقل کیا گیا ہے۔ پس اگر کوئی شخص صفویہ کی صحیح صحیح تاریخ لکھنا چاہے تو اُسے اصلی ماخذ کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہونی چاہیے کہ یہ ماخذ جو سردست صرف قلمی صورت میں ہیں طبع کر دیے جائیں۔

---

[1] History of Persia (تاریخ ایران) (لندن ۱۸۱۵ء) جلداول صفحہ ۵۲۷ ۱۲ مصنف

[2] میرے قلمی نسخے P. H. 14 کا ۲۶۶ ب و ۲۶۷ ب ۱۲ مصنف

ترکی ذرائع معلومات لیکن اس قسم کی تالیف کے لیے جو کچھ مواد دستیاب ہوسکتا ہے فارسی تاریخیں صرف اس کا ایک جز ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد اور بعض اچھے اچھے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ترکی وقایع بھی موجود ہیں جو اس دور سے بحث کرتے ہیں۔ اور خاص کر ترکوں اور ایرانیوں کی اُن لڑائیوں کا بیان کرتے ہیں جو سولھویں اور سترھویں صدی میں برابر ہوتی رہیں۔ ایرانی تاریخوں کے ضمیمے (اور اکثر صورتوں میں ان کی تصحیح) کی حیثیت سے یہ وقائع ناگزیر ہیں۔ ترکی سرکاری کاغذات کا جو بڑا ذخیرہ فریدوں بے نے منشآت سلاطین

فریدوں بے کے نام سے ۹۹۱ھ م ۱۵۸۳ء سے قبل مرتب کیا ہے اور جو ۱۲۷۴ھ م ۱۸۵۸ء میں دو جلدوں[1] میں قسطنطنیہ سے شایع ہوا ہے وہ ان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس قابلِ قدر کتاب میں جس کی اہمیت کو ابھی پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے، جو سیاسی مراسلت نقل کی گئی ہے وہ تاریخ وار مرتب کی گئی ہے، اور اس کا کچھ حصہ ترکی میں ہے کچھ عربی میں، اور کچھ فارسی میں۔ اس کا بڑا حصہ تیمور کے زمانہ سے شروع ہوکر ۱۵۸۳ء تک ایران کے حالات پر مشتمل ہے اور پہلی جلد کے

---

[1] اس حصہ کی تحریر کے وقت میرے پاس صرف پہلی جلد ہی تھی جو ۶۲۶ صفحوں پر مشتمل ہے اور ۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) تک کے واقعات پر حاوی ہے۔ اب اپنے عنایت فرما حسین دانش بے کی مہربانی سے مجھے دوسری جلد بھی مل گئی ہے۔ ۱۲ مصنف

آخری نصف حصّے میں زیادہ تر وہ مراسلات ہیں جو ایک طرف سے ترکی کے سلطان بایزید (۱۴۸۲ء - ۱۵۱۲ء) سلطان سلیم (۱۵۱۲ء - ۱۵۲۰ء) سلطان سلیمان اول (۱۵۰۰ء - ۱۵۲۴ء) اور دوسری جانب شاہ اسماعیل (۱۵۰۰ء - ۱۵۲۴ء)۔ اور اس کے بیٹے اور جانشین شاہ طہماسپ (۱۵۲۴ء - ۱۵۷۶ء) نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بعض فوج کشیوں کے حالات بھی درج ہیں مثلاً وہ فوج کشی جس کا نتیجہ ۲۳ر اگست ۱۵۱۴ء کو جنگ چالدیران کی صورت میں ایرانیوں کے لیے بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ ان حالات کے ذیل میں عثمانی عساکر کی نقل و حرکت اور اُن کی پیش قدمیوں اور مراجعت کے روز روز کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور سرکاری کاغذات (ایرانی اور ترکی دونوں) ابھی تک صرف قلمی صورت میں ہیں اور اب تک ان کی تحقیق نہیں ہوسکی ہے[۱]۔

---

[۱] صاری عبداللہ آفندی (وفات ۱۰۷۹ھ م ۱۶۶۸ء) کی دستورالانشاء کے بعض دلچسپ سرکاری مراسلات بھی M. ch. Chafer (ایم - چارلس - شے فر) نے حواشی کے ساتھ اپنی کتاب Christhomathie Persane (Paris 1885) کی جلد دوم میں صفحہ ۲۱۸ - ۲۵۹ (انگریزی) اور صفحہ ۳۹ - ۴۳ (فارسی) پر نقل کیے ہیں۔ ۱۲ مصنف

اس زمانے کے یورپی بیانات | تیسری قسم کا مواد اور ایسا مواد کہ اس کی اہمیت کے متعلق جتنا مبالغہ بھی کیا جائے کم ہے، ان یورپی لوگوں کی تحریریں ہیں جو اس زمانہ میں سیاسی، تبلیغی یا تجارتی کام کے لیے ایران گئے ہیں۔ شاہ عباس کا جو فیاضانہ رویہ عیسائیوں کے ساتھ تھا اس کی وجہ سے خود اس کے نیز اس کے جانشینوں کے عہدوں میں اس قسم کے سیاحوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے۔ ان لوگوں کے سوانح نیز ان کی تصانیف کے متعلق جو بہترین بیان اب تک میری نظر سے گزرا ہے وہ وہ ہے جو ایم چارلس شے فر آنجہانی نے اپنے مرتبہ L'estate de la Persie en 1660 حالات ایران ۱۶۶۰ء میں) کے اڈیشن کے مقدمہ (ص CXV -ا) میں دیا ہے۔ چونکہ یہ شخص پیری رے فائیل ڈو مانس ایک نہایت خوش سیرت شخص تھا، اعلیٰ ذہنی قابلیت رکھتا تھا، نیز پچاس سال کی طویل مدت (۱۶۴۴ء۔ ۱۶۹۶ء) تک اصفہان میں مقیم رہ چکا تھا اس لیے اس بارے میں اس سے زیادہ مستند

L'estat de la Persie en 1660 by le Pere Raphael du Maus, Superior of the Capuehin Mission at Isfahan edited by M. ch. Schafer (Lerorx Paris 1890. PPCXV+469)

۱۲ مصنف

کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ایم شے فر[1] (M. Schafer) نے جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے، وہ علیحدہ علیحدہ طور پر ولندیزی، انگریزی فرانسیسی، المانی، اطالوی، لاطینی، پرتگالی، اور ہسپانوی زبانوں میں لکھی گئی تھیں، لیکن ان میں سے اکثر، جو زیادہ اہم تھیں دو یا تین زبانوں میں آچکی ہیں۔ ان مصنفین میں سے (بہ استثناء اُن وینشی (Venetian) سفرا کے جو شروع میں اوزدن حسن کے دربار میں متعین تھے جیسے کے سے ری نو زینو (Catarino Zeno) جوزسے فو بار سبے رو (Josepho Babaro) اور امبروسیو کان ستے رینی (Ambrosio Contarini) اور جن میں سے اکثر پندرھویں صدی کے نصف آخر میں، یعنی خاندان صفویہ کے عروج سے پہلے ایران آئے) سب سے زیادہ مشہور یہ ہیں:۔ این تھونی جنکنسن (Anthony Jenkinson) شرلی برادران، کارٹ رائٹ (Cartwright) پیری (Parry) اور سر طامس ہربرٹ (Sir Thomas Herbert) انگریزوں میں سے؛ اور دوسروں میں سے

[1] اس فہرست میں ہمیں بہادر ترکی امیرالبحر سیدی علی رئیس کی مرآۃ الممالک کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اس نے ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء/۱۵۵۶ء میں خشکی کے راستے ہندوستان سے ترکی تک سفر کیا تھا اور قزوین میں شاہ طہماسپ کے دربار میں باریاب ہوا تھا۔ ومبیری نے اس کتاب کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے (Luzac, London 1899) وہ ابھی بہت کچھ تکمیل طلب ہے۔ ۱۲ مصنف

این ٹونیوڈی گوویا (Antonio di Govea) ڈان کار
سیاس ڈی سلوا فی گوے روسا (Don Garcias di Silva
Figuerosa) اولی اے ریس (Olearius) تیک زیرا
(Teixeira) پیترو دلا والے (Pietro della valle.
ٹے وریئیر (Tavernier) تھے دی ناٹ (Thevenot)
اور آخر ہیں لیکن دوسروں کے برابر مشہور، شاردن (Char
din) اور پی تس دی لاکر اے (Petis de la Croix)
ایم شے فر کا تبصرہ تو سترھویں صدی تک محدود ہے، لیکن
صفویہ کے زوال کا (جو ۱۷۲۲ء کے افغانی قتل و غارت سے
پہلے ہوا تھا) قابل ترین مؤرخ جے سوئٹ پیری کروسن سکی
(Pere Crusinski) ہے، اور اصفہان کے بعض ولندیزی
تاجروں کے خطوط سے بھی جنھیں ایچ ڈن لاپ (H. Dunlop)
نے اپنی کتاب (Persie-Haarlem 1912-PP 242-7)
میں چھاپا ہے اس المناک بربادی کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔
اس زمانے سے لے کر قاچاریہ کے عروج تک جو اٹھارھویں صدی
کے آخر میں ہوا، بہت کم یورپیوں نے ایران کی سیاحت یا
وہاں اقامت کی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس درمیان
میں ملک بہت کچھ بدنظمی کی حالت میں تھا اور تبلیغی یا تجارتی
کاموں میں بڑی بڑی مشکلیں تھیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ
سیاسی حالات بھی بہت کچھ بدل گئے تھے۔ عہد صفویہ کے دوران
میں یا اس سے کچھ ہی پہلے جو کچھ متعدد سیاسی وفود یورپی

۔دل کی طرف سے ایران بھیجے گئے تھے، ان میں سے تقریباً
ہر ایک کی غرض یہ تھی کہ عثمانی ترکوں کی زبردست قوت کا مقابلہ
یران سے مدد لے کر کیا جائے۔ جب سے ترکوں نے قسطنطنیہ
فتح کیا، یعنی ۱۴۵۳ء سے لے کر سلطان سلیم "مہیب" اور
سلیمان "ذی شان" کے عہدوں تک (۱۵۱۲ء تا ۱۵۵۶ء) ترکوں
کی قوت انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی تھی، چنانچہ ان دو سلطانوں
میں سے اول الذکر نے مصر اور مقامات مقدسہ فتح کیے اور "خلیفۃ
المسلمین" کا لقب اختیار کیا اور ثانی الذکر کے وائنا فتح کرنے میں
تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی۔ یورپی مدبّروں پر ترکی کا رعب اتنا
غالب تھا اور وہ اس سے اس قدر خائف تھے کہ بس بیک
(Busbecq) نے جو شاہ فرڈی نینڈ کی طرف سے دربار
سلطان سلیمان میں سفیر تھا، اس کے متعلق یہ الفاظ کہے تھے:
"صرف ایران ہی ہمیں تباہی سے بچائے ہوئے ہے ترک تو
کب کا ہم پر چڑھائی کر چکا ہوتا، لیکن ایرانی ہی اُسے روکے
ہوئے ہیں۔ اس کی ایران کے ساتھ یہ جنگ ہمارے لیے صرف
ایک مہلت سکون کا حکم رکھتی ہے، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے
کہ ہم بالکل ہی بچ جائیں گے"[۱] جب ۱۷۲۲ء میں خاندان صفویہ کا

[۱] ملاحظہ ہو کریزی کی تاریخ عثمانی ترک History of the Ottoman Turks) (لندن ۱۸۷۷ء، ص ۱۷۱ - ۱۷۷)

نیز ملاحظہ ہو (Foster and Daniel's "Life and letters of Busbecq") (لندن ۱۸۸۱ء) جلد اول ص ۲۲۱ - ۲۲۲ - ۱۲ مصنف

جو عرصہ سے دم توڑ رہا تھا، بالکل خاتمہ ہوگیا، تو اس وقت ترک یورپ کے لیے باعث خوف و دہشت نہ رہے تھے اور جو شدید مذہبی اختلافات دو صدیوں تک ترکوں اور ایرانیوں کو لڑاتے رہے تھے، ان کا زور بھی بہت کچھ کم ہوچکا تھا، خصوصًا نادرشاہ اعظم کی روا دارانہ پالیسی کی وجہ سے ان میں اور بھی کمی ہوگئی تھی۔ پس چوں کہ حالات اس قدر بدل چکے تھے اس لیے یورپ کی جو پالیسی ایران کے ساتھ پہلے تھی، وہ اب نہ صرف غیر ضروری ہوچکی تھی، بلکہ ناممکن بھی ہوگئی تھی۔

خاندان صفویہ کی خاص خصوصیتیں

خاندان صفویہ کے متعلق جو ذرایع علم ہمارے پاس موجود ہیں ان کے مذکورۂ بالا اجمالی تبصرے کے بعد اب ہم اس خاندان کی خاص خصوصیتوں سے بحث کرتے ہیں۔ یہ خصوصتیں اگرچہ سرسری طور پر نمایاں اور واضح ہیں لیکن ان کے ضمن میں بعض ایسے دلچسپ مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کے متعلق اب تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب قطعی طور پر طے ہوچکے ہیں۔ یہ مسائل ان عنوانات پر مشتمل ہیں: خاندان صفویہ کی قومیت، مذہب، ادب و فن، چنانچہ اب ہم اسی ترتیب کے ساتھ ان سے بحث کریں گے۔

قومیت

تحریک صفویہ کو قومی تحریک کن معنوں میں کہا جا سکتا ہے؟

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ساڑھے آٹھ سو سال کے بعد ایران کو

"ازسرِنو ایک قوم" بنانے کا سہرا صفویہ ہی کے سر ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن جس "قوم خواہی" کی مظہر تحریک صفویہ تھی وہ قوم خواہی کی ان متعدد شکلوں سے کئی حیثیتوں سے مختلف ہے جو آج کل ہمارے علم میں آتی رہتی ہیں۔ اتحاد زبان و نسل فی زمانہ قومیت کی روح سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اُس زمانے کی قومیت میں ان عناصر کا حصّہ مذہب کے مقابلے میں بہت کم نظر آتا ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کا آپس کا نفاق اور نفرت جتنا ۱۵۱۲ء سے لے کر ۱۵۲۰ء تک کے آٹھ سال میں شدید تھا، اتنا کبھی نہ ہؤا ہوگا۔ اس زمانے میں سلطان سلیم دہیب، ترکوں کا اور شاہ اسماعیل بانی خاندانِ صفویہ ایرانیوں کا حامی و معین تھا۔ فریدوں بے نے اس زمانے کے جو سرکاری مراسلات نقل کیے ہیں وہ امور سیاست کی حد سے ہٹ کر سب وشتم کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں اور سلطان سلیم انتہائی ملاطفت آمیز الفاظ میں بھی اپنے ایرانی دشمنوں کا ذکر کرتا ہے تو انھیں "اوباش قزلباش" کہتا ہے۔ اس شدید نفرت کا سبب جو بجا اور نمایاں ہے "مذہب" کے ذیل میں بیان ہوگا۔ لیکن واضح رہے کہ یہ نفرت نسل یا زبان کے بارے میں بالکل نہ تھی۔ گزشتہ جنگ عظیم میں جب امریکہ میدان میں اُترا ہے تو اخباروں میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ بعض شہروں میں لوگوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جرمن کتابیں جمع کیں اور ان میں آگ لگا دی۔ سولھویں صدی کا تُرک یا ایرانی اپنے جذبات نفرت

کو اس طفلانہ طریقے پر ظاہر کرنا کبھی گوارا نہ کرسکتا تھا۔ برخلاف اس کے یہ ایک عجیب بات ہے کہ اگرچہ شاہ اسماعیل اور شاہ سلیم دونوں کافی استعداد شعری رکھتے تھے مگر ثانی الذکر نے ہمیشہ صرف فارسی زبان میں اشعار کہے اور اول الذکر نے جس کا تخلص "خطائی" تھا تمام ترکی میں شاعری کی[1]۔ ترک صرف قزل باشوں کو ملحد سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے۔ انھیں ایرانیوں سے کوئی نفرت نہ تھی اور ان کی ادبیات اور سیاست میں فارسی زبان کا استعمال ہی تہذیب اور شایستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ تمام تعلیم یافتہ ترک اور ایرانی شاہ نامہ فردوسی میں ایران اور توران کی پرانی عداوت کا حال پڑھ چکے تھے، لیکن ذیل کی "تمہید" سے جو سلطان سلیم کے ایک

---

[1] سلیم کے فارسی دیوان کا مختصر تذکرہ ناظرین کو گب کی تاریخ ادبیات ترکی (جلد دوم ص۲۶۰) میں ملے گا۔ اس دیوان کا ایک نہایت مطلا اور مذہب نسخہ جو کئی قلمی نسخ سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مرتب کیا گیا تھا، ڈاکٹر پال ہارن آنجہانی نے برلن میں طبع کیا تھا اور ۱۹۰۴ء میں اسے معزول قیصر ولیم قیصر جرمنی کی طرف سے سلطان عبدالحمید خاں ثانی مرحوم کی خدمت میں تحفتہً پیش کیا گیا تھا۔ میرے سلسلۃ النسب صفویہ کے قلمی نسخے میں شاہ اسمٰعیل کی کئی ترکی نظمیں دی ہوئی ہیں۔ J. R. A. S. بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء ص۴۱۲ پر اس کے متعلق مزید حوالہ جات مل سکتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

مراسلہ مرقومہ اپریل ۱۵۱۴ء (صفر ۹۲۰ھ) میں نظر آتی ہے۔ یہ
معلوم کرکے تعجب ہوتا ہے کہ سلیم خود کو قدیم ایرانی بادشاہوں
مثلاً فریدوں، کیخسرو اور دارا کا ہم سر بتاتا ہے اور اپنے
ایرانی دشمن شاہ اسماعیل کی تشبیہ ترکوں کے حامی افراسیاب
سے دیتا ہے:-

"اما بعد، ایں خطاب مستطاب از جناب خلافت مآب[۵۲]
ما کہ قاتل الکفرۃ والمشرکین، قامع اعداء الدین، مرغم انوف الفراعین
مغفر تیجان الخواقین، سلطان الغزاۃ والمجاہدین، فریدوں فر،
سکندر در، کیخسروِ عدل و داد، دارائے عالی نژاد، سلطان سلیم شاہ
بن سلطان بایزید، بن سلطان محمد خان ایم، بہ سوئے تو کہ فرمان
دہِ عجم، سپہ سالارِ اعظم، سردارِ معظم، ضحاک روزگار، داراب
گیر و دار، افراسیابِ عہد امیر اسمعیل نام داری، سمت صدور یافتہ"

مجھے اب تک صرف ایک شعر ایسا نظر آیا ہے جس میں شاہ
اسمٰعیل کو حامیِ شیعیت نہیں، بلکہ حامیِ ایران بتایا گیا ہے۔ یہ
شعر احسن التواریخ[۵۳] میں موجود ہے۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو فریدوں بے جلد اول ص ۳۸ ۔ ۱۲ مصنف

۵۲ یہ لفظ "خلافت مآب" اس بات کا ایک دلچسپ ثبوت ہے کہ سلطان سلیم
اپنے بیٹے اور جانشین سلیمان سے پہلے ہی منصب خلافت کا دعوے
کرچکا تھا پروفیسر نے لی لوکا یہ خیال کہ ایسا نہیں ہوا اس لفظ سے
غلط ثابت ہوتا ہے۔ ۱۲ مصنف

۵۳ ملاحظہ ہو مسٹر الیس کا قلمی نسخہ ص ۲۴ ب بذیل واقعات ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ - ۱۵۱۵ء) ۱۲ مصنف

فروزندۂ تخت و تاجِ کیاں[۱]
فرازندۂ اختر کاویاں[۲]

صفویہ کے زمانے میں ترکی زبان کا رواج زیادہ تھا

اسی طرح سے وہ سات قبایل جو قزلباش فوجوں کی جان تھے، سب کے سب خالص ترکی نسل کے تھے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہی: روملو، شاملو، موصلو وغیرہ۔ یہی حال عساکر صفویہ کے سربرآوردہ افسروں کا بھی تھا۔ چنانچہ شاہ اسمٰعیل کے زمانے کی ایک نایاب تاریخ[۳] سے معلوم ہوتا ہی کہ قزلباشوں کا نعرۂ جنگ "پاینده باد ایران" یا اسی مضمون کا کوئی جملہ نہ تھا، بلکہ ترکی زبان کا ایک جملہ تھا جس کے معنے یہ تھے "ای میرے مرشد و آقا میری جان تجھ پہ تصدق ہی"۔

" صداے قربان اولدیغم (صدقہ) اولدیغم پیروم مرشدم کہ

---

[۱] باستانی شاہان ایران کا دوسرا خاندان۔ ۱۲ مترجم

[۲] کاوہ ایک وطن خواہ لوہار تھا، اس نے غیر ملکی غاصب ضحاک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ اسی کا پوستین "درفشِ کاویانی" کے نام سے قومی نشان قرار پایا۔ ۱۲ مترجم

[۳] یہ کتاب کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں زیر نشان Add 200 محفوظ ہی۔ (ملاحظہ ہو .F 41. a) سر ای۔ ڈے نی سن راس (Sir E. Denison Ross) نے J. R. A. S. بابتہ ۱۸۹۶ء جلد ۲۸۔ صفحہ ۲۶۴، صفحہ ۲۸۵ پہ اس کتاب پر ایک مضمون لکھا ہی۔ ۱۲ مصنف

شیوہ و شعارِ فرقۂ ناجیہ قزلباش است در میمنہ و میسرۂ کارزار انداختند[۵۱]"

شاہ اسمٰعیل کی وفات کے ایک سو سال بعد جب دارالخلافہ شمالی ایران سے ہٹاکر اصفہان میں منتقل ہوگیا تھا، اس وقت بھی درباری زبان عام طور پر ترکی ہی تھی[۵۱]۔ یہ اور اسی قسم کی متعدد مثالیں اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ اگرچہ خاندان صفویہ کے احیا کی وجہ سے ایران میں وہ یک رنگی پیدا ہو چلی تھی جو قومی احساس کی بنیاد ہوا کرتی ہے، لیکن پھر بھی احیاء صفویہ میں اور آج کل کے "ایران خواہوں" اور نوجوان ایرانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آج کل دونوں قوموں کے وطن خواہ، دوسری چیزوں سے زیادہ اپنی اپنی قومی زبانوں کی توسیع و اشاعت اور ان کو خارجی عناصر سے پاک کرنے پر خاص زور دیتے ہیں اور اگر ایک طرف انگورہ کے ترک قوم خواہ اپنے نئے خلیفہ کا خطبہ قدیم عربی کی بجائے ترکی میں پڑھتے ہیں تو دوسری طرف ایرانی "سردار سپاہ رضا خان[۵۲] اپنی فوج میں خالص ایرانی مصطلحات کو رواج دینا چاہتا ہے۔

---

[۵۱] ملاحظہ ہو (Olearius) (اولی ایریس) (لندن ۱۶۶۹ء) کا انگریزی اڈیشن طباعت دوم - صفحہ ۲۱۲ - ۱۲ مصنف

[۵۲] پروفیسر براؤن کی زندگی میں رضا خان سردار سپاہ تھے، رضا شاہ خان پہلوی نہ ہوئے تھے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس سن عیسوی (۱۹۲۶ء) نے ایران کے تخت کو کج کلاہان قاچاریہ سے خالی کرایا، اسی نے ایرانی ادبیات کے ایک محقق اور رکن رکین کو بزم حیات سے اٹھایا - پروفیسر براؤن مرحوم کی یہ جلد آخری تاجدار قاچاریہ احمد شاہ کے زمانے تک ہے۔ ۱۲ مترجم

صفویہ کا مذہب

(۳)

عقیدہ شیعیت کی ماہیت

ویسے تو مسلمان خود اپنے بیان کے مطابق بہتر یا تہتر فرقوں میں منقسم ہیں[۱]، لیکن چونکہ جبر و قدر اور خلق قرآن کے متعلق جو مختلف فیہ مسائل تھے وہ ان آخر دنوں میں بہت کچھ دب گئے ہیں، اس لیے یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ آج کل اُن کے دو بڑے بڑے اور خاص فرقے اہل سنت اور اہل تشیع ہیں۔ ویسے تو اہل تشیع کی جماعتیں منتشر طور پر ایشیائے کوچک، شام (یہاں انھیں متولی جمع متولا کہا جاتا ہے) ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں، لیکن خاص کر ایران میں اس مذہب کے پیرووں کی بہت کثرت ہے اور وہاں سلطنت کا مذہب بھی شیعیت ہی ہے۔ اس سوال سے تو بعد میں بحث کی جائے گی کہ صفویہ نے ۱۵۰۰ء کے قریب شیعیت کو سلطنت کا مذہب کس طرح بنایا، سر دست ہم اس مذہب کی ماہیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں کتاب الملل کے مشہور مصنف شہرستانی کا قول نقل کرتے ہیں جس کی وفات کا زمانہ بارھویں صدی

---

[۱] ملاحظہ ہو شہرستانی کتاب الملل (ed. Curlton) ص۲ و ص۳ ۔

۱۲ مترجم

عیسوی کے نصف کے قریب ہے۔[1]

الشیعۃ

ھم الذین شایعوا علیاً علیہ السلام علی الخصوص

(مصنف کے ترجمہ کا اردو ترجمہ) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خاص طور پر علی علیہ السلام

وقالوا بامامتہ وخلافتہ نصا ووصایۃ اما جلیا واما خفیا

کا ساتھ دیا اور انھیں نص اور وصیت کی رو سے خواہ جلی ہو یا خفی

واعتقدوا ان الامامۃ لا تخرج من اولادہ وان خرجت فبظلم

امام اور خلیفہ بتایا اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امامت ان کی

یکون من غیرہ او بتقیۃ من عندہ قالوا ولیست الامامۃ

اولاد سے الگ نہیں ہو سکتی، مگر دوسرے کے ظلم کی وجہ سے

قضیۃ مصلحیۃ تناط باختیار العامۃ وینتصب الامام

یا خود ان کے تقیہ کی وجہ سے۔ اور کہتے ہیں کہ امامت، صرف مصلحت کا سوال

نہیں ہے بلکہ اصول کا سوال ہے۔ یہ اختیار عامّہ پر موقوف

---

[1] پروفیسر براؤن مرحوم نے اس موقع پر شہرستانی کی عبارت کا ترجمہ دیا ہے، ہم اصل عبارت کتاب الملل سے نقل کرتے ہیں۔ آئندہ بھی حتی الامکان اس کی کوشش کی جائے گی کہ جن اقتباسات کا انگریزی ترجمہ پروفیسر مرحوم نے دیا ہے اس کے اردو ترجمے کے ساتھ ساتھ حاشیہ میں اصل عبارت بھی کتاب سے نقل کر دی جائے اگر کتاب نایاب ہو یا نہ مل سکے تو بدرجہ مجبوری انگریزی ترجمے کے ترجمے ہی پر قناعت کی جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ۔ ۱۲ مترجم

بنصبہم۔ بل ھی قضیۃ اصولیۃ ھو رکن الدین لا یجوز
نہیں ہے کہ وہ خود امام مقرر کردیں بلکہ ایک دینی رکن ہے، جس سے غفلت
للرسول علیہ السلام اغفالہ واھمالہ ولا تفویضہ الی العامۃ وارسالہ
یا اہمال رسول مقبول کے لیے بھی جائز نہیں ہے، اور جو عوام کے سپرد نہیں کیا جاسکتا
ویجمعہم القول بوجوب التعیین والتنصیص وثبوت عصمۃ
ان سب کا اجماع اس تعین و تنصیص پر اور چھوٹے بڑے سب
الائمۃ وجوبا من الکبائر والصغائر والقول بالتولی والتبری
ائمہ کی عصمت پر ہے، نیز قولاً و فعلاً اور اعتقاداً
قولا وفعلا وعقدا الا فی حال التقیۃ ویخالفہم بعض
تولا اور تبرا پر ہے سوائے تقیہ کی صورت کے لیکن اس بارے
الزیدیۃ فی ذالک ولہم فی تعدیۃ الامامۃ کلام وخلاف
میں بعض زیدی ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تعدیہ امامت میں بحث
کثیر وعند کل تعدیۃ وتوقف مقالہ ومذھب وخبط
اور اختلاف کثرت سے ہے اور ہر تعدیہ کے موقع پر ایک بحث اور مذہب اور خرابی موجود
وھم خمس فرق کیسانیۃ، وزیدیۃ وامامیۃ وغلاۃ
وہ پانچ فرقے ہیں: کیسانیہ اور زیدیہ اور امامیہ اور غلاۃ اور اسمٰعیلیہ
واسمٰعیلیۃ وبعضہم یمیل فی الاصول الی الاعتزال
بعض ان میں سے اصول اعتزال کی طرف مائل ہیں
وبعضہم الی السنۃ وبعضہم الی التشبیہ[1]
بعض سنت کی طرف اور بعض تشبیہ کی طرف

---

[1] کتاب الملل والنحل الشہرستانی مطبوعہ مطبعۃ الادبیہ فی سوق الخضار القدیم مصر ۱۳۱۷ھ جزاول حاشیہ صفحہ ۱۹۶ صفحہ ۱۹۵ ۱۲ مترجم

عقیدۂ شیعیت ایرانی مزاج کو کیوں پسند ہے

مذکورۂ بالا بیان سے جو مطلب مختصر اور واضح طور پر نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمام شیعہ پہلے تین منتخب شدہ خلفائے راشدین یعنی حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو نہیں مانتے - ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد ان کے برادر عم زاد اور اُن کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے شوہر حضرت علیؓ کو ان کا جانشین ہونا چاہیے تھا اور آنحضرتؐ نے خود بھی اُنھیں کو نامزد فرمایا تھا، نیز یہ کہ حضرت علیؓ کے بعد خلافت ان کے خاندان میں بطور حق الٰہی کے منتقل ہونی چاہیے تھی - شیعہ خود خاندان علی میں بھی انتخاب خلیفہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو منتخب اور نامزد فرمایا تھا، اسی طرح ہر امام اپنے جانشین کو خود منتخب اور نامزد کرسکتا تھا- اُن لوگوں میں بھی جو مذکورہ بالا اُصولوں پر متفق تھے، جزئیات کے بارے میں اختلاف رائے کی بہت کچھ گنجایش تھی - بعض شیعہ صرف امام کا اولاد علی میں ہونا ہی کافی سمجھتے تھے اور امام محمد ابن الحنفیہ کو ماننے کے لیے طیار تھے اور بعض یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خلافت صرف اولاد فاطمہ ہی میں رہنی چاہیے - فرقہ ہائے سبعین یا اسماعیلیہ اور اِثنا عشری یا امامیہ اسی آخری گروہ میں شامل ہیں اور ہماری بحث صرف اِثنا عشری فرقے سے ہے - تیسرے امام حضرت امام حسین کے زمانے میں، جو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ کے

چھوٹے صاحبزادے تھے، ایک دوسرا ہی عنصر پیدا ہوگیا، کیونکہ متقدمین اور مستند مورخین مثلاً الیعقوبی[1] وغیرہ کے بیان کے مطابق ایران کے آخری ساسانی تاجدار یزدگرد سوم کی ایک دختر حضرت امام حسین کے حبالۂ عقد میں تھیں اور ان سے ایک صاحبزادے الموسوم بہ علی و الملقب بہ زین العابدین تھے جو چوتھے امام تھے اور ایک طرف اولاد فاطمہ سے تھے تو دوسری جانب ایرانی خاندان شاہی سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ نظر بایں حالات، ایرانیوں کا حضرت امام زین العابدین اور ان کی اولاد کے ساتھ عقیدت اور وفاداری رکھنا تعجب خیز امر نہیں ہے۔

شیعہ سنّی کا اختلاف شخصی نہیں بلکہ اصولی ہے۔ مذکورۂ بالا بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ شیعہ اور سنّی کا جھگڑا صرف ناموں یا شخصیتوں کا جھگڑا نہیں ہے، بلکہ دو متضاد اصولوں یعنی جمہوریت اور بادشاہوں کے حق الٰہی کا جھگڑا ہے۔ عرب زیادہ تر جمہوریت پسند ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں لیکن ایرانی ہمیشہ اپنے بادشاہوں کو الٰہی یا نیم الٰہی ہستیاں سمجھتے رہے ہیں۔ جو طبایع اس بات تک کو گوارا نہیں کرسکتے کہ انسانوں کا

---

[1] اس کی تاریخ ۲۵۹ہجری کے آخر میں لکھی گئی ہے۔ ہوتسما (Houtsma) نے اسے مرتب کرکے ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے دو جلدوں میں شایع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو میری تاریخ ادبیات ایران جلد اول ص۲۲۹، اور اسی کا حاشیہ ۲ الخ ۱۲۔ مصنف

منتخب کردہ کوئی شخص ان کی ریاست کا حاکم ہو، وہ امام یعنی خلیفۃ الرسول کے انتخاب عمومی کو کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ ایران ہمیشہ سے اسماعیلیہ اور امامیہ فرقوں کا مرکز بنا رہا ہی۔ غزنویہ اور سلجوق کے ترکی سنّی خاندانوں کے زمانے میں[1] تو یہ فرقے محکوم اور دبے ہوئے رہے ہیں لیکن بُویہ اور بعض مغلوں (خصوصاً غازان اور خدا بندہ الجائیتو) کے عہدوں میں ان پر نظر عنایت رہی ہی اور صفویہ کے دور میں تو یہ پورے ایران پر حاوی ہو چکے تھے۔

صفویوں کا سلسلۂ نسب اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ یہ صفویہ تھے کون؟ انھوں نے اس قدر شد و مد کے ساتھ شیعیت کب اختیار کی؟ اور انھیں غلبہ کیونکر نصیب ہوا؟ صفوی صفی کی صفت ہی اور اس خاندان کا یہ نام ایک مشہور بزرگ صفی الدین کے نام سے پڑا جن کا وصال ۱۳۳۴ء میں بعمر ۸۵ سال گیلان میں ہوا۔ یہ بزرگ اپنے کو حضرت امام موسیٰ کاظم، ساتویں امام کی بیسویں پشت میں بتاتے تھے[2]۔ جس عزت و احترام کے ساتھ ان کا ہمعصر مشہور مورخ اور مدبّر رشید الدین فضل اللہ اپنے خطوط میں ان کا تذکرہ کرتا ہی اس سے صاف

---

[1] سلجوقی دور کی اکثر تصانیف مثلاً سیاست نامہ اور راحت الصدور سے اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] ناظرین کو یہ پورہ شجرہ J. R. A. S. بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء صفحہ ۳۹۶ اور حاشیہ ۱ میں مل سکتا ہی۔ ۱۲ مصنف

طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعی (ایک ذی شہرت بزرگ تھے۔) اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ (ان کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد صفوۃ الصفا کے نام سے ان کی ایک ضخیم سوانح عمری مرتب کی گئی۔ اس سوانح عمری کا مواد ان کے فرزند صدرالدین نے فراہم کیا تھا اور خاندانِ صفویہ کے (جس کے یہ مورثِ اعلیٰ تھے) ہر مورخ نے براہِ راست یا بالواسطہ اسی سوانح عمری سے استفادہ و استناد کیا ہے۔ شاہ اسماعیل جو سلطنت صفویہ کا اصل بانی تھا ان کی چھٹی پشت میں تھا۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ شیعیت میں جو توغل شیخ صفی الدین کے اخلاف کو تھا، وہی خود انھیں بھی تھا۔ اس باب میں جو کچھ تھوڑی بہت شہادت فراہم ہوسکتی ہے اس کی رو سے تو شیخ صفی الدین کو سنّی کہا جا سکتا ہے۔ اُزبک سرداروں نے شاہ اسماعیل کے بیٹے شاہ طہماسپ کے نام جو خط ۱۵۲۹ء ۱۵۳۰ء میں لکھا ہے اس میں وہ کہتے ہیں "ہم نے تو یہی سنا ہے کہ شیخ صفی الدین سنّی تھے"، اور اس امر پر اظہار تعجب کرتے ہیں کہ "شما (شاہ طہماسپ) نہ روش حضرت مرتضیٰ علی را تابع اید و نہ روش پدر کلاں را"۔[1] خواجہ علی (صفی الدین کے پوتے اور شاہ اسماعیل کے پردادا کے والد) اس خاندان کے پہلے شخص ہیں جو شیعیت کی طرف بہت زیادہ مائل نظر آتے ہیں[2] اور خوابہا

---

[1] یہ عبارت آیندہ صفحہ ۱۳۲ پر بھی ملے گی۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو J. R. A. S بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء صفحہ ۳۹۵۔ ۴۰۶۔ ۱۲ مصنف

میں ائمہ علیہم السلام سے باتیں کرتے ہیں۔ ان خواجہ علی کے
پوتے جنید اور پرپوتے حیدر وہ پہلے اشخاص ہیں جنھوں نے
شیعیت کی تبلیغ بزور شمشیر کی اور میدانِ جنگ میں کام آئے۔
ابتدا میں جماعت صفویہ صرف ایک مذہبی جماعت تھی۔ غرض کہ پندرھویں صدی کے شروع میں صفویوں کی حیثیت
صرف خاندانی پیروں یا مرشدوں کی سی تھی اور ان کے قبیلہ
نے درویشوں یا صوفیوں کے ایک اہم فرقے کی شکل اختیار
کرلی تھی جس کی تعداد روز افزوں تھی۔ اس جماعت کے پیرو
صرف ایران ہی میں نہ تھے بلکہ ایشیائے کوچک کے ترکی صوبوں
میں بھی پھیلے ہوئے تھے اور وہاں سرگرمی کے ساتھ اپنے حلقے
کی اشاعت کرتے تھے[1]۔ اس بات کا اندازہ کہ یہ تحریک آئندہ
چل کر کس قدر کامیاب ہونے والی تھی، اسی سے ہوسکتا ہی
کہ جب سلطان سلیم مہیب نے ۱۵۱۴ء میں شاہ اسمٰعیل کے
خلاف زبردست فوج کشی شروع کی ہی تو اس نے حفظ ماتقدم
کے طور پر پہلے اپنی مملکت کے چالیس ہزار شیعوں کو بے دریغ
قتل کردیا[2]۔ ان درویشوں یا مریدوں کے نعرۂ جنگ سے جو
(صفحہ ۲۴ پر دیا جاچکا ہی) معلوم ہوتا ہی کہ یہ لوگ خاندانِ صفویہ

[1] ملاحظہ ہو گب (Gibb) کی History of the Ottoman Poetry Vol II PP.227-228 ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو L'estat de Perse en 1660 (۱۶۶۰ء میں سلطنت ایران کی حالت) مرتبہ ایم۔ شیفر (Schefer) صفحہ ۱۱۔۱۲ ۱۲ مصنف

کے سردار کو اس زمانے میں بھی اپنا "پیر و مرشد" ہی سمجھتے تھے، جب وہ "شیخ" نہیں رہا تھا بلکہ "شاہ" ہو چکا تھا۔

صوفی اعظم کی اصطلاح شاہانِ صفویہ کے ہم عصر یورپی مدبّرین اور مصنفین انھیں صوفی اعظم (The Great Soph) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ شاردِن (Chardin) رے فائل ڈومانس (Raphael du Mans) اور دوسرے مستند مورخین نے اس لقب کا بڑا مضحکہ اڑایا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ چونکہ صوفی عام طور پر غریب اور ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے، کچھ ایسے زیادہ پابند شرع بھی نہ تھے اور عوام انھیں نظر حقارت سے دیکھتے تھے، اس لیے ان لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ ایران کا شاہنشاہ ان کے نام کو اپنے لقب کے ساتھ کس طرح منسوب کرسکتا ہے۔ لیکن دور صفویہ کی فارسی تاریخوں میں حتّٰی کہ خود سلسلۃ النسب میں جس کی تالیف کا سن وہی ہے جو رے فائیل ڈومانس کی تصنیف کا، نیز احسن التواریخ اور اس سے پہلے کے وقایع میں رُوم یعنی ایشیائی ترکی کے صوفیوں کو عساکر صفویہ کی جان کہا گیا ہے۔ ایثار، علوِّ ہمّت اور اسی قسم کے صفات کو "صوفیت کا جزو غیر منفک[۱]" بتایا گیا ہے اور ادنیٰ درجہ کے یا غیر وفادارانہ افعال کو "ناصوفی" کہا گیا ہے۔ پس اگر ایک ایسے شخص کو جو صرف شاہِ ایران ہی نہیں بلکہ ان فداکار دردیشوں یا صوفیوں کا

---

[۱] ملاحظہ ہو J. R. A. S. بابتہ جولائی ۱۹۲۱؁ء۔ یہ اصل فارسی الفاظ اس تصویر میں درج ہیں جو ۳۱۵ کے مقابل ہے۔ ۱۲ مصنف

شیخ بھی تھا اور جس کی ہمّت و شجاعت پر اس زمانے کے وینشی سیاح عش عش کرتے تھے اگر یورپ والے "صوفیٔ اعظم" یا "صوفی" کہیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ ہماری رائے میں اس لفظ صوفیٔ اعظم کی سب سے زیادہ قرینِ قیاس وجہ تسمیہ یہی ہے جو بیان ہوئی، کیونکہ اسے لفظ صفویہ کا مخرب کہنا تو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ یورپ میں ایک اور خیال یہ بھی رائج تھا کہ لفظ "صوفی" یونانی لفظ "سوفوس" سے بنا ہے۔ اس خیال کی بنیاد غالبًا وہ مبہم روایات تھے جو مجوسیوں اور دانایانِ مشرق کے متعلق یورپ میں مشہور تھے۔ لیکن ڈان جوان ایرانی اس کی پُر زور تردید کرتا ہے[۱]۔ یہ بتانے کے بعد کہ شاہ اسمٰعیل نے فتح تبریز کے بعد ہی Gran Sophi de Persia صوفیٔ کبیر ایران) کا لقب اختیار کر لیا تھا، وہ آگے چل کر یوں صراحت کرتا ہے:—

"یہاں لفظ صوفی سے مراد دانا نہیں ہے جیسا کہ بعضوں نے غلطی سے اسے یونانی لفظ "سوفوس" کی شکل سمجھ کر قیاس کر لیا ہے، بلکہ یہ لفظ دراصل "صوف" سے نکلا ہے جو فارسی لفظ ہے اور جس کے معنی 'اون' یا 'روئی' کے ہیں[۲]۔"

---

[۱] Ed. Valladolid سنہ ۱۶۰۴ء۔ صفحہ ۵۔ ۱۲ مصنف

[۲] کروسن سکی کا بھی یہی خیال ہے۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب کے انگریزی ترجمے کا صفحہ ۶۵ (مطبوعہ لندن سنہ ۱۷۲۹ء)۔ ۱۲ مصنف

اسمٰعیل کا بچپن جس کس مپرسی اور خطرے کی حالت میں بسر ہوا اس کو دیکھتے ہوئے اس کا اس قدر جلد قوت پکڑ جانا تاریخ ایران کا ایک حیرت آفریں واقعہ ہے۔ اس کے باپ شیخ حیدر کو ۱۴۹۰ء میں قتل کیا گیا تھا۔ اسمٰعیل کی عمر اس وقت صرف تین سال کی تھی[ل۵] اور اس کو اور اس کے دونوں بھائیوں کو (جن میں سے بڑا بھائی سلطان علی ۱۴۹۵ء میں جنگ میں کام آیا) ہمیشہ آق قویونلو (گوسفند سفید) خاندان کے ترکمان حاکموں کی طرف سے اپنی جانوں کا اندیشہ رہا کرتا تھا اور کئی مرتبہ تو یہ تینوں بھائی صرف اپنے فدا کار صوفی مریدوں کی وجہ سے ان دشمنوں کے ہاتھوں سے بال بال بچے ہیں۔ جب اسمٰعیل ۱۳ سال کی عمر میں سلطنت ختم کرنے، یا جان پر کھیل جانے کا قصد کرکے لاہجان سے اردبیل کی سمت بڑھا ہے تو اس وقت اِس جماعت صوفیہ میں سے صرف سات آدمی اس کے ساتھ تھے! لیکن ہر منزل پر برابر لوگ آآکر شریک ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ طارم پہنچتے پہنچتے اس کی فوجی جمعیت پندرہ سو ہوگئی تھی اور جب وہ فرخ یسار شاہ شیروان پر حملہ کرنے کے ارادے سے اوزنجان پہنچا ہے تو اس وقت اس کے ساتھ سات ہزار آدمی تھے۔ ایک سال کے اندر ہی اندر وہ تبریز فتح کرکے تخت ایران پر متمکن ہوگیا اور اپنے مشیروں کے مشورے کے باوجود اس نے اپنی رعایا کے لیے

[ل۵] شاہ اسمٰعیل کا سن ولادت ۵ رجب ۸۹۲ھ مطابق ۲۷ جون ۱۴۸۷ء ہے۔ ۱۲ مصنف

مذہب شیعیت لازمی اور جبری قرار دے دیا۔ لوگوں نے ہر چند اسے سمجھایا کہ تبریز کی دو ثلث آبادی سنّی ہے اور نماز اور خطبوں میں ایسے فقرات کا اضافہ جو خصوصیت کے ساتھ شیعوں کا شعار ہیں، خاص کر پہلے تین خلفا ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ پر تبرّا بازی کہیں کوئی فتنہ نہ پیدا کر دے، لیکن اس نے نہ مانا اور جواب دیا:

"حذائے عالم با حضرات ائمہ معصومین ہمراہ منند ومن از ہیچ کس باک ندارم بتوفیق اللہ تعالیٰ اگر رعیت حرفے بگویند شمشیر می کشم و یک کس را زندہ نمی گزارم"[1]

چنانچہ اس نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا اور رعیت کو حکم دیا گیا کہ اگر تبرّا پڑھتے وقت انھوں نے بآواز بلند "بیش باد، کم باد" نہ کہا تو انھیں سزائے موت دی جائے گی۔

شاہ اسمٰعیل کی سیرت | اگرچہ بظاہر آثار اسمٰعیل ظالم اور خوں ریز تھا، لیکن اس زمانے کے وینسی سیاحوں نے جو حال اس کا لکھا ہے اس میں کئی دلکش خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بقول کے ٹے ری نو زے نو (Caterino Zeno) کے وہ ۱۳ سال کی عمر ہی میں:

"بڑی آن بان اور شاہانہ شان رکھتا تھا اور

---

[1] یہ پوری عبارت آیندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔ ۱۲ مصنف

جیسی اس کی صورت حسین تھی ویسی ہی اس کی سیرت بھی
زیبا تھی، اس کا ذہن نہایت رسا تھا اور وہ ایسے ایسے
خیالات رکھتا تھا جو اس کی کم سنی میں ناقابلِ یقین نظر آتے ہیں"

اینِ جیولے لو (Angiolello) اس کا بیان یوں کرتا ہے:
"اپنے حسن اور دلکش طور طریقوں کی وجہ سے وہ
بہت محبوب اور ہر دلعزیز ہے"

پھر اس کی جوانی کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-
"وہ صبیح، خوش شکل اور زیبا شمائل ہے۔ کچھ ایسا
زیادہ دراز قامت نہیں ہے، بلکہ سبک اور سڈول
کاٹھی رکھتا ہے۔ سینہ کشادہ ہے جسم چھریرا نہیں بلکہ
دُہرا ہے۔ بال سُرخی مائل ہیں، ڈاڑھی منڈاتا ہے،
مونچھیں رکھتا ہے، وہ ہتّا ہے۔ شجاعت میں وہ
کسی لڑنے والے مرغ سے کم نہیں اور زور و
قوت میں اپنے سب سرداروں سے زیادہ ہے
تیر اندازی کی مشقوں میں ۱۰ میں سے ۷ سیب
اسی کے نشانے سے گرتے ہیں"

تبریز میں شاہ اسمٰعیل نے جو کچھ کیا اس کے بیان کرنے کے
بعد گمنام تاجر لکھتا ہے :-
"میں سمجھتا ہوں کہ نیرو (Nero) کے وقت سے
لے کر اب تک ایسا جلّاد بادشاہ نہ پیدا ہوا ہوگا"
لیکن آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے :-

"قیصریہ میں اس نے حکم عام نافذ کیا تھا کہ جو شخص
اُردُوے شاہی میں اشیائے خور و نوش فروخت
کرنے آئے، اسے فراخ دلی کے ساتھ قیمت دی
جائے اور اپنے آدمیوں کو تاکید کردی تھی کہ
چونکہ یہ شہر ہمارا حلیف اور دوست ہی اس لیے
اگر کسی نے مٹھی بھر گھاس بھی بغیر قیمت دیے
ہوئے لی تو وہ سزائے قتل کا مستوجب ہوگا"

یہی مصنف آگے چل کر اس کے متعلق کہتا ہی:-

"وہ لڑکیوں کی طرح سلیم الطبع ہی، پیدایشی بہتا ہی
آہو کی سی پھرتی رکھتا ہی اور اپنے سب سرداروں
سے زیادہ قوی ہی"

پھر کہتا ہی:

"اس صوفی (Sophy) کی رعایا خصوصًا اس کے
سپاہی اس کی عزّت اور احترام خدا کی طرح کرتے
ہیں۔ اس کے اکثر سپاہی تو بغیر زرہ بکتر کے
لڑائی کے گھمسان میں پِل پڑتے ہیں۔ ان کا عقیدہ
یہ ہی کہ لڑتے وقت ہمارا آقا اسمٰعیل ہمارا حافظ و
ناصر رہے گا"۔

صفوی اور عباسی تبلیغ کی مماثلت

میرا خیال ہی کہ تحریک صفویہ کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہی تو اس تبلیغ اور دعوت میں جو ابو مسلم نے آٹھویں صدی عیسوی کے نصف

کے قریب عباسی خلفا کے لیے کی تھی اور جس میں وہ بہت کچھ کامیاب بھی ہوا تھا۔ یہ دونوں تحریکیں خصوصیت کے ساتھ مذہبی تحریکیں تھیں اور ضمناً نسلی بھی تھیں۔ ان دونوں میں خاص مابہ الامتیاز یہ ہے کہ تحریک صفویہ کو جس مخالف یعنی عثمانی سلطان سلیم سے عہدہ برآ ہونا پڑا، وہ جبروت اور قوت میں تحریک عباسیہ کے مخالف یعنی اموی خلیفہ مروان سے کہیں زیادہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ صفوی تحریک کی کامیابی بہت کچھ محدود رہی۔ تحریک عباسیہ تو تمام مشرقی اسلامی ممالک میں کامیابی کے ساتھ پھیل گئی تھی، لیکن صفویہ کی کامیابی صرف ایران ہی کی حد تک رہی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ایک زمانے میں ترکی تک بھی اس کا اثر پہنچنے والا تھا۔ ظلم کا بڑا محرک ہمیشہ جذبہ خوف ہوا کرتا ہے، اور یہ اسی جذبے کا تقاضا تھا کہ سلطان سلیم نے اپنی

اس زمانے میں ترکوں اور ایرانیوں کی شدید عداوت کی وجہ

چالیس ہزار شیعہ رعایا کو بے دریغ قتل کر دیا تھا۔ لیکن اس شقاوت کی وجہ خوف کے علاوہ کچھ اور بھی تھی۔ غصّہ اور مایوسی کا بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا۔ سلطان سلیم آج کل کی اصطلاح میں اسلام خواہ[1] تھا وہ ایک عظیم ترین اور زبردست

[1] اسلام خواہ: یعنی تمام دنیا میں اتحاد اسلامی پیدا کرکے اسلام کی قوت کو عالمگیر بنانا۔ ہم نے پین اسلامزم (Pan-Islamism) کا ترجمہ اسلام خواہی کیا ہے، اس کا اسم فاعل اسلام خواہ ہے۔ ۱۲ مترجم

اسلامی سلطنت کا بادشاہ ہی بننا نہ چاہتا تھا، بلکہ کُل دنیائے اسلامی کے حاکم مطلق العنان بننے کا ارمان بھی دل میں رکھتا تھا اور کوئی شک نہیں کہ اس کی یہ آرزو پوری بھی ہو جاتی، اس لیے کہ وہ ۱۵۱۷ء میں مصر اور اماکن مقدسہ کو فتح کر چکا تھا اور آخری عباسی خلیفہ کو دھمکا یا پھسلا کر اس بات پر راضی کر چکا تھا کہ وہ اس کے حق میں منصبِ خلافت سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن اس کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا شاہ اسمٰعیل تھا، اس لیے کہ اس کی شیعہ سلطنت مغرب کے سنّی مسلمانوں اور اقصائے مشرق یعنی ماوراءالنہر، افغانستان، بلوچستان اور ہندوستان کی سنّی آبادی کے بیچ میں حائل تھی۔ ایرانی صرف سلطان سلیم کی خلافت ہی کے منکر نہ تھے، بلکہ وہ سرے سے مسئلہ خلافت ہی کے قائل نہ تھے۔ ترکوں کو جو فتح اگست ۱۵۱۴ء میں ایرانیوں پر حاصل ہوئی وہ بھی کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوئی، اس لیے کہ عثمانی فوجیں آگے بڑھنے پر تیار نہ تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر بھی ان کی فوج کشی پوری طرح بارآور نہ ہوسکی اور اس سے طرفین کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے خلش پیدا ہو گئی، جس نے اسلام کی سیاسی قوت میں ضعف پیدا کر کے یورپ کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ۱۵۰۸ء میں دارالخلافۃ الاسلام یعنی بغداد ایرانیوں کے قبضہ میں آگیا تھا اور ۱۵۳۴ء میں پھر ترکوں نے اس پر قبضہ کر لیا، لیکن اس تیس سالہ مدت میں جیسے جیسے ان شدید اور لا تعداد ہی جنگوں کا مد و جزر ہوتا رہا، ویسے

ویسے اس شہر کی قسمت بھی پلٹے کھاتی رہی - یہ کبھی ایک کے قبضہ میں رہا کبھی دوسرے کے - حتیٰ کہ جب صفویہ کے آخری تاجداروں کا زور دن بدن ٹوٹنے لگا اور ان کی قوت کم ہوگئی تو ترک عراق کے مالکِ کُل بن بیٹھے -

صفویہ کے فنون اور ادبیات

عہد صفویہ میں بلند پایہ شعرا کی کمی - عہد صفویہ کی ایک نہایت عجیب خصوصیت جس کی وجہ بادی النظر میں سمجھ میں نہیں آتی، یہ ہے کہ ان کے دو صد سالہ زمانے میں ایران میں مشہور شاعروں کی حیرت انگیز کمی رہی ہے - فن عمارت، مصوری اور دوسرے فنون میں تو اس دور میں بہت کچھ ترقیاں ہوئیں، چنانچہ شاہ عباس کی بنائی ہوئی عمارتیں جو اس کی مملکت، خصوصًا اس کی دارالخلافت اصفہان کی زینت تھیں، آج تک اپنے زائرین سے خراج تحسین و آفرین وصول کرتی ہیں - بہزاد اور ان دوسرے صناعوں کے جانشین جو ہرات کے تیموری درباروں میں موجود تھے، ایران میں بھی اسی زمانے میں گزرے: مثلاً رضائے عباسی اور اس کے ہم جماعت - لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ باوجودیکہ تحفۂ سامی[1]

[1] شہزادہ سام مرزا پسر شاہ اسمٰعیل نے اس نام سے اپنے معاصر شعرا کا تذکرہ لکھا تھا - یہ کتاب بھی اس قابل ہے کہ اسے جلد از جلد طبع کرادیا جائے - ۱۲ مصنف

مجلس علمی حیدرآباد دکن کے مجموعہ مضامین میں جو مذاکرات کے نام سے شائع ہوا ہے، مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے تحفۂ سامی پر ایک بلند پایہ مضمون لکھا ہے - ۱۲ مترجم

اور دوسرے تذکروں میں بے شمار شاعروں کے حالات لکھے ہوئے ہیں، لیکن ان میں باستثنائے ہاتفی، ہلالی اور دیگر خراسانی شعرا جنھیں درحقیقت ہرات کے شاعروں کا سلسلہ ہی سمجھنا چاہیے، ایک شاعر بھی تو ایسا نہیں ہوا جسے اعلیٰ درجہ کا شاعر کہا جاسکے۔ کیسی عجیب بات ہی کہ تیمور کے ہفتاد سالہ عہد آشوب میں تو آٹھ دس ایسے بلند پایہ شعرا پیدا ہوں جن کے ناموں کو ادبیات فارسی کا کوئی متعلم فراموش کر ہی نہیں سکتا اور پھر ان سب کا سرتاج حافظ بھی اسی زمانہ میں پیدا ہو۔ لیکن (جہاں تک مجھے علم ہی) صفویہ کے دو صد و بست سالہ عہد میں نمایاں قابلیت یا جدّت رکھنے والا ایک شاعر بھی ایران کی سرزمین سے نہ اُٹھے!! میں نے اس موقع پر یہ الفاظ "ایران کی سر زمین" قصداً استعمال کیے ہیں، اس لیے کہ شاعروں کا ایک جھمکڑا ایران چھوڑ کر ہندوستان کے مغلیہ درباروں کی رونق میں گیا تھا جن میں عرفی شیرازی (وفات ۱۵۹۰ء) اور صائب اصفہانی (وفات ۱۶۷۷ء) خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ نو آبادیا مہاجرین کی اولاد نہ تھے، بلکہ خود تلاش معیشت میں ایران چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے اور وہاں دولت کما کر پھر اپنے وطن واپس آگئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ دورِ صفویہ میں شاعروں کی کمی کا سبب فقدانِ استعداد نہیں، بلکہ سرپرستی اور قدر شناسی کی کمی تھا۔ رضا قلی خاں نے جو ضخیم انتخاب اشعار مجمع الفصحا کے نام سے مرتب کیا ہی اور جو گزشتہ صدی

کے نصف کے قریب لکھا گیا ہے، اس کے دیباچے میں اس نے بھی اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ علیٰ ہٰذا جن یورپی عالموں (مثلاً ڈاکٹر ایتھے (Ethe) نے فارسی ادبیات پر قلم اُٹھایا ہے، انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ رضا قلی خاں اور ان یورپی علما کے بیانات میں صرف یہ فرق ہے کہ موخرالذکر بالاتفاق رائے جاؔمی کو ایران کا آخری نامور شاعر کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی وفات کے بعد جسے چار صدی کا زمانہ گزرا کوئی مشہور فارسی شاعر نہیں پیدا ہوا، لیکن رضا قلی خاں دور قاچاریہ کے بعض جدید شعرا مثلاً قاآنی، فروغی، یغما وغیرہم کو بھی اول درجے کا شاعر کہتا ہے۔ خود میں بھی ذاتی حیثیت سے رضا قلی خاں کا ہم خیال ہوں۔

شعرا کی کمی کی وجہ

صفویہ کے جیسے طویل اور شان دار دور میں کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا نہ ہونا مجھے اتنا تعجب خیز نظر آیا کہ میں نے اپنے عالم اور محقق دوست مرزا محمد خاں قزوینی کی خدمت میں (جن کی کاوش علمی اور قابلیت کا ہر فارسی داں ممنون ہے) ایک عریضہ بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ بھی اس خیال کو صحیح سمجھتے ہیں اور اگر صحیح سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ آپ کے خیال میں کیا ہے۔ اپنے مکتوب مورخہ ۲۴ ۔مئی ۱۹۱۱ء میں انھوں نے اس کا حسب ذیل جواب دیا۔

شاعروں کی کمی کے متعلق مرزا محمد خان قزوینی کی رائے۔

"اس میں تو واقعی کوئی شبہ نہیں کہ عہد

صفویہ میں ادب اور شعر بہت کچھ پست حالت میں تھے اور اس زمانے کے کسی شاعر کو بھی اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ خود آپ نے بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ بادشاہ اپنے سیاسی اغراض، نیز سلطنت عثمانی کی شدید مخالفت کی وجہ سے اپنی تمام تر قوتیں عقیدہ شیعیت کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کرتے تھے اور ارکان و اصول مذہب کے علما کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علما ایران کے اتحاد مذہبی کے لیے بہت کوشاں رہتے تھے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی اتحاد مذہبی اتحاد سیاسی کا ذریعہ بھی ثابت ہوا اور ایران کی جو حالت آج ہے یعنی وہاں کے باشندوں کا ایک زبان، یک نسل، اور یک مذہب ہونا، یہ انھیں کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر ادب شعر، صوفیت، تصوف غرض کہ ہر اس چیز پر نظر ڈالی جائے جو بقول ان کے "متعلق بہ کمالیات بود در مقابل شرعیات" تو معلوم ہوگا کہ ان علما و مجتہدین نے ان چیزوں کو ترقی دینے میں نہ صرف غفلت برتی اور کوتاہی کی بلکہ "اہلِ کمالیات" کو ہر طریقہ سے ضرر پہنچایا اور ایذائیں دیں اور یہ سب محض اس بنا پر کہ یہ

بچارے فقہ اور اس کے فروعات پر حاوی نہ تھے!
خصوصًا صوفیوں کے ساتھ تو وہ ہر طرح کی زیادتی کرتے
تھے اور انھیں جلا وطنی، شہر بدر، قتل، سب وشتم
غرض ہر طرح کی تکالیف دیتے تھے اور اکثروں
کو تو خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے تھے، یا مروا
ڈالتے تھے اور زندہ جلادیتے تھے۔ یہ تو ایک
بدیہی بات ہے کہ ہر ملک میں خصوصًا سرزمین ایران
میں ادب اور شعر اور صوفیت اور تصوف کا
آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان میں سے
ایک کا زوال دوسرے کے زوال اور پستی کو مستلزم
ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خاندانِ صفویہ کے عہدِ حکومت
میں علم، تہذیب، شعر اور تصوف سرزمینِ ایران
سے ناپید ہوگئے اور تکیوں، خانقاہوں اور زاویوں
کا تو ایسا قلع قمع کیا گیا کہ آج سارے ایران میں
اس قسم کی کوئی خیراتی عمارت نظر نہیں آتی، حالانکہ
ابن بطوطہ کے سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس
کے زمانے میں اس قسم کی بنائیں اور ادارے ہر
شہر، قصبہ اور قریہ میں موجود تھیں، اور وہ چھوٹے
سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے مقام پر پہنچتا تو
انھیں عمارتوں میں فروکش ہوتا تھا۔ لیکن آج ان
کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ جو شخص دورِ

صفویہ کے حالات سے واقف نہ ہو، اسے واقعی تعجب ہوگا کہ کیا یہ وہی ایران ہے جو زمانۂ سابق میں تھا، اور کیا اس کے باشندوں کا مذہب بھی وہی اسلام ہے! اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج سارے ایران میں بجز دو چار خانقاہوں کے ایک خانقاہ بھی نہیں ہے، حالانکہ سلطنت ترکی کے ان علاقوں میں جو حدود صفویہ سے باہر تھے، جیسے عراق، کردستان، سلیمانیہ، آج بھی اس قسم کی عمارتیں اتنی ہی تعداد میں موجود ہیں جتنی ابن بطوطہ کے زمانے میں تھیں"

"قصّہ مختصر یہ کہ صفویہ کے زمانے میں بڑے بڑے شعرا اور فلاسفہ کی بجائے جیّد علما اور مجتہدین پیدا ہوئے، جو اس میں شک نہیں کہ جیّد ضرور تھے لیکن ساتھ ہی درشت مزاج، کھرّے، غالی اور قشری بھی تھے، جیسے علماءِ مجلسی، محقق ثانی شیخ حُر آملی، شیخ بہائی وغیرہ"

شاہانِ صفویہ اپنی شان میں مدحیّہ قصائد پسند نہیں کرتے تھے

مشرق کے اکثر پیشہ ور شاعر زیادہ تر قصیدہ گو ہوا کرتے ہیں۔ اگر رضا قلی خاں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ شاہانِ صفویہ، خصوصاً شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کبیر، اپنی شان میں نہیں، بلکہ ائمہ کی شان میں مدحیّہ قصائد لکھوانا زیادہ پسند کرتے تھے تو

اس سے ان کے زمانے میں شاعروں کی کمی کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ زیادہ قرینِ قیاس بھی ہے۔ چونکہ اماموں کی بجائے ہندوستان کے زبردست مغل بادشاہوں سے مادّی فوائد حاصل کرنے کی توقع زیادہ تھی، اس لیے ایران کے اکثر طالبِ زر شاعروں کے قدم بجائے اس کے کہ کربلا کی طرف اُٹھیں، دہلی کی سمت زیادہ بڑھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران میں مذہبی شاعری خصوصاً ائمہ اطہار کی منقبت اور ان کے مصائب کے بیان کو بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ان شاعروں میں سب سے زیادہ مشہور محتشم کاشی (وفات ۱۵۸۸ء) ہے ان رسمی اور قدیم مراثی کے علاوہ ان سادہ اور دل ہلا دینے والے اشعار کی ابتدا جنھیں محرم کے زمانے میں پڑھ کر ایرانی اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا کرتے ہیں، اسی زمانے سے ہوئی ہے اس لیے کہ صفویہ کے زمانے میں اہلِ بیت کے ساتھ محبّت اور عقیدت اور ان کے ستانے والوں کی طرف سے حقارت اور نفرت پیدا کرنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا گیا تھا۔ برخلاف اس کے (۲) واقعات کربلا کے مؤثر مناظر کو شبیہ کی صورت میں پیش کرنا جو فی زمانہ عزاداری کا ایک لازمہ بن گیا ہے اور جسے یورپی مصنفین Miracle Plays "تمثیلاتِ معجزہ" کہتے ہیں، یہ غالبًا اس زمانے کے بہت بعد میں شروع ہوا ہے۔ اولی اسے ریس (Olearius) نے جو ایک محتاط مورخ ہے، ۱۰۴۷ھ کا محرم (مطابق مئی۔ جون ۱۶۳۷ء) اردبیل میں بسر

کیا تھا جو خاندانِ صفویہ کا قدیمی مامن تھا۔ ماتم، بکا، نوحہ خوانی، جسم زخمی کرنا، غرض کہ وہ سب باتیں جو عاشورہ محرم یا "روزِ قتل" تک ہوتی رہتی ہیں اس کی نظر سے گزری تھیں اور اس نے ان کا حال لکھا بھی ہے لیکن کسی شبیہ[1] کا بیان اس نے نہیں کیا ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس چیز کا رواج نہ تھا۔ اس امر کی تحقیق کے لیے میں نے اپنے دو باخبر اور ذہین دوستوں سید تقی زادہ اور مرزا حسین دانش کو بھی خطوط لکھے تھے۔ اول الذکر صاحب کا خیال ہے کہ روضہ خوانی یعنی منبر پر بیٹھ کر روضۃ الشہدا یا دوسرے شہادت ناموں سے واقعات پڑھنا تو صفویہ ہی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے مگر تعزیہ گردانی اور شبیہ وغیرہ بعد کی چیزیں ہیں اور غالبًا یورپی اثر سے پیدا ہوئی ہیں۔ دوسرے صاحب مرزا حسین دانش نے بھی شبیہوں[2] کے آغاز کا زمانہ اٹھارھویں صدی کا ختم یا اوائل انیسویں صدی قرار دیا ہے۔ یعنی عہدِ قاچاریہ کے شروع میں اور اسی سلسلے میں انھوں نے رضائے کرد کے یہ دو شعر بھی نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو حضرت عمرؓ سے جو عداوت ہے اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ

---

[1] ایران میں واقعات کربلا کا سوانگ بھرا جاتا ہے، اسے شبیہ کہتے ہیں ۱۲ مترجم

[2] سر لیوس پلی (Leuis Pelly) نے شبیہوں کے جو ترجمے کیے ہیں ان سے انگریزی داں اصحاب کو ان کا اچھا علم ہو سکتا ہے۔ ۱۲ مصنف

اور حضرت فاطمہ رض کے حقوق کو غصب کیا، بلکہ یہ بھی ہی کہ انھوں نے ایران کو فتح کرکے ساسانی خاندان کا خاتمہ کردیا۔

وہ شعر یہ ہیں:-

بشکست عمرؓ پشت ہزبرانِ عجم را

بر باد فنا داد رگ و ریشۂ جم را

این عربدہ بر غصب خلافت ز علیؓ نیست

با آلِ عمرؓ کینہ قدیم است عجم را

آخر میں ہم صفویہ کی ایک اور کار روائی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے سلطنت ایران کو اور زیادہ استحکام نصیب ہوا اور آدمیوں کی جو تعداد اور روپیہ کے جو ذخیرے ہر سال ملک کے باہر جاتے تھے، وہ اندرونِ ملک ہی رہنے لگے۔ انھوں نے مشہد، قم اور دوسرے بلاد ایران کو بڑھا چڑھا کر مرجع انام بنادیا اور اس طرح زائرین کا انبوہ کثیر صرف ان کی سلطنت کے حدود کے اندر ہی رہنے لگا، چنانچہ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں، کربلا، نجف اور مشہد علی کے مقدس مزارات اور درگاہیں پہلے اسی سلطنت میں واقع تھیں اور بعد کو ترکوں کی زیرِ سیادت آئیں۔

ملکرلہ

میرے مکرم دوست مسٹر ہ۔ ل۔ رے بی لو (H. L. Rabino) نے جن کا تعلق دولت انگلشیہ کے محکمۂ سفارت

سے ہی، اپنی عنایت سے مجھے ان مراسم عزا کا حال لکھ کر دیا ہی جو چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں بغداد میں منائے جاتے تھے۔ سردست میرے پاس صرف دو عبارتوں کی نقل موجود ہی جن میں سے ایک المانی زبان میں ہی اور ایک فارسی میں۔ ان عبارتوں کے متعلق انھوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں کچھ حوالے بھی دیے تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ خط گم ہوگیا ہی۔ میرا قیاس ہی کہ غالبًا یہ یہ عبارتیں ڈارن (Dorn) کے ایک مضمون سے لی گئی ہیں جو شاید رسالہ (Melanges Asiatiques) میں شائع ہوا تھا۔ جرمن عبارت کا ترجمہ یہ ہی[1]۔

"بغداد میں عزاداری کو ۹۶۳ء میں آل بویہ کے حکمران معزالدولہ نے رواج دیا، جیسا کہ ابوالفتح نے اپنی کتاب "احسن القصص" میں لکھا ہی"

فارسی اقتباس درج ذیل ہی:-

"بنائے تعزیہ سید الشہدا در بغداد ۳۵۲ھ در تاریخ ابن کثیر شامی آوردہ کہ معزالدولہ احمد بن بویہ در بغداد در دہۂ اوّلِ محرم امر کرد کہ تمامی بازارہائے بغداد را بستہ مردم سیاہ عزا پوشیدند و بہ تعزیت سیدالشہدا پرداختند۔ چوں ایں قاعدہ در بغداد رسم

[1] اس جرمن عبارت کا اردو ترجمہ میرے محترم عنایت فرما ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی نے کیا ہی ۱۲ مترجم

نبود، لہٰذا علمائے اہلِ سنت آں را بدعتے بزرگ دانستند و چوں بر معزالدولہ دستے نداشتند، چارۂ جز تسلیم نتوانستند، بعد ازاں ہر سالہ تا انقراضِ دولتِ دیلمہ شیعیاں در دہ روزِ اولِ محرم در جمیع بلاد رسمِ تعزیہ بجا می آوردند و در بغداد تا اوائلِ سلطنتِ طغرل سلجوقی بر قرار بود۔"

باب دوم

من ابتدائے قیام صفویہ، لغایۃ ۹۳۰ھ (۱۵۲۴ء)

شاہ اسمٰعیل اور اس کے اسلاف

شیخ صفی الدین کی شہرت رسوخ اور بزرگی کے متعلق تاریخی شہادتیں۔

اس امر کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ اردبیل کے گوشہ نشین بزرگ شیخ صفی الدین جو شاہان صفویہ کے مورث اعلیٰ تھے اور جن کی وجہ سے اس خاندان کا یہ نام پڑا، اپنے زمانے کے ایک مشہور اور ذی رسوخ بزرگ تھے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنے قوت بازو سے تخت و تاج کا مالک بنے گا اور ایک ایسے خاندان کی بنا ڈالے گا جو دو صدیوں تک برسرِ حکومت رہے تو وہ اگر کسی ادنیٰ خاندان کا فرد ہے تو ضرور اپنے اسلاف کے متعلق کوئی ایسی روایت مشہور کر دے گا جس سے اس کا سلسلۂ نسب مشہور باستانی بادشاہوں، مدبّروں، یا سورماؤں سے جا ملے۔ غرض کہ ہر طرح سے یہ ثابت کر دکھائے گا کہ اس کا خاندان جو درحقیقت اس کے عروج و اقتدار سے پہلے کچھ وقعت نہ رکھتا تھا، ہمیشہ سے معزز اور رفیع رہا ہے۔ لیکن شاہ اسمٰعیل کو اس قسم کی روایت تراشنے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ وہ شیخ صفی الدین[1]

[1] آیندہ ہم بنظر اختصار شیخ صفی الدین کو صرف شیخ صفی لکھیں گے ۱۲ مصنف

کی چھٹی پشت میں گزرا ہے اور یہی وہ ہستی ہے جس نے سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں خاندان صفویہ کی بنا ڈالی اور ایران کو از سرِ نو وہ کھوئی ہوئی عظمت دی جس سے وہ ساتویں صدی عیسوی میں، یعنی عربوں کے ہاتھوں قدیم اور زبردست شاہانِ ساسانیہ کے زوال کے بعد محروم ہو چکا تھا۔ ہاں، تو ہم کہہ رہے تھے کہ شاہ اسمٰعیل کو اس امر کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ وہ زبردستی اپنا سلسلۂ نسب کسی قدیم شاہی خاندان سے ملا کر اپنے آپ کو معزز ثابت کرے۔ وہ شیخ صفی کی اولاد میں تھا۔ اور خواہ شیخ صفی کو شیعوں کے امامِ ہفتم حضرت موسیٰ کاظمؒ اور اس سلسلے سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد مانا جائے یا نہ مانا جائے، لیکن دو ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے، یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں ایک بڑے زبردست مرشد اور بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ باقی رہا اولادِ علیؓ ہونے کا سوال تو اس اعتبار سے بھی ان کا سیّد ہونے کا دعویٰ اتنا ہی صحیح اور قوی تھا جتنا ان کے ہم عصر دوسرے سادات کا۔

---

[1] شیخ صفی کا مکمل شجرہ صرف چند اختلافات کے ساتھ صفوۃ الصفا، احسن التواریخ سلسلۃ النسب صفویہ اور صفویہ کی اکثر تاریخوں میں دیا ہوا ہے۔

صفی الدین ابو الفتح اسحٰق، ابن امین الدین جبرئیل، ابن صالح، ابن قطب الدین احمد، ابن صلاح الدین رشید، ابن محمد حافظ، ابن عوض الخواص، ابن فیروز شاہ زریں کلاہ، ابن محمدؐ، ابن شرف شاہ، ابن محمد، ابن حسن، ابن محمدؐ، ابن ابراہیم ابن جعفر، ابن محمد ابن اسمٰعیل، ابن محمدؐ، ابن سید احمد العربی، ابن ابو محمد قاسم، ابن ابو القاسم حمزہ، ابن الامام موسیٰ کاظم (جو امام ہفتم اور حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کی پانچویں پشت میں تھے۔ ۱۲ مصنف

مشہور وزیر رشید الدین فضل اللہ ان کی بہت عزت کرتا تھا | ان کی شہرت اور اثر کا پہلا اور اہم تر ثبوت یہ ہے کہ ہم

تاریخوں میں مشہور وزیر رشید الدین فضل اللہ کو ان کی خیریت سننے کے لیے مضطرب پاتے ہیں اور وہ ہمیشہ ان کے الطاف اور توسل کا جویا نظر آتا ہے۔ اس وزیر کے مجموعۂ خطوط میں جس کا نام منشآت رشیدی[1] ہے اور جو آج کل بہت نایاب ہے دو خط ایسے ہیں جن سے مذکورہ بالا امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ پہلا خط (مجموعے کا نمبر ۴۰ اور میرے نسخے کا ورق ۱۴۵ الف - ۱۴۹ ب) خود شیخ صفی الدین کے نام ہے اور اس میں ان کی خانقاہ کے لیے سالانہ غلہ، شربت انگور، تیل، مویشی، شکر، شہد اور دیگر اجناس خوردنی کی کچھ رسد مقرر کی گئی ہے تاکہ عید میلاد النبیؐ کے موقع پر امرائے اردبیل کی ضیافت اچھی طرح کی جاسکے اور شرط یہ مقرر کی گئی ہے کہ ختم میلاد پر راقم خطوط (اور اس جشن کے منتظم) کے حق میں دعائے خیر کی جائے۔ دوسرا خط (مجموعہ نمبر ۴۹ اور نسخہ ورق ۱۶۱ ب - ورق ۱۶۹ ب) رشید نے اپنے لڑکے میر احمدؔ حاکم اردبیل کے نام لکھا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ کل ساکنان اردبیل پر نظر عنایت رکھے خصوصاً:-

"و نوعے سازی کہ جناب قطبِ فلکِ حقیقت و سیاح بحارِ شریعت، مساح مضمارِ طریقت، شیخ الاسلام و المسلمین

---

[1] ملاحظہ ہو میرا مضمون مندرجہ J. R. A. S. بابۃ اکتوبر ۱۹۱۷ء (ص ۲۹۵ - ص ۲۹۶) بعنوان
Persian MSS of the late sir Albert Houtum Schindler
نیز ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد سوم صفحہ ۸۰ - صفحہ ۸۷ - ۱۲ مصنف

بُرہان الواصلین، قدوۂ صفۂ صفا، گلبن دوحۂ وفا، شیخ
صفی الملۃ والدّین ادام اللہ تعالیٰ برکات انفاسہ الشریفہ
از تو راضی و شاکر باشند۔"

ان خطوط سے اور خاص کر دوسرے خط میں شیخ صفی کے جو مناقب بیان کیے گئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مذکور کی عزّت اور احترام ان کے معاصرین کے دلوں میں کس قدر تھا[1]۔

شیخ صفی کی ضخیم سوانح عمری صفوۃ الصفا

ہمارے موضوع بحث سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ شیخ موصوف کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کے مرید اور درویش توکل[2] ابن اسمٰعیل الموسوم بہ ابن البزّاز نے ان کی ایک مبسوط سوانح عمری لکھی جس میں ان کے حالات زندگی، سیرت، عادات و اخلاق، تعلیمات، عقائد، محاسن اور خوارق عادات کا بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوانح عمری شیخ صدرالدین کے ایما سے لکھی گئی تھی جو اپنے والد شیخ صفی کے انتقال کے بعد شیخ سلسلہ بنے اور ۵۸ برس یعنی ۱۳۳۴ء۔ ۱۳۹۲ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ یہ نایاب اور اہم کتاب اب تک غیر مطبوعہ ہے[3] اور بانیِ خاندان

---

[1] شیخ صفی الدین کی وفات ۷۳۵ھ (۱۳۳۴ء) میں بعمر ۸۵ سال ہوئی رشید الدین ۱۳۱۸ء میں جب اس کی عمر شاید ۰، سے متجاوز تھی، قتل کیا گیا۔ ۱۲ مصنف

[2] انھیں توکلی بھی کہتے ہیں، چنانچہ مسٹر الیس کے نسخے میں یہی درج ہے۔ ۱۲ مصنف

[3] اس حصّے کی تکمیل کے بعد مجھے اپنے ایرانی نامہ نگار کی عنایت سے صفوۃ الصفا کا ایک اعلیٰ درجے کا لیتھو کا چھپا ہوا نسخہ ملا ہے جو بمبئی میں ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں چھپا ہے۔ اس باب کی تحریر کے وقت مجھے اس نسخے کے وجود کی مطلق اطلاع نہ تھی۔ ۱۲ مصنف

نیز کل صفویہ خاندان کے متعلق جو کچھ حالات بعد کی تصانیف میں نظر آتے ہیں، ان سب کا مآخذ یہی کتاب ہے اور اسی کے اقتباسات ان تصانیف میں سے اکثر میں جابجا نظر آتے ہیں۔ ایک صاحب مسمی ابوالفتح حسینی نے نسبتہً قریب تر زمانے میں یعنی شاہ طہماسپ کے عہد حکومت میں (۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء) اس کی نظر ثانی بھی کی تھی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کے صرف تین نسخوں کا علم ہے یعنی برٹش میوزیم کا[۵۱] قلمی نسخہ نشان Add. 11745 کنگ کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ذخیرۂ پوٹ (Pote) کا ۸۵[۵۲]، اور ایک اور اعلیٰ درجے کا نسخہ جو ۱۰۳۰ھ مطابق ۱۶۲۱ء میں اردبیل میں لکھا گیا تھا۔ یہ آج کل مسٹر ایلس (Ellis) کے پاس ہے اور انھوں نے اپنی قدیم عنایات سے کام لے کر مجھے اجازت دی ہے کہ جب تک ضرورت ہو اسے اپنے پاس رکھوں۔ یہ ضخیم کتاب ایک دیباچہ، بارہ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر ایک کئی کئی حصّوں پر منقسم ہے[۵۳]۔ ریو (Rieu) نے حسب عادت اس کے مباحث کی تلخیص نہایت صحت کے ساتھ کی ہے۔ کتاب میں دلچسپ مواد بہت کچھ ہے، لیکن رطب و یابس کی بھی کمی نہیں جس کا مطالعہ سوائے عقیدتمند مریدوں کے اور ہر شخص کے لیے بار ہوگا۔ منقبت آمیز طرزِ تحریر کا

---

[۵۱] ملاحظہ ہو ریو (Rieu) فہرست کتب فارسی صفحہ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۱۲ مصنف

[۵۲] ملاحظہ ہو میری مرتب کردہ فہرست ضمیمہ (Supplementary Hand List) صفحہ ۱۳۷۔ ۸۳۷۔ ۱۲ مصنف

[۵۳] باب ہشتم میں کم از کم ۲۷ فصلیں ہیں۔ ۱۲ مصنف

جو نمونہ قارئین کو افلاکی کی مناقب العارفین میں ملتا ہو (جس کا انگریزی ترجمہ ریڈ ہاوس[1] (Red House) اور فرانسیسی ہوارت[2] نے کیا ہو) وہی طرز تحریر اس کتاب میں بھی زیادہ تر نمایاں ہو۔ اس کتاب کے جو اقتباسات خاندانِ صفویہ کی بعد کی تاریخوں میں (خصوصاً سلسلۃ النسب صفویہ میں[3]) شریک کیے گئے ہیں، وہ عام قارئین کے لیے بالکل کافی ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اصل کتاب کا احتیاط کے ساتھ مطالعہ اور اس کی تحقیق بہت کچھ نتیجہ خیز ہوسکتی ہو، کیونکہ اس کے اکثر واقعات اور اقوال کی تصدیق خود شیخ صدرالدین نے

---

[1] یہ ترجمہ اس منظوم ترجمے کے شروع میں موجود ہو جو ریڈ ہاؤس نے مع مثنوی مولانا جلال الدین رومی رح کے دفتر اول کا کیا ہو اور جو ٹربنر (Trubner) کے سلسلۂ مشرقیہ میں شایع ہوا ہو۔ مناقب العارفین کا ترجمہ ناظرین کو ص۳ ، ص۱۳۵ پر ملے گا۔ ۱۲ مصنف

[2] Les Saints des Deroisches Tourneurs (Etudes d' Hagiographie Musulmane) Vol, I (Paris, Leroux) 1918: Vol. II 1922.

[3] اس نایاب اور نہایت دلچسپ کتاب کا مفصل بیان میں J. R. A. S. بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء ص۳۹۵ ۔ ص۴۱۸ پر کرچکا ہوں۔ ڈاکٹر بابنگر (Babniger) اور ایم۔ منارسکی (M. Minorsky) دونوں نے مجھے توجہ دلائی ہو کہ خانی کوف نے Melanges Asiatique کے ص۵۸۰ ۔ ص۵۸۳ پر اس کتاب کے ایک نسخے کا حال لکھا ہو جو سینٹ پٹرس برگ میں موجود ہو۔ ۱۲ مصنف

کی ہے، لیکن شیخ صفی اور ان کی اولاد کی بحث کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کرکے ہم پہلے ان کے اسلاف کا حال لکھتے ہیں۔

شیخ صفی الدین کے بزرگوں کا حال

امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظم رح

(مشہور مورخ الیعقوبی[1]) سے ہمیں اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ حضرت امام علی رضا کے علاوہ جو امام ہفتم کے بعد منصبِ امامت پر سرفراز ہوئے، حضرت موسیٰ کاظم کے ایک اور صاحبزادے بھی تھے جن کا نام حمزہ تھا۔ شیخ صفی الدین خود کو انھیں کی اولاد میں بتاتے ہیں، لیکن اس کے بعد جو بارہ نام شجرے میں درج ہیں اور جن میں سے پانچ صرف محمد ہیں اور اس سے آگے کوئی نام نہیں، وہ اتنے غیر معروف ہیں کہ ان کی تحقیق نہیں کی جا سکتی۔ فیروز شاہ زریں کلاہ صفویوں کے پہلے مورثِ اعلیٰ

فیروز شاہ زریں کلاہ

جن کے متعلق ہمیں کچھ مفصل حالات دستیاب ہو سکتے ہیں، سلسلۃ النسب میں لکھا ہے کہ انھیں ابراہیم ادھم رح نے (جن کو شاہِ ایران بتایا گیا ہے) حاکم اردبیل مقرر کیا تھا اور اسی وقت سے یہ شہر اس خاندان کا مسکن اور مرکز قرار پایا۔ ابراہیم ادھم کو اگرچہ خاندان شاہی کا رکن بتایا گیا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے بعد کو دنیا ترک کر دی تھی اور ایک مشہور بزرگ ہوئے اور ۱۶۱ھ کے قریب شام میں ان کی وفات ہوئی۔ تاریخ میں ان کے کسی ایسے فرزند کا ذکر نہیں ہے جو ان کے بعد ایران میں یا اور کہیں ان کے تخت کا

---

[1] مرتبہ ہوتسما (Houtsma) جلد دوم صفحہ ۵۰۱ - ۱۲ مصنف

وارث بنا ہو۔ فیروز شاہ نے اپنی زندگی خوش حالی سے بسر کی اور رنگین میں جو گیلان میں ایک مقام ہے، انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے فرزند عوض ان کے جانشین ہوئے۔ لیکن تاریخ میں ان کا حال کہیں درج نہیں ہے، صرف اس قدر معلوم ہوسکا ہے کہ وہ اردبیل کے پاس ایک مقام اسفرنجان میں رہتے تھے۔ اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے فرزند محمد چونکہ حافظ قرآن تھے اس لیے حافظ ان کی کنیت ہی ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ حافظ قرآن بننے کی سعادت انھیں اجنہ کے طفیل میں حاصل ہوئی تھی جو سات سال کی عمر میں انھیں اُٹھا لے گئے تھے اور سات سال تک اپنے پاس رکھ کر تعلیم دیتے رہے۔ بعد کے دو بزرگ

محمد حافظ

صلاح الدین رشید

خاندان صلاح الدین رشید اور قطب الدین احمد کے متعلق ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ یہ حضرات اپنی زندگی کلخران[1] میں سکون کے ساتھ بسر کرتے اور کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔ جب گرجیوں کا خوفناک حملہ ہوا ہے تو ان میں سے آخرالذکر اپنے خاندان کے ساتھ جس میں ان کا مہینے بھر کا بچہ امین الدین جبرئیل بھی تھا، اردبیل کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن یہاں بھی انھیں اطمینان نصیب نہ ہوا۔ گرجی ان کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے اور انھیں ایک چھوٹے سے حجرے میں پناہ لینی پڑی۔ ان کی جانیں صرف ایک وفادار نوجوان شخص کی وجہ سے بچیں جس نے حملہ آوروں کے

[1] جیسا کہ مجھے ایم۔ منارسکی سے معلوم ہوا ہے اس لفظ کا صحیح تلفظ کلخران ہی ہے۔ گل خواران نہیں ہے۔ ۱۲ مصنف

ہاتھوں شہید ہونے سے پہلے حجرے کے دروازے کے سامنے مٹی کی ایک بہت بڑی ناند ڈال دی اور اس طرح اندر جانے کے راستے کو چھپا دیا۔ خود قطب الدین کی گردن پر بہت بڑا زخم لگا اور وہ بال بال بچے۔ ان کے پوتے شیخ صفی جو ان کی زندگی ہی میں تولد ہو چکے تھے فرماتے تھے کہ جب کبھی دادا جان مجھے اپنے کندھے پر بٹھاتے تھے تو میں اپنی چھوٹی چھوٹی چار انگلیاں زخم کے گھاؤ میں رکھ دیا کرتا تھا۔ قطب الدین کے بعد ان کی جگہ ان کے بیٹے

امین الدین جبرئیل | امین الدین جبرئیل نے لی۔ یہ ولی تھے اور کاشتکاری کرتے تھے۔ انھوں نے خواجہ کمال الدین عرب شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ان کی شادی دولتی نامی ایک خاتون سے ہوئی تھی جس کے بطن سے ۶۵۰ھ مطابق ۵۳-۱۲۵۲ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جو بعد کو شیخ صفی الدین کے نام سے مسندِ شہرت پر بیٹھا۔ انھیں صفی الدین کے زمانے سے یہ خاندان گوشۂ گمنامی سے نکل کر شہرت کے میدان میں آیا۔ سلسلۃ النسب کا مصنف صرف شیخ صفی الدین کی تاریخ ولادت ہی دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ذیل کے واقعات سے بھی اس کا تطابق اور تعیّن کرتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تو شمس تبریزؒ کے وصال کو پانچ برس ہو چکے تھے اور شیخ محی الدین ابن العربی اور نجم الدین کبرےؒ کی وفات کو علی الترتیب ۱۲ برس اور ۳۴ برس ہو چکے تھے۔ جب ہلاکو خاں مغل نے ایران فتح کیا اس وقت شیخ صفی الدین کی عمر پانچ سال کی تھی اور جلال الدین رومیؒ کی وفات کے وقت ۲۲ سال اور شیخ سعدیؒ کی رحلت کے وقت ۴۱ سال

کی تھی۔ ان کے معاصر مشہور اولیاء اللہ عبداللہ شیرازی، شیخ نجیب الدین بزگوش، علاء الدولہ سمنانی اور شیخ محمود شبستری (مصنف گلشن راز) وغیرہم تھے۔ ان کے تین بڑے اور دو چھوٹے بھائی تھے اور ایک بہن بھی تھیں جو ان سے بڑی تھیں۔ اس طرح سے سات اولادوں میں سے یہ پانچویں تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر چھ سال کی تھی۔

شیخ صفی الدین (۱۲۵۴ء تا ۱۳۳۴ء)

کتاب صفوۃ الصفا کا موضوع ضخامت اور مباحث

اب تک تو ہمیں سوانح حیات کی قلت کی شکایت رہی ہے، لیکن شیخ صفی الدین کے زمانے سے ہمیں سوانح کی وہ کثرت نظر آتی ہے کہ الجھن ہونے لگتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ صفی الدین کے حالات میں جو کچھ ہمیں آج مل سکتا ہے، صفوۃ الصفا اس سب پر حاوی ہے۔ لیکن وہ بہت ضخیم ہے اور اس میں کم و بیش ۲ لاکھ ۱۶ ہزار الفاظ ہیں۔ اس کا طرزِ تحریر صاف اور سادہ ہے، حشو اور عبارت آرائی بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے، اس لیے اس کے کل مطالب کے مکمل بیان کے لیے خود ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ (اس میں سنین تاریخی کی افسوسناک کمی ہے) اور شیخ صفی اور ان کے مرشد شیخ زاہد گیلانی کی زندگیوں کے دنیاوی پہلوؤں کی بجائے، روحانی حیثیتوں کا ذکر بہت زیادہ کیا

---

۵۱ محمد، صلاح الدین رشید اور اسمٰعیل۔ ۱۲ مصنف

۵۲ یعقوب اور فخر الدین یوسف۔ ۱۲ مصنف

گیا ہے۔ میں ذیل میں اس کے مطالب کی مختصر سی مختصر تلخیص ناظرین
کے سامنے پیش کرتا ہوں:-

مقدّمہ : (دو دفعات میں) شیخ صفی الدین کے ظہور سے متعلق
رسول مقبولؐ اور اولیائے سابقین مثلاً جلال الدین رومیؒ
وغیرہ کی پیشین گوئیاں۔

باب اوّل (۱۱ دفعات میں جن میں سے دو کی مزید تقسیم کی گئی ہے)
شیخ صفی کی ابتدائی زندگی، ان کا سلسلہ نسب، کرامات
قبل ولادت، ولادت و عہدِ طفولیت، مرشد کی تلاش،
شیخ زاہد گیلانی سے ملاقات، ان کے مرید کی حیثیت سے
شیخ صفی کی زندگی، شیخ حلقہ کے منصب پر سرافرازی،
نبی کریمؐ کے ساتھ ان کا روحانی وصال، شیخ زاہد کی
خصوصیات اور خوارق۔

باب دوم (تین دفعات میں) شیخ صفی کے بعض خوارق عادات
جن کی مدد سے انھوں نے خلق اللہ کو سمندر، گہرے
پانی، پہاڑ، کہر اور برف، دشمنوں کے حملے، غلامی اور
امراض سے نجات دلائی۔

باب سوم (تین دفعات میں) بعض خوارق کا بیان جو شیخ صفی سے
حالت جلال و جمال میں ظاہر ہوئے۔

باب چہارم (چھ دفعات میں جن میں سے دو کی مزید تقسیم کی گئی ہے)
شیخ صفی کے بعض اقوال، ان کی بتائی ہوئی آیاتِ قرآنی،
احادیث نبوی، اقوال اولیاء اللہ اور شعرا کے عارفانہ

اشعار کی تشریح و تفسیر۔

باب پنجم (تین دفعات میں) اجنہ، حیوانات اور غیر ذی روح اشیا کے متعلق شیخ صفی کے بعض خوارق۔

باب ششم (اس کی تقسیم نہیں کی گئی ہی) شیخ صفی کی وجد کی حالتوں اور "حال" کا بیان۔

باب ہفتم (پانچ دفعات میں) شیخ صفی کی مختلف کرامات مثلاً روشن ضمیری، پیشین گوئی، مُردوں سے بات چیت۔

باب ہشتم (۲۷ دفعات میں) شیخ صفی کے محاسن، ان کی قوتوں اعمالِ صالحہ، ادعیۂ ماثورہ، وجد اور حال کی بعض مثالیں (بروایت و شہادت شیخ صدرالدین)

باب نہم (دو دفعات میں) شیخ صفی کا مرض الموت اور ان کا وصال۔

باب دہم (تین دفعات میں) شیخ صفی کی کرامات بعد از مرگ

باب یازدہم (تین دفعات میں) شیخ صفی اور ان کے خلفا کے فضل کا تمام دنیا میں غلغلہ۔

باب دوازدہم (دو دفعات میں) شیخ صفی کے مریدوں کے خوارق عادات۔

خاتمہ۔

مسلمانوں کے تذکرات الاولیا کی خصوصیات اگرچہ یہ امر بہت کچھ مایوس کن ہی کہ ایک اتنی ضخیم کتاب کا نسبتاً بہت ہی مختصر حصہ سوانح حیات سے متعلق ہی، تاہم اس پر

تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جو حضرات لازمان اور لامکان سے تعلق رکھیں گے، وہ سنین تاریخی، یا ایسی ہی اور دوسری جزوی تفصیلات میں کیوں پڑنے لگے! اس حیثیت سے اولیا کے تمام تذکرے تقریبًا یکساں ہیں۔ ان میں صرف خصوصیت کے ساتھ اس شخص کے جس کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، نیک اقوال، صالح اعمال اور کرامات ہی کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی کرامات[1] روحانی اکتشاف (Psychical Research) کے سلسلے میں تھوڑی بہت دلچسپی ضرور رکھتی ہے۔ ڈ۔ ب۔ میک ڈونالڈ (D. B. Macdonald) نے اپنی بے مثل تصنیف (The Religious Attitude & Life in Islám)[2] میں اور کل ہوارٹ (Cl. Huart) نے اپنی کتاب[3] ''Saints des Derviches Tourneurs'' میں اس کو تسلیم کیا ہے۔ آخر الذکر مصنف ان روحانی مظاہرات کی جو مناقب العارفین میں درج ہیں، حسب ذیل تقسیم کرتا ہے۔ واضح رہے کہ کتاب مناقب العارفین تقریبًا ۷۱۸ھ مطابق ۱۳۱۸ء میں

---

[1] جامی رح نے اپنی کتاب نفحات الانس (Edition Nassan Lees P.22-31) میں اہل کرامت کے مافوق الفطرت کمالات کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے:-

(۱) معجزات انبیا (۲) کرامات اولیا اور (۳) خوارق عادات جو معمولی انسانوں سے اعمال سفلی و علوی کی بدولت ظاہر ہوں۔ ۱۲ مصنف

[2] یونیورسٹی آف شکاگو پریس ۱۹۰۹ء ۱۲ مصنف

[3] Paris, Leroux, 1918-22 ۱۲ مصنف

یعنی صفوۃ الصفا سے صرف تیس سال پہلے لکھی گئی ہے جو خود اس
کی طرز پہ تصنیف کی گئی ہے۔ بہرحال ک۔ ل۔ ہوارت کی تقسیم
حسب ذیل ہے:-

مراقبہ، غیبی (چھپی ہوئی اشیا کا حال دریافت کرنا) رویا،
روشن ضمیری، القا، انسانی اور غیر انسانی اجسام کا منور ہوجانا
بند دروازوں کا خود بخود کھل پڑنا، بیک وقت کئی مقامات پر موجود
رہنا، دور بیٹھ کر مادّی اشیا پر اثر آفرینی، فقدانِ حس اور سمیات
کے اثرات سے محفوظ رہنا، کیمیا، عضلات اور ہاضمہ کی قوتیں،
قوتِ مردمی کا غیر معمولی ہونا، جسم کا پھیلانا اور بڑا کرنا، بشرہ کا
ردّ و بدل اور چہرے کا اُتار چڑھاؤ، مافوق الفطرت شکلوں کا نظر
آنا، روحانی اثر سے علاج کرنا، مشکل سوالات کو حل کرنا، مسلمان
بنانا، جانوروں کو تلقین کرنا، اولیا کا انتقام ان کے دشمنوں سے
انفکاک ذہنی، طویل المدت خلوت گزینی اور روزہ رکھنا، طلسمی اثر
رکھنے والے پہرے، دفعتاً غایب ہوجانا۔

ان سب، یا قریب قریب سب مظاہرات کی مثالیں صفوۃ الصفا
کے صفحات میں نظر آتی ہیں۔ سلسلۃ النسب میں ان کا ذخیرہ اگرچہ
کم ہے، لیکن پھر بھی ہر منظہر کی مثال ملتی ہے۔ ان چیزوں کی تفصیلی
بحث اگرچہ دلچسپی اور منفعت سے خالی نہیں، تاہم اس کتاب کی
حدِ نظر سے باہر ہے۔ اس موقع پر یہ بھی بتادینا چاہیے کہ ان مسلمان

مسلمان اہلِ کرامات کی بعض ناپسندیدہ خصوصیات۔

اولیاء اللہ کے بعض حالات جو
ان کے مریدوں اور معتقدین

نے بیان کیے ہیں، مغربی دماغوں کو ہیچ و پوچ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بد دعاؤں اور دعاؤں دونوں میں یکساں طور پر تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کی عیش پسندیاں اور ان کی ریاضتیں دونوں یکساں طور پر مفرط ہیں اور جو بدنصیب ان کے عتاب اور جلال کے مورد رہ چکے ہیں ان کے عبرت ناک انجام پر متحیر اُڑانے کی مثال بھی شاذ نہیں ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ایک شہزادے سیامک ولد شروان شاہ نے مغل لشکر کی سمت کوچ کرتے وقت شیخ زاہد کے مریدوں کا ذکر حقارت کے ساتھ کیا اور دھمکی دی کہ واپسی میں ان کی خانقاہوں کو آگ لگا دوں گا اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجوا دوں گا۔ جب یہ خبر شیخ کے گوش گزار کی گئی تو انھوں نے حالت جلال میں سیامک کے نام کی مناسبت سے فرمایا کہ "سیامک سیاہ مرگ ہوگا"۔ چنانچہ یہ بات پوری اُتری کیونکہ سیامک کسی بات پر مغل بادشاہ کے عتاب کا مورد ہوا اور ان وحشیوں کی رسم کے بموجب اسے سیاہ نمدے میں لپیٹ کر ٹھوکروں سے، یا روند وا کر مروا ڈالا گیا[۱] لیکن مغل

---

[۱] کہتے ہیں کہ ہلاکو خاں مغل نے آخری عباسی خلیفہ المستعصم کو اسی طرح مروایا تھا کیونکہ مغول، بادشاہوں کا خون بہانے سے ڈرتے تھے۔ اسی طرح سے کلے دی جو (Clavijo) لکھتا ہے کہ "تیمور کے دربار میں جب کوئی بڑا آدمی مارا جاتا ہے تو اسے پھانسی دی جاتی ہے، لیکن ادنیٰ درجے کے لوگوں کی گردنیں اُڑا دی جاتی ہیں" ملاحظہ ہو سر کلی منٹ مارکھم (Sir Clement Markham) کا ترجمہ وقائع کلے دی جو (Clavijo's Narrative) مطبوعہ ہیک لوئٹ سوسائٹی (Hackluyt Society) ۱۸۵۹ء، ص ۱۵۰۔ ۱۲ مصنف

الخان غازان خان[5] شیخ زاہد کی بہت عزّت کرتا تھا خصوصاً جب انھوں نے روشن ضمیری کے متعلق اپنے کمالات ظاہر کیے تو غازان خان اتنا متاثّر ہُوا کہ اس نے اصرار کرکے ان کے قدموں کا بوسہ لیا۔

شیخ صفی کا بچپن | ظاہری حیثیت سے شیخ صفی کی زندگی خصوصاً شیخ زاہد کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور اردبیل میں سکونت گزیں ہوجانے کے بعد سے کچھ زیادہ ہنگامہ آرا نہ تھی۔ وہ بچپن ہی میں بہت سنجیدہ اور خلوت پسند تھے اور لہو و لعب سے دُور رہتے تھے۔ کم عمری ہی سے انھیں مذہبی باتوں سے شغف تھا، رویائے صادقہ نظر آتے تھے، عالمِ ملکوتی کے ساتھ گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اردبیل میں جب انھیں کوئی مرشد صادق نہ ملا اور انھوں نے شیخ نجیب الدین بُزگوش شیرازی کا شُہرہ سُنا تو ان کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا، لیکن جب اپنی والدہ کو بمنت و سماجت راضی کرکے وہ شیراز پہنچے تو ان بزرگ کا وصال ہوچکا تھا۔[2] شیراز کے

سعدیؒ سے ملاقات | قیام کے زمانے میں اُنھوں نے کئی مشہور بزرگوں اور درویشوں کی خدمت میں نیاز حاصل کیا اور مشہور شاعر سعدیؒ سے بھی ملاقات کی، لیکن سعدیؒ کے متعلق انھوں نے اچھی رائے قایم نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ (شیخ صفی) ان سے

---

[5] اس نے ۱۲۹۵ء سے ۱۳۰۴ء تک حکومت کی، ملاحظہ ہو میری تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص۱۲ تا ۴۶ ۱۲ مصنف

[2] جامیؒ کے بیان کے بموجب ان کی تاریخ وصال شعبان ۶۷۸ھ مطابق دسمبر ۱۲۷۹ء ہے ۔ ۱۲ مصنف

پاک سے بھی نہیں ملے اور جب سعدی رح نے اپنے کلیات کا
ایک دستخطی نسخہ ان کی خدمت میں گزراننا چاہا تو اس کو قبول کرنے
سے بھی انکار کردیا۔ بالآخر شیخ بزگوش کے فرزند اور جانشین
ظہیرالدین نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ کی روحانی تسکین بجز شیخ زاہد
گیلانی کے اور کوئی نہیں کرسکتا اور ساتھ ہی ان کے حلیے اور
بحیرہ خزر کے کنارے ان کی جائے سکونت کی پوری پوری تفصیل
انھیں بتادی۔ لیکن شیخ صفی کو کہیں چار سال بعد ان بزرگ کی
خدمت میں رسائی کا موقع ملا۔ اس وقت شیخ زاہد کا سن ٦٠ سال کا تھا۔ انھوں نے

شیخ زاہد گیلانی کے ہاتھ پر بیعت۔

شیخ صفی کا صدق دل سے استقبال کیا اور یہ اپنی زندگی کے بقیہ
٢٥ سال تک انھیں کی خدمت میں حاضر رہے۔

شیخ زاہد کا حال

صفوۃ الصفا میں شیخ زاہد کا پورا نام تاج الدین
ابراہیم ابن روشن ضمیر ابن بابیل، ابن شیخ پندار (یا بندار) الکردی
السنجانی دیا ہوا ہے۔ ان کے دادا بابیل کی والدہ (یعنی شیخ صفی کی
پرنانی) کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جنیہ تھیں۔ شیخ زاہد کو زاہد
کا لقب ان کے مرشد سید جمال الدین نے عطا کیا تھا اور اس کے
مختلف وجوہ بیان کیے جاتے ہیں۔ شیخ زاہد نے اپنی صاحبزادی بی بی
فاطمہ کو شیخ صفی کے حبالۂ عقد میں دیا۔ اس رشتے سے تین بیٹے ہوئے
جن میں سے منجھلے صدرالدین آخر چل کر اپنے والد کی جگہ شیخ حلقہ
ہوئے۔ سلسلۃ النسب کا مصنف انھیں کے خاندان سے تھا۔ یہ لوگ
مجموعی طور پر "پیرزادے" کہلاتے تھے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے

کہ صفویہ کے پورے دور میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔
سلسلۃ النسب میں جو واقعات درج ہیں، مثلاً یہ کہ شیخ زاہد شیخ صفی سے ۳۵ سال بڑے تھے، دونوں کا انتقال بعمر ۸۵ سال ہوا اور شیخ صفی کا وصال ۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۴ء میں ہوا وغیرہ وغیرہ ان سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شیخ زاہد کا انتقال تقریباً ۷۰۰ھ مطابق ۱۳۰۱ء ہوا ہوگا۔ اس کی مزید تصدیق اس بیان سے ہوتی ہے کہ ان کے نواسے صدرالدین ۷۰۴ھ مطابق ۱۳۰۵ء میں یعنی اپنے نانا (شیخ زاہد) کی وفات کے چار سال بعد تولد ہوئے۔ شیخ زاہد کے بعد شیخ صفی شیخِ سلسلہ ہوئے اور ۳۵ سال تک یعنی اپنی وفات[1] کے وقت تک اس منصب پر فائز رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے صدرالدین ان کے سجادہ نشین ہوئے۔

شیخ صفی کی شاعری

(شیخ صفی نے گیلان کی بولی میں (جس میں یہ اکثر شیخ زاہد سے گفتگو کیا کرتے تھے) نیز معمولی فارسی میں بعض اشعار بھی کہے ہیں۔ اگرچہ ان کی ایک رباعی[2] ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:-

"جس کے دل میں حُبِّ علی کا ایک ذرّہ بھی موجود ہے،
وہ چاہے کیسا ہی گنہگار ہو خدا اُسے معاف کردے گا"
حضرت علی علیہ السلام سے ان کی محبّت ظاہر ہوتی ہے تاہم مجھے اس

[1] ان کی وفات یوم دوشنبہ ۱۲ محرم ۷۳۵ھ مطابق ۱۲ستمبر ۱۳۳۴ء کو ہوئی۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو Journal of the Royal Asiatic Society بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء صفحہ ۳۰۴ ۱۲ مصنف

بات کا کوئی ثبوت کہیں نہیں ملا کہ تشیعیت کا وہ توغّل جو بعد میں ان کے اخلاف کا شیوہ بنا، خود ان میں بھی تھا یا نہیں؟ بلکہ حسن التواریخ میں جو پہلے دو شاہانِ صفویہ کی ایک غیر مطبوعہ[1] اہم تاریخ ہے، شاہ طہماسپ کے زمانے میں لکھی گئی اور ۹۰۰ھ تا ۹۸۵ھ (مطابق ۱۴۹۵ء لغایت ۱۵۷۸ء) تک کے حالات پر مشتمل ہے،[2] مجھے شیخ صفی کی شیعیت کے خلاف ایک شہادت نظر آتی ہے۔ عبید خان ازبک نے جو شکایتی خط شاہ طہماسپ کے نام ۹۳۶ھ مطابق ۱۵۲۹ء۔۱۵۳۰ء میں لکھا تھا، اس میں حسب ذیل جملہ نظر آتا ہے:-

"و پدر کلانِ شما جناب مرحوم شیخ صفی را ہم چنیں شنیدہ ایم کہ مردے عزیز اہل سنت و جماعت بودند۔ ما را حیرت عظیم دست می دہد کہ شما نہ روشِ حضرت مرتضیٰ علیؓ را تابع آید و نہ روشِ پدر کلاں را۔"

ایشیائے کوچک میں شیخ صفی کا اثر و اقتدار

جس حلقہ کے وہ شیخ تھے اس کا اثر و اقتدار بڑھانے کی انھوں نے بہت کوشش کی۔ ان کے اثر کا ثبوت مولانا شمس الدین برنیقی اردبیلی کے اس بیان سے ملتا ہے جسے سلسلۃ النسب[3] میں نقل کیا گیا

[1] مسٹر اے۔جی۔ الیس (A. G. Ellis) نے از راہِ عنایت اس نادر کتاب کا اپنا ذاتی قلمی نسخہ مجھے دے دیا تھا اور آئندہ تمام حوالے اسی کے متعلق ہیں ۱۲ مصنف

[2] احسن التواریخ، مسٹر الیس کا نسخہ ورق ۱۶۲ الف ۱۲ مصنف

[3] ملاحظہ ہو J. R. A. S. بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء ص ۴۰۳۔ ص ۴۰۶ ۱۲ مصنف

ہی کہ تین ماہ کی قلیل مدت میں صرف ایک راستہ یعنی مراغہ اور تبریز سے جو لوگ ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے، ان کی تعداد ۱۳ ہزار تھی۔ ظاہر ہی کہ یہ سب کے سب نہیں تو ان میں سے اکثر ایشیائے کوچک سے آئے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اس ابتدائی زمانے میں بھی یہ حلقہ اُن علاقوں میں قایم اور مستحکم ہو رہا تھا جہاں آگے چل کر یہ عثمانی سلاطین کے لیے بہت زیادہ پریشان کن ثابت ہونے والا تھا۔[1]

صدرالدین اپنے والد کے جانشین ہوتے ہیں۔

شیخ صدرالدین ۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۴ء میں بعمر ۳۱ سال اپنے والد کے جانشین ہوئے اور اپنی تاریخ وفات ۷۹۴ھ مطابق ۱۳۹۲ء تک یعنی ۵۹ سال حلقہ کے انتظامات وغیرہ کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ وہ بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ذات سے بھی بہت سے خوارق عادات منسوب کیے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور کرامت یہ ہی کہ اردبیل کی جامع مسجد کا جو دروازہ گرجی اپنی تاخت اردبیل (۷۶۰ھ مطابق ۱۳۵۸ء یا ۱۳۵۹ء) کے وقت اکھاڑ لے گئے، وہ واپس مل گیا۔ ان کا مشہور ترین مرید قاسم الانوار نامی

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر فرانز بابنگر (Doctor Franz Babniger) کے وہ حالات جو اُنھوں نے اپنی قابلِ قدر تصنیف Scheich Bedr-ed-din der Sohn des Richters Von Simaw Sonderabdruck (مطبوعہ برلن و لائپزگ ۱۹۲۱ء) خصوصاً کے ص۱۵ پر دیے ہیں۔ ۱۲ مصنف

ایک شاعر ہوا ہے جس کے عقیدے متزلزل تھے اور جسے شاہ رخ نے ہرات سے نکلوا دیا تھا۔ اس اخراج کے پورے حالات میں ایک دوسرے موقع پر بیان کرچکا ہوں[1] شیخ صدرالدین کے اثر و اقتدار اور ان کی بعض کارروائیوں سے قرب و جوار کے بادشاہ ان کی طرف سے مشتبہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ملک اشرف[2] انھیں دھوکے سے تبریز لے گیا اور دونوں انھیں ۳ ماہ تک حراست میں رکھا۔ بعد کو جب خواب میں اسے تنبیہ کی گئی تو اس نے انھیں چھوڑ دیا، لیکن دوبارہ گرفتار کرنے کی کوشش کی اور آخر کار یہ مجبور ہوکر گیلان کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ شیخ صدرالدین کے علاوہ دوسرے مقدس بزرگوں اور علما نے بھی اس ظالم بادشاہ کے ہاتھوں ایذائیں پائی ہیں۔ انھیں میں سے ایک

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص۴۷۳ ص۳۸۶ و ص۳۶۵ ص۳۶۶
اس موقع پر میں اس غلطی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں جو قاسم الانوار کے اشعار کے ترجمے میں جلد سوم کے ص۴۷۴ پر مجھ سے ہوئی ہے۔ یہ اشعار شیخ صفی نہیں، بلکہ شیخ صدرالدین کے متعلق ہیں جو پورے ۹۰ سال تک (۷۰۴ھ تا ۷۹۴ھ) زندہ رہے۔ پہلے مصرع میں لفظ "نقد" کی بجائے "نجل" (بمعنی فرزند) یا ایسا ہی کوئی لفظ ہونا چاہیے کیونکہ وہاں بیٹے ہی کے معنے موزوں ہوتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو D'Ohsson's History of the Mongols (جلد چہارم، ص۷۴۰ - ص۷۴۲) - ۱۲ مصنف

بزرگ قاضی محی الدین بردعی تھے جنھوں نے ملک اشرف کی شکایت جانی بیگ خان ولد اُزبک حاکم دشت قبچاق کے سامنے کچھ ایسے دل ہلا دینے والے انداز سے کی تھی کہ اس نے بے اختیار ہوکر آذربائجان پر حملہ کردیا اور ملک اشرف کو شکست دے کر اسے مار ڈالا۔ (سلسلۃ النسب کے بیان کے بموجب جانی بیگ خان شیخ صدرالدین کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا، ان کے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آیا اور بعض جاگیریں جن کے محاصل پہلے اردبیل کی خانقاہ کو ملتے تھے، ان کے نام بحال کردیں۔)

شیخ صدرالدین کے جانشین ان کے فرزند خواجہ علی ہوتے ہیں (۷۹۴ھ مطابق ۱۳۹۲ع) اپنے والد شیخ صفی کی طرح شیخ صدرالدین نے بھی آخر عمر میں فریضۂ حج ادا کیا، اور کہتے ہیں کہ وہ رایت نبوی اپنے ساتھ اردبیل لائے۔ حج سے واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد ۷۹۴ھ مطابق ۱۳۹۲ع میں ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے بیٹے خواجہ علی ان کی گدی پر بیٹھے اور اپنی تاریخ وفات ۱۸ رجب ۸۳۰ھ مطابق ۱۵ رمئی ۱۴۲۷ع، یعنی ۳۶ سال تک شیخ حلقہ کے فرایض انجام دیتے رہے۔ ان کی وفات فلسطین میں ہوئی اور وہ وہیں مدفون ہیں۔ ان کی قبر مقبرۂ سید علی عجمیؒ کے نام سے مشہور ہے۔

۱؎ ملاحظہ ہو J. R. A. S. بابتہ جولائی ۱۹۲۱ع ص ۴۰۲۔ ڈاکٹر فرانز بابنگر (Doctor Franz Babniger) نے ایک خانگی خط میں مجھے تحریر فرماتے ہیں :- "Quds-ul-Khalil ist vielmehr al quds wal Khalil, d. h Jerusalem (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اپنے والد اور دادا کی طرح وہ بھی شاعر اور صاحبِ کرامات تھے سلسلۃ النسب میں ان کے دو سو سے زیادہ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں شیعیت کا رجحان بہت نمایاں ہے۔ امام نہم حضرت محمد تقی انھیں خواب میں چند ہدایات دیتے ہیں، جن کی بنا پر وہ اپنی کرامت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) and Hebron, eine haufige Bezeichnung fur Sud-Palastina (ترجمہ از مترجم:-

قدس الخلیل اصل میں القدس والخلیل ہے یعنی بیت المقدس اور الخلیل جنوبی فلسطین کے لیے اکثر یہ نام آتا ہے" ۱۲ مترجم)

اس کی تصدیق ریورنڈ کے نن۔ ج۔ ا۔ ہنا ور Rev. Canon J. E. Hanauer) نے بھی کی ہے۔ ڈاکٹر بانگر نے ان کو بھی خط لکھا تھا اور انھوں نے بھی اس قبر کی تلاش کی کوشش کی تھی۔ ان کا مکتوب بنہایت دلچسپ ہے لیکن طوالت کی وجہ سے پورے خط کی نقل نہیں دی جاسکتی۔ لکھتے ہیں:-

"عرب مورخ مجدالدین نے اپنی تصنیف میں جو تقریباً ۱۴۹۵ء یعنی خواجہ علی کی وفات کے ۷۰ سال بعد لکھی گئی ہے، ان تمام مشاہیر شیوخ کی فہرست دی ہے جو الخلیل (Hebron) میں مدفون ہوئے لیکن اس نے علی عجمی کا تذکرہ نہیں کیا۔ پس ہمیں ان کا مزار کہیں اور تلاش کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں چار مشہور مقامات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے (۱) حرم علی ابن علاہی جو جافہ سے شمال کی طرف ۲½ گھنٹے کی مسافت پر ہے (۲) دلی العجمی جو جافہ کے عین جنوب میں ہے۔ (۳) ایک صغیر قبرستان اور امام علی کا مزار جو بابیہ الود کے نزدیک ہے اور (۴) قصبۂ بیت محسیر کے اوپر ایک پہاڑی پر العجمی کا نہایت متبرک مزار جو جنگل اور جھاڑیوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کے نن ہناور کا خیال ہے کہ شاید آخر الذکر مزار ہی سید علی عجمی کا ہے۔ ۱۲ مصنف

سے دریائے دِزفُل کی روانی بند کر دیتے ہیں اور اس طرح وہاں کی رعیت کو حضرت علی رضؓ کی فضیلت کا مقر بناتے ہیں۔ اسی طرح سے وہ اپنی روحانی کرامت سے تیمور کو اپنا عقیدت مند بنا لیتے اور اسے نصیحت کرتے ہیں کہ:۔

"یزدی گُردوں کو جو معاویہ کے دوست ہیں، سزا دے کر کیفرِ کردار کو پہنچایا جائے، اس لیے کہ انھیں کے کرتوت کی بدولت ہمیں ائمہ معصومین کے ماتم میں سیہ پوش ہونا پڑتا ہے[1]"

لیکن ان سب سے زیادہ مشہور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے چند اسیرانِ روم کے متعلق تیمور سے سفارش کی اور انھیں رہا کرادیا، بعد میں انھیں اسیروں کی احسان مند اولاد صوفیان روملو کے نام سے خاندانِ صفویہ کی زبردست حلیف اور ہوا خواہ ہوئی[2]

شیخ شاہ ۸۳۰ھ لغایت ۸۵۱ھ مطابق ۱۴۲۷ء لغایت ۱۴۴۷ء شیخ ابراہیم جو عام طور پہ شیخ شاہ کے نام سے مشہور ہیں ۸۳۰ھ مطابق ۱۴۲۷ء میں اپنے باپ کے خلیفہ ہوئے اور ۸۵۱ھ مطابق ۱۴۴۷ء - ۱۴۴۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے حالات کا

---

[1] ملاحظہ ہو J. R. A. Society بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء ص ۴۰۸ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو سرجان میل کم (Sir John Malcolm) کی تاریخ ایران (طبع ۱۸۱۵ء) جلد اوّل ص ۲۹۶ - ص ۴۹۴ اور حواشی۔ شیخ صدر الدین اور ان کے والد شیخ صفی کی طرف اس سفارش کا انتساب محض تاریخی مغالطہ ہے۔ ۱۲ مصنف

بیان بہت کم ملتا ہی۔ صرف ان کے چھ فرزندوں کے نام دیے گئے ہیں۔ اور تاریخ عالم آرائے عباسی تو سرے سے ان کے خلیفہ ہونے ہی کا ذکر نہیں کرتی۔ ان کے وصال کے بعد ان کے سب سے چھوٹے بیٹے جنید ان کے خلیفہ ہوئے اور سب سے پہلے انھیں کے زمانے میں اس خاندان نے جارحانہ حیثیت اختیار کی۔ انھوں نے دیارِ بکر کی سیاحت کی اور آق قویونلو (بایندری یا گوسفند سفید) قبیلہ کے حکمران اوزون حسن کی ان پر ایسی نظرِ عنایت ہوئی کہ اس نے اپنی بہن خدیجہ کو ان کے عقد میں دے دیا۔ کچھ تو اس رشتے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ شیخ جنید کے جھنڈے کے نیچے دس ہزار "غزاتِ صوفیا" جمع تھے جو اپنے مرشدِ کامل کے لیے جان تک دینا بہت ادنیٰ درجے کا اظہارِ عقیدت سمجھتے تھے[1] جہاں شاہ جو آذربائجان اور عراقین کا ترکمان حاکم تھا اور دوسرے ہمسایہ حکمران، بہت مشوش ہوئے۔ شروان شاہ سے جو جنگ ہوئی[2] اس میں شیخ جنید مارے گئے۔ ایک بیان تو یہ ہی کہ ان کی لاش اردبیل لائی اور وہیں سپردِ خاک کی گئی، لیکن دوسری روایات کے بموجب ان کی تدفین میدانِ جنگ کے پاس ہی کسی قصبہ میں ہوئی جسے قُربال، قُردیال یا قوریان کہا جاتا ہی۔

---

[1] یہ واقعات تاریخ عالم آرائے عباسی سے لیے گئے ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] بابنگر (کتابِ محولہ بالا) کے بیان کے بموجب یہ جنگ ۸۶۰ھ مطابق ۱۴۵۶ء میں ہوئی۔ ۱۲ مصنف

شیخ حیدر ۱۴۵۶ء تا ۱۴۸۸ء۔

شیخ حیدر اپنے والد شیخ جنید کے خلیفہ ہوئے اور انھیں کی طرح وہ بھی اپنے ماموں کہن سال اوزون حسن کی عنایات کے مورد رہے۔ اس نے اپنی بیٹی کی شادی ان کے ساتھ کردی۔ بیٹی کے نام مرتہ، حلیمہ، باقی آقا، یا عالم شاہ بیگم بتائے جاتے ہیں۔ اس کی ماں مشہور آفاق دسپینہ خاتون تھی جو کیلو آیونیس (Kalo Ioannes) کی بیٹی تھی۔ کیلو آیونیس شریف یونانی خاندان کوم نینی (Comneni) [۱] کا چشم و چراغ اور طرابزون کا آخری عیسائی تاجدار تھا۔ وہ گمنام وینیشی (Venitian) سیاح جس کے حالات سفر "Italian Travels in Persia in the 15th and 16th Centuries" (پندرھویں اور سولھویں صدی میں ایران کی سیاحتِ اطالویاں) میں دیے ہوئے ہیں، شیخ حیدر کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس کا نام سکیدرؔ [۲] تھا اور وہ کاونٹ (Count) کے رتبہ کا کوئی شخص تھا۔ اس کا تعلق "صوفی" نام کے ایک فرقہ یا مذہب سے تھا اور اس کے ہم مذہب مرشدوں کی طرح اس کی تعظیم اور سردار کی طرح اس کی تعمیل کرتے تھے۔"

اسی سلسلے میں وہ لکھتا ہے:۔

"ایران کے مختلف حصوں میں ان کی کثیر التعداد

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص۴۰۶ ۱۲ مصنف

[۲] شیخ حیدر کا مخرب ۔ ۱۲ مترجم

جماعتیں پھیلی ہوئی ہیں، مثلاً اناطولیہ[1]، قرامان وغیرہ میں،
یہ سب کے سب اس شخص سکیدر کی جو اردبیل کا باشندہ
ہے، بڑی عزّت کرتے ہیں۔ اس شخص نے اردبیل (یا اردویل)
میں کثرت سے لوگوں کو صوفی مذہب کا پیرو بنالیا ہے۔ اس
کی بالکل وہی حیثیت ہے جو راہبوں کی قوم میں لاٹ پادری کی
ہوتی ہے۔ اس کی چھ اولادیں ہیں جو اسام بے احسن بے
یعنی اوزون حسن) کی بیٹی کے بطن سے ہیں: تین لڑکے[1]
اور تین لڑکیاں۔ وہ عیسائیوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔"

لفظ قزلباش کی وجہ تسمیہ

شیخ حیدر نے خواب میں ہدایت پاکر اپنے
مریدوں کو حکم دیا تھا کہ وہ "طاقیہ ترکمانی" کی بجائے
سرخ رنگ کا "تاج دوازدہ ترک"[2] استعمال کیا کریں۔ چنانچہ اسی
ٹوپی کی وجہ سے وہ ترکی میں قزلباش اور فارسی میں "سرخ سر" کہلاتے
ہیں۔ جس گمنام وینیسی سیاح کا ابھی حوالہ دیا جاچکا ہے وہ "Italian
Travels" (سیاحت اطالویاں) کے ص۲۰۶ پر لکھتا ہے:-

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی کے بموجب ان کے نام یہ ہیں:- سلطان علی مرزا یا بادشاہ،
اسمٰعیل اور ابراہیم۔ لیکن احسن التواریخ میں ان سے مختلف نام دیے ہوئے ہیں۔ مصنف

[2] اس کے متعلق مرحوم سراے۔ ہوتم شنڈلر کا وہ نوٹ ملاحظہ ہو جو J. R. A. S.
بابتہ ۱۸۹۷ء کے صفحات ص۱۱۴ اور ص۱۱۵ پر دیا ہوا ہے۔ قزلباش پر ایک اور
طویل حاشیہ دیکھنا ہو تو ملاحظہ ہو بابنگر (Babniger) کی کتاب
"Schejch Bedred-Din" ص۸۴ و ص۸۵
Sonderabdruck ۱۳ - مصنف

"یہ لوگ سرخ خفتان پہنے اور ایک بارہ تہ والی لمبی مخروطی
کلاہ اوڑھنے کے عادی ہیں۔ یہ بارہ تہیں ان کے فرقے
کے بارہ مقدس اصولوں یا علیؓ کی بارہ اولادوں کی
یادگار کے طور پر رکھی گئی ہیں[1]"

اپنے والد کی طرح شیخ حیدر بھی دربند کے پاس بمقام طبرستان شروان شاہ اور اس کے ترکمان حلیفوں کے مقابلے میں شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کا انتقام بائیس سال کے بعد لیا گیا۔ اور ان کے مشہور آفاق بیٹے شاہ اسمٰعیل نے (جو ان کی وفات کے وقت یعنی ۲۰۔رجب ۸۹۳ھ[2] کو صرف ایک برس کا تھا) ان کی لاش کو اردبیل لاکر دفن کیا۔

شاہ اسمٰعیل (۱)

(ولادت: ۸۹۳ھ مطابق ۱۴۸۷ء، تاجپوشی: ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹۔۱۵۰۰ء، وفات: ۹۳۰ھ مطابق ۱۵۲۳ء۔۱۵۲۴ء)

اسمٰعیل اور اس کے دو بھائی | شیخ حیدر کی وفات کے بعد

---

[1] یہ یقیناً غلط ہے اس لیے کہ بارہ اماموں میں خود علیؓ بھی داخل ہیں۔ جو امام اول تھے اور ان کے بعد ان کی اولادوں میں سے گیارہ امام ہوئے۔

۱۲ مصنف

[2] شاہ اسمٰعیل کے دور کے متعلق جو نادر تاریخ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں زیر نشان Add 200 محفوظ ہے اس میں شیخ حیدر کی شہادت کا سن ۸۹۵ھ (مطابق ۱۴۹۰ء) بیان کیا گیا ہے۔ ۱۲ مصنف

ان کے تین خورد سال بچّوں کی حالت جیسی کچھ ناگفتہ بہ ہوگی، ظاہر ہو۔ (اپنے باپ کے دشمنوں کے رحم و کرم پر ان کی زیست منحصر تھی۔ اوزون حسن کے بیٹے سلطان یعقوب نے محض ان بچّوں کی ماں کی خاطر سے (جو اس کی بہن تھی)، ان کی جان بخشی کی اور انھیں استخر (فارس) میں نظر بند کردینے ہی پر اکتفا کی)۔ یہاں یہ تینوں بچے منصور بیگ پرناک حاکم صوبہ کی نگرانی میں رکھے گئے (لیکن این جے لو لیکو (Angiolello)[۱] کا بیان ہو کہ یہ تینوں بچے استمر کی جھیل (جسے مترجم نے آج کل کی وان جھیل کہا ہو) کے ایک جزیرے میں نظر بند کردیے گئے تھے) اس جزیرے میں زیادہ تر ارمنی عیسائیوں کی آبادی تھی۔ یہ تینوں یہاں تین سال تک رہے اور ہر شخص ان سے محبت کرنے لگا "خصوصًا دوسرے بیٹے اسمٰعیل کے ساتھ تو لوگوں کو اس کے حُسن اور خوش سیرتی کی وجہ سے سب سے زیادہ محبت ہوگئی تھی"؛ (چنانچہ اوزون حسن کے پوتے رستم نے جب اپنے چچا یعقوب کی وفات کے بعد قتل کرنے کی نیت سے ان بچوں کی سپردگی کا مطالبہ کیا تو ارمنیوں نے نہ صرف حیلے بہانے کرکے اس درخواست کو ٹال دیا، بلکہ دریائی راستے سے نکال کر تینوں کو ملک کرایاس (قراباغ) کی طرف روانہ کردیا۔) (فارسی وقایع میں لکھا ہو کہ استخر سے ان بچوں کی رہائی کا سہرا دراصل رستم کے سر ہو۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہو کہ چونکہ وہ

[۱] PP. 101-2 of the Hakluyt's Society's Translation of Charles Greyڈ
۱۲ مصنف

چونکہ نے چچازاد بھائی بے سنقر کے ساتھ مصروفِ جنگ تھا اس لیے وہ ان بچوں کے ساتھ ہمدردی کرکے ان کی اور ان کے لاتعداد مریدوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ان بچوں میں سب سے بڑے سلطان علی کو تبریز آنے کی دعوت دی ان کا استقبال بہت عزت اور احترام کے ساتھ کیا، جملہ لوازمات بادشاہی بلکہ "بادشاہ" کا خطاب بھی ان کی خدمت میں پیش کیا اور انھیں بے سنقر پر حملہ کرنے کی غرض سے بھیج دیا۔ چنانچہ وہ اہر کے پاس انھیں کے ہاتھ سے لڑائی میں مارا گیا۔ جب دشمن کا کانٹا نکل گیا تو رستم نے اپنے محسن پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ لیکن چونکہ سلطان علی کو اپنے ایک ترکمان مرید کے توسط سے اس کے ارادۂ فاسد کی اطلاع مل گئی تھی، اس لیے وہ اردبیل کی طرف بھاگ نکلے۔ لیکن پاس ہی شماسی نام ایک موضع میں دشمنوں نے انھیں محصور کر لیا۔ اور ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء۔ ۱۴۹۵ء میں وہ جنگ میں شہید ہوئے[1]۔ لیکن ان کے دونوں چھوٹے بھائی صحیح و سلامت اردبیل پہنچ گئے اور جب وہاں ترکمانوں نے انھیں گھر گھر ڈھونڈنا شروع کیا۔ تو ان کے وفادار مریدوں نے انھیں ایک محفوظ مقام میں چھپائے رکھا اور

اسمٰعیل کے بھائی سلطان علی کی شہادت

---

[1] اس واقعہ کا جو شاہ اسمٰعیل کے عہد کی تاریخ (محولہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے ماخوذ ہو بقیہ حصہ سر ای۔ ڈینی سن راس (Sir E. Denison Ross) نے J. R. A. S. بابتہ ۱۸۹۶ء (جلد ۲۸۔ ص ۲۶۴ تا ص ۲۸۵) میں ترجمہ کرکے شایع کیا ہے۔ ۱۲ مصنف

موقع پاتے ہی انھیں گیلان کی طرف لے گئے - یہ لوگ سب سے پہلے رشت آئے جہاں تھوڑی ہی مدت (تخمیناً ۲ دن سے ۳۰ دن تک) ان کا قیام رہا۔ پھر وہاں سے لاہجان کی طرف بڑھ گئے جہاں کے حاکم کارکیا مرزا علی نے کئی سال تک انھیں اپنا مہمان رکھا اور دشمنوں سے بچاتا رہا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب ان کے ترکمان دشمن انھیں تلاش کرتے ہوئے لاہجان پہنچے تو کارکیا مرزا علی نے انھیں ایک پنجرے میں بند کرکے جنگل میں لٹکوا دیا تاکہ یہ قسم کھانے کی گنجایش رہے کہ سرزمین لاہجان پر ان کے قدموں کے نشان موجود نہیں ہیں!

اسمٰعیل کے مریدوں کی فدا کاری

اسمٰعیل کے مریدوں یعنی صوفیان لاہجان کی شجاعت اور فدا کاری کی شہادت ان کے معاصر یورپی اور ایرانی مؤرخین دونوں بہت شدومد کے ساتھ دیتے ہیں۔ وہ گمنام اطالوی تاجر[۵] جس نے اپنی داستانِ سیاحت لکھی ہے، لکھتا ہے:-

"اس صوفی کی عزّت اور احترام اس کی رعایا خدا کی

---

[۵] ملاحظہ ہو "Travels of Venetians in Persia" (باشندگانِ وینس کی سیاحت ایران) مطبوعہ Hakluyt Society (طبع لندن ۱۸۷۳ء) اسی کتاب کا صفحہ ۲۲۲ بھی ملاحظہ طلب ہے، جہاں Vincentio d' Alessandari نے شاہ طہماسپ (فرزند و جانشین شاہ اسمٰعیل) کے ساتھ اس کی رعایا کی عقیدت مندی کا بھی ایسا ہی پُرزور بیان کیا ہے، اس عبارت کے بیشتر حصے کا ترجمہ جلد ہذا کے صفحہ ۱۰۴ پر دیا جا چکا ہے - ۱۲ مصنف

طرح کرتی ہے۔ خصوصاً سپاہیوں کی عقیدت کا تو یہ عالم
ہے کہ ان میں سے اکثر بغیر کسی قسم کی زرہ بکتر پہنے ہوئے
میدانِ کارزار میں پھاند پڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہمارا
آقا اسمٰعیل دورانِ جنگ میں ہماری حفاظت کرے گا"۔
.... سارے ایران میں خدا کا نام تو لوگ
بالکل بھول ہی گئے ہیں، فقط اسمٰعیل کا نام رہ گیا ہے"۔

وینسی (Venetian) سیاحوں کے وقایع میں نہیں یہ جملہ بار بار
نظر آتا ہے "صفویہ شیروں کی طرح لڑے"۔ لیکن ان سب باتوں کے
باوجود اور باوصف اس امر کے کہ ان کے سلسلہ کے مرید "مغرب
بعید سے لے کر بلخ اور بخارا کی حدود تک پھیلے ہوئے تھے"[1] واقعہ
یہ ہے کہ اگر شیخ ۱۴۷۸ء میں اس زبردست اور بیدار مغز بادشاہ اوزون
کا انتقال نہ ہوچکا ہوتا اور اس کی وفات کے بعد قبیلۂ آق قویونلو
(گوسفندانِ سفید) میں وہ خانہ جنگی نہ شروع ہوگئی ہوتی جس نے
آخر تک اس قبیلہ کی تاریخ کے صفحات کو خونی بنادیا ہے تو شاہانِ
صفویہ کی یہ محیر العقول کامیابیاں بہت کچھ مشکوک اور مشتبہ ہوجاتیں۔

۱۳ برس کی عمر میں شاہِ اسمٰعیل کے سلسلۂ فتوحات کا آغاز

اسمٰعیل نے جب لاہجان کے گوشۂ عزلت سے نکل کر
اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا ہے اس وقت اس کی عمر صرف
۱۳ سال کی تھی۔ شروع میں صرف سات فداکار "صوفی" اس کے

[1] یہ عبارت شاہ اسمٰعیل کی نادر تاریخ کے اس حصّے کی ہے جہاں اس کے
دادا جنید کا ذکر ہے۔ ۱۲ مصنف

ساتھ تھے، لیکن جیسے جیسے وہ براہ طارم اور خلخال اردبیل کی طرف بڑھتا گیا، اس کے بہادر اور جوشیلے مریدوں کی کثیر تعداد شام اور ایشیائے کوچک سے آکر ہر منزل پر اس سے ملتی گئی:۔

"در عرضِ راہِ اربابِ جلادت و صوفیان پاک طینت
در ہر منزلے از منازل از طوایف روم و شام بموکب عالی
پیوستند[1]"

جب ترکمان حاکم سلطان علی بیگ چاکر لو نے اسے اردبیل سے نکل جانے کا حکم دیا تو وہ کچھ مدت کے لیے ارجوان کی طرف جو استارا کے پاس بحیرہ خزر پر واقع ہے واپس چلا گیا۔ یہاں وہ اپنے محبوب شغل یعنی مچھلی کے شکار سے اپنا جی بہلاتا رہا۔ لیکن ۱۵۰۰ء موسم بہار میں وہ پھر اردبیل جا پہنچا اور اس مرتبہ سات ترکی قبایل کی ایک اچھی خاصی فوج اس کے ہمراہ رکاب تھی۔ صفویہ کی فوجی قوت کی جان دراصل یہ سات ترکی قبایل ہی تھے[2]۔ اب اسمٰعیل کے

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص ۴۱۷ ۱۲ مصنف

(منقول از تاریخ شاہ اسمٰعیل محفوظ کتب خانہ کیمبرج زیر نشان Add 200. ورق ۲۷ ب (الف) ۱۲ مصنف

[2] یہ قبایل حسب ذیل تھے :- شاملو، روملو، استاجلو، تکلو، ذوالقدر، افشار اور قاجار۔ آگے چل کر قبیلۂ افشار میں سے نادرشاہ اور قبیلۂ قاجار میں سے ایران کا موجودہ قاجاری شاہی خاندان پیدا ہوئے۔ ۱۲ مصنف (مصنف مرحوم کی وفات کے وقت تک رضا شاہ خاں نے تخت نشیں ہو کر خاندان پہلوی کی بنیاد نہ رکھی تھی ۱۲ مترجم

پاس اتنی جمعیت موجود تھی کہ وہ گرجستانی "کُفار" کے خلاف جہاد کرسکے
چنانچہ اس نے فرخ یسار شاہ شروان پر جوابی حملہ کر دیا۔ اور

شاہ اسمٰعیل فرخ یسار شاہ شروان کو شکست دے کر اسے مار ڈالتا ہے (۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۰ء)

گلستان کے قریب شکست دے کر اسے مار ڈالا، اور اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے
کرکے اسے جلا دیا۔ غنیم کے مقتولین کے سروں کا ایک مینار بنایا گیا
قدیم شروان شاہوں کی قبریں مسمار کر دی گئیں۔ سابق تاجدار
خلیل (اسمٰعیل کے دادا شیخ جنید کا قاتل) کی قبر کھدوا کر اس کی لاش
کو جلا دیا گیا۔ غرض کہ اس طرح سے ایک ایسے خاندان کا چراغ اسمٰعیل
کے ہاتھوں گل ہُوا جس کا سلسلہ مشہور ساسانی تاجدار انوشیرواں سے
ملتا تھا اور مشہور قصیدہ نگار خاقانی کا محسن بھی اور ممدوح بھی اسی
خاندان کا رکن تھا۔

جنگ شرور، تبریز میں اسمٰعیل کی تاجپوشی ۹۰۷ھ مطابق ۱۵۰۱ یا ۱۵۰۲ء

باکو (بادکوبہ یا بادکوبہ) کو فتح کرنے کے بعد اسمٰعیل کو خواب میں ائمۂ معصومین کی طرف سے بشارت
دی گئی، چنانچہ اس نے گلستان کا محاصرہ اٹھالیا اور آذربائجان
پر دھاوا بول دیا۔ الوند اور اس کے آق قویونلو ترکمانوں نے چاہا
کہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکیں، لیکن شرور میں جو فیصلہ کن
جنگ ہوئی اس میں ان کو شکست فاش نصیب ہوئی اور ہزاروں
آدمی کھیت رہے۔ الوند نے تو آذربائجان کی طرف راہِ فرار
اختیار کی اور ادھر اسمٰعیل فاتحانہ شان سے تبریز میں داخل ہُوا۔

اور "شاہِ ایران" بن کر تخت سلطنت پر متمکن ہوا) آیندہ ہم بھی اسے شاہِ اسمٰعیل ہی کہیں گے، لیکن ایرانی مورخ اس کو "خاقان اسکندر شان" اور اس کے بیٹے اور جانشین شاہ طہماسپ کو "شاہ دین پناہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

ویسے تو شاہِ اسمٰعیل اور اس کے رفیقوں کی شدید شیعیت کا ثبوت پہلے ہی مل چکا تھا، چنانچہ جس روز انھوں نے شروان شاہ کو قتل کیا، اس دن ان کا نعرۂ جنگ "اللہ، اللہ و علیؑ ولی اللہ" تھا۔ اسی طرح سے الوند کے سامنے یہ شرط پیش کی گئی تھی کہ اگر تم شیعیت قبول کرلو اور مذکورۂ بالا کلمہ پڑھو تو تمھارے ساتھ صلح ہو سکتی ہے[1] —— لیکن تخت نشین ہوتے ہی شاہ اسمٰعیل نے پورا ارادہ کرلیا کہ شیعیت کو نہ صرف سلطنت کا مذہب قرار دیا جائے، بلکہ صرف یہی ایک مذہب ایران میں باقی رہے۔ بادشاہ کے اس ارادے سے خود تبریز کے

تبلیغ شیعیت میں شاہ اسمٰعیل کا جوش

بعض شیعہ مجتہدین کو بھی تشویش لاحق ہوئی، چنانچہ اسمٰعیل کی تخت نشینی سے ایک روز پہلے رات کے وقت یہ لوگ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی :-

"قربانت شویم۔ دولیست سی صد ہزار خلق کہ در تبریز است چہار دانگ آں ہمہ سنّی اند و از زمان حضرات تا حال ایں خطبہ را کسے برملا نخواندہ و می ترسیم کہ مردم بگویند

[1] Add 200. Cambridge University Library

کہ پادشاہ شیعہ نمی خواہیم و نعوذ باللہ اگر رعیت برگردند
چہ تدارک دریں باب تواں کرد"

بادشاہ فرمودند کہ "مرا بایں کار باز داشتہ اند و
خدائے عالم با حضرات ائمۂ معصومین ہمراہ منند، و من از ہیچ
کس باک ندارم، بتوفیق اللہ تعالیٰ، اگر رعیت حرفے بگویند
شمشیر می کشم و یک کس را زندہ نمی گزارم "۔ [1]

پہلے تین خلفائے راشدین پر تبرّا بازی۔

شاہ اسمٰعیل نے صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کی منقبت اور فضیلت کو منوانے ہی پر اکتفا نہ کی، بلکہ حکم دے دیا کہ پہلے تین خلفا، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ پر عام مجمعوں میں تبرّا کہی جائے اور حاضرینِ جلسہ اُسے سُن کر بہ آوازِ بلند "بیش باد کم مباد" کہیں اور جو یہ نہ کہے اُسے قتل کر دیا جائے۔

عقیدۂ شیعیت کی تبلیغ بزورِ شمشیر

احسن التواریخ میں لکھا ہے[2] کہ شاہ اسمٰعیل نے تختِ نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے تمام خطیبوں کو حکم دے دیا تھا کہ خالص شیعہ کلمہ "اشہد ان علی ولی اللہ" کو اقرارِ ایمان باللسان کا اور "حی علی خیر العمل" کو تکبیر کا جزو بنایا جائے۔ شاہ اسمٰعیل سے پانچ سو اٹھائیس برس پہلے جب طغرل بیگ

---

[1] اس اہم عبارت کا حوالہ اس سے قبل صفحہ $\frac{۳۴۶}{۸}$ پر بھی دیا جا چکا ہے۔ یہ کیمبج یونیورسٹی کے مخطوطہ Add 200 پر ورق ۴۴ ب پر موجود ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] مسٹر ایلیس کا نسخہ ورق ۴۴ ۔ ۱۲ مصنف

سلجوقی نے البساسیری[1] کو جنگ میں شکست دے کر قتل کردیا تھا، اس وقت سے اب تک یہ کلمے ممنوع اور متروک تھے۔ اسمٰعیل نے جیساکہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، بازاروں اور گلیوں میں پہلے تین خلفائے راشدین پر تبرّا بازی کا حکم بھی دیا اور عدول حکمی کی سزا قتل قرار دی۔ چونکہ عقائد الشیعہ پر بہت کم کتابیں تھیں اس لیے عوام کو ان نئے مذہبی عقائد سے روشناس کرانے میں بہت دقتوں کا سامنا ہوا۔ بالآخر قاضی نوراللہ زیتونی نے اپنے کتب خانہ سے قواعد اسلام مصنفہ شیخ جمال الدین ابن علی ابن المطہر الملی[2] کی پہلی جلد برآمد کی

---

[1] دیکھو Weil's Geschichte der Chalifen (تاریخ الخلفا جلد سوم صفحہ ۹۳ تا صفحہ ۱۰۳) البساسیری الملک الرحیم بویہ کی افواج کا سپہ سالار تھا، اس نے فاطمی خلیفہ المستنصر کا ساتھ دیا اور عباسی خلیفہ القائم کو معزول کرنا چاہا۔ ۶۔ ذیقعدہ ۴۵۱ھ (مطابق ۱۴۔ دسمبر ۱۰۵۹ء) کو مار ڈالا گیا۔ چونکہ اسمٰعیل کی تخت نشینی ۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۱ء؍۱۵۰۲ء میں ہوئی تھی، اس لیے ہمیں لفظ "پہلے" سے مطلب اسمٰعیل کی تخت نشینی سے پہلے سمجھنا چاہیے، بلکہ احسن التواریخ کے سالِ تصنیف سے، یا کم از کم اس کی عبارت زیر بحث کی تحریر سے پہلے سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس کتاب (احسن التواریخ) کا سلسلۂ واقعات ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) تک چلا گیا ہے حالانکہ ہمیں جو سال مطلوب ہے وہ ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء؍۱۵۷۲ء) ہے یعنی (۴۵۱ + ۵۲۸ = ۹۷۹) - ۱۲ مصنف

[2] قلمی نسخے میں یہ نام ٹھیک سے نہیں لکھا ہے لیکن اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مجالس المؤمنین کی مجلس پنجم کے خاتمے پر بھی ایک ایسے ہی مصنف کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی کوئی تصنیف اس نام کی نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہاں ایک دوسرے عالم "الحلّی" کی مشہور اور مقبول تصنیف شرایعت الاسلام مراد ہو۔ ملاحظہ ہو ریو (Rieu) Arabic Supplement P. 212
۱۲ مصنف

اور اُسے شیعہ عقاید کی تعلیم کی بنیاد قرار دیا گیا، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ:-

"مذہب اثنا عشری کی حقیقت اور صداقت کا آفتاب روز بروز بلند تر ہوتا گیا اور تمام اطراف و اکناف عالم میں طریق حقیقت کے انوار و تجلیات سے اُجالا ہو گیا۔[۵]

شاہ اسمٰعیل کے حریف ایرانی حکمران (۹۰۷ھ م ۱۵۰۱-۲ء) ⑨

اسمٰعیل کی ان کارروائیوں سے ہمسایہ سلطنتوں خصوصاً سلطنت عثمانیہ میں غم و غصّہ کی جو لہریں پیدا ہوئیں ان کا ذکر ہم ابھی کریں گے، لیکن پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "احسن التواریخ" سے ان حکمرانوں کی فہرست نقل کر دی جائے جو اس وقت ایران میں دعویٰ شہنشاہی کر رہے تھے۔ وہ یہ ہیں:-

(۱) شاہ اسمٰعیل، آذربائجان میں (۲) سلطان مراد عراق کے بیشتر حصّے میں (۳) مراد بیگ بایندری یزد میں (۴) رئیس محمد کرہ (؟) ابرقوہ میں (۵) حسین کیائے چلاوی سمنان، خوار اور فیروزکوہ میں (۶) باریک پرناک عراق عرب میں (۷) قاسم بیگ، ابن جہانگیر بیگ، ابن علی بیگ دیار بکر میں (۸) قاضی محمد اور مولانا مسعود کاشان میں (۹) سلطان حسین مرزا (تیموری)، خراسان میں (۱۰) امیر ذوالنون قندھار میں (۱۱) بدیع الزماں مرزا (تیموری) بلخ میں اور (۱۲) ابوالفتح بیگ بایندری، کرمان میں۔

اسمٰعیل اپنے چھوٹے چھوٹے حریفوں کا خاتمہ کر دیتا ہے

ان ملوک الطوائف میں سے اکثر تو بالکل برائے نام تھے اور بعض تو

[۵] احسن التواریخ مسٹر ایلیس کا نسخہ ورق ۳۹ ب۔

ایسے ہیں کہ ان کے ناموں کے متعلق میں تحقیق ہی نہ کرسکا۔ ان میں سے کوئی بھی زیادہ عرصے تک شاہ اسمٰعیل کی فتح وظفر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا۔ اس کے پُرانے دشمن الوند (حاکم قبیلۂ آق قویونلو) نے ۱۵۰۳ء کے موسمِ گرما میں اس کے ہاتھوں شکستِ فاش کھائی اور ایک سال یا تقریبًا ایک سال بعد ہی دیارِ بکر یا بغداد ان دونوں جگہوں میں سے کسی ایک میں اُس کا انتقال ہوگیا[1]۔ تقریبًا اسی زمانے میں الوند کے بھائی مُراد کو شیراز میں شکست ہوئی اور کازرون کے علمائے اہلِ سنت والجماعت پر بہت مظالم کیے گئے، ان میں سے اکثر تہ تیغ کیے گئے اور ان کے اسلاف کے مقابر اور دوسری بنائیں مسمار کردی گئیں۔ کتنی بے انصافی اور ستم ظریفی کی بات ہے کہ ان سب مظالم کے لیے رحمتٌ للعالمین (۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ـ۱۵۰۴ء) مادّہ تاریخ نکالا گیا۔ فریقِ ثانی نے اس کا جواب یوں دیا کہ جب شاہِ اسمٰعیل نے اپنے سردار الیاس بیگ ذوالقدر کو حاکمِ شیراز مقرر کیا تو فارس کے شعرا اور دوسرے ظریفوں نے اس کا تاریخی مادّہ شلتاق سپاہی (لغوی: فوجی جبر و استیلا) نکالا۔ کاشان تو ہمیشہ سے شیعیوں کا مامن ومسکن تھا[2]، چنانچہ جب شاہ اسمٰعیل کا وہاں ورود ہوا تو اس کا استقبال بہت

کازرون کے سنّی علما پر مظالم

---

[1] اس کے یورپی معاصرین نے جو حالات لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ الوند کو شاہ اسمٰعیل نے کمال بے رحمی کے ساتھ قتل کرادیا تھا۔ دیکھو ص۵۹ آیندہ

[2] ملاحظہ ہو راحت الصدور مرتبہ شیخ محمد اقبال مطبوعہ Gibb Memorial Series جلد ۲ (۱۹۲۱ء) ص۳۰ ۱۲ مصنف

جوش و خروش کے ساتھ کہا گیا اور اس نے یفین کے دلکش سواد میں ایک دربار منعقد کیا۔ وہاں سے وہ قُم شریف کی طرف بڑھا اور بظاہر اس کا ارادہ سردیوں کا موسم وہیں گزارنے کا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس اثنا میں خبر ملی کہ اس کا نہایت معتمد علیہ سردار الیاس بیگ "آں صوفیٔ صافی نہاد، پاک اعتقاد" حسین کیائے چلاوی کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی اس نے انتقام لینے کے ارادے سے ۲۵ فروری سنہ ۱۵۰۴ء کو وہاں سے کوچ کر دیا، تین ہفتے بعد استرآباد پہنچا، یہاں

قیدیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک

محمد حسن مرزا خلف سلطان حسین مرزا تیموری سے اس کا مقابلہ ہوا۔ شاہ اسمٰعیل نے فیروزکوہ اور گل خندان کی گڑھیوں پر ہلّہ کر کے انھیں مسمار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے آب رسانی روک کر قلعہ اُستا کو مسخر کر لیا اور وہاں کی محصور فوج کے قتل عام کا حکم دے دیا (احسن التواریخ میں اس فوج کی تعداد دس ہزار بتائی گئی ہے)۔ بدنصیب حسین کیا گرفتار ہو گیا اور شاہِ اسمٰعیل کے حکم سے اسے ایک آہنی پنجرے میں قید کیا گیا لیکن اس نے کسی ترکیب سے اپنے آپ کو زخمی کر لیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد زخموں کی تکلیف سے مر گیا[1]۔

رئیس محمد خاں کرہ حاکم ابرقوہ کا انجام اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہوا۔ اس نے بغاوت کر کے یزد کے قدیم شہر پر قبضہ کر لیا تھا،

[1] کیمبرج یونیورسٹی کتب خانے کے مخطوطہ Add 200 کے ورق ۱۰۲ پر درج ہے کہ حسین کیا کی لاش اصفہان لائی گئی اور وہاں کے میدان میں بارود سے اُڑا دی گئی۔ ۱۲ مصنف

اس کی پاداش میں اسے بھی شاہ اسمٰعیل نے لوہے کے پنجرے میں بند کر دیا اور اس کے بدن پر شہد مل دیا جس کی وجہ سے بھڑوں نے اسے خوب بھنبوڑا بالآخر اسے اصفہان کے میدان میں زندہ جلا دیا گیا۔

ترکی سے سلطان بایزید ثانی کے سفیر کی آمد

تقریبًا اسی زمانے میں عثمانی سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کے سفرا شاہ اسمٰعیل کی خدمت میں تسخیر عراق و فارس کی مبارک باد دینے اور شاہ کے "شایانِ شان تحایف اور ہدیے" گزراننے کے لیے حاضرِ دربار ہوئے۔ شاہِ اسمٰعیل نے انھیں خلعت دے کر رخصت کیا اور دولتِ عثمانیہ کو اپنی دوستی کا یقین دلایا، لیکن روانگی سے پہلے ان سفیروں کو سزائے قتل کی کئی وارداتوں کا عینی مشاہدہ کرایا گیا۔ انھیں میں سے ایک واقعہ شاید میر حسین میبذی[1] کے قتل کا بھی تھا جو ایک مشہور فلسفی اور قاضی تھے اور جن کا سارا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ "سُنّیِ غالی" تھے! ایرانی بادشاہوں کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ وہ اس طرح کے سزائے قتل کے واقعات دکھا کر دولِ خارجہ کے سفیروں پر اپنی سیاست و انصاف کا رعب بٹھانا چاہتے تھے، کلے وی جو (Clavijo) نے تیمور کے متعلق بھی

[1] ان کی تفسیر ہدایا آج تک حلقۂ کے ابتدائی نصاب میں داخل ہے۔ نیز ملاحظہ ہو بروکل مین (Brocklemann) کی تاریخ ادبیات عرب (Gesich. d. Arab Litt.) جلد ۲ - صفحہ ۲۱۱ اور ریو (Rieu) فہرست کتب فارسی برٹش میوزیم صفحہ ۱۰۷۵ ۱۲ مصنف

ایک ایسا ہی واقعہ لکھا ہے۔ خود شاہ اسمٰعیل کے فرزند اور جانشین شاہ طہماسپ نے ہمایوں کے سفیر بیرم خان پر اپنا رعب بٹھانے کے لیے اس کی نظروں کے سامنے کئی ملاحدہ کو قتل کرا دیا تھا۔ ترکی سفیروں کو اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیّد سنّی عالم کو قتل ہوتے ہوئے دیکھنا اور وہ بھی ان لوگوں کے ہاتھوں جنھیں وہ ملعون اور منافق سمجھتے تھے، جس قدر شاق گزرا کم ہے۔

ترکوں اور ایرانیوں کے تعلقات کی کشیدگی کا ذکر، جس کا نتیجہ بالآخر اگست ۱۵۱۴ء میں جنگ چالدران کی صورت میں ظاہر ہوا تو ہم آئندہ کریں گے، سردست ہمیں شاہ اسمٰعیل کے فتح وظفر کے کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس بحث کو ختم کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس کی متواتر فوج کشیوں کا تفصیلی بیان موجودہ تصنیف کی حدّ نظر نیز ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اس کا اجمالی خلاصہ یہاں پیش کر سکتے ہیں۔

مغرب میں اسمٰعیل کی فتوحات ۹۱۱ھ سے ۹۱۵ھ تک (مطابق ۱۵۰۶ء تا ۱۵۱۰ء) اسمٰعیل زیادہ تر اقصائے مغرب کی طرف متوجہ رہا۔ پہلے وہ ہمدان میں داخل ہوا اور وہاں درگاہ امام زادہ سہل علی کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس کے بعد

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ و۔ ارسکن (W. Erskine) کی History of India etc. (لندن ۱۸۵۴ء) جلد ۲ صفحہ ۲۸۹ ۱۲ مصنف

وہ یزیدی کُردوں[1] کی بغاوت فرو کرنے میں لگا رہا۔ ان کے سرغنہ شیر صارم کو شکست ہوئی اور ایک سخت خوں ریز لڑائی کے بعد جس میں اسمٰعیل کے کئی سربرآوردہ سردار کھیت رہے، اسے گرفتار کرلیا گیا۔ کُردی قیدیوں کو ان کے اعزہ کے حوالے کردیا گیا، لیکن اس شرط پر کہ "انھیں سخت سے سخت ایذائیں دے کر مارا جائے"! اس کے بعد اسمٰعیل نے سلطان مراد سیزدہم (آق قویونلو خاندان کے آخری تاجدار) اور علاء الدولہ ذوالقدر کی متحدہ فوجوں کے ساتھ جنگ کی۔ اس زمانے کے اطالوی سیاحوں نے علاء الدولہ کو علی دولی (Allduli) لکھا ہے۔ اسمٰعیل نے علاء الدولہ کے سامنے یہ شرط پیش کی تھی کہ "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہ" کے کلمہ نیک سے اپنی زبان کو جنبش دو اور دشمنانِ مذہب (یعنی پہلے تین خلفائے راشدین) پر تبرّا کرو"۔ لیکن اس نے اس تجویز کو کمال حقارت سے رد کردیا تھا اور عثمانی ترکوں سے مدد کی درخواست کی تھی۔ لیکن شاہ اسمٰعیل کب کسی کی ماننے والا تھا، چنانچہ اس نے جویزہ میں غُلات شیعہ کو سزائیں | یکے بعد دیگرے دیار بکر، اِخلاط، تبلیس، ارجیش اور آخر میں ۹۱۴ھ (مطابق ۱۵۰۸ء) میں خود بغداد پر قبضہ کرلیا، بغداد کے فتح ہوجانے سے کربلا اور نجف کی مقدس

---

[1] بقول گمنام اطالوی تاجر کے (ص ۱۵۷) :-

"ایران کے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں یزیدی کرد کہیں زیادہ سچے مسلمان ہیں۔ ایرانی تو صفویہ کا عقیدہ اختیار کرچکے ہیں، لیکن کُردوں نے ابھی تک اسے اختیار نہیں کیا ہے اور اگرچہ وہ بظاہر سرخ خفقانیں پہنتے ہیں لیکن دل میں قزلباشوں سے سخت متنفر ہیں"۔ ۱۲ مصنف

زیارت گاہیں جنھیں ہر شیعہ عزیز رکھتا ہے، اس کے ہاتھ آگئیں اور وہ وہاں دوگانہ شکر ادا کرنے کے لیے بڑھا۔ حویزہ پہنچ کر شاہ اسمٰعیل نے رعایا کو دکھا دیا کہ باوجود شیعہ ہونے کے وہ غُلات کی حرکات کو روا نہیں رکھ سکتا۔ یہاں کے غُلات میں بعض عرب تھے جو مشعشع کہلاتے تھے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کی تقدیس و تکریم میں بے حد غلو کرتے تھے، ان کو خدا کی طرح پوجتے تھے اور ان کا نام لے کر ننگی تلواروں کی دھاروں پر گر پڑتے تھے مگر ان کے بدن پر کوئی زخم نہ لگتا تھا! ان کی حرکات ویسی ہی تھیں جو آج بھی شمالی افریقہ کے عیساویہ کیا کرتے ہیں۔ جس زمانے میں شاہ اسمٰعیل حویزہ پہنچا ہے، ان غُلات کے سردار میر سلطان محسن کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان فیاض سردار ہوا تھا اور الوہیت کا دعویٰ کرنے لگا تھا[1]۔ شاہ اسمٰعیل نے سختی کے ساتھ ان ملاحدہ کی گوشمالی کی اور یہاں سے دزفل اور شوستر کی جانب بڑھا۔ اثنائے راہ میں قوم کُر کے سردار شاہ رستم نے اطاعت قبول کی" اور کُرِی زبان میں کچھ ایسی میٹھی آواز سے شاہ اسمٰعیل سے التجا اور اس کی تعریف کی کہ اس کا دل موم ہو گیا" وہاں سے شاہ اسمٰعیل مشرق کی جانب فارس کی طرف بڑھا۔ اثنائے راہ میں کچھ عرصے کے لیے داراب جرد میں پڑاؤ کیا گیا۔ یہاں اس نے

کُردستان نے اطاعت قبول کرلی

---

[1] کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطہ Add 200 کے ورق ۹۳ ب پر حسب ذیل عبارت موجود ہے:-

"و آں کافر مردود دعویٰ الوہیت کردہ، قوم مشعشع حالا بہ الوہیت فیاض قایل اند" ۱۲ مصنف

ایک زبردست شکار کے انتظامات کیے جس کی اصلی غرض ایک خاص

فارس کے واقعات

قسم کے پہاڑی بکرے کا حاصل کرنا تھا جس
سے "پادزہر حیوانی" نکلتا ہے۔ قاضی محمد کاشی کو جو صدر الصدورِ امور
مذہبی کے عہدہ پر فائز تھا، قتل کرکے ان کی جگہ سید شریف
استرآبادی کو مقرر کیا گیا جن کا سلسلۂ نسب ننہال کی طرف سے مشہور
روزگار جرجانی سے ملتا ہے۔ پھر اسمٰعیل نے قصرِ زر میں اپنے بھائی
سلطان احمد مرزا کی یادگار میں جس کا انتقال وہیں ہوا تھا، ایک مزار
تعمیر کرایا۔ چونکہ "نجم اول" امیر نجم الدین مسعود رشتی کا انتقال حال ہی
میں نجف میں ہوچکا تھا، اس لیے ان کی جگہ امیر یار احمد خوزانی "نجم ثانی"
کے لقب سے مقرر کیے گئے۔ امیدی شاعر نے اس تقریب میں ایک
نہایت مرصع اور بدیع قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع حسب ذیل ہے:۔

زہے جوہرت گوہرِ آسمانی توئی عقلِ اوّل، توئی نجم ثانی
رواقِ حرم را تو رکنِ عراقی عراقِ عجم را سہیلِ یمانی

فارس سے شاہ اسمٰعیل نے شیروان کی طرف پیش قدمی کی، جہاں شیخ شاہ خلف فرخ یسار نے از سرِ نو بساطِ حکومت جمالی تھی۔ یہاں اس نے اپنے والد شیخ حیدر کی لاش قبر سے نکلوائی اور جیسا کہ اوپر کسی موقع پر بیان ہوچکا ہے، اسے دفن کرنے کی غرض سے اردبیل لے گیا۔ دربند بھی فتح کرلیا گیا۔

دو زبردست خارجی دشمن اُزبک اور ترک

اب تک شاہ اسمٰعیل کی تمام تر توجہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو زیر کرنے

[1] کہتے ہیں کہ اس شکار میں چھپن ہزار سات سو جانور مارے گئے۔ "مصنف"

اور چھوٹے مدعیانِ سلطنت کو نیچا دکھا کر حدود ایران میں اپنی سلطنت کی مستحکم بنائیں ڈالنے کی طرف مبذول رہی تھی۔ چنانچہ اس کی سلطنت کی حدیں مغرب اور شمالِ مغرب میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور قدیم ساسانی حدود کے برابر ہوگئی تھیں۔ لیکن ابھی تک اسے اپنے دو زبردست دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی نوبت نہ آئی تھی؛ یعنی وسط ایشیا کے اُزبک اور عثمانی ترک جن کی وجہ سے آگے چل کر اسے اور اس کے جانشینوں کو اتنی کھکھیڑیں اٹھانی پڑیں) اس موقع پر ہمیں یہ بتا دینا چاہیے کہ شاہ اسمٰعیل کے تعلقات اپنے ان دو زبردست حریفوں کے ساتھ کس قسم کے تھے، لیکن پہلے ہم چاہتے ہیں کہ خود شاہ اسمٰعیل کی شکل صورت، سیرت وغیرہ کے متعلق کچھ باتیں بیان کردیں۔ اس کے معاصر یورپی سیاحوں نے

شاہ اسمٰعیل کی صورت اور سیرت کے متعلق معاصر یورپی سیاحوں کے بیانات

ان چیزوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ حسب دستور خود اس کے ابنائے ملک کے بیانات سے کہیں زیادہ واضح اور روشن ہے۔ اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی شجاعت، جوش، علم اور سیماب مزاجی کے قصے خود اس کے عہد حکومت کے ایرانی مورخین کے یہاں بہت کچھ ملتے ہیں۔ کے ٹے رِی نو زے نو[1] (Caterino Zeno) کے

---

[1] اطالوی سیاحان ایران کے حالات (Narrative of Italian Travels in Persia) مطبوعہ Hakluyt Society لندن ۱۸۷۳ء ص ۴۳۔۴۹۔ پہلے بھی تصنیف ہذا کے صفحہ ۳ پر اس عبارت کا کچھ حصہ نقل کیا جا چکا ہے۔ مصنف

بیان کے بموجب جب اس نے ۱۳ برس کی عمر میں اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا ہو تو اس وقت وہ

"خوش شکیل تھا، شاہانہ جمال رکھتا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پُر رعب و جلال تاثیر تھی جو پکار پکار کر کہتی تھی کہ یہ شخص ایک دن زبردست بادشاہ بننے والا ہو۔ اس کا حسنِ سیرت، حسنِ صورت سے کچھ کم نہ تھا، اس کی فراست اعلیٰ درجے کی تھی۔ اور اس کچی عمر میں اس کے خیالات اتنے پختہ اور بلند تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ جودتِ فکر، شجاعت اور ذکاوت میں اس کے ہم عصروں میں سے ایک بھی اس کی ٹکر کا نہ تھا۔"

اینجیولے لو (Angilello) لکھتا ہو[1]:-

"وہ بچپن ہی میں زیبا شمایل اور خوش اطوار تھا"

پھر آگے چل کر علاء الدولہ کے ساتھ اس کی جنگ کے بیان میں لکھتا ہو[2]:-

"اس نے رسد کے جو ذخائر اپنی فوجوں کے لیے حاصل کیے، ان کے پورے پورے دام دیے اور منادی کرادی کہ ہر شخص اپنا مال بیچنے کے لیے فوج میں بے روک ٹوک آسکتا ہو اور اگر کسی شخص نے بغیر دام ادا کیے ہوئے

---

[1] اطالوی سیاحان ایران کے حالات (محولہ حاشیہ بالا) ص۱۰۲
نیز ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا ص[illegible]۔ ۱۲ مصنف / ص۱۰۳

[2] کتاب محولہ حاشیہ بالا کا ص۱۱۱ اور تصنیف ہذا کا ص[illegible]۔ ۱۲ مصنف

کوئی چیز لی تو اُسے سزائے قتل دی جائے گی۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:-

"یہ صوفی صبیح، خوش شکل اور زیبا شمایل ہے۔ وہ کچھ ایسا زیادہ طویل القامت نہیں ہے لیکن اس کی کاٹھی بہت شکیل اور سڈول ہے اس کا بدن چھریرا نہیں بلکہ دُہرا ہے اور سینہ کشادہ ہے۔ اس کے بال سُرخی مائل ہیں اس کے ڈاڑھی نہیں ہے۔ صرف مونچھیں رکھتا ہے اور بہتّا ہے شجاعت میں وہ کسی لڑنے والے مرغ سے کم نہیں اور قوت میں اپنے سب سرداروں سے زیادہ ہے۔ تیراندازی کی مشقوں میں ۱۰ اسیبوں ہیں سے ۷ اسی کے نشانے سے گرتے ہیں۔ جب وہ تیراندازی کرتا ہے تو لوگ مختلف مزامیر بجاتے رہتے ہیں۔ اور اس کی تعریف کے گیت گاتے ہیں۔"

یہی مصنف ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے[1]:-

لوگ خدا کی طرح اس کی پرستش کرتے ہیں۔ خاص کر اس کے سپاہی تو اکثر بغیر کسی زرہ بکتر کے میدانِ جنگ میں اُتر پڑتے ہیں اور اپنے آقا کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ میں جب تبریز میں تھا تو میں نے سنا تھا کہ بادشاہ اس بات سے بہت ناراض ہے کہ لوگ اس کی پرستش کرتے اور اسے خدا کہتے ہیں۔"

---

[1] اطالوی سیاحان ایران کے حالات (Narrative of Italian Travels) ص ۱۱۵ - ۱۲ صفحہ

گمنام اِطالوی تاجر اس کے متعلق لکھتا ہی[1] :-

"۳۱ سال کی عمر ہی۔ وہ بہت خوش شکل ہی۔ اس کے چہرے سے وقار برستا ہی، قد درمیانہ ہی۔ رنگ کھُلتا ہُوا ہی۔ بدن دہرا ہی، سینہ چوڑا ہی۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی ہی۔ صرف مونچھیں رکھتا ہی، وہ کچھ ایسا زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتا۔ لڑکیوں کی طرح سلیم الطبع ہی۔ قدرتاً ہنّستا ہی، ہرن کی طرح پھرتیلا، اور اپنے سب سرداروں سے زیادہ قوی ہی۔ تیراندازی کی مشقوں میں وہ اتنا بڑھا ہُوا ہی کہ دس سیبوں میں سے چھ اسی کے نشانے سے گرتے ہیں"

دوسری طرف یہی مصنف الوند کے سپاہیوں اور سلطان یعقوب کے گھرانے کی عورتوں اور مردوں کے قتل عام، تبریز کی تین سو زنانِ بازاری، الوند کے پرورش کردہ آٹھ سو پرخور بلاسی[2] اور شہر تبریز کے تمام کتّوں کے مروا ڈالنے کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہی :-

"میں سمجھتا ہوں کہ نیرو (Naro) کے وقت سے اب تک ایسا جلّاد بادشاہ نہ پیدا ہُوا ہوگا"

---

[1] کتاب محولہ حاشیہ بالا ص۲۰۲ نیز تصنیف ہٰذا کے ص۲۳ پر اس عبارت کا کچھ حصّہ نقل کیا جاچکا ہی۔ ۱۲ مصنف

[2] میں اس لفظ "بلاسی" کی اب تک تحقیق نہیں کرسکا ہوں۔ ۱۲ مصنف

صاحب فرہنگ آنندراج نے لفظ بلاسی تو نہیں دیا۔ البتہ صاد مہملہ کے لفظ بلاصی (جمع بلصاۃ) کے تحت لکھا ہی: "نوعے از طائر است کہ مُنبۂ او سبز باشد۔ ۱۲ مترجم

مختصر یہ کہ شاہ اسمٰعیل کی سیرت متضاد صفات کا ایک عجیب غریب مجموعہ تھی۔ ایک طرف اس کا حُسن اس کی مسلّمہ شجاعت، سخاوت اور ایک حد تک اس کی انصاف پسندی۔ یہ سب باتیں اس کی سیرت کو ہماری نظروں میں دل کش اور محبوب بناتی ہیں تو دوسری طرف اس کے بعض افعال سے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کی بہیمیت کے ایسے مناظر ہماری نظروں کے سامنے آتے ہیں جو اُس دورِ کُشت و خون میں بھی حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اور ہمارے جذباتِ نفرت کو بر انگیختہ کر دیتے ہیں۔ میدانِ کارزار کے علاوہ وہ شکار میں بھی اپنی بہادری کا ثبوت دیتا تھا۔ فتح بغداد کے بعد جب اسے خبر ملی کہ ایک خوفناک مردم خوار شیر پاس ہی کسی جنگل میں اپنی ماند بنائے ہوئے ہے اور تمام باشندے اس کی ہیبت سے سراسیمہ ہیں تو اپنے ندیموں کی خوشامد اور لجاجت کے باوجود وہ تن تنہا اس کے مقابلے کے لیے چل پڑا اور اپنے مخصوص وار سے اس کا کام تمام کر دیا[۵۱]۔ اس سے پہلے بھی تیرہ برس کی عمر میں وہ ارزنجان کے پاس ایک غار کے اندر اسی طرح ایک خوفناک ریچھ کا شکار کر چکا تھا[۵۲]۔ جب بحیرہ خزر کی ایک بندرگاہ پر قبضہ کرنے کے بعد "خزائنِ کثیرہ" اس کے ہاتھ آئے تو اس نے "انھیں برابر کے حصّے کر کے اپنے آدمیوں میں بانٹ دیا اور خود اپنے لیے کچھ نہ رکھا[۵۳]" لیکن جب سیاح نے اس کی

---

[۵۱] احسن التواریخ۔ مسٹر الیس کا نسخہ ص ۲۴۶۔ ۱۲ مصنف

[۵۲] احسن التواریخ ص ۲۶۔ ۱۲ مصنف

[۵۳] Travels of a Merchant P. 188 ۱۲ مصنف

نیاضی کا یہ قصہ لکھا ہے" جس کی وجہ سے بہادر بادشاہ اسمٰعیل سے انعام پانے کی امید میں صفویہ کے علاوہ اور لوگ بھی جوق جوق اس کے گروہ میں شامل ہونے لگے" وہی آگے چل کر یہ بھی لکھتا ہے کہ الاموت کے بدنصیب نوجوان شہزادہ الوند کو عیاری سے گرفتار کیا گیا[۵۱] اور اسمٰعیل نے اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اُڑائی۔ اس سیاح نے اپنی آنکھوں سے اس شہزادے کو ایک خیمے کے اندر پا بزنجیر پڑا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے بعض اس سے بھی شدیدتر مظالم کا بیان کیا ہے جو شاہ اسمٰعیل نے ۱۵۰۲ء میں داخلہ تبریز کے موقع پر کیے تھے[۵۲]۔ سُنّیوں کے حق میں

سُنّیوں پر مظالم وہ بہت ظالم تھا۔ اس نے نہ تو فرید الدین احمد[۵۳] جیسے جلیل القدر عالم کو چھوڑا جو مشہور محقق عالم سعدالدین تفتازانی کے پوتے تھے اور تیس سال تک ہرات میں شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز رہ چکے تھے۔ اور نہ بنّائی جیسے ظریف اور بذلہ سنج شاعر پر رحم کیا جو ۹۱۸ھ میں (مطابق ۱۵۱۲ء) قرشی کے قتل عام میں مارا گیا۔ لیکن اس کے ظلم اور کینہ پروری کی ان سے بھی بڑھی چڑھی اور حیرت انگیز مثال یہ ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے دشمنوں کو بھی معاف نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے قدیم دشمن ازبک سردار محمد خان شیبانی (یا شیبک) کی لاش کی جو کچھ بے حرمتی اس نے کی، وہ ہم آگے چل کر

---

۵۱ Travels of a Merchant P. 180 حبیب السیر اور دوسری ایرانی تاریخوں میں لکھا ہے کہ الوند اپنی موت سے مرا، ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ ۵۱ ۱۲ مصنف

۵۲ Travels of a Merchant P. 207

۵۳ انھیں رمضان ۹۱۶ھ مطابق دسمبر ۱۵۱۰ء میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۲ مصنف

بیان کریں گے۔

دولِ خارجہ کے ساتھ ایران کے تعلقات

پہلے کسی موقع پر لکھا جا چکا ہے کہ جب شاہ اسمٰعیل سرزمینِ ایران کو آق قویونلو قبیلہ سے پاک کر چکا اور ان دوسرے چھوٹے چھوٹے حریفوں کو زیر کر چکا جو قدیم ایرانی سلطنت کے تخت و تاج کے دعوے دار تھے تو اس کے خارجی تعلقات زیادہ تر تین حکومتوں کے ساتھ رہ گئے: ایک تو آلِ تیموریہ جو اب تک ہرات، خراسان اور وسط ایشیا کے بعض حصوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھے، دوسرے ماوراء النہر کے زبردست ازبک سردار اور تیسرے عثمانی ترک۔ آخر الذکر دو فریقوں کے ساتھ ایران کے تعلقات ہمیشہ سے مخالفانہ رہے، اس لیے کہ اُزبک اور تُرک دونوں پکّے سُنّی تھے۔ لیکن تیموریوں کے ساتھ جو اپنی جگہ پر خود ہمیشہ اُزبکوں سے سہمے ہوئے رہتے تھے، دولت ایران کے تعلقات کسی قدر دوستانہ بلکہ ایک حد تک مخلصانہ رہا کرتے تھے۔ سلطان حسین ابن بیقارہ والیٔ ہرات جس کا دربار پرُشان و شوکت تھا اور علم و فن[1] کا زبردست مرکز تھا، ان چند حکمرانوں میں تھا جنھوں نے اپنی سلطنت میں حنفیت کی جگہ شیعیت کو رائج کرنا تو چاہا لیکن شاہ اسمٰعیل کی سی کامیابی انھیں نصیب نہ ہوئی[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر ف۔ ر۔ مارٹن (F. R. Martin) کی تصنیف "Miniature Paintings and Painters of Persia etc" صفحہ ۳۵ حاشیہ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد ۳ صفحہ ۴۵۶ ۱۲ مصنف
~~انجمن ترقی اردو کا ترجمہ جلد ۳ صفحہ ۔۔۔ ۱۲ مترجم~~
سین نے اس کی کوشش ۸۷۳ھ مطابق ۱۴۶۸ء-۱۴۶۹ء میں کی تھی۔

اسی طرح سے بابر نے بھی خواہ واقعتاً ہو یا مصلحتاً شیعیت کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا تھا جس سے اس کی وسط ایشیا کی سُنّی رعایا میں کسی قدر بےچینی کے آثار پیدا ہو گئے تھے[۱]۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ شاہ اسمٰعیل کو آل تیموریہ کے ساتھ دشمنی کی ایسی وجہ نہ تھی جیسی کہ بقیہ دو حکومتوں کے ساتھ تھی۔ دوسری طرف چونکہ بابر بھی اس زبردست شخص شیبانی خان اور اس کے اُزبکوں سے نفرت رکھتا تھا، اس لیے بابر اور اسمٰعیل ایک ہی دشمن کے دشمن یعنی دوست ہو گئے تھے۔

شیبانی (یا شیبک) خان اور اُزبک تیموریہ کے زوال اور اُزبکوں کے عروج کی داستان بیان کرنا اس کتاب کی حدِ نظر سے باہر ہے۔ ان کے متعلق زیادہ مفصل اور مکمل معلومات ارسکن (Erskine) نیز دوسرے مصنفین[۲] کی تحریروں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ شیبانی یا شیبک خان

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ ارسکن (W Erskine) کی History of India (لندن ۱۸۵۴ء) جلد اول صفحہ ۳۱۹۔ صفحہ ۳۲۲۔ ۱۲ مصنف

[۲] مثلاً ن۔ الیاس اور ڈے نی سن راس کی کتاب History of the Moghuls of Central Asia (لندن ۱۸۹۵ء) نیز تزک بابری خصوصاً اس کا وہ نسخہ جو ارسکن (Erskine) اور لیڈن (Leyden) کا ترجمہ کیا ہوا ہے اور جس کی نظر ثانی اور تحشی سر لوکاس کنگ (Sir Lucas King) نے کی ہے (طبع آکسفورڈ ۱۹۲۱ء) ۱۲ مصنف

جس کا سلسلۂ نسب براہِ راست چنگیز خاں سے ملتا ہے[1] سب سے پہلے ۱۵۰۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور سمرقند، بخارا اور چند دن بعد تاشقند اور فرغنہ پر قابض ہوگیا۔ ۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۵ء۔ ۱۵۰۶ء میں جب سلطان حسین کا انتقال ہُوا تو اس نے خراسان پر حملہ کردیا، اور اس کے ایک یا دو سال بعد سوائے بابر اور بدیع الزماں کے بقیہ سب تیموری شہزادوں کو خراسان سے نکال باہر کیا۔ بدیع الزماں بھاگ کر شاہ اسمٰعیل کے پاس پناہ گزین ہؤا۔ اگرچہ شیبانی نے ۹۱۵ھ ہی میں کرمان پر حملہ کرکے شاہ اسمٰعیل کو ناراض کردیا تھا۔ اور پھر اس کی نرم اور دوستانہ شکایتی تحریر[2] کے جواب میں اس کو ایک نہایت ہی توہین آمیز خط لکھا تھا۔ لیکن دونوں کی میدانِ جنگ میں دوبدو ہونے کی نوبت کہیں ۹۱۶ھ (مطابق ۱۵۱۰ء۔ ۱۵۱۱ء) میں آئی۔ مذکورہ بالا جواب پاکر اسمٰعیل نے بھی شیبانی خاں کی توہین آمیز تحریر کا جواب توہین سے دیا اور چونکہ اس کی سلطنت کے دوسرے حصّوں میں اب امن و امان قایم ہوچکا تھا، اس لیے فوراً ہی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خراسان کی طرف بڑھا۔

---

[1] احسن التواریخ میں شیبانی خاں کا سلسلۂ نسب یوں لکھا ہے:-
شیبک خان، بن بوداق سلطان، بن ابوالخیر خان، بن دوست شیخ، بن ایلتی ادغلن، بن فولاد ادغلن، بن ایبو خواجہ، بن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ، بن بکنے، بن شیبان بن جوجی، بن چنگیز خان۔　　۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو ارسکن کی History of India جلد اول ص ۲۹۶۔ اس طویل خط کی نقل احسن التواریخ میں بھی موجود ہے، مسٹر ایلس (Ellis) کا نسخہ ورق ۸ب الخ ۱۲ مصنف

اثنائے راہ میں اس نے مشہد میں روضۂ امام علی رضا کی جو ہر شیعہ کو عزیز ہے، زیارت کی۔ مرو کے نزدیک طاہر آباد نام کے ایک مقام پر دونوں میں ایک فیصلہ کُن جنگ ہوئی اور باوجود اس کے کہ اُزبک بہت دیر تک لڑتے اور دادِ شجاعت دیتے رہے انھیں شکستِ کامل نصیب ہوئی اور شیبانی خان مارا گیا جب جنگ کے بعد اس کی نعش مقتولین کے پشتہ کے نیچے سے نکالی گئی تو شاہ اسمٰعیل نے حکم دیا کہ اس کے اعضائے جسم کی کھال کاٹ کر سلطنت کے مختلف حصوں میں بھیج دیے جائیں اور سر میں بھُس بھرواکر اسے عثمانی سلطان بایزید ثانی کے پاس تحفۃً روانہ کیا جائے[1]۔

شیبانی کی لاش کے ساتھ بہیمانہ سلوک

کاسۂ سر کی ہڈیوں کو اس نے سونے سے منڈھوایا اور خاص اپنے استعمال کے لیے اس کا ایک پیالہ تیار کرایا۔ لاش کا ایک ہاتھ کاٹ کر ایک معتبر قاصد درویش محمد بیاؤل کی معرفت آقا رستم روز افزوں حاکم مازندران کے پاس روانہ کیا۔ جب قاصد پہنچا ہے تو رستم ساری میں اپنے درباریوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بار یاب ہوتے ہی قاصد نے یہ کہہ کر "تو گفتی کہ دست من است و دامن شیبک خاں، اکنوں بہ بیں کہ دست اوست و دامن تست" کٹا ہوا ہاتھ رستم کے دامن پر پھینک دیا۔ حاضرینِ دربار اس گستاخانہ حرکت پر کچھ ایسے مبہوت ہوئے

---

[1] شاہ اسمٰعیل کی تاریخ مخزونہ کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی نشان Add 200 کے ص۱۴۱ پر لکھا ہے کہ شہزادہ سلیم جو بعد کو سلطان ہوا، شاہ اسمٰعیل کی اس حرکت سے بہت چراغ پا ہوا تھا اور اسی معاملے پر اس میں اور اس کے باپ میں سخت شکر رنجی ہو گئی تھی۔ ۱۲ مصنف

کہ کسی نے قاصد کی گرفتاری کے لیے بھی انگلی نہ ہلائی۔ خود رستم پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہؤا کہ وہ بیمار پڑگیا اور چند دن بعد مرگیا۔ اس پیالے کے متعلق (جو شاہ اسمٰعیل نے شیبانی کے کاسۂ سر کا بنوایا تھا) یہ روایت مشہور ہے کہ ایک روز دعوت کے موقع پر شاہ اسمٰعیل نے پیالے کی طرف اشارہ کرکے خواجہ کمال الدین ساغرچی سے جو شیبانی کے خاص مشیروں میں تھا اور جان بچانے کے لیے شیعیت قبول کرکے شاہ اسمٰعیل کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہوگیا تھا، پوچھا: "پہچانتے ہو یہ کس کا کاسۂ سر ہے" تو اُس نے جواب دیا:۔

"سبحان اللہ، چہ صاحب دولتے بود کہ ہنوز دولت درو باقیست کہ باین حال بر روئے دست چوں تو صاحب اقبالیست کہ دم بدم بادۂ نشاط می نوشد"

شیبانی خان کی عمر وفات کے وقت ۶۱ سال کی تھی۔ اس نے گیارہ سال حکومت کی۔ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے وہ کٹر سنّی تھا اور اپنی سلطنت میں شیعوں پر بڑا ظلم کرتا تھا۔ چنانچہ اسی کے انتقام میں اب اسمٰعیل کے ہاتھوں سُنّیوں کے ستائے جانے کی باری تھی۔ اس شکست کے باوجود اُزبکوں کا زور کسی طرح نہ ٹوٹتا تھا اور اگرچہ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ان کے اور ایرانیوں کے درمیان رسمی طور پر صلح بھی ہوگئی تھی، لیکن دلوں میں رنجش تھی۔ اور آخرکار اُزبکوں نے غجدوان کی جنگ میں اپنا انتقام لے ہی لیا جس میں بابر اور اس کے ایرانی رفیقوں کو شکست فاش نصیب ہوئی اور ان کے اکثر عمائد و اکابر جن میں نجم ثانی بھی تھے، نومبر ۱۵۱۲ء میں قتل کر دیے گئے۔

پوری سولھویں صدی میں ایرانیوں کو ازبکوں کی طرف سے اطمینان نصیب نہ ہوا، چنانچہ اس زمانے کے فارسی وقائع و تواریخ میں ان لوگوں کی تاخت خراسان کا ذکر ہمیں بار بار نظر آتا ہے۔

فریدوں بے کا مرتّب کردہ ترکی سرکاری منشآت کا مجموعہ

اب ہم ایرانیوں اور عثمانی ترکوں کے باہمی تعلقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ فریدوں بے نے ۹۸۲ھ مطابق ۱۵۷۴ء میں بڑی محنت اور کاوش سے ترکی سرکاری مراسلات کا مجموعہ منشآتِ سلاطین[1] کے نام سے مدوّن و مرتّب کیا ہے، اس سے ایران اور ترکی کے اس زمانے کے تعلقات پر ایسی روشنی پڑتی ہے جو اکثر فارسی اور ترکی تاریخوں سے بھی نہیں پڑتی۔ یہ وہ مراسلات ہیں جو یکے بعد دیگرے کئی ترکی سلاطین

---

[1] یہ کتاب ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں قسطنطنیہ میں چھپی ہے۔ ابھی کچھ زمانے ادھر تک میرے پاس صرف اس کی پہلی جلد ہی تھی جو ۶۲۶ صفحات پر مشتمل اور ۹۶۶ھ (مطابق ۱۵۵۸ء-۱۵۵۹ء) تک کے حالات پر حاوی ہے۔ اس نہایت اہم کتاب کے متعلق اگر مزید واقفیت مطلوب ہو تو ملاحظہ ہو:-

(۱) فان ہیمر (Von Hammer) کی تاریخ آلِ عثمان Geschichte der Osmanisch رائش (Riech) جلد ۴ ص ۵۱

(۲) Flugel's Vianna Catalogue جلد اول ص ۲۸۳ - ص ۲۸۵

(۳) Z D M G. جلد ہفتم ص ۴۶

(۴) جلد پنجم Notices of Extracts ص ۶۶۲ تا ص ۶۸۸

(۵) ریو (Rieu) کا Turkish Catalogue ص ۸۰ تا ص ۸۳

(۶) حاجی خلیفہ (اڈیشن فلیوگل) جلد پنجم ص ۴۸۸ ۱۲ مصنف

نے اپنی ہمسایہ سلطنتوں یا اپنے بیٹوں، وزیروں اور صوبے کے گورنروں کو لکھے تھے۔ ان میں سے بعض ترکی زبان میں ہیں اور بعض فارسی میں۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر پر تاریخ درج نہیں ہے۔ اب تک ان خطوط سے اس قدر کم استفادہ کیا گیا ہے کہ اگر میں اس موقع پر ان مراسلات کا جو شاہ اسمٰعیل کی وفات کے زمانے (سنہ ۹۳۰ھ مطابق سنہ ۱۵۲۳ سنہ ۱۵۲۴ء) تک صفویہ سلطنت اور اس کے معاصر عثمانی سلاطین بایزید ثانی (سنہ ۸۸۶ تا سنہ ۹۱۸ھ مطابق سنہ ۱۴۸۱ء۔ سنہ ۱۵۱۲ء) سلیم اول سنہ ۹۱۸ھ تا سنہ ۹۲۶ھ مطابق سنہ ۱۵۱۲ء تا سنہ ۱۵۲۰ء اور سلیمان ذی شان کے عہد کے ابتدائی چار سالوں یعنی سنہ ۹۲۶ھ تا سنہ ۹۳۰ھ (مطابق سنہ ۱۵۲۰ء تا سنہ ۱۵۲۴ء کے متعلق ہیں، خلاصہ درج کر دوں، یا اس کے مطالب کا مجمل بیان کر دوں تو غالباً کچھ زیادہ بے محل نہ ہوگا۔

(۱) منجانب یعقوب پادشاہ قبیلۂ آق قویونلو بنام سلطان بایزید دربارۂ اطلاع شکست و انتقال شیخ حیدر (پدر اسمٰعیل) ص ۳۰۹

یہ خط فارسی میں ہے۔ تاریخ درج نہیں ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حیدر کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد لکھا گیا ہے۔ (شیخ حیدر ۳۰۔ جون سنہ ۱۴۸۸ء کو مارے گئے)۔ اس میں شیخ حیدر کو "صدر حلقہ ارباب ضلال" لکھا گیا ہے۔ کاتب خط نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ "ان باغیان گمراہ، دشمنان شیعت نبوی و مخالفان مذہب و سلطنت" کے استیصال کی خبر سے ہر سچے مسلمان کو خوشی ہوگی۔

(۲) سلطان بایزید کی طرف سے مذکورۂ بالا خط کا جواب۔ یہ بھی

فارسی میں ہے اور تاریخ درج نہیں ہے (ص۲۱۳) اس میں یعقوب کی "افواج ناجیہ بایندریہ" کو اس کی فتح پر مبارک باد دی گئی ہے، جو انھیں "گروہ ضلۂ حیدریہ" پر حاصل ہوئی۔

(۳) من جانب شاہ اسمٰعیل بنام سلطان بایزید ثانی۔ اس میں یہ استدعا ہے کہ اس کے وہ مرید جو ایشیائے کوچک میں ہیں، اس کے پاس اردبیل آنے سے نہ روکے جائیں (ص۲۵۵)۔ یہ خط فارسی میں ہے، تاریخ درج نہیں ہے۔ اس کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عثمانی سلطنت کی حدود میں بھی صفویہ کے ہوا خواہوں کی تعداد کتنی زیادہ تھی۔

(۴) مذکورہ بالا خط کا سلطان بایزید ثانی کی طرف سے جواب، فارسی میں ہے۔ اور تاریخ درج نہیں ہے (ص۳۴۵۔ ص۳۴۶) عثمانی سلطان لکھتا ہے کہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ان زائرین میں سے اکثر کے اردبیل جانے کا منشا مرشد سے اظہارِ عقیدت نہیں، بلکہ ترکی فوجی خدمات سے گریز کرنا ہے۔

(۵) موضوع محولہ بالا پر شاہ اسمٰعیل کا خط سلطان بایزید کے نام، فارسی میں ہے اور تاریخ درج نہیں ہے (ص۳۴۶۔ ص۳۴۷)۔ اسمٰعیل نے اطلاع دی ہے کہ میں اپنے دشمنوں کو سزا دینے کے لیے مجبوراً حدود عثمانی میں داخل ہوا ہوں، لیکن میری نیت کسی طرح سے آپ کی مخالفت یا بے ادبی کرنے کی نہیں ہے۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ میں نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ باشندوں کی جان و مال کا ہر طرح سے خیال رکھیں۔

(۶)　مذکورہ بالا خط کا جواب سلطان بایزید کی طرف سے فارسی میں ہی اور بے تاریخ ہی۔(ص۳۴۷)۔ بایزید نے اسمٰعیل کے وعدوں کو تسلیم کیا ہی اور اپنے افسروں کو حکم دیا ہی کہ دوستانہ حیثیت سے شاہ اسمٰعیل کی مدد کریں۔

(۷)　من جانب الوند آق قویونلو، بادشاہ ایران، بنام سلطان بایزید۔یہ خط بھی بجز تمہید کے، فارسی میں ہی اور بے تاریخ ہی، (ص۳۵۱۔ ص۳۵۲)۔ الوند نے اطلاع دی ہی کہ آپ کا فرستادہ قاصد محمد آقا چاؤش باشی وہ خط لے کر پہنچ گیا ہی جس میں آپ نے بایندری (یا آق قویونلو) قبیلہ کو تاکید کی ہی کہ وہ اپنے مشترکہ دشمن "اوباش قزلباش" کے مقابلے کے لیے متحد و متفق ہوجائیں۔ الوند نے وعدہ کیا ہی کہ خواہ میرے اعزّہ میری مدد کریں یا نہ کریں، لیکن میں تعمیلِ ارشاد کی پوری پوری کوشش کروں گا، بشرطیکہ آپ کی طرف سے مجھے مالی اور اخلاقی مدد پہنچے۔

(۸)　مذکورہ بالا خط کا جواب، بایزید کی طرف سے، فارسی میں اور بے تاریخ ہی (ص۳۵۲۔ ص۳۵۳) بایزید نے الوند کے ارادے کی تعریف کی ہی اور وعدہ کیا ہی کہ میں "طائفۂ باغیہ قزلباش" کے خلاف ہر طرح سے تمھاری مدد کروں گا۔

(۹)　من جانب بایزید، بنام حاجی رستم بیگ کرد، فارسی میں ہی۔ تاریخ ربیع الاول ۹۰۸ھ (مطابق ستمبر ۱۵۰۲ء) درج ہی (ص۳۵۳) بایزید نے قزلباشوں کی نقل و حرکت اور حالات کے متعلق صحیح صحیح

واقعات طلب کیے ہیں اور لکھا ہو کہ آق قویونلو (یا بایندری) شہزادگان کے ساتھ جو معرکے قزلباشوں کے ہوتے ہیں، ان کے نتائج کی اطلاع اس کے قاصد کیوان چاؤش کو دی جائے۔

(۱۰) مذکورہ بالا خط کا جواب، حاجی رستم کی طرف سے، فارسی میں ہو اور تاریخ درج نہیں ہو (ص۳۵۳ - ۳۵۴) کاتب اطلاع دیتا ہو کہ قزلباش مذہب خراش، قبیلۂ آق قویونلو کے سرداروں الوند اور مراد کو شکست دینے کے بعد اب عثمانی ترکوں کے خلاف مصر سے ساز باز کر رہے ہیں۔ اور مرعش اور دیار بکر کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔

(۱۱) من جانب سلطان بایزید، بنام سلطان غوری، والیٔ مصر عربی میں ہو، تاریخ ۹۱۰ھ درج ہو (مطابق ۱۵۰۴ء - ۱۵۰۵ء) (ص۳۵۴ ص۳۵۵)- اس خط میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہو" جو اقصائے مشرق میں ظاہر ہؤا ہو اور وہاں کے حاکم کو شکست دے کر رعایا کو محکوم کر لیا ہو"۔ اس خط کا جو جواب لکھا گیا اس سے معلوم ہوتا ہو کہ غالبًا یہ اشارہ شاہ اسمٰعیل یا پھر شاہ سشاہ قلی کی طرف ہو۔

(۱۲) مذکورہ بالا خط کا جواب، عربی میں ہو، تاریخ درج نہیں، (ص۳۵۵، ص۳۵۶)- اس خط میں" مشرق میں گمراہ قزلباشوں کی فتح" کا ذکر ہو اور اسے ان ممالک کے حق میں "آفتِ عظیم" کہا گیا ہو۔

ترکوں اور ایرانیوں کی باہمی مخالفت کی شدّت

سلطان بایزید کے مراسلات میں سے صرف مذکورہ بالا خطوط ہی ایسے ہیں جن کا تعلق براہِ راست صفویہ سے ہے، لیکن ان کے علاوہ ایسے اور مراسلات بھی ہیں جو تاریخ ایران کے ہر محقق کے لیے دلچسپ ثابت ہوں گے مثلاً سلطان ابو الغازی حسین (۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۵ء) جامی رح مشہور حنفی، جلال الدین دوّانی اور فرید الدین تفتازانی، شیخ الاسلام ہرات کے نام (۹۱۳ھ م ۱۵۰۷ء)۔ ان میں سے آخرالذکر بزرگ کو تین سال بعد، ۹۱۶ھ مطابق ۱۵۱۰ء میں شاہِ اسمٰعیل نے شیعیت نہ قبول کرنے کی پاداش میں قتل کرادیا تھا۔ قبل اس کے کہ سلطان سلیم کے زمانے کے سرکاری مراسلات کا ذکر کیا جائے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ترکوں اور ایرانیوں کی شدید مخالفتوں کی ابتدا کا کچھ حال بیان کردیا جائے، اس لیے کہ ان دو اسلامی سلطنتوں کی یہ ناچاقی، پورے دورِ صفویہ کی خصوصیت خاصہ تھی۔ اس کی بدولت اسلام کا شیرازۂ اتحاد پراگندہ ہوا اور اسلامی قوت میں ضعف نمودار ہوا۔ رچرڈ نولس (Richard Knolles) نے اپنی تصنیف میں شیعیانِ اناطولیہ کی بغاوت کا ذکر کیا ہے۔ اس بغاوت کا بانی مبانی شاہ قلی تھا جسے ترک "شیطان قلی" کہتے تھے، وہ شاہ اسمٰعیل کے والد شیخ حیدر کے ایک مرید مسمے حسن خلیفہ کا لڑکا تھا۔ نولس کے بیان کا ابتدائی حصہ اس قابل ہے کہ اس موقع پر اس کو من و عن نقل کردیا جائے۔[1]

---

[1] میں نے یہ اقتباس اس کی "تاریخ ترکی" (Turkish History) (صفحہ ۱۱۳ ملاحظہ ہو)

ایشیائے کوچک میں شیعوں کی بغاوت

نولس (Knolles) لکھتا ہے:-

"غرض کہ کھکھیڑیں اٹھانے کے بعد بایزید (Bajazet) نے اپنی زندگی امن وسکون سے بسر کرنی شروع کردی اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ فلسفہ کے مطالعہ اور علما کی صحبتوں میں گزارنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرتاً اس کے طبعی رجحانات بہ نسبت جنگ وجدل کے اس قسم کے پرسکون علمی مشاغل کی طرف زیادہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ امور ملکی کے اقتضاء اور وزیران جنگ کے اصرار سے اسے میدانِ جنگ میں اترنا پڑا ہو۔ سلطنت کا سارا انتظام اس نے اپنے معتمد علیہ پاشاؤں علی پاشا (Alis)، احمد پاشا (Achmetes) اور یحییٰ پاشا (Jaehla) کے تفویض کردیا تھا۔ اس کی اس پرسکون اور خوش گوار زندگی کو پانچ سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ دفعتاً ایک ذراسی چنگاری جس کی طرف کسی نے التفات بھی نہ کی تھی، بھڑک اٹھی اور ایسی بھڑکی کہ سارے ایشیا میں شعلے بھڑکنے لگے اور ایسی آگ لگ گئی جو اس وقت تک فرو نہ ہوئی جب تک کہ بایزید کی رعایا کے خون کی ندیاں نہ بہ لیں اور اس کے ایشیائی مقبوضات معرض خطر میں نہ آگئے"۔ اس ابتلائے عظیم کے واقعات یاد کرکے اس نواح کی

(بقیہ صفحہ ۱۱۳) کے چھٹے اڈیشن سے لیا ہے، جو سرپال ریکاٹ (Sir Paul Rycaut) کے اضافوں کے ساتھ لندن سے ۱۶۸۷ء میں شایع ہوئی۔ ملاحظہ ہو جلد اول ص ۳۱۹ ۱۲ مصنف

ضعیف الاعتقاد رعایا آج بھی لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے۔ یہ
آگ دو منافق ایرانیوں حسن خلیفہ (Chasan Chelife)
اور اس کے لڑکے شاہ قلی (Schach Culi) کی
لگائی ہوئی تھی جسے بعض لوگ تیکل شاہ قلی (Teckel
(Schach Culi) اور بعض تِکے اِلّی (Techellis)[1]
کہتے ہیں۔ ان دونوں نے پہلے تو اس مقام پر سکونت اختیار
کی اور اپنی ریاکاری سے وہاں کی جاہل رعایا کے دلوں
پر اپنے تقدس کا سکّہ جمایا، اس کے بعد اپنے سرپھرے
مریدوں کی جماعت کو ساتھ لے کر (جن کا دماغ ان کی
تبلیغ سے پہلے ہی خراب ہوگیا تھا) پہلے تو اپنے جھوٹے
نبی[2] کے جانشینوں کا مسئلہ اُٹھایا اور پھر رعایا میں ایسی
شورشیں پیدا کردیں کہ ان میں سے ایک کی آگ تو آج
تک نہیں بجھی ہے اور دوسری ایک مدت دراز کے
کشت و خون کے بعد فرو ہوئی۔

اس کے بعد نولکس نے اس خطرناک شورش کی طویل تفصیل دی ہے۔
ترکوں کو اس میں کئی مرتبہ فاش شکستیں ہوئیں اور ان کے کئی نامور
سردار (جن میں وزیر اعظم خادم علی پاشا بھی تھا) مارے گئے۔ تب کہیں
بہزار دقت و خرابی یہ شورش دبی۔ اور باغی منتشر ہوئے، کچھ قتل

[1] تِکلّو یا تے کلّو یعنی تِکّے اِلّی کی صفت۔ ۱۲ مصنف

[2] اس مقام پر نولکس نے اپنی خلقی سیہ کاری اور تعصب کا ثبوت دیا ہے۔
نعوذ باللہ من ذالک، نقل کفر کفر نباشد۔ ۱۲ مترجم

بیچے گئے۔ اور کچھ بھاگ کر ایران چلے گئے۔ شاہ اسمٰعیل نے بجائے اس سے کہ مفرورین کو انعام دیتا یا ان کی دلجوئی کرتا، ان میں سے اکثر کو تبریز میں قتل کرادیا، کیونکہ بقول نولس (Knolles) سے[1] انھوں نے ذی ثروت تاجروں کے ایک قافلہ کو لوٹ لیا تھا۔ لیکن زمانۂ حال کے ایک ترکی مورخ[2] کی رائے میں اسمٰعیل نے ان لوگوں کو محض اس وجہ سے مصلحتاً قتل کرایا تھا کہ وہ بایزید کی نظروں میں ممد و معاونِ بغاوت نہ ٹھہرے۔

نولس (Knolles) آگے چل کر لکھتا ہے:-

"خود تیک اِلی (شاہ قلی) کو بھی دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے زندہ جلادیا گیا"

لیکن ترکی مورخ کے بیان کے مطابق، وہ بھی علی پاشا کی طرح جنگ گیوک چاہے (مابین سیواس اور قیصریہ) میں مارا گیا تھا۔ صاحب احسن التواریخ کا بھی اسی پر اتفاق ہے۔ نولس (Knolles) لکھتا ہے:-

ترکی سلطنت میں شیعوں کا قتل عام | "تیک اِلی (شاہ قلی)

---

[1] کتاب مذکورہ بالا ص ۳۲۶ - ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو عبدالرحمٰن اشرف کی تاریخ سلطنت عثمانیہ (قسطنطنیہ) اشاعت دوم (۱۳۱۵ھ م ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ء) جلد اول۔ ص ۱۹۶ - ۱۹۷۔

نیز ملاحظہ ہو فان ہیمر (Von Hammer) کی تاریخ آل عثمان (Gesch. d. Osmanisch)(Reich) جلد دوم ص ۳۵۹ ص ۳۶۰ اور ص ۳۹۳ ص ۳۹۴ - ۱۲ مصنف

کے فرار ہونے کے بعد جوشمس[۱] نے ایشیاے کوچک کے
تمام شہروں میں ایرانی (شیعہ) مذہب کے پیرؤوں کو
کھود کھود کر نکالا اور جس کے متعلق اسے معلوم ہؤا کہ یہ
بھی گزشتہ بغاوت میں شریک تھا، اسے اس نے سخت
ترین ایذائیں دے کر مروا ڈالا اور بقیہ کی پیشانیاں
گرم لوہے سے دغوائیں تاکہ ہمیشہ ان کی پہچان رہے
اور پھر ان سب کو، نیز ان لوگوں کے عزیزوں کو جنھیں
پھانسی دی گئی تھی یا جو تیک اُلّی (شاہ قلی) کے ساتھ فرار
ہوگئے تھے، یورپ میں جلا وطن کردیا اور مقدونیہ،
ایپرس اور پے لی پونے سیس (Pleponessis)
میں ان کو منتشر کردیا، تاکہ اگر شاہ قلی جو ایران کی طرف
بھاگ گیا ہے دوبارہ فوجیں لے کر آئے، تو یہ لوگ اس کے
شریک ہوکر پھر بغاوت نہ کرسکیں۔ یہ ہے اس زبردست
شورش کی ابتدا اور رفتار، جس سے شدید تر بغاوت کا
سامنا شاید ہی کبھی ترکی کو کرنا پڑا ہو اس لیے کہ اس
وقت تو یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ اگر شاہ ایران
ذرا بھی اس موقع سے فائدہ اُٹھاتا تو ترکوں کے تمام
ایشیائی مقبوضات یا کم ازکم ان کا بڑا حصّہ تو ضرور
اس کے قبضے میں آسکتا تھا۔"

---

[۱] یعنی کپلن پاشا، سلطان سلیم کا وزیر اعظم، جسے ۹۱۳ھ مطابق ۱۵۱۶ء
میں پھانسی دی گئی ۱۲ مصنف

نولس (Knolles) نے ان واقعات کا سن وقوع ۱۵۰۸ء قرار دیا ہے، لیکن احسن التواریخ میں یہ ۹۱۷ھ مطابق ۱۵۱۱ء - ۱۵۱۲ء سے متعلق بتائے گئے ہیں یعنی بایزید کی موت سے ایک سال پہلے۔

تعجب کی بات ہے کہ کسی شیعہ مورخ نے ترکی میں شیعوں کے اس قتل عام کی طرف کچھ بھی اشارہ نہیں کیا ہے، حالانکہ فان ہیمر (Von Hammer) لکھتا ہے کہ محکمہ احتساب کے کشت و خون اور سینٹ بارتھولومیو (Saint Bartholomew) کے قتل عام دونوں کو بھی اگر ملا لیا جائے، تب بھی شیعوں کے اس قتل عام سے زیادہ دہشت ناک کارروائی تاریخ عالم میں مذہب کے نام سے کبھی نہ کی گئی ہوگی۔ اکثر ترکی مورخین نے بھی اس قتل عام کے بیان کو نظر انداز کر دیا ہے، جو چنداں تعجب خیز نہیں ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ ان واقعات کا بیان ان کے لیے کسی طرح سے موجب فخر و مباہات نہ ہو سکتا تھا۔ نولس نے اس واقعہ کو بایزید ثانی کے عہد سے منسوب کرنے میں غلطی کی ہے اس لیے کہ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ اس قسم کے قتل عام کے دو واقعات پیش آئے ہوں اور یہ بھی ثابت ہے کہ ایک ایسا واقعہ ۱۵۱۴ء میں یعنی سلیم کی تخت نشینی کے بعد ضرور پیش آیا، اس لیے کہ نکولو گوئس تونیانی (Nicolo Guistoniani) نے اسی سال ۷۔ اکتوبر کو اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اس کا حال لکھا ہے۔ سعد الدین، سولاق زادہ، اور علی ابو الفضل ابن ادریس تبلیسی نے مقتولین کی تعداد چالیس ہزار

بتائی ہی۔ آخرالذکر مورخ (علی ابوالفضل) نے جو تفصیلات دی ہیں اور جنھیں فان ہیمر (Von Hammer) نے اصل فارسی زبان میں لاطینی رسم الخط میں نقل کردیا ہی، وہ حسب ذیل ہیں[1]

فرستادہ سلطان دانا رسوم دبیرانِ دانا بھہ مرز و بوم
کہ اتباع این قوم را قسم قسم در آرد بنوک قلم اسم اسم
زہفت و زہفتاد سالہ بنام بیارید دیوانِ عالی مقام
چو دفتر سپردند اہلِ حساب عدد و چہل ہزار آمد از شیخ و شاب
پس آنگہ بحکام ہر کشورے رسانند فرمان بران دفترے
بہر جا کہ رفتہ قدم ار قلم نہد تیغ بُرّاں قدم بر قدم
شد اعداد این کشتہ ہائے دیار فزوں از حساب قلم چہل ہزار

سلطان سلیم کی فارسی مراسلات اب ہم پھر فریدوں بے کے منشآت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیں سلطان سلیم کے عہد کے حسب ذیل مراسلات نظر آتے ہیں جن سے اس کے اور سلطنت ایران کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہی (خطوط کا سلسلۂ شمار گزشتہ خطوط سے ملایا گیا ہی۔) :-

(۱۳) از سلطان سلیم بنام عبید خان ازبک۔ فارسی میں ہی آخر محرم ۹۲۰ھ (مطابق ۲۷۔ مارچ ۱۵۱۴ء) کی تاریخ درج ہی، یعنی جنگ چالدران سے صرف پانچ ماہ پہلے (ص ۳۷۴۔ ص ۳۷۵) اس طویل مراسلت میں جو ایک شخص

---

[1] اس مقام پر پروفیسر براؤن نے وہ المانی ترجمہ بھی نقل کیا ہی جو فان ہیمر نے ان اشعار کا کیا ہی۔ ہم نے اسے قصداً نظر انداز کردیا ہی۔ ۱۲ مترجم

محمد بے کی معرفت بھیجی گئی تھی، سلطان سلیم لکھتا ہی:-

"کہ اہالیان بلاد شرق از دست صوفی بچہ
لئیم ناپاک، اثیم افاک، ذمیم سفّاک بجاں
آمدہ اند"

اور عبید خاں کو تاکید کی گئی ہی کہ وہ جس طرح سے ممکن ہو اپنے مرحوم باپ، شیبک خان کا انتقام لے۔

(۱۴) مذکورہ بالا مراسلت کا جواب، فارسی میں آخر جمادی الثانی ۹۲۰ھ (۲۱۔ اگست ۱۵۱۴ء) تاریخ درج ہی ص۳۷۷۔ ۳۷۹۔ عبید خان نے جواب دیا ہی کہ میں اپنے والد کا انتقام تو پہلے ہی لے چکا ہوں[1]۔ اور اس سگ بچۂ صغیر کو جو سگ بچۂ کبیر (یعنی شاہ اسمٰعیل) کا نائب اور کارندہ تھا، اور جو حماقت سے اپنے آپ کو نجم ثانی کہتا تھا، قتل کرچکا ہوں۔ اس کے بعد وہ وعدہ کرتا ہی کہ میں آپ کو (ترکی سلطان)

"شر ذمہ قلیلۂ زنادقۂ او باش و ملاحدۂ قزلباش"

کی بیخ کنی میں ضرور مدد دوں گا۔

(۱۵) من جانب سلطان سلیم، بنام شاہ اسمٰعیل فارسی میں ہی

[1] ازبکوں کو شاہ اسمٰعیل اور بابر کی متحدہ فوجوں پر یہ فتح ۱۷۔ رمضان ۹۱۸ھ (۲۶۔ نومبر ۱۵۱۲ء) کو حاصل ہوئی تھی۔ امیر نجم الدین مسعود (نجم اول) کا انتقال ۹۱۵ھ (۱۵۰۹ء۔ ۱۵۱۰ء) میں ہوچکا تھا اور ان کی جگہ امیر یار احمد اصفہانی الملقب بہ نجم ثانی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۲ مصنف

۹۲۰ھ ہر تاریخ درج ہی (۱ اپریل ۱۵۱۴ء) ۳۷۹ - ۳۸۱۔
یہ خط بہت توہین آمیز اور سخت الفاظ میں لکھا گیا ہی۔
اس میں سلیم نے شاہ اسمٰعیل کو تنبیہ کی ہی کہ اپنے الحاد
اور بد اعمالیوں سے تائب ہوجاؤ۔ خصوصًا شیخین رض کی
سب و شتم بند کردو، ورنہ حملہ کردیا جائے گا۔ اور جو علاقہ
تم نے جبر و تشدد سے غصب کرلیا ہی وہ چھین لیا جائے گا"

(۱۶) من جانب سلطان سلیم بنام محمد بیگ آق قویونلو، فارسی
میں ہی۔ آخر صفر ۹۲۰ھ (۲۵ - اپریل ۱۵۱۴ء) تاریخ
درج ہی۔ ۳۸۱ - ۳۸۲ اس خط میں محمد بیگ کو اس کے
خاندان اور رعایا کے پکے سنّی عقاید پر مبارک باد دی گئی
ہی۔ اور اس سے "ملاحدۂ قزلباش" کی سرکوبی کے لیے
مدد طلب کی گئی ہی۔

(۱۷) مذکورۂ بالا خط کا جواب۔ فارسی میں ہی۔ آخر ربیع الثانی
۹۲۰ھ (۲۳- جون ۱۵۱۴ء) تاریخ درج ہی، ۳۸۲۔
اس خط سے معلوم ہوتا ہی کہ سلطان سلیم کا قاصد احمد جان
نامی کوئی شخص تھا اور وہی یہ جواب بھی لے گیا۔ کاتب
خط کو اس کا بہت اندیشہ ہی کہ کہیں یہ مراسلت طشت
از بام نہ ہوجائے۔

(۱۸) سلطان سلیم کا دوسرا خط شاہ اسمٰعیل کے نام۔ فارسی
میں ہی تاریخ ندارد۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ اس خط میں سلیم نے
خلافت کا دعوٰے کیا ہی۔ شاہ اسمٰعیل اور اُس کے خاندان

کو کفر، الحاد اور بدکرداری کا مجرم قرار دیا ہے۔ اور تنبیہ کی ہے کہ ابھی وقت ہے، تائب ہو جاؤ۔ اور ایران کو ممالک محروسہ عثمانیہ میں ملحق کر دو۔

(۱۹) سلطان سلیم کا تیسرا خط شاہ اسمٰعیل کے نام۔ ترکی زبان میں ہے۔ آخر جمادی الاول ۹۲۰ھ (۲۳۔ جون ۱۵۱۴ء) تاریخ دی ہوئی ہے۔ ارزنجان سے بھیجا گیا ہے۔ اس میں شاہ اسمٰعیل کو طعنہ دیا گیا ہے کہ میدانِ جنگ میں قسمت آزمائی سے کیوں جی چُراتے ہو۔

(۲۰) شاہ اسمٰعیل کی طرف سے سلطان سلیم کے تینوں خطوں کا جواب فارسی میں ہے۔ تاریخ ندارد۔ غالبًا یہ وہی خط ہے جس کا حوالہ کریزی (Creasy)(History of the Ottoman Turks) تاریخ عثمانی ترک میں دیا ہے۔ شاہ اسمٰعیل لکھتا ہے کہ شاید آپ کا منشی خط لکھتے وقت افیون (یا بھنگ) کھائے ہوئے تھا۔ چنانچہ میں اپنے قاصد شاہ قلی آغا کے ہاتھ ایک سونے کی ڈبیا تحفۃً بھیجتا ہوں جس میں افیون (یا بھنگ) رکھی ہوئی ہے۔ اور بنظر احتیاط (ڈبیہ) پر مہر ثبت کر دی گئی ہے۔ یا

(۲۱) سلطان سلیم کا چوتھا خط شاہ اسمٰعیل کے نام۔ ترکی میں ہے۔ آخر جمادی الثانی ۹۲۰ھ (۲۱۔ اگست ۱۵۱۴ء) تاریخ درج ہے اس خط میں پھر اسمٰعیل کو دعوت جنگ دی گئی ہے۔

جنگ چالدران اگست ۱۵۱۴ء

اس آخری خط کے لکھنے کے تھوڑے ہی دن بعد یعنی اوائل رجب ۹۲۰ھ (اگست ستمبر ۱۵۱۴ء)[1] بمقام چالدران جو تبریز سے تقریباً ۲۰ فرسنگ دور ہے، ترکوں اور ایرانیوں میں ایک جنگ عظیم ہوئی جس میں تین ہزار ترک اور دو ہزار ایرانی کھیت رہے، لیکن بالآخر میدان ترکی توپ خانے کے ہاتھ رہا اور اگرچہ شاہ اسمٰعیل اور اس کے جاں نثاروں نے خوب ہی داد شجاعت دی لیکن انھیں پسپا ہوکر تبریز کے پیچھے تک ہٹ جانا پڑا جس پر ۱۶ - رجب ۹۲۰ھ (۶ - ستمبر ۱۵۱۴ء) کو ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔ دونوں طرف کے ہزاروں آدمی معرکہ میں کام آئے۔ ترکی سرداروں میں سے حسن پاشا رومیلیا کا بگلر بیگی جو ترکی میسرہ کی کمان کر رہا تھا، حسن بے، گورنر موریا، قیصریہ کا گورنر اویس بے، نتاکیا کا گورنر ایاس بے اور دوسرے فوجی سردار اور عمائدین مارے گئے۔ اور ایرانیوں میں سے امیر سید شریف شیرازی جو مذہب شیعیت کا بڑا حامی تھا، امیر عبدالباقی جو مشہور زمانہ بزرگ شاہ نعمت اللہ کرمانی کی اولاد میں سے تھا، سید محمد کمونہ نجفی، خان محمد خان اور دوسرے سردار کام آئے۔

فتح چالدران کے بعد سلطان سلیم کی کارروائیاں

سلطان سلیم نے اپنی اس فتح کی خوشی میں حسب دستور اپنے بیٹے سلیمان، خان کریمیا، کرد سرداروں، آق قویونلو قبیلہ کے آخری سردار سلطان مراد، شاہ رستم کردستانی، اڈریانوپل کے گورنر اور دوسرے

[1] بقول فریدوں بے کے پہلی رجب ۹۲۰ھ (۲۲ اگست ۱۵۱۴ء) منشآت صفحہ ۱۱

حکام کے نام دھوم دھام کے فتح نامے روانہ کیے۔ فریدوں بے نے اپنی منشآت میں ان سب فتح ناموں کی پوری پوری عبارتیں نقل کی ہیں (صفحہ ۳۸۶ - صفحہ ۳۹۶) لیکن تاریخی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم وہ تحریریں ہیں جو ان فتح ناموں کے بعد ہی صفحہ ۳۹۶ - صفحہ ۴۰۶ پر درج ہیں۔ درجن سے اُس وقت سے لے کر جب کہ ترکی فوج ۳- محرم ۹۲۰ھ (۲۰- مارچ ۱۵۱۴ء) کو ایڈریا نوپل سے روانہ ہوئی، اس وقت تک کے، جب وہ اسی سال کے آخر میں یعنی نومبر- دسمبر ۱۵۱۴ء میں اماسیہ میں موسم سرما بسر کرنے کے لیئے ٹھہری، روز روز کی نقل وحرکت کے واقعات درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے ایڈریا نوپل سے تبریز تک کی مسافت ۱۰۵ منزلوں میں طے کی، اور قسطنطنیہ، قیصریہ، سیواس، ارزنجان، چالدران، خوئے اور مرند ہوتے ہوئے وہاں (تبریز) پہنچے - وہاں سے ۵۸ منزلوں میں نخچوان، جسر جوبان، اور بے برت ہوتے ہوئے۔ اماسیہ واپس آئے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں مقتول دشمنوں کی کھوپریوں کا ایک مینار تیار کیا، شاہ اسمٰعیل کی ایک بیوی کو جو ان کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی تھی، جعفر بے کے حوالے کردیا اور تبریز میں داخلے سے ایک روز پہلے قصبۂ ساحلان کے پاس خالد بے دراس کے ۱۵۰ قزلباشوں کا قتل عام کیا - خاص شہر تبریز میں ان کی فوجوں نے نہایت بُردباری سے کام لیا - چنانچہ شاہ اسمٰعیل کے مورخ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے[۱]- سلطان سلیم صرف ایک ہفتہ تبریز میں ٹھہرا، (۶- تا ۱۴ ستمبر ۱۵۱۴ء)، اور تیموری شہزادے بدیع الزمان

[۱] مخطوطہ نمبر Add 200۲ مخزونہ کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی ورق نمبر ۱۵۱ - ۱۲ مصنف

کو[۱] جو مرحوم سلطان ابوالغازی حسین ابن بیقرہ کا بیٹا تھا اور جان بچانے کے لیے روپوش ہوگیا تھا، نیز اپنی مملکت میں آباد کرنے کی غرض سے تبریز کے چند باکمال صناعوں کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوگیا۔ سلطان سلیم کی واپسی کے دو یا تین ہفتہ بعد ہی شاہ اسمٰعیل پھر تبریز میں واپس آگیا۔ سرجان ملکم (Sir John Malcolm) لکھتا ہے[۲]

"اسمٰعیل کے اولوالعزم دل پر اس شکست فاش کا اثر بہت گہرا پڑا۔ اور اگرچہ وہ پہلے بہت خوش مزاج اور خنداں جبیں تھا لیکن اس واقعہ کے بعد سے کسی نے اسے مسکراتے بھی نہ دیکھا"

اس میں شک نہیں کہ یہ شکست، "شکست فاش" ضرور تھی، لیکن اس کا مستقل اثر بہت ہی کم ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ سلطان سلیم کو اپنی جاں نثار افواج کی بے چینی، اور وطن واپس جانے کے لیے ان کے اضطراب کو دیکھ کر مجبوراً ایرانی حدود سے اپنی فوجیں ہٹانی پڑیں اور بجز ایک مرتبہ کے، جب ۱۵۱۵ء کے موسم بہار میں اس نے ارزنجان کے نزدیک بمقام کماخ ذوالقدریہ[۳] نامی شاہی خاندان کا

---

[۱] یہ اس واقعہ کے چار ماہ بعد قسطنطنیہ میں بعارضہ طاعون فوت ہوا ۱۲ مصنف

[۲] تاریخ ایران (History of Persia) جلد اول ص۵۰۲ - لیکن جو فارسی تاریخیں میرے مطالعہ سے گزریں ان میں مجھے اس بیان کی کوئی تصدیق نظر نہیں آئی ۱۲

[۳] بقول احسن التواریخ کے اس خاندان سے صرف چار بادشاہ گزرے۔ ملک ارسلان سلیمان، ناصرالدین اور علاءالدولہ ان میں سے آخرالذکر کو اور اس کے ساتھ اس کے چار بیٹوں اور تیس ہمراہیوں کو سلیم کے سپاہیوں نے ۱۳ جون ۱۵۱۵ء کو شکست دینے کے بعد قتل کر دیا ۱۲ مصنف

قلع و قمع کیا تھا، وہ بقیہ عمر مصر، شام اور عرب کو زیر سیادت لانے میں اپنی پوری فوجی قوت صرف کرتا رہا اور دوبارہ اس نے ایران کا رُخ نہ کیا۔

جنگ چالدران کے بعد جب شاہ اسمٰعیل تبریز واپس آیا تو اس نے نور الدین عبد الوہاب کے ہاتھ ایک نہایت ہی ملاطفت آمیز اور پُر معذرت خط سلطان سلیم کو بھیجا[۵۱]۔ سلیم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن چند ماہ بعد (آخر رجب ۹۲۱ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۵۱۵ء) ایک طویل خط ترکی زبان میں عبید خاں اُزبک کو لکھا اور اسے ترغیب دی کہ شیعوں کو چین سے نہ بیٹھنے دو[۵۲]۔

محولہ بالا صفحات کے علاوہ فریدوں بے کی منشآت کے اور ۴۸ صفحے[۵۳] سلطان سلیم کے عہد کے مراسلات اور تحریروں سے بھرے ہوئے ہیں لیکن سوائے ایک کے ہر خط میں شاہ اسمٰعیل کا ذکر سب وشتم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ مراسلہ جس کو ہم نے مستثنٰی کیا ہے، دو نظموں پر مشتمل ہے جن میں سے ایک فارسی میں ہے اور ایک ترکی میں۔ یہ نظمیں سلطان سلیم کو مخاطب کرکے لکھی گئی تھیں۔ ان کا لکھنے والا ایک وطن فروش ایرانی ہے جس کا نام خواجہ اصفہانی بتایا گیا ہے۔ یہ شخص غالباً خواجہ مولانائے اصفہانی ہے جو غالی سنّی تھا اور اُزبک شیبک خان کے متوسلین میں تھا۔ احسن التواریخ میں اس کا سنِ وفات ۹۲۷ھ ہے

---

[۵۱] فریدوں بے جلد اول ص۴۱۳۔ ص۴۱۴ ۔ ۱۲ مصنف

[۵۲] فریدوں بے جلد اول ص۴۱۵۔ ص۴۱۶ ۔ ۱۲ مصنف

[۵۳] سب سے آخری مراسلہ ص۴۶۵ پر ختم ہوتا ہے ۱۲ مصنف

مطابق ۹۲۷ھ ۱۵۲۱ء بتایا گیا ہے۔[1]

فارسی نظم کے حسب ذیل اشعار سے پوری نظم کے رنگ کا اندازہ ہو جائے گا۔

سلیم کے نام ایک فارسی تہنیت نامہ

الا ای قاصدِ فرخندہ منظر — نیازم بر سوی شاہِ مظفر
بگو ای پادشاہِ جملہ عالم — توئی امروز در مردی مسلّم
اساسِ دین تو در دنیا نہادی — تو شرع مصطفےٰ[2] بر جاں نہادی
مجدّد گشت دین از ہمّتِ تو — جہاں در زیرِ بارِ منّتِ تو
اگر ملک شریعت مستقیم است — ہمہ از دولتِ سلطان سلیم است
ز ہیبت در تزلزل فارس و ترک — چو افگندی سرِ تاجِ قزل بُرک[3]
نگندی تاجش از سرای مظفر — فگن اکنوں بہ مردی از تنش سر
قزل بُرک است ہیچو مار افعی — سرش را تا نہ کوبی نیست نفعی
توئی امروز ز اوصافِ شریفہ — خدا را و محمدؐ را خلیفہ

---

[1] اس کی ترکی نظم کے ایک مصرعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا گھر خراسان اور خوارزم میں تھا، اور وہ اس کو ترک کرنے پر مجبور ہوا تھا، اس لیے کہ "کفر نے خانۂ دین برباد کر دیا تھا اور سریرِ مذہب پر متمکن ہو گیا تھا"۔ ۱۲ مصنف

[2] ...

[3] بُرک ترکی لفظ ہے، جس کے معنے ایک قسم کی لمبی سموری ٹوپی ہیں۔ قزل بُرک سے یہاں وہی مراد لی گئی ہے جو قزلباش سے لی جاتی ہے۔ ۱۲ مصنف

روا داری کہ گبرِ[۵۱] ملحد و دزد | دہد دشنام اصحابِ محمدؐ[۵۲]
تو او را نشکنی از زورِ مردی | سرش را نا بریدہ باز گردی
اگر گیرد امانیے در سلامت | بگیرم دامنت را در قیامت
چنیں دیدم ز اخبارِ پیمبرؐ | کہ ذوالقرنین[۵۳] بُد در رومِ[۵۴] قیصر
بذوالقرنین ازاں خود را علم کرد | کہ ملکِ فارس را با روم ضم کرد
دو قرن او شہی اندر جہاں شد | بشرق و غرب حکم او رواں شد
بیا از نصرِ دین کسرِ صنم کن | بہ تختِ روم ملکِ فارس ضم کن

سلطان سلیم نے ۹۲۶ھ مطابق ۱۵۲۰ء میں وفات پائی۔ بقول احسن التواریخ، اس نے ۸ سال، ۸ ماہ، اور ۸ یوم حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلیمان تخت نشین ہوا۔ جسے اس کے ہم ملک سلیمان قانونی، اور اہلِ یورپ سلیمان ذی شان کہتے ہیں۔ ایرانی شاعر امینی نے اس کی تخت نشینی کے موقع پر ایک نظم لکھی تھی جس کے ہر مصرع

[۵۱] گبر کے اصلی معنے زردشتی کے ہیں لیکن اس زمانے کے مصنفین ہر غیر مسلم یا مشرک کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، جس طرح ترکی میں انھیں معنوں کے لیے "گیاور" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھو جلد ہذا کا صفحہ ۹۸، ۱۵۰ ۱۲ مصنف

[۵۲] یہاں پر اس تبرا بازی کی طرف اشارہ ہے جو شاہ اسمٰعیل کے حکم سے ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ پر کی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو جلد ہذا کا صفحہ ۵۱، ۹۸ ۱۲ مصنف

[۵۳] اس پُر اسرار شخص کو (جیسا کہ اس موقع پر) عام طور پر سکندر اعظم کہا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو قرآن پ ۱۶، ع آیت ۸۲ - ۸۵، ۹۳، اور اس کی تفسیر ۱۲ مصنف

[۵۴] روم کا لفظ یکے بعد دیگرے رومی بازنطینی اور عثمانی حکومتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ آج کل کے ایرانی مورخین عثمانی سلطان کو ہمیشہ سلطان روم کہتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

سے مادہ تاریخی (۹۲۶ھ) نکلتا ہے۔ احسن التواریخ میں ذیل کا شعر نمونے کے طور پر درج کیا گیا ہے۔

بکاؤس عہد سلیمان ثانی	بداوہ زماں ملکت کامرانی
۹۲۶ھ	۹۲۶ھ

تخت نشینی کے تین سال بعد جب سلیمان نے اردوس (Rhodes) کو مسخر کیا، تو ایک دوسرے ایرانی شاعر نیازی نے اس کی تہنیت میں بھی ایک ایسا ہی بدیع قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع یہ تھا۔

دوم فتح اردوس الا ای نیازی	در اول جلوسے بوی سرفرازی
۹۳۰ھ	۹۲۶ھ

اس کے مصرعہ اولی سے سلیمان کی تخت نشینی کا سال (۹۲۶ھ مطابق ۱۵۲۰ء) اور مصرعہ ثانی سے فتح اردوس کا سال نکلتا ہے[۱]

شاہ اسمٰعیل کی وفات: شاہ اسمٰعیل نے ۲۴ سال حکومت کرنے کے بعد بروز دوشنبہ، بتاریخ ۱۹ ر رجب ۹۳۰ھ مطابق ۲۳ر مئی ۱۵۲۴ء بعمر ۳۸ سال انتقال کیا اور اردبیل میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوا۔ اس نے چار بیٹے چھوڑے۔ شاہ طہماسپ جو ۲۶ر ذی الحجہ ۹۱۹ھ (۲۲ر فروری ۱۵۱۴ء) کو پیدا ہوا اور باپ کے تخت پر بیٹھا القاس

[۱] احسن التواریخ (مسٹر الیس کے نسخے کا ورق ۱۳۸ ب) مصرعہ اولی سے توضیح سن نکلتا ہے یعنی ۹۲۶ھ، لیکن مصرعہ ثانی میں سے جیسا کہ اس نسخے میں وہ "دویم" سے کے ساتھ لکھا ہوا ہے ۹۴۰ھ نکلتا ہے لہذا میں نے دویم کی بجائے دوم کر دیا ہے، جس سے ۹۳۰ھ نکلتا ہے، اگرچہ یہ بھی فتح اردوس کی تاریخ سے ایک سال زیادہ ہے۔ ۱۲ مصنف

(ولادت ۹۲۲ھ مطابق ۱۵۱۶ء) سام اور بہرام جو دونوں القاص
کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔ ان چار بیٹوں کے علاوہ۔ پانچ بیٹیاں بھی
تھیں[1]۔ اس کے عہدِ حکومت میں قلم کے بدلے، سیف کے جوہر زیادہ
کھلتے رہے۔ اس نے نہ صرف ~~اپنے~~ متعدد چھوٹے چھوٹے بادشاہوں
کو بساطِ ملک سے نکال باہر کیا۔ بلکہ اپنی قلمرو کے حدود بھی بڑھائے
احسن التواریخ میں لکھا ہے[2]:۔

اس کے حدودِ سلطنت

"اس کی قلمرو آذربائیجان، عراق
عجم، خراسان، فارس، کرمان اور خوزستان پر حاوی تھی
اور ان کے علاوہ دیار بکر، بلخ اور مرو بھی ایک زمانے
میں اس کے زیر سیادت تھے، رزم میں وہ ایسا ضیغم
خنجر آزما تھا، تو بزم میں ابر دُر بار۔ اس کی چشم سخاوت
میں زر خالص عیار اور نمک بے حقیقت دونوں ایک
تھے۔ علو ہمتی کا یہ عالم تھا کہ بحر و معدن کے تمام ذخائر
اس کی یک روزہ جود و عطا کے لیے بھی کفایت نہ کرتے
تھے اور اس کا خزانہ عموماً خالی رہتا تھا۔ شکار کا اسے
خاص شوق تھا اور وہ تن تنہا شیروں کو مار ڈالتا تھا
اس کا حکم تھا کہ جو شخص کسی شیر کے دیکھے جانے کی خبر
لائے گا۔ وہ اس کے سرداروں سے اسپ مع زین انعام

---

[1] خانش خانم، پری خان خانم، مہین بانو سلطانم، فرنگیس خانم اور
زینب خانم۔ ۱۲ مصنف

[2] ۵۲ ورق ۱۳۱ ۔ ۱۲ مصنف

پائے گا۔ اور جو تیندوے کی اطلاع دے گا، اسے بے
زین کا گھوڑا ملے گا، وہ اکیلا نکل جاتا اور شیر اور تیندوے
مار لاتا۔ اپنے عہدِ حکومت میں وہ پانچ لڑائیاں لڑا،
پہلی بمقام جیانی، فرخ یسار شاہ شروان سے، دوسری
شرور الوند سے، تیسری ہمدان کے پاس بمقام المانو لاغی،
سلطان مراد سے چوتھی مرو کے قریب شیبک خان سے
اور پانچویں چالدران میں سلطان سلیم سے[1]۔"

اس کی وفات کا مادۂ تاریخی لفظ ظل (سنہ ۹۳۰ھ) سے نکلتا ہے
نیز "خسرو دین" سے بھی۔ جیسا کہ ذیل کے قطعات تاریخی سے معلوم ہوگا۔

شاہِ گردوں پناہ اسمٰعیل — آں کہ چوں مہر در نقاب شدہ
از جہاں رفت و ظل شدش تاریخ — سایہ تاریخ آفتاب شدہ

سنہ ۹۳۰ھ

رباعی

شاہے کہ چو خورشید جہاں گشت مبیں — بز دود غبار ظلم از روے زمیں
تاریخ وفات آں شہ شیر کمیں — از خسرو دیں طلب کہ شد خسرو دیں

سنہ ۹۳۰ھ

شاہ اسمٰعیل کے معاصر اہل قلم | ہم اس سے پہلے کسی موقع پر

[1] یہ جنگیں علی الترتیب سنہ ۹۰۶ھ مطابق سنہ ۱۵۰۰ء؛ سنہ ۹۰۷ھ مطابق سنہ ۱۵۰۱ء؛ سنہ ۹۰۸ھ مطابق سنہ ۱۵۰۲ء؛ سنہ ۹۱۶ھ مطابق سنہ ۱۵۱۰ء؛ اور سنہ ۹۲۰ھ مطابق سنہ ۱۵۱۴ء میں ہوئیں۔ سوائے آخری لڑائی کے اور سب میں شاہ اسمٰعیل ہی فتح یاب ہوا۔ ۱۲ مصنف

بتا چکے ہیں[1] کہ صفویہ کے پورے دور میں، ایران میں اعلیٰ درجے کے شاعروں کی بہت کمی رہی ہے۔ باقی رہے زبردست علمار اور مجتہدین تو ان کا زمانہ بھی کچھ بعد کا ہے، یعنی جب شیعیت نے، جسے شاہ اسمٰعیل نے اپنی کوششوں سے ایران کا قومی مذہب بنادیا تھا، زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمالیے تھے۔ جن مشہور مصنفوں اور اہلِ قلم حضرات کے سنین وفات احسن التواریخ اور شاہ اسمٰعیل کے عہد کے دوسرے وقایع میں دیے ہوئے ہیں، ان کا تعلق فی الحقیقت اُس جھگڑے سے ہے جو تیموری سلطان، ابوالغازی حسین اور اس کے وزیر خوش تدبیر میر علی شیر نوائی کی قدردانیوں کی وجہ سے ان کے درباروں میں جمع ہوگیا تھا۔ ہاتفی برادر زادہ جامی رح، (وفات ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۱ء) امیر حسین معمای (وفات ۹۰۴ھ مطابق ۱۴۹۸ء۔ ۱۴۹۹ء) بنائی جو اس قتل عام میں ہلاک ہوا جو اسمٰعیل کے سپہ سالار نجم ثانی نے ۹۱۸ھ مطابق ۱۵۱۲ء میں قرشی میں کیا تھا؛ ہلالی، جسے شیعہ ہونے کی پاداش میں اُزبکوں نے ۹۳۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء۔ ۱۵۲۹ء میں ہرات میں قتل کردیا تھا۔ مشہور فلسفی جلال الدین دوّانی (وفات ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۰۲ء۔ ۱۵۰۳ء)، مشہور مورخ میر خواند (وفات ۹۰۳ھ مطابق ۱۴۹۷ء۔ ۱۴۹۸ء بہ عمر ۶۸ سال) اور وہ جامع العلوم شخص یعنی حسین واعظ کاشفی جو مفسر، اخلاقی اور وقایع نگار تھا۔ اور جو اپنی تصنیف انوارِ سہیلی کی وجہ سے زندۂ جاوید ہے ــــ یہ سب کے سب دراصل سلطان

[1] ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا صفحہ ۳۲۵ تا ۴۲۳ ۱۲

ابوالغازی حسین ہی کے دربار کے مشاہیر رجال تھے۔[1]

قاسمی نے شاہ اسمٰعیل کے کارناموں کا بیان ایک شاہ نامہ میں کیا ہے، جو غیر مطبوعہ ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی شاذ و نادر ہی میسّر آتے ہیں[2]۔ یہ شاہ نامہ، شاہ اسمٰعیل کی وفات کے دس سال بعد مکمل ہوا۔ اسمٰعیل کو اکثر ایرانی بادشاہوں کے برخلاف، درباریوں کی خوشامد اور زر پرست شعرا کی مدح و ستایش سننے کا شوق بہت ہی کم تھا۔[3]

---

[1] ان میں سے مشہور ترین مصنفوں اور شاعروں کے سوانح زندگی تاریخ ادبیات ایران جلد سوم (ادبیات فارسی بزمانہ تاتاریہ) میں دیے جا چکے ہیں ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو ریو (Rieu) فہرست کتب فارسی ص۶۶۳۔ ص۶۶۱ ۱۲ مصنف

[3] ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا ص۴۷ ۱۲ م

باب سوم

دولتِ صفویہ کا عُروج و زوال

از شاہ طہماسپ (۹۳۰ھ ۱۵۲۴ء تا ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء) تا شاہ حسین (۱۱۰۵ھ ۱۶۹۴ء تا ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ء)

شاہ طہماسپ کی تخت نشینی ۲۳ مئی ۱۵۲۴ء

اسمٰعیل کے بڑے بیٹے طہماسپ کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف دس سال کی تھی۔ اس نے ساڑھے باون برس ایران پر حکومت کی، اور ۱۴ مئی ۱۵۷۶ء کو اس کا انتقال ہوا۔ اُس زمانہ کے وقایع میں اسے عام طور پر شاہ دیں پناہ کہا گیا ہے۔ اس کی تخت نشینی کا مادۂ تاریخ ذیل کے قطعہ سے نکالا گیا تھا:۔

طہماسپ شاہ عالم کز نصرتِ الٰہی   جا بعد شاہ غازی بر تخت زر گرفتی

جائے پدر گرفتی۔ کردی جہاں مسخر   تاریخ سلطنت شد۔ جائے پدر گرفتی

۹۳۰ھ

اس کے عہد کے دو مستند فارسی مآخذ

یوں تو اس کے طویل عہدِ حکومت کے متعلق متعدد وقائع موجود ہیں، لیکن سطورِ ذیل میں مَیں ان میں سے صرف دو سے استفادہ کروں گا۔ ایک تو اس کی خود نوشتہ سوانح عمری[1] جو اس کی تخت نشینی کے دن، یعنی

[1] اسے ڈاکٹر پال ہارن آنجہانی (Doctor Paul Horn) Z. D. M. G بابتہ ۱۸۹۰ء میں شایع کر چکے ہیں۔ ص ۵۶۳۔ ص ۶۲۹۔ نیز یہ محمد حسین خان اعتماد السلطنت کی تصنیف مطلع الشمس کی دوسری جلد میں بھی چھپ چکی ہے ص ۱۶۵۔ ص ۲۱۳۔ ۱۲ مصنف

دوشنبہ ۱۹ رجب ۹۳۰ھ (۲۳ مئی ۱۵۲۴ء) سے شروع ہو کر اس تاریخ پر ختم ہوتی ہے جب اس نے نہایت بے مروّتی سے ترکی شہزادہ بایزید کو جو اس کے یہاں پناہ گزیں ہوا تھا۔ دشمنوں کے حوالے کردیا تھا یعنی ۹۶۹ھ (۱۵۶۱ء۔۱۵۶۲ء) تک۔ دوسرا ماخذ جس سے میں نے کام لیا ہے حسن بیگ روملو کی بلند پایہ تصنیف احسن التواریخ ہے جس کے خاتمہ کا سال ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء۔۱۵۷۸ء) ہے یعنی شاہ طہماسپ کی وفات کے صرف ایک سال بعد۔ طہماسپ کو خود نوشتہ سوانح عمری لکھنے کا خیال غالبًا بابر کی بے نظیر تزک کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس سے کہیں کم رتبہ ہے۔ اور سبق آموزی اور دلچسپی میں اس کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ناصر الدین شاہ کے روزناموں سے بھی جن کی اہمیت کے متعلق غیر معمولی مبالغہ کیا جاتا ہے، کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ اتنا بہرحال ضرور ہے کہ اس آپ بیتی سے ہمیں طہماسپ کی ذہنیت کے متعلق بہت کافی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ان خشک اور بے مزہ سرکاری وقائع کے مقابلہ میں جو زیادہ تر لاتعداد محاربوں، قتل عام وغیرہ کے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور عوام الناس کی معاشرتی اور ذہنی حالت کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ اس سوانح عمری سے ہم کو اور کچھ نہیں تو بعض اندرونی حالات کا پتہ تو ضرور ہی مل جاتا ہے۔ سر جان ملکم (Sir John Malcolm)[1] طہماسپ کی سیرت اور

---

[1] تاریخ ایران جلد اول ص۵۱۱۔ ص۵۱۳ ۱۲ مصنف

ارسکن[1] (Erskine) دونوں مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ شاہ طہماسپ کی طبیعت میں مذہبی تعصب بہت تھا تاہم سرجان ملکم نے اس کی سیرت کے متعلق نسبتہً اچھی رائے قائم کی ہے۔ وہ لکھتا ہے

"وہ نیک دل اور فیاض تھا"

یا پھر آگے چل کر کہتا ہے:-

"معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حزم اور جوش کا مادہ بھی تھا، چاہے اس میں اعلیٰ صفات زیادہ نہ ہوں، لیکن کم از کم اتنا ضرور ہے کہ وہ برائیوں سے بھی پاک تھا"

انتھونی جنکنس (Anthony Jenkins) جو ملکہ الزبتھ (Elizabeth) کا سفارشی خط لے کر گیا تھا، نومبر ۱۵۶۲ء میں بمقام قزوین اس کی خدمت میں باریاب ہوا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ طہماسپ سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا[2]

طہماسپ کا حلیہ

وینسی سفیر وِن سِن شیو ڈاَلِس سینڈری (Vincentio d' Allessandri) جو ۱۵۷۱ء میں اس کے دربار میں متعین کیا گیا تھا، اس کے متعلق

---

[1] تاریخ ہندوستان بعہد بابر و ہمایوں (History of India under Babar and Humayun) (لندن ۱۸۵۴ء) جلد دوم ص ۲۸۵ الخ ۱۲ مصنف

[2] اس عجیب و غریب خط کے مضمون کے لیے ملاحظہ ہو Hackluyt Society کی طبع کردہ کتاب "Early Voyages and Travels to Russia and Persia No. IXXII London-1886 ص ۱۱۲ - ص ۱۱۴ ۱۲ مصنف

[3] کتاب محولہ حاشیہ بالا - ص ۱۴۲ - ص ۱۴۵ ۱۲ مصنف

لکھتا ہے[1]

"اس کا سن ۶۴ سال کا ہے اور اس کی حکومت کا یہ ۵۱ واں برس ہے۔ اس کا قد درمیانہ ہے۔ جسم اور قویٰ اچھے ہیں۔ رنگ سیاہ ہے، ہونٹ موٹے ہیں اور ڈاڑھی کھچڑی ہے۔ اس کی طبیعت پر حزن و ملال کا رنگ بہت غالب ہے جس کے یوں تو اور کئی ثبوت بھی ہیں، لیکن بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ گیارہ سال سے اپنے محل سے باہر نہیں نکلا ہے اور نہ شکار یا کسی اور تفریح کے لیے گیا ہے۔ اس کی اس حرکت سے اُس کی رعایا اس سے بہت ناخوش ہے۔"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"وہ مغرور ہے، لیکن لڑائی کے کام کا نہیں ہے بہت ہی کم ہمّت ہے۔ عدل اور انصاف کا اسے بالکل خیال نہیں لیکن عورتوں اور روپیوں پر دم دیتا ہے۔ کم ظرف اور حریص ہے۔ ادنیٰ درجے کے تاجروں کا سا کائیاں پن دکھاتا ہے۔"

خاتمے پر لکھتا ہے:-

"اگر اس بیان سے کوئی یہ سمجھے کہ سب اس سے نفرت کرتے ہوں گے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ ان عیوب کے باوجود

---

[1] Travels of Venetians in Persia (مطبوعہ ہیکلوئٹ سوسائٹی ۱۸۷۳ء) صفحہ ۲۱۵ الخ ۱۲ مصنف

اس کی رعایا اس کا اتنا ادب اور احترام کرتی ہے جو
ناقابلِ یقین ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ اس کو بادشاہ سمجھ کر
نہیں، بلکہ دیوتا یا خدا سمجھ کر مانتے ہیں جس کا سبب یہ
ہے کہ وہ (حضرت) علی رض کی اولاد میں سے ہے جن کا
احترام ہر شخص کے دل میں ہے۔"

آگے چل کر یہ مصنف اس جذبۂ احترام، بلکہ پرستش کی چند مثالیں بھی دیتا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف عوام، بلکہ خود شاہی خاندان کے ارکان، درباری اور سلطنت کے دور و دراز کے حصوں کے باشندے ان کو جوشِ عقیدت طہماسپ کے ساتھ اتنا ہی بڑھا ہوا تھا۔ اس وینی سفیر نے شاہ کی سخاوت کا بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کی وجہ سے رعایا پر سے محصول کا بہت بار کم کر دیا گیا۔ اس فیاضی کا محرک ایک خواب تھا، بادشاہ نے خواب میں دیکھا:۔

طہماسپ خواب کا بہت قایل تھا

"کہ چند فرشتوں نے اس کا گلا پکڑ لیا ہے اور پوچھتے ہیں کہ
تو جو اپنے نام کے آگے عادل کا لقب استعمال کرتا ہے اور
اولادِ علی رض میں سے ہے، تجھ کو شرم نہیں آتی کہ اتنی غریب
مخلوق کو تباہ و برباد کر کے اپنا خزانہ بھرتا ہے۔ اس کے بعد
فرشتوں نے اسے حکم دیا کہ رعایا کو اس ناجائز بار سے
آزاد کرے۔"

یہ قصہ سچ معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اپنی آپ بیتی میں بھی طہماسپ نے کئی خوابوں کا ذکر کیا ہے اور وہ ان کا بہت کچھ قایل بھی نظر آتا ہے۔

مثلاً ۱۵۲۸ء کے قریبی زمانے میں[۱] اس نے خواب دیکھا کہ حضرت علیؓ تشریف لائے ہیں اور بشارت دیتے ہیں کہ تو اُزبکوں پر فتح پائے گا۔ اس خواب کے ایک یا دو سال بعد، اس نے پھر ہرات میں آپ کو خواب میں دیکھا کہ ایک اور جنگ کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں[۲]۔ اسی سلسلے میں لکھتا ہے :-

"اس خادم حقیر طہماسپ الصفوی الموسوی الحسینی کا تو ایمان ہے کہ جو کوئی حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کو خواب میں دیکھ لے، تو جو حکم وہ لگائے وہی ہو کر رہے"[۳]

اسی طرح جب وہ بیس برس کا تھا تو اس نے یکے بعد دیگرے دو خواب دیکھے۔ دوسرے خواب میں اس نے حضرت امام علی رضا کو دیکھا اور ان سے اپنے پہلے خواب کی تعبیر پوچھی۔ چنانچہ حضرت نے تعبیر دی۔ ان خوابوں کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے شراب خواری اور دوسرے منہیات سے توبہ کرلی اور اپنی قلمرو کے تمام شراب خانوں اور بدکاریوں کے اڈوں کو توڑ ڈالا۔ اس موقع پر اس نے حسب ذیل رباعی کہی تھی[۳]

یک چندپے زمرّد سوده شدیم یک چند بہ یاقوت[۴] تر آلوده شدیم
آلودگیٔ بود بہر رنگ کہ بود شستیم بہ آب توبہ، آسوده شدیم

---

[۱] ہارن کی کتاب محولہ حاشیہ ع۱ ص۸ تصنیف ہذا کا ص۵۵ ۔ ۱۲ مصنف

[۲] ہارن کی تصنیف محولہ حاشیہ بالا۔ ص۵۹ ۔ ۱۲ مصنف

[۳] آتش کدہ نے بھی اسے نقل کیا ہے (طبع بمبئی لیتھو ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) ص۱۱ ۱۲ مصنف

[۴] یعنی بھنگ یا حشیش۔ آتش کدہ نے اس کی وضاحت کردی ہے۔ ۱۲ مصنف

[۵] یعنی شراب۔ ۱۲ مصنف

شاہ طہماسپ کی اس توبہ کا حال احسن التواریخ میں ۹۳۹ھ (۱۵۳۲ء
۱۵۳۳ء) کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہوا ہے۔

اس زمانے میں عثمانی سلطان، سلیمان کی فوجوں نے یہ دیکھ کر کہ
ایران شمال مشرقی سرحد پر اُزبکوں کے حملہ میں پھنسا ہوا ہے، حسبِ معمول
اس مصروفیت سے فائدہ اٹھاکر آذر بائیجان کی طرف پیش قدمی شروع
کردی، لیکن اگرچہ موسم برف باری کا نہ تھا پھر بھی ایسی شدت سے
برف گری کہ ترک اس طوفان میں بالکل گھر گئے (یہ اکتوبر کے مہینے کا
واقعہ ہے) اور کثیر تعداد میں اس کی فوج کے آدمی ہلاک ہوگئے۔
اپنے آبائی دشمن ترکوں کی اس بربادی کو شاہ طہماسپ نے "تائید
ایزدی و دستگیری ائمہ معصومینؑ" سے منسوب کیا ہے۔ ذیل کی پُر جوش
رباعی میں، جسے احسن التواریخ اور تاریخ عالم آرائے عباسی دونوں نے
نقل کیا ہے،[۱] اسی کی طرف اشارہ ہے:-

رفتم سوے سلطانیہ آں طرفہ چمن دیدم دو ہزار مردہ بے گور و کفن
گفتم، کہ بکشت ایں ہمہ عثمانی را بادِ سحر از میانہ برخاست کہ من

شاہ طہماسپ نے اپنی سوانح عمری میں دوسرے خوابوں کو بھی
تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اردبیل میں اس نے اپنے مورثِ اعلیٰ
شیخ صفی الدینؒ[۲] کو خواب میں دیکھا اور اُن سے ہم کلام ہوا۔ ایک

---

[۱] ہارن ص۶۰، نیز ملاحظہ ہو فریدون بے کی منشآت جلد اول ص۵۸۸۔ ۵۸۹ جس
میں اس جنگ کے متعلق ترکوں کا بیان درج ہے۔ اور اس شدید سردی کا ذکر کیا
گیا ہے۔ ترکی فوجیں سلطانیہ میں ۵۔ ربیع الثانی ۹۴۱ھ (۱۴۔ اکتوبر ۱۵۳۴ء) کو پہنچی تھیں ۱۲ مصنف

[۲] ہارن ص۶۰۔ ۱۲ مصنف

دوسرے موقع پر شیخ شہاب الدین[۵۱] کی روح نے خواب میں اس کو تسلّی دی اور ہمّت افزائی کی۔ ان کے علاوہ اور کئی خوابوں کا بیان ۹۵۶ھ مطابق ۱۵۵۰ء اور ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۴ء کے واقعات کے ذیل میں دیا ہوا ہے[۵۲]۔

خانگی تعلقات کی بدمزگی اپنے خانگی اور خاندانی تعلقات کے بارے میں شاہ طہماسپ بڑا بدقسمت تھا، اگرچہ اس کی حالت اپنے ہم عصر ایشیائی حکمرانوں خصوصًا سلاطینِ عثمانی کے مقابلے میں پھر بھی کہیں اچھی تھی اُس کے تین چھوٹے بھائی تھے: سام[۵۳] (جو شاعر اور تذکرہ نویس کی حیثیت سے معروف ہے) بہرام اور القاس۔ ان میں سے سام اور القاس نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ سام مرزا ۹۶۹ھ (۱۵۶۱ء۔ ۱۵۶۲ء) میں قید کردیا گیا اور اسی حالت میں طہماسپ کے جانشین نے ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء۔ ۱۵۷۷ء) میں اسے قتل کردیا۔ القاس کی دُرگت اس سے بھی بدتر ہوئی، اس لیے کہ وہ صرف باغی ہی نہیں بلکہ غدّار بھی تھا۔ پہلے تو اس نے قسطنطنیہ میں سلطان سلیمان کے پاس پناہ لی، پھر اسے شہ دے کر اس نے ایران پر حملہ کرایا اور خود بھی اپنے ملک کے خلاف اس جنگ میں شریک ہوا۔ ۹۵۵ھ مطابق ۱۵۴۸ء میں اس نے ہمدان میں اپنی بھاوج

---

[۵۱] بارن ص ۶۲۳۔ ۱۲ مصنف

[۵۲] بارن ص ۶۳۵۔ ص ۶۳۶۔ ۱۲ مصنف

[۵۳] سام ایک قابلِ قدر تذکرۃ الشعرا کا مصنف ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۲ مصنف
ہم نے ص ... کے حاشیہ پر اس تذکرہ کا ذکر کیا ہے اور نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جو اس تذکرہ کے متعلق انھوں نے لکھا ہے۔ ۱۲ مترجم

یعنی بہرام مرزا کی بیوی کا مکان لوٹ لیا۔ پھر بیش قدمی کرتا ہوا یزدخواست تک پہنچ گیا۔ اور وہاں کی رعایا کا قتل عام کیا۔ لیکن دوسرے سال اسے شکست ہوئی اور اپنے بھائی بہرام کے ہاتھ گرفتار ہوگیا۔ جس نے اسے طہماسپ کے حوالے کردیا۔ طہماسپ نے، جیسا کہ اپنی سوانح عمری میں اس نے خود لکھا ہے، اسے قلعہ الاموت میں نظر بند کردیا۔ لیکن احسن التواریخ کا بیان ہے کہ اسے قلعہ قہقہہ میں نظر بند کردیا گیا تھا جہاں وہ ایک ہفتہ کے بعد مرگیا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے طہماسپ لکھتا ہے:-

"قصہ مختصر یہ کہ چند دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہر وقت میری طرف سے خائف رہتا ہے، اس لیے میں نے اسے ابراہیم خاں اور حسن بیگ کمانداد سپاہ کی حراست میں ایک گڑھی میں بھیج دیا۔ ان لوگوں نے اسے قلعہ الاموت میں نظر بند کردیا۔ چند دن بعد جب کہ اس کے محافظ اپنی خدمت پر حاضر نہ تھے، دو تین آدمیوں نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ (جو القاس کے ہاتھوں مقتول ہوا تھا) اس طرح لیا کہ اسے قلعہ الاموت سے نیچے پھینک دیا۔ اس کی موت کے بعد ملک کو امن و امان نصیب ہوا"

اس میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا کہ اگر طہماسپ خود اس ظالمانہ فعل کا مرتکب نہیں ہوا تو کم از کم وہ اس سے خوش ضرور ہوا۔ اسی سال ۳۳ برس کی عمر میں بہرام مرزا کا بھی انتقال ہوگیا۔

عثمانی شہزادے بایزید کے ساتھ دغا | بدنصیب عثمانی شہزادے

بایزید کی جو سلطان سلیمان کا بیٹا تھا، اس سے بھی بُری گت ہوئی۔ اس شہزادے کو جب تاہیہ کی گورنری سے برطرف کر دیا گیا۔ اور اپنی سوتیلی روسی نژاد ماں خرّم[1] کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے (جو اپنے بیٹے سلیم کو جو آیندہ چل کر احمق کے لقب سے ملقب ہُوا، تخت دلوانا چاہتی تھی) اسے اپنا ملک چھوڑنا پڑا تو وہ ۹۶۷ھ (۱۵۵۹ء-۱۵۶۰ء) میں طہماسپ کے دربار میں آکر پناہ گزیں ہُوا۔ اب اس کی اور اس کے بچّوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے لیے علی پاشا کی سرکردگی میں ایک ترکی سفارت قزوین پہنچی۔ انتھونی جنکنس کا بیان[2] پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ قزوین پہنچا ہے تو اس سفارتی وفد کو وہاں آئے ہوئے چار دن ہوئے تھے، یعنی ۳۰۔ اکتوبر ۱۵۶۲ء اس کی تاریخ ورود تھی۔ طہماسپ نے کچھ تو سلطنت عثمانی کے خوف سے اور کچھ رشوتوں کے اثر سے اپنے وعدوں کو جو بڑی شد و مد کے ساتھ کیے گئے تھے، توڑ ڈالا، اور بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس بدنصیب شہزادے اور اس کے چار خورد سال بچّوں کو مروا ڈالا۔ انتھونی جنکنس کا بیان ہے کہ:۔

"شہزادے (بایزید) کا سر تحفۃً اس کے شقی باپ کے پاس روانہ کیا گیا جو دل و جان سے اس کا منتظر اور خواستگار تھا"

---

[1] ملاحظہ ہو گب (Gibb) کی تاریخ ادبیات عثمانی جلد سوم صفحہ ۱ طبع ۱۲ مصنف

[2] Early Voyages etc. (Hackluyt Society, 1886 جلد اول صفحہ ۱۴۲ اور حاشیہ۔ اس حاشیے میں اس بیان کا خلاصہ درج ہے جو نولس (Knolles) نے اسی زمانے میں لکھا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو کریزی (Creasy) کی تاریخ عثمان لی ترک (لندن ۱۸۷۷ء) صفحہ ۱۹۶-۱۹۷ ۱۲ مصنف

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بفرضِ محال طہماسپ کے ضمیر نے مہمانوں کے ساتھ اس طرح وعدہ خلافی اور بے مروتی کرنے پر اسے لعنت و ملامت بھی کی ہوگی تو اس نے اس خیال سے اپنے دل کو سمجھا لیا ہوگا کہ میں نے اپنے وعدہ کی پابندی کی، یعنی ان مہمانوں کو براہِ راست سلیمان کے حوالے نہیں کیا، بلکہ اس کے بھائی سلیم کے قاصدوں کے سپرد کیا! خود شاہ طہماسپ نے اپنی سوانح عمری میں اس المناک واقعہ کی جو تفصیل لکھی ہے وہی اس کو مجرم قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ اس کے خاتمہ پر وہ لکھتا ہے[1]:-

اس دغا کا بیان خود طہماسپ کے قلم سے

"اس زمانے میں خاوندگار[2] حضرت سلطان کا فرستادہ قاصد، علی آقا آیا اور میرے امراء اور اہلِ دربار میں سے جس جس نے جو تحفہ بھیجا تھا، اس نے اس کا بدل پایا، لیکن میرے تحایف اور ہدایا اس مرتبہ بھی شرفِ قبولیت نہ حاصل کر سکے۔ بلکہ جو مراسلہ مجھے لکھا گیا اس میں شکایات، بلکہ کنایوں اور اشاروں میں تنبیہ کی گئی تھی۔ میں نے کہا" دیکھیے خاوندگار سلطان اور شہزادہ سلیم کی خاطر سے میں نے شاہزادہ بایزید اور اس کے چار بیٹوں کو اپنی حراست میں رکھ چھوڑا ہے، لیکن چونکہ میں اس کا وعدہ کر چکا ہوں کہ بایزید کو سلطان کے سپرد نہ کروں گا۔ اس لیے

---

[1] براؤن ص ۶۴۳ ص ۶۴۹ - ۱۲ مصنف

[2] اس موقع پر بھی حسبِ دستور سلطان ترکی کو "خاوندگار" لکھا گیا ہے جو شاید "خداوندگار" کا مخرب ہے۔ ترکوں نے خاوندگار کو بگاڑ کر "خون کار" (خوں ریز) کر لیا ہے۔ ۱۲ مصنف

میرا ارادہ ہے کہ جب سلطان کا حکم ملے، نیز شہزادہ سلیم کے قاصد یہاں پہنچ جائیں تو میں بایزید کو ان لوگوں کے حوالے کردوں گا۔ اس طرح سے وعدہ شکنی کا الزام مجھ پر نہ عائد ہوسکے گا" پس جب سلطان کے قاصد پہنچے تو میں نے کہا کہ آپ کا اور حسن آقا کا دونوں کا میں صدق دل سے استقبال کرتا ہوں۔ میں اعلیٰ حضرت خاوندگار سلطان روم کے فرمان کی حرف بحرف تعمیل کروں گا۔ اور اس میں سرمو کوتاہی نہ کروں گا۔ لیکن اس اہم اور نازک خدمت کے معاوضہ میں میں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت اور شہزادہ سلیم مجھے کوئی ایسا صلہ حُسنِ خدمت دیں جو ان کے شایانِ شان ہو۔ نیز میں سلطان سے دوستانہ طور پر اس امر کا بھی متوقع ہوں کہ شہزادہ بایزید اور اس کے بیٹوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچنے پائے"

یہ کہنا تو لاحاصل ہے کہ شاہ کی اس "دوستانہ توقع" کا ان المناک حالات پر کوئی اثر نہ پڑا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ احکام سلطانی بجا لانے کی وجہ سے عارضی طور پر ترکی اور ایران کے تعلقات کسی قدر بہتر ہوگئے اس کا ثبوت انتھونی جنکنس (Anthony Jenkins) کے یہاں نیز فریدوں بے کے منشآت کی پہلی جلد کے آخری سرکاری مراسلات سے ملتا ہے۔ ان مراسلات میں۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ، سلطان سلیمان نے شاہ طہماسپ کو تہذیب اور عزت کے ساتھ مخاطب کیا ہے۔ بایزید کے واقعہ کے متعلق ان مراسلات میں کسی قسم کا کوئی حوالہ

یا اشارہ نہیں ہے

شہنشاہ ہمایوں کی آمد، ایران میں

بایزید کے ساتھ جو کچھ سلوک ہوا، اخلاقی حیثیت سے اس سے کہیں زیادہ بہتر اور تاریخی حیثیت سے اس سے کہیں زیادہ مشہور وہ استقبال ہے جو طہماسپ کے دربار میں ہمایوں ابن بابر شہنشاہ دہلی کا کیا گیا۔ ہمایوں کو جب ۱۵۴۴ء میں سلطنت سے نکال دیا گیا۔ تو اس نے بھاگ کر دربار ایران میں پناہ لی۔ اس کے ساتھ جو مہمان نوازی کی گئی، اس کا ذکر سرجان ملکم نے بہت شد و مد کے ساتھ کیا ہے[1]۔ لیکن ارسکن (Erskine) نے[2] ہمایوں کے ملازم جوہر[3] کے صاف و سادہ بیان کے مقابلہ میں سرکاری بیانات کو بہت کم وقعت دی ہے۔ اور متعدد دلائل اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ "ہمایوں کو بے شمار تکلیفیں اور ذلتیں برداشت کرنی پڑیں"۔ ایک خاص بات جو اس کے ساتھ کی گئی یہ تھی کہ اس پر شیعیت قبول کرنے کے متعلق بہت زور ڈالا گیا۔ اور اگر شاہ کی ہمشیرہ سلطانم خانم، وزیر سلطنت قاضی جہان اور طبیب شاہی نورالدین کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو شاید تبدیلِ مذہب کے متعلق یہ دباؤ کوئی اور شدید صورت بھی اختیار کر لیتا۔ اصفہان

---

[1] تاریخ ایران (لندن ۱۸۱۵ء) جلد اول ص۵۰۰۔ ص۵۰۹ ۱۲ مصنف

[2] تاریخ ہندوستان بعہد بابر و ہمایوں (لندن ۱۸۵۴ء) جلد دوم ص۲۴۲ الخ۔ ۱۲ مصنف

[3] Translated by Major Charles Stewart & printed in London 183[?] for the Oriental Translation Fund ۱۲ مصنف

کے مشہور قصر چہل ستون[1] کی دیوار پر اس دعوت کی ایک تصویر کھنچی ہوئی ہے جو شاہ طہماسپ نے ہمایوں کے اعزاز میں دی تھی۔

طہماسپ کے زمانے میں ایران کے تعلقات دولِ خارجہ سے۔ اپنے باپ شاہ اسمٰعیل کے زمانے کی طرح شاہ طہماسپ کے تعلقات بھی خاص طور پر تین سلطنتوں کے ساتھ رہے ماوراء النہر کے ازبک، دلی کے مغلِ اعظم اور ترکی سلطان، طہماسپ کے عہدِ حکومت کے بیشتر حصّے میں یعنی ۹۷۴ ہجری (۱۵۶۶-۱۵۶۷ء) تک، سلطان سلیمان اعظم تختِ عثمانی پر متمکن رہا۔ اس کے بعد سلیم سلطان ہوا اور طہماسپ کی عمر کے آخری دو سالوں یعنی ۹۸۲ ہجری ۹۸۴ ہجری (۱۵۷۴ تا ۱۵۷۶ء) میں سلطان مراد ثالث سلطان روم رہا ازبک حکمرانوں میں عبید خان اپنی وفات کے زمانے یعنی ۹۴۶ ہجری ۱۵۳۹-۱۵۴۰ء) تک قایم رہا۔ اس کے بعد دین محمد سلطان حاکم ہوا یہ دونوں طہماسپ کے جانی دشمن تھے۔ اگر ترک اس کی سلطنت کے مغربی حدود پر تاخت کرتے رہتے تھے، تو یہ دونوں مشرقی حدود پر اسے پریشان کیے ہوئے تھے۔ مغلانِ اعظم میں سے بابر (وفات ۹۳۷ ہجری مطابق ۱۵۳۰ء یا ۱۵۳۱ء) ہمایوں (وفات ۹۶۲ ہجری (۱۵۵۵ء) اور اکبر اس کے معاصرین تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو لارڈ کرزن کی تصنیف "Persia" جلد دوم ص ۳۵ اس تصویر کی ایک نقل جو ٹکس ایر (Texler) کی بنائی ہوئی ہے سر پرسی کاکس (Sir Percy Cox) کی تصنیف تاریخ ایران (طبع دوم، لندن ۱۹۲۱ء) جلد ۲ ص ۱۶۴ پر دی ہوئی ہے۔ ۱۲ مصنف

انتھونی جنکنس، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ۱۵۶۱ء میں ملکہ الزبتھ (Elizabeth) کا تعارف نامہ لے کر اس کے دربار میں حاضر ہوا تھا اور احسن التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کے ۱۳ سال بعد یعنی ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں ڈان سباس شین (Don Sebastian) کی فرستادہ ایک پرتگالی سفارت بھی اس کے دربار میں آئی تھی، لیکن اس کا کچھ ایسا زیادہ حوصلہ افزا خیر مقدم نہیں کیا گیا۔

غرض کہ اس زمانے میں بھی ایک طرف سے عثمانی ترکوں نے اور دوسری طرف سے اُزبکوں نے ایران کو چین نہ لینے دیا اور شمال شرقی اور شمال مغربی دونوں سرحدوں پر ان حریفوں کے ساتھ جنگوں کا ایک طویل اور اُکتا دینے والا سلسلہ برابر جاری رہا، جس میں قسمت دونوں طرف پلٹے کھاتی رہی۔ سلطان سلیمان کے ساتھ خاص خاص جنگیں یہ ہوئیں :-

ترکوں کے ساتھ جنگیں

۱- ۹۴۰ھ تا ۹۴۲ھ (مطابق ۱۵۳۴ء تا ۱۵۳۶ء) اس میں ترکوں نے بغداد کو ایرانیوں سے چھین لیا اور آذربائجان پر تاخت کی[1]۔

۲- ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء تا ۱۵۴۴ء)؛ ۹۵۳ھ - ۹۵۵ھ (مطابق ۱۵۴۶ء تا ۱۵۴۸ء)؛ ان لڑائیوں میں شاہ طہماسپ کا بھائی القاس ترکوں کے ساتھ مل گیا۔

---

[1] "ملحد قزلباش شاہ طہماسپ" کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں ان کا مکمل روزنامچہ فریدوں بے کی منشآت کی جلد اول میں ملتا ہے۔ (ص۵۸۴ - ص۵۹۸) عثمانی فوجیں ۱۰- جون ۱۵۳۴ء کو قسطنطنیہ سے روانہ ہوئیں، اس سال ماہ دسمبر میں بغداد پر ان کا قبضہ ہوا - اور ۷ جنوری ۱۵۳۶ء کو وہ قسطنطنیہ واپس ہوئیں۔ ۱۲ مصنف

۳- ۹۵۹ھ (۱۵۵۲ء) اس میں ایرانیوں کا قبضہ پھر ارجیش پر ہو گیا
۴- ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) اس میں سلیمان نے نخچوان میں آگ لگا دی
اور چوتھی مرتبہ آذربائجان پر تاخت کی۔

اس زمانے میں ترکوں کی فوجی قوت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اور نہ صرف ایران، بلکہ بڑے بڑے دول یورپ بھی ان سے سہمے ہوئے رہتے تھے، خاص کر دول یورپ تو اس بات پر خدا کا ہزار ہزار شکر کرتے تھے کہ ایرانی جنگیں وقتاً فوقتاً ترکی کی توجہ کو یورپ سے ہٹا دیا کرتی ہیں۔ بس بک (Busbecq) جو شاہ فرڈی نینڈ کی طرف سے سلطان سلیمان کے دربار میں بحیثیت سفیر متعین تھا، کہا کرتا تھا کہ "صرف ایران ہی ہمیں تباہی سے بچائے ہوئے ہے"[1] کریزی (Creasy) لکھتا ہے[2]:-

"اس زمانے میں ترکی فوج، نہ صرف اپنی تعداد میں بلکہ اپنے توپخانے کی عمدگی کے اعتبار سے بھی بہت بڑھی ہوئی تھی"

پھر آگے چل کر لکھتا ہے:-

"قلعہ بندی، نیز فوجی انجنیری کے ہر شعبہ میں بھی ان کی مہارت اور کمال کا یہی حال تھا"

اگرچہ ایرانی فوجیں، ترکی کے مقابلہ میں، کیا بہ لحاظ ضبط و انتظام اور کیا بہ اعتبار ساز و سامان بہت حقیر تھیں، پھر بھی ان کے لیے بڑی قابلِ تعریف بات ہے کہ وہ اپنے استقلال اور پامردی کے ساتھ مقابلہ

---

[1] ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا صفحہ ۱۸ ۱۲ مصنف

[2] تاریخ عثمان لی۔ ترک۔ مطبوعہ لندن ۱۸۷۷ء صفحہ ۲۰۳ ۔ ۱۲ مصنف

کرتی رہیں، خصوصًا ایسی حالت میں کہ ترک دوسری طرف اپنی سیاسی چالوں سے ہمیشہ اُزبکوں، ترکمانوں اور دوسری سنّی رعایا کو اس پر اُبھارتے رہتے تھے کہ ہمارے ساتھ مل کر" اوباش قزلباش" پر حملہ کردو۔ خود سلیمان کے زمانے کے سرکاری مراسلات اس کے باپ سلیم کے مراسلات کی طرح ترکوں کی اس حکمت عملی کی شہادت دیتے ہیں مثلاً وہ خط جو ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) کے آخر میں ایک ترکمان سردار کو لکھا گیا تھا۔ (فریدوں بے، منشآت، ص ۶۱۲ - ص ۶۱۳)۔ اس خط کو ترکمان سردار کے چار سند وہیں محمدؐ، میرابوتراب، میر طوطی اور صندک۔ ترکی سے لائے تھے، یہ چاروں حج سے فارغ ہوکر واپسی میں قسطنطنیہ ٹھہرے اور سلطان سلیمان کے دربار میں باریاب ہوئے تھے اور اسے ایرانیوں پر فتح پانے کی خوش خبری سُنائی تھی۔

اُزبکوں کے ساتھ جنگیں

اُزبکوں کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہا جب تک کہ تیس سال تک حکومت کرنے کے بعد ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء-۱۵۴۰ء) میں عبید خان کا انتقال نہ ہولیا۔ یہ زبردست شخص براہِ راست چنگیز خان کی نسل سے تھا۔ احسن التواریخ میں لکھا ہے کہ اس نے ایرانیوں کے خلاف سات لڑائیاں لڑیں اور صرف ایک مرتبہ شکست کھائی۔ ان جنگوں میں طوس، مشہد اور خاص کر ہرات کی خوب ہی دُرگت ہوئی، اس لیے کہ مذہبی مظالم ان سب لڑائیوں کا لازمہ ہوا کرتے تھے۔ اگر ایک طرف

مذہبی شدائد

شاعر ہلالی سنّی اُزبکوں کے ہاتھوں ۹۳۵ھ (۱۵۲۸ء-۱۵۲۹ء) میں بمقام ہرات قتل ہوا۔ تو دوسری طرف

سنہ ۹۱۹ھ مطابق (۱۵۱۳ء-۱۵۱۴ء) میں قرشی کے قتل عام میں بنائی شاعر شیعوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ عبید خان کے تسخیر ہرات کے موقع پر شیعوں پر جو مظالم ہوئے ان کی تفصیل احسن التواریخ میں سنہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء-۱۵۳۶ء) کے واقعات کے ذیل میں دی ہوئی ہے۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:-

"ہر روز بہ حکم آں خان بے ایمان پنج شش کس بواسطہ تشیع باقوال جہال در چہار سوق[1] ہرات کشتہ می شدند۔ و روستائیاں بے دیانت و شہریاں با خیانت باہر کس کہ عداوتے داشتند اورا گرفتہ نزد قاضی می بردند کہ ایں مرد و زنان قزلباش لعن ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کردہ است۔ بہ سخن آں دو گواہ جاہل قاضی بقتل آں مظلوم حکم می کرد، و اورا کشاں کشاں بچہار سوق ہرات می بردند و بہ قتلش می آوردند۔ و از شومئ ایشاں امواج محن، و افواج فتن بدرجہ اعلیٰ رسید و سلب و نہب در اطراف خراسان واقع گردید"

گرجیوں کے ساتھ جنگیں اس زمانے میں گرجیوں کے ساتھ بھی ایران کی مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں، مثلاً سنہ ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء-۱۵۴۱ء)؛ سنہ ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء-۱۵۴۴ء)؛ سنہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء)؛ سنہ ۹۶۱ھ (مطابق ۱۵۵۴ء) سنہ ۹۶۸ھ (مطابق ۱۵۶۰ء-۱۵۶۱ء) اور سنہ ۹۷۶ھ (مطابق ۱۵۶۸ء-۱۵۶۹ء) کی لڑائیاں۔ ان لڑائیوں میں فریقین کی طرف سے بہت کچھ مظالم ہوتے تھے۔ ایک بات قابل لحاظ

[1] چوراہہ۔ آج کل کا ترکی لفظ "چارشی" اسی سے نکلا ہے۔ ۱۲ مصنف

یہ ہے کہ اس زمانے کے ایرانی مورخین گرجستان کے عیسائی باشندوں کو ہمیشہ گبر لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ بجا طور پر صرف زرتشتیوں کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا جنگوں میں سے ایک کا منظوم بیان بھی موجود ہے، جس کا ایک شعر یہ ہے:-

در آں سنگلاخ آں دداں کردہ جا،
وطن گاہ گبران مردم رُبا

احسن التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ میں صرف انھی گرجیوں کی جان بخشی کی گئی تھی جو اسلام لے آئے تھے؛ بقیہ کو تہِ تیغ کیا گیا علیٰ ہذا اسی تاریخ میں ۹۵۸ ہجری (۱۵۵۱ء) کی جنگ کے بیان میں لکھا ہے:-

"غازیانِ ظفر شعار، پست و بلند دیار، کفار فجار را احاطہ نمودند و ہر کوہ و کمر کہ گریزگاہ آن گمراہ بود از لکدکوب دلاوران بالاموں یکساں شد، و یک متنفس ازاں مشرکین از دائرۂ قہر و کین" وَاللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکٰفِرِیْنَ" جان بہ سلامت بیروں نہ برد، واہل و عیال و اموال بارث شرعی از مقتولان بہ قاتلان انتقال نمودند"

چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اور شورشیں ان بڑی لڑائیوں کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں جو زیادہ تر گیلان کے کم و بیش خود مختار حکمرانوں اور اس قدیم لیکن تباہ حال خاندان یعنی شروان شاہوں سے لڑی گئیں جو نوشیروانِ اعظم کی اولاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اگرچہ شروان شاہوں کا آخری تاجدار

شاہ رخ ابن سلطان فرخ، ابن شیخ شاہ ابن فرخ یسار ۹۴۶ ہجری (۱۵۳۹ء ۱۵۴۰ء) میں شاہ طہماسپ کے حکم سے قتل کیا جا چکا تھا، لیکن اس واقعہ کے ۹ سال بعد ہمیں اسی خانوادے کا ایک فرد مسمی برہان اسمٰعیل مرزا سے برسر جنگ نظر آتا ہے۔ گیلان میں خان احمد جو ایک چھوٹی سی سلطنت کا جو دو سو پانچ سال تک رہی، گیارھواں تاجدار تھا، ۹۷۵ ہجری (۱۵۶۷ء - ۱۵۶۸ء) میں شکست کھا کر قلعہ قہقہہ میں نظربند کر دیا گیا۔ تبریز میں بھی شورہ پشتوں کا ایک گروہ ادھم مچاتے ہوئے تھا، اور جب ان میں سے ڈیڑھ سو آدمی تہ تیغ کیے گئے، تب کہیں ان کا زور ٹوٹا اور انھوں نے اطاعت قبول کی اس زمانہ میں وحشیانہ سزائیں دینا ایک معمولی بات تھی۔

وحشیانہ سزائیں مظفر سلطان والی رشت کو بغاوت کے الزام میں شہر میں گشت کرایا گیا۔ اسے ایسے مسخر انگیز کپڑے پہنائے گئے کہ عوام الناس اس کے پیچھے تالیاں بجاتے تھے، آخرکار ایک لوہے کے پنجرے میں بند کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ اسی پنجرے کے نیچے ایک اور پنجرے میں امیر سعد الدین عنایت اللہ خوزانی کو بند کر کے، ان کے ساتھ بھی یہی وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ اسی طرح سے خواجہ کلاں غوریانی پر جو ایک کٹر سنی تھا اور عبید خان ازبک کے استقبال کی غرض سے گیا تھا، یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے بادشاہ کا ذکر حقارت آمیز الفاظ میں کیا ہے اور اس کی پاداش میں ہرات کے بازار میں اس کی کھال کھینچی گئی۔ اور بھُس بھر کر ایک بانس پر لٹکا دی گئی۔ رکن الدین مسعود کازرونی جو ایک نہایت ذی علم شخص اور اعلیٰ درجہ کا طبیب تھا

عتاب شاہی کا مورد ہوا اور زندہ جلا دیا گیا۔ محمد صالح پر جو ایک فیاض طبع شخص اور شاعروں کا بڑا قدر شناس تھا اور جس کی مدح میں حیرتی نے ایک قصیدہ کہا ہی، بادشاہ کا ذکر بے ادبی کے ساتھ کرنے کا الزام لگایا گیا اور اس جرم کی سزا میں پہلے تو اس کا منہ سی دیا گیا اور پھر ایک بڑی مٹی کی ناند میں رکھ کر اسے ایک بلند مینار سے زمین پر پھینک دیا گیا۔

طہماسپ کے عجیب وغریب شوقوں کی ہجو

احسن التواریخ میں لکھا ہی کہ طہماسپ کو جوانی میں خطاطی اور نقاشی کا بہت شوق تھا، علیٰ ہذا مصری گدھوں پر سواری کرنے کا بھی وہ بہت شوقین تھا، چنانچہ ان کی سواری عام طور پر فیشن میں داخل ہوگئی اور شوقین مزاج لوگوں نے، اپنے اپنے شوق کے مطابق انھیں زرّیں سازوں اور سنہری کلابتون کی پوشش سے مزین کرنا شروع کردیا، ایک مسخرے شاعر نے، جس نے "یوق العشق" کا عجیب وغریب تخلص اختیار کیا تھا، ذیل کے شعر میں بادشاہ کے ان شوقوں کا مضحکہ اُڑایا ہی:-

بے تکلف خوش ترقی کردہ اند
کاتب و نقاش و قزوینی و خر

شاہ طہماسپ کو اپنی طہارتِ جسمانی کے بارے میں بھی خاص اہتمام مدّ نظر تھا:-

"وہ اکثر چیزوں کو نجس سمجھا کرتا تھا اور اکثر منہ کا نوالہ پانی یا آگ میں پھینک دیا کرتا تھا"

اس کی اس عادت کی وجہ سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوتی ہی کہ:-

"وہ کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کبھی نہ کھاتا تھا"

ناخن ترشوانے اور ایسی ہی دوسری "طہارتوں" کا اسے بہت خیال رہتا تھا اور جس دن وہ "ناخن ترشواتا تھا، اس کے دوسرے روز وہ دن بھر حمام میں رہتا تھا۔

طہاسپ کا انتقال اور فتنہ و فساد کا ظہور

طہاسپ نے ۱۵۔صفر ۹۸۴ھ (۱۴ مئی ۱۵۷۶ء) کو ۶۴ سال کی عمر میں اور ساڑھے باون برس حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا۔ احسن التواریخ میں لکھا ہے کہ سوائے فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ[۱] کے اور کسی مسلمان بادشاہ نے اتنے دنوں تک حکومت نہیں کی۔ اسی تاریخ میں اس کے گیارہ بیٹوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جس میں سے اس کے انتقال کے وقت صرف نو زندہ تھے، سب سے بڑا بیٹا محمدؐ خدا بندہ تھا، جس کی عمر ۴۵ سال تھی، اگرچہ ایک سال بعد وہ تخت نشین ہوگیا، لیکن باپ کے انتقال کے وقت اس نے اپنے فتور بصارت کی وجہ سے تخت قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ممالک مشرقی، خصوصًا ایران میں نابینا کو خواہ وہ خلقی ہو، یا زبردستی کسی کو نابینا کردیا گیا ہو، فرائض شاہی کی بجا آوری میں ایک طرح کا مانع تصور کیا جاتا تھا۔

خدا بندہ کے چھوٹے بھائی حیدر نے، دوسرے بھائیوں کی دار الخلافت

---

[۱] المستنصر کی حکومت ساٹھ قمری سال یعنی ۴۲۷ھ تا ۴۸۷ھ (۱۰۳۵ء تا ۱۰۹۴ء) تک رہی۔ ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو (Chardin's Voyages) (مطبوعہ پیرس ۱۸۱۱ء) جلد پنجم ص ۲۴۱۔ ۲۴۴۔ ۱۲ مصنف

سے عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاکر (کیونکہ اسمٰعیل تو قہقہہ میں نظر بند تھا، اور دوسرے بھائی زیادہ تر دور و دراز کے صوبوں میں رہا کرتے تھے) تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے بھائی اسمٰعیل کے طرف داروں نے موقع پاکر اسے زنانخانے میں جہاں وہ پناہ گزیں ہوا تھا، قتل کردیا، اور طہماسپ کے انتقال کے ۹ روز بعد قزوین کی بڑی بڑی مسجدوں میں اسمٰعیل کی تخت نشینی کا اعلان کردیا گیا۔

اسمٰعیل ثانی کا مختصر اور خونین دورِ حکومت

اسمٰعیل کا عہد حکومت مختصر اور خونین تھا۔ مشتبہ دعویداران تخت و تاج سے نجات پانے کے لیے جو سخت کارروائیاں اس نے کیں، وہ ظالم سے ظالم عثمانی سلطان نے بھی نہ کی ہوں گی۔ پہلے تو اس نے اپنے دو بھائیوں سلیمان اور مصطفٰے کو مروا ڈالا۔ اس کے بعد نہایت اہتمام کے ساتھ مشہد میں اپنے مرحوم باپ کی تجہیز و تکفین کی، پھر کمال تزک و احتشام کے ساتھ، قزوین میں اپنی تخت نشینی کی رسم ادا کی، جس میں بقیۃ السیف بھائیوں کو ان کے منصب کے مناسب اعزازات عطا ہوئے۔ ان مراسم سے فارغ ہونے کے بعد، اب اس نے اپنے بھائیوں کے قتل کا سلسلہ شروع کیا۔ یکشنبہ ۶۔ ذی الحجہ ۹۸۴ھ (مطابق ۲۴۔ فروری ۱۵۷۷ء) کو اس نے حسب ذیل چھ شہزادوں کو قتل کیا۔ سلطان ابراہیم مرزا جو مشہور شاعر، مغنی اور خطاط تھا؛ محمد حسین مرزا، اس کا بھتیجا جس کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی اور جو پہلے ہی بصارت سے محروم کیا جا چکا تھا؛ سلطان محمود مرزا؛ سلطان محمود مرزا کا بیٹا باقر مرزا جو صرف دو سال کا تھا؛ امام قلی مرزا اور سلطان احمد مرزا۔ اس کے بعد وہ ان شہزادوں کی طرف

متوجہ ہُوا جو دور دراز کے صوبوں میں رہتے تھے۔ مثلاً خراسان میں،
بدیع الزمان مرزا اور اس کا خورد سال بچہ بہرام مرزا گنجہ میں سلطان
علی مرزا اور طہران میں سلطان حسن مرزا۔ یہ سب قتل کردیے گئے۔ صرف
خورد سال شہزادہ عباس مرزا جو اس ظالم کا بھتیجا تھا اور جو آگے چل کر
زمانۂ حال کے ایرانی حکمرانوں میں سب سے زیادہ زبردست حکمران ہونے
والا تھا۔ محض حسن اتفاق سے اپنے سفاک چچا کے پنجے سے بچا۔ عباس مرزا
کا سوانح نگار اسکندر منشی[1] اس کے بچنے کو معجزہ اور تائید غیبی سمجھتا ہے۔
شہزادہ عباس بال بال بچ گیا | خون آشام اسمٰعیل نے تو ایک شخص
مسمی قلی خاں شاملو کو، شہزادے کو قتل کرنے کے ارادہ سے ہرات جہاں
یہ شش سالہ معصوم بچہ برائے نام گورنر تھا، بھیج دیا تھا، لیکن جذبۂ ترحم
کہو، یا ضعیف الاعتقادی، اس شخص نے اپنے ارادۂ فاسد کی تکمیل (دیر میں)
کردی اور اس کا منتظر رہا کہ ماہِ صیام ختم ہولے۔ لیکن قبل اس کے کہ
رمضان کا مہینہ ختم ہو، قاصد نے آکر خوش خبری دی کہ شاہ اسمٰعیل ثانی
کا انتقال ہوگیا ہے۔ جیسی اس کی زندگی شرمناک تھی، ویسا ہی اس کا
اسمٰعیل کا عبرت ناک انجام | انجام بھی خراب ہُوا۔ یکشنبہ مورخہ ۱۳۔
رمضان ۹۸۵ھ (۲۴۔ نومبر ۱۵۷۷ء) کی رات کو وہ حسب عادت شہر
کے بازاروں میں رنگ رلیاں منانے نکلا، حسن بیگ نامی ایک حلوائی
کا لڑکا جو اس کا منظورِ نظر تھا اور دوسرے اوباش ندیم اس کے
ساتھ تھے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ حسن بیگ کے گھر میں سونے کے لیے داخل

[1] یہی شخص شاہ عباس کبیر کے عہد کے متعلق ایک زبردست تصنیف کا مصنف
ہے جو تاریخ عالم آرائے عباسی کے نام سے مشہور ہے ۱۲ مصنف

ہوا اور دن کے وقت لوگوں کو وہیں اس کی لاش ملی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اسے زہر دیا گیا، کچھ لوگ کہتے تھے کہ پہلے اسے داروے بے ہوشی پلائی گئی اور پھر گلا گھونٹ دیا گیا۔ بعض اس رائے پر متفق تھے کہ اس نے افیون کی، جسے وہ اپنے درد قولنج کے دور کرنے کے لیے کھایا کرتا تھا۔ معمول سے زیادہ مقدار کھالی۔ بہرحال اس کی موت سے سب کو ایسی خوشی ہوئی کہ کسی نے اس کی تفتیش کرنے کی زحمت نہ گوارا کی۔ اور اس بات کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ حسن بیگ کو بھی کسی قسم کی سزا دی گئی یا نہیں۔ خود حسن بیگ کو جب دوسرے دن لوگوں نے دیکھا تو وہ نیم مفلوج سا تھا[1]۔

محمدؐ خدا بندہ کا عہدِ حکومت اب محمدؐ خدا بندہ جس نے اپنے باپ شاہ طہماسپ کے انتقال کے وقت تخت و تاج قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، باوجود نابینا ہونے کے تخت پر بٹھایا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۶ سال کی تھی[2]۔ پہلے وہ ہرات کا حاکم تھا، لیکن جب وہاں اس کا چھوٹا بیٹا شہزادہ عباس جس کے موت سے بال بال بچنے کا ذکر ابھی ہم کر چکے ہیں حاکم مقرر ہوا، تو وہ شیراز میں رہنے لگا۔ نئے بادشاہ نے فوراً شیراز سے قزوین کا رُخ کیا۔ وہاں جن لوگوں نے بمقام قُم اس کا استقبال کیا، ان میں حسن بیگ روملو بھی تھا جو احسن التواریخ کا مصنف ہے، یہ ایک نہایت اہم تاریخ ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ یہ تاریخ اسی سال ختم ہوئی اور مذکورہ بالا واقعات کے

---

[1] ملاحظہ ہو سرجان ملکم کی تاریخ ایران (لندن ۱۸۱۵ء جلد اول ص ۵۱۶-۵۱۵ ۱۲ مصنف

[2] احسن التواریخ میں اس کا سال ولادت ۹۳۸ھ مطابق ۱۵۳۱ء-۱۵۳۲ء دیا ہوا ہے ۱۲ مصنف

متعلق اس کے جو بیانات ہیں ان کا پایہ بہ اعتبار مستند ہونے کے بہت بلند ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بعض بیانات گنجلک اور مبہم ہیں اور دوسری تاریخوں مثلاً خلد بریں یا تاریخ عالم آرائے عباسی سے ان کی تصدیق اور تطبیق کی ضرورت ہی، لیکن اس کی وجہ یہ ہی کہ زمانہ پُرآشوب تھا اور حالات کچھ ایسی جلدی جلدی بدلتے رہتے تھے کہ ہر مصنف کو ان کا مطالعہ اور ان کے متعلق اظہار خیال احتیاط کے ساتھ کرنا پڑتا تھا، ورنہ جان کا اندیشہ تھا۔

قزوین میں سلیمان پاشا نے جو ابوسعید تیموری کا پرپوتا تھا۔ محمد خدا بندہ کی تہنیت میں حسب ذیل اشعار کہے:۔

شاہا در تو قبلۂ شاہانِ عالم است گردوں ترا مسخر و گیتی مسلم است
یکتا[1] شدست رشتۂ شاہی بدستِ تو الحمدللہ ارچہ کہ یکتاست محکم است

پری خان خانم کا قتل محمد خدا بندہ کے حکم سے خلیل خان افشار نے پری خان خانم، اس کے ماموں شمخال خان اور مرحوم شاہ اسمٰعیل ثانی کے خورد سال بچہ شاہ شجاع کو قتل کردیا۔ پری خان خانم ایک نہایت زیرک، عالی حوصلہ اور حسین شہزادی تھی، وہ طہماسپ کی محبوب دختر اور اس کی سرکیشیای بیوی کے بطن سے تھی۔[2] شاہ طہماسپ کے

---

[1] میرے خیال میں یکتا کا کنایہ اس طرف ہی کہ شاہ اسمٰعیل ثانی نے بقیہ شاہی خاندان کا خاتمہ کردیا تھا ۱۲ مصنف

[2] سرجان ملکم نے (تاریخ ایران، جلد اول ص۵۱۲ و ص۵۱۵) پری خان خانم اور اس کی ماں کے ناموں کو خلط ملط کردیا ہی، مثلاً وہ اس کے متعلق لکھتا ہی:۔
"مرحوم شاہ (طہماسپ) کی محبوب ملکۂ شمخال کی بہن" (بقیہ حاشیہ ص۱۶۰ پر ملاحظہ ہو)

انتقال کے بعد جو انتشار رو نما ہوا، اِس میں اس شہزادی نے بھی نمایاں حصّہ لیا تھا اور اگرچہ وہ ملکہ کے خطاب سے مخاطب نہیں ہوئی۔ لیکن دراصل اس کے دل میں حکومت کرنے کی بڑی آرزو تھی۔ ان سفاکانہ قتلوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ صفویہ کے شاہی خاندان میں سے صرف شاہ محمد خدا بندہ اور اس کے چار لڑکے حمزہ، عباس، ابو طالب اور طہماسپ باقی رہ گئے۔ حمزہ جسے اکثر مورخین شاہانِ صفویہ میں شمار کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے نابینا باپ کی زندگی میں کچھ دن فرائض شاہنشاہی ادا کیے تھے ۔۔۔ ۲۲۔ ذی الحجہ ۹۹۴ھ مطابق ۴ دسمبر ۱۵۸٦ء کو ایک نوجوان حجام خدا وردی[1] کے ہاتھ سے مارا گیا۔ چونکہ بڑا بیٹا عباس اب تک خراسان میں تھا، اس لیے ابو طالب ولی عہد سلطنت منتخب ہُوا لیکن عباس اپنے سرپرست اور اُستاد مرشد قلی خاں استاجلو کے ساتھ فوراً موقع پر آن موجود ہوا اور پہلے تو اس نے ان لوگوں کو عبرت ناک سزائیں دیں جو اس کے بڑے بھائی حمزہ کے قتل کی سازش میں شریک پائے گئے اور پھر اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں (ابو طالب اور طہماسپ) کو اندھا کرکے معذور کر دیا اور قلعہ الاموت میں نظر بند کر دیا[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حالانکہ تاریخ عالم آرائے عباسی میں اسے طہماسپ کی آٹھ بیٹیوں میں سے دوسری بیٹی کہا گیا ہے، لیکن دوسرے مورخین اسے شاہ اسمٰعیل اول کی پانچ بیٹیوں میں سے ایک بیٹی بتاتے ہیں یعنی طہماسپ کی بہن (ملاحظہ تصنیف ہذا کا حاشیہ صفحہ ۱۴۰) ڈان جوان ایرانی اسے (Infanta) کہتا ہے۔ ۱۲ مصنف

[1] ڈان جوان ایرانی اسے (Cudy de Lac) (ردلاک) لکھتا ہے ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو ڈان جوان ایرانی Don Juan of Persia Folio 107 b ۱۲ مصنف

شاہ عباس کبیر کی تخت نشینی ۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء　شاہ محمد خدا بندہ دس سال سریر آرائے مسندِ حکومت رہنے کے بعد ذی قعدہ ۹۹۵ھ (اکتوبر ۱۵۸۸ء) میں اپنے بیٹے عباس کو زمام سلطنت دے کر خود کنارہ کش ہوگیا، اور اسی سال شاہ عباس تخت ایران پر بیٹھا جس کی شان و شوکت میں اس کے قدموں کی برکت سے چار چاند لگتا تھے۔

وہ اور اس کے تینوں بھائی ایک ہی ماں کے بطن سے تھے جو مازندران کے مرعشی سادات کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اپنی نند پری خان خانم[1] کی طرح اس کی طبیعت میں بھی جذبۂ حکومت پسندی بہت تھا اور اس کا بھی انجام ویسا ہی افسوس ناک ہوا۔ چند قزلباش سرداروں نے جو اس کے مستبدانہ طور طریقوں، نیز اس کے کمزور طبیعت اور مرنجاں مرنج شوہر محمد خدا بندہ پر اس کا تسلط دیکھ کر اس سے خار کھاتے تھے، اسے، اس کی ضعیف العمر ماں اور اس کے خاندان اور وطن کے کئی لوگوں کو قتل کروا دیا۔ ان قزلباش سرداروں نے اپنے اس فعل کے لیے جو دلیل جواز پیش کی، وہ یہ تھی:-

فروغے نماند دراں خاندان　　که بانگ خروس آید از ماکیان[2]

محمد خدا بندہ کی سیرت　محمد خدا بندہ ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء-۱۵۳۲ء) میں پیدا ہوا۔ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء-۱۵۷۷ء) میں جب اس کے باپ طہماسپ

---

[1] اس موقع پر پروفیسر براؤن نے مصنف عالم آرائے عباسی کا ہم خیال ہو کر پری خان خانم کو شاہ اسمٰعیل اول کی بیٹی نہیں بلکہ شاہ طہماسپ کی دوسری بیٹی سمجھا ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ[1] صفحہ ۱۵۹ ۱۲ مترجم

[2] ضمیمہ روضۃ الصفا۔ ۱۲ مصنف

کا انتقال ہوا تو اس کی عمر ۴۶ سال کی تھی۔ اس نے اپنے بھائی اسمٰعیل کی موت کے بعد دس سال تک حکومت کی۔ اور تخت سے کنارہ کش ہونے کے بعد ۸ یا ۹ سال تک زندہ رہ کر ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء - ۱۵۹۶ء) میں انتقال کیا۔ رضا قلی خاں نے اپنے ضمیمہ روضۃ الصفا میں اس کی سیرت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا ہے:-

"وہ جملہ علومِ متداولہ میں دست گاہ رکھتا تھا اور اصابتِ فہم و رائے، حسنِ سیرت، باریک بینی، جود و کرم، انشاپردازی اور فصاحت میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ چونکہ وہ اسم بامسمےٰ "خدا بندہ" تھا، اس لیے انتظامِ سلطنت، جنگ، غضب اور سیاست ان سب موقعوں پر وہ انتہائی حلم سے کام لیتا تھا اور حتی الامکان کسی کے قتل کا حکم نہ دیتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خداوردی حجام پر پہلا وار اسی نے کیا لیکن یہ محض بہ اتباعِ حکمِ شریعت تھا۔ بصارت کی کمزوری کی وجہ سے اس نے کبھی دربارِ عام منعقد نہیں کیا۔ وہ خود زنانخانے میں رہتا تھا اور سیدہ (اس کی بیوی) اس کے احکام نافذ کرتی اور انصرامِ امور کے خیال سے خود ہی کاغذات پر مُہرِ شاہی ثبت کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ "پادشاہ درویش خصال" یا "درویش بادشاہ جلال" تھا"

اس کا مختصر عہدِ حکومت بھی، نہ صرف مصرحہ بالا المناک خانگی حالات کی وجہ سے، بلکہ ازبکوں، ترکوں، کریمیا کے تاتاروں، گرجیوں اور ان دوسرے خارجی دشمنوں کی وجہ سے پریشانی اور انتشار میں گزرا

جو شاہ طہماسپ کی موت کے بعد اندرونی کشت و خون اور خانہ جنگی میں ایران کی مصروفیت دیکھ کر اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔

شاہ عباس اعظم ۱۵۸۸ء تا ۱۶۲۹ء

شاہ عباس اول جسے عام طور پر اور بجا طور پر "کبیر" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء)[1] میں اپنی تخت نشینی کے وقت صرف ۱۶ یا ۱۷ سال کا تھا۔ اس نے ۴۳ قمری سال حکومت کی اور جمادی الاول ۱۰۳۸ھ مطابق جنوری ۱۶۲۹ء میں ۶۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ باتفاق رائے، اس کی حکومت کا زمانہ ہی وہ زمانہ خیال کیا جاتا ہے جس میں ایران کو جدید زمانہ میں سب سے زیادہ قوت، خوش حالی اور شان و شوکت نصیب ہوئی۔ شروع میں اس کے راستہ میں مشکلات اور خطرات بہت تھے۔ نہ صرف حسب دستور مغرب کی طرف سے عثمانی

اس کی تخت نشینی کے وقت ایران کی حالت

ترک اور مشرق کی طرف سے اُزبک ایران پر دانت لگائے ہوئے تھے، بلکہ اکثر صوبے بھی علم بغاوت بلند کر چکے تھے اور مختلف قبائل کے قزلباش سرداروں کی آپس کی رقابتوں اور حرص و آز کی وجہ سے ملک میں ہر طرف انتشار بپا تھا۔ ان سرداروں میں دو زبردست ترین مرشد قلی خاں اور علی قلی خاں تھے اور شروع میں نوعمر بادشاہ انھیں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہا۔ جب مرشد قلی خاں بادشاہ کو تخت نشین

---

[1] بقول صاحب عالم آرائے عباسی کے، اس کی ولادت یکم رمضان ۹۷۸ھ مطابق ۲۷۔ جنوری ۱۵۷۱ء یا ۹۷۹ھ کی یکم رمضان (۱۷۔ جنوری ۱۵۷۲ء) کو واقع ہوئی۔ اس کی تخت نشینی کا مادۂ تاریخی ظل اللہ سے نکلتا ہے ۱۲ مصنف
۹۹۶ھ

کرانے کے لیے اس کے ساتھ قزوین آیا تو اس نے علی قلی خان کو اُزبکوں
کی تاخت کی روک تھام کے لیے خراسان میں چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ
۹ ماہ تک ان کا مقابلہ کرنے کے بعد وہ ان کے ہاتھوں مارا گیا۔
عباس کو شبہ ہُوا کہ مرشد قلی خاں نے دیدہ و دانستہ اپنے حریف
(علی قلی خاں) کی امداد سے پہلوتہی کی۔ چنانچہ اسی شبہ پر اسے بھی
شاہ رود کی لشکرگاہ میں قتل کر دیا گیا اور بادشاہ کو اس کی "اتالیقی"
سے نجات ملی اور اب وہ نام ہی کا نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں بادشاہ
بنا۔ یہ دیکھ کر کہ بہ یک وقت ترکوں اور اُزبکوں دونوں کے خلاف
کامیابی سے جنگ کرنا مشکل ہے، شاہ عباس کبیر نے کمال دُور اندیشی
سے کام لے کر ترکوں سے ادنیٰ شرائط ہی پر صلح کر لی تاکہ یکسوئی کے
ساتھ اُزبکوں کی یورشوں کی روک تھام کی جا سکے اور ان شورہ پشت
قزلباش امرا کی رقابتوں کو دُور کرنے اور انھیں دبانے کی بھی کوئی
صورت نکلے، جنھوں نے اس کے حکم اور اس کی افواج کے ضبط و
انتظام کو معطّل بنا دیا تھا۔ ترکوں سے جن شرائط پر صلح کی گئی وہ یہ تھیں
ترکی سے صلح | آذربائیجان اور گرجستان کے وہ شہر و اضلاع جو ترکی
فوجوں نے ۱۲ سال سے زیادہ عرصہ تک (۹۸۵ھ تا ۹۹۸ھ مطابق
۱۵۷۷ء تا ۱۵۹۰ء) جنگ کرنے کے بعد فتح کیے تھے، ان کے حوالے
کر دیے گئے۔ ان میں حسب ذیل شہر شامل تھے:۔ تبریز، گنجہ، قارص
نخجوان، شکی، شماخی اور طفلس۔ ان کے علاوہ کردستان کا کچھ علاقہ بھی
ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔ پہلے تین خلفا ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ
پر تبرّا بازی بند کر دی گئی۔ شاہ عباس کے بھانجے، حیدر مرزا کو بطور

یرغمال سلطان کے پاس قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔ یہ شہزادہ عثمانی جنرل فرہاد پاشا کی معیت میں قسطنطنیہ گیا تھا اور دو سال بعد وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔

اُزبکوں کی تاخت اس کے بعد شاہ عباس نے شیراز، کرمان، گیلان اور خرم آباد (لُرستان) کو زیرِ نگین لانے اور یعقوب خاں ذوالقدر اور دوسرے سرکش امرا کو تنبیہ کرنے کی طرف توجہ کی۔ اس اثنا میں دوسری طرف سے عبدالمؤمن خاں اور اس کے اُزبک خراسان کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ چنانچہ شاہ عباس ان کی روک تھام کے لیے بڑھا۔ لیکن طہران پہنچ کر وہ شدید بخار میں مبتلا ہوگیا۔ ادھر وہ صاحبِ فراش تھا اور اُدھر وحشی اُزبک مشہد پر قبضہ کرنے کے بعد اسے خوب لُوٹ رہے تھے اور وہاں کے اکثر باشندوں کو قتل کر رہے تھے۔ ۱۰۰۲ھ (مطابق ۱۵۹۳ء-۱۵۹۴ء) میں سبزوار[۱] کی بھی یہی دُرگت بنی۔ لیکن اس واقعہ کے تین یا چار سال بعد[۲] اُزبکوں کے حاکم عبداللہ شاہ کا انتقال ہوگیا اور اس کے بیٹے (مذکورۂ الصدر عبدالمؤمن خاں) کو خود اس کی رعایا نے قتل کردیا۔ عین اسی موقع پر (اپریل ۱۵۹۸ء) شاہ عباس کی حالت سنبھل چکی تھی اور اب وہ کثیر فوج کے ساتھ اُزبکوں پر حملہ آور ہوا اور انھیں خراسان سے نکال باہر کیا اور برسوں کے بعد اب کہیں جاکر اس حصّۂ ملک کو امن

---

[۱] تاریخ عالم آرائے عباسی کا مصنف لکھتا ہے کہ سبزوار کے مقتولین میں، میں نے بچشم خود ایسی عورتوں کو دیکھا جن کی گودوں میں بچے تھے۔ ۱۲ مصنف

[۲] عالم آرائے عباسی کے مطابق ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء-۱۵۹۸ء) میں ۱۲ مصنف

و امان نصیب ہوا۔ جب شاہ عباس اس فتح کے بعد اسی سال کے موسم خزاں میں قزوین واپس ہوا اس نے وہاں دو مشہور اور قسمت آزما، انگریز بھائیوں

شرلے برادران (Sherley Brothers)

سر انتھونی شرلے (Sir Anthony Sherley) اور سر رابرٹ شرلے (Sir Robert Sherley) کو اپنا منتظر پایا جن کی سرگزشت کے افسانے آج تک کئی اعلیٰ درجہ کی تحریروں میں محفوظ ہیں[1]۔ ان لوگوں کے ہمراہ کئی درجن انگریز ملازمین وغیرہ بھی تھے جن میں سے کم از کم ایک شخص توپیں ڈھالنا جانتا تھا۔ ان سب نے ایرانی فوج کی تنظیم خصوصاً توپخانہ کی ترتیب اور انتظام میں شاہ عباس کو بڑی مدد دی اس لیے کہ توپ خانہ ہی کی کمی کی وجہ سے اب تک ایرانی ترکوں کا برابر سے مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اس کا جو اثر ہوا وہ Purchas's Pilgrims نے عجیب و غریب عبارت میں یوں لکھا ہے:—

---

[1] مثلاً

I. "The Sherley Brothers, an historical memoir of the lives of Sir Thomas Sherley, Sir Anthony Sherley, and Sir Robert Sherley, Knights, by one of the same house" (Eve-lyn Phillip Sherley, Roxburgh Club Chiswick, 1848).

II. The Three brothers, or the Travels and adventures of Sir A, Sir R, and Sir T. Sherley in Persia, Russia, Turkey, Spain etc. with portraits (Anon London, 1825).

"زبردست عثمانی جس کے خوف سے عیسائی دنیا کو تپ لرزہ
آتی تھی، اب خود "تپ شرلے" میں مبتلا ہے اور آنے
والے انجام بد کے آثار ابھی سے اُس پر ظاہر ہو رہے ہیں۔
آج کل کے ایرانی نے شرلے برادران کے فنون جنگ سیکھ
لیے ہیں جو پہلے گولے بارود کا استعمال تک نہ جانتا تھا۔
آج کل اس کے پاس ۵۰۰ برنجی توپیں اور ساٹھ ہزار
توڑے دار بندوقیں ہیں۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ وہ لوگ
جو پہلے بھی فن شمشیر زنی میں ترکوں کے لیے خطرناک تھے،
آج کل دُور کی مار اور گندھکی[۱] فنون کی وجہ سے اس
کے لیے اور بھی زیادہ خوفناک بن گئے ہیں"

فرقہ شاہ سیون کا وجود مذکورہ بالا تنظیم و ترتیب کے علاوہ اور بھی کئی ایسے اسباب تھے جنھوں نے ایرانی فوج کے ضبط و انتظام کو پہلے سے کہیں بہتر بنا دیا تھا، مثلاً حریص اور شورہ پُشت قزلباش سرداروں کا اخراج، ایک مخلوط قبائلی فوج کی تاسیس جس کا نام شاہ سیون تھا یعنی "جاں نثارانِ شاہ" اور جس کا مرکزِ اتحاد قبائلی تعلقات نہیں، بلکہ وفاداری شاہ تھی، نیز ترکی "جاں نثاری" فوج سے ملتی جلتی ایک باقاعدہ پیدل پلٹن کی ترتیب۔

ترکوں کے خلاف کامیاب جنگیں شاہ طہماسپ کی موت کے بعد ترکوں نے جو صوبے ایرانیوں سے زبردستی چھین لیے تھے، ان کو دوبارہ حاصل کرنے کی آرزوئیں تو شاہ عباس کو برسوں سے

---

[۱] یعنی گولے بارود کا فن۔ ۱۲ مصنف

تھی، لیکن ایک یا دو سال بعد اس کو عملی جامہ پہنانے کا موقع بھی مل گیا۔ ترکی میں کمزور سلطان محمد ثالث کا دورِ حکومت ختم ہو رہا تھا، آسٹریا کے ساتھ طویل المدت لڑائیوں اور ایشیائے کوچک میں جلالی[1] بغاوت نے ترکی کو پہلے ہی سے کمزور بنا دیا تھا کہ اتنے میں ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء-۱۶۰۳ء) میں شاہ عباس نے اپنا حملہ شروع کر دیا۔ ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۳ء-۱۶۰۴ء) میں ایرانیوں نے "توپوں کی مدد سے، جنھیں ایرانی ایک عرصہ سے یہ سمجھ کر استعمال نہ کرتے تھے کہ وہ بہادروں کے شایانِ شان نہیں ہیں، دوبارہ تبریز کو ترکوں سے چھین لیا۔ اس کے دو سال بعد، مشہور زمانہ ترکی جنرل چغالہ زادہ سنان پاشا (Cicala) کو سلماس کے قریب بُری شکست ہوئی اور وہ پسپا ہوکر وان اور دیار بکر تک پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا جہاں اس شکست کی کوفت سے وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اسی زمانے میں ایرانیوں نے بغداد اور شیروان پر دوبارہ قبضہ کرلیا، لیکن بغداد کی قسمت نے شاہ عباس کی زندگی میں کئی مرتبہ پلٹے کھائے۔ ۱۶۲۵ء میں جب ایرانیوں کا اس پر پھر قبضہ ہوگیا تو اس واقعہ کے متعلق حافظ پاشا اور سلطان مراد چہارم نے ایک دوسرے کو کچھ اشعار لکھے تھے جو تاریخ ادبیات ترکی میں کسی قدر

---

[1] منجم باشی نے (صحائف الاخبار کا ترکی ترجمہ، مطبوعہ قسطنطنیہ، ۱۲۸۵ھ جلد سوم ص۴۷۱) نے اس ملحد شخص جلال کے حالات لکھے ہیں۔ ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۱۹ء میں بمقام سیواس وہ اور اس کے متعدد ساتھی قتل کر دیے گئے تھے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد ایک صدی تک اس کے قائم کیے ہوئے جلالی فرقہ میں جان باقی رہی۔ ۱۲ مصنف

مشہور ہوگئے ہیں۔[1]

اس زمانے کے فارسی وقائع میں ان جنگوں کا خشک اور غیر دلچسپ بیان

جہاں تک مجھے علم ہے، ترکوں، اُزبکوں اور گرجیوں کے ساتھ ایرانیوں کی ان لڑائیوں کا کوئی مربوط اور ناقدانہ بیان اب تک نہیں لکھا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی مؤرخ جو ترکی اور فارسی دونوں زبانوں سے واقف ہو، اس کام کو کرنا چاہے تو اس کے لیے مواد بہ افراط موجود ہے۔ تاریخ عالم آرائے عباسی اور دوسرے معاصر وقائع میں ان فوجی کارروائیوں کے حالات کی اتنی کثرت ہے کہ اس شخص کے لیے جو فوجی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، ان کا پڑھنا بہت ہی خشک اور مشکل کام ہے۔ اور اگر فوجی تاریخ کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو معمولی جزئیات کی کثرت اور بیان میں وسعت نظر اور وضاحت کی کمی نے ان کی قدر و قیمت کو بہت ہی کم کر دیا ہے۔ بہت سے ایسے واقعات جن کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق ہر شخص کو قدرتی طور پر ہوتا ہے؛ ان میں سرے سے بیان ہی نہیں کیے گئے ہیں اور ایسے حصّے جن سے اس زمانے کی مذہبی اور معاشرتی حالت پر کچھ روشنی پڑ سکے تو شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ مارچ ۱۶۲۲ء میں متحدہ انگریزی اور ایرانی افواج نے خلیج فارس کے جزیرہ ہرمز کو دوبارہ پرتگالیوں سے چھین لیا تھا، چنانچہ اس واقعہ کی تفصیل اس زمانے کی انگریزی تحریروں میں بہت ملتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو گبؔ کی تاریخ ادبیات ترکی جلد سوم ص۲۴۵۔ ص۲۵۱۔ اشعار کے لیے ملاحظہ ہو جلد ششم ص۱۹۔ ص۱۹۱۔ ۱۲ مصنف

شاہ عباس کی سیرت اور اس کی تشکیلات[1] یہ تو ہم اس تصنیف کے پہلے ہی باب[2] میں بتا چکے ہیں کہ شاہ عباس کے زمانے میں اصفہان کی شان و شوکت اور خوش حالی معراج کمال تک پہنچ گئی تھی اور غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری کے ساتھ وہ پیش آتا تھا، اس کی وجہ سے ایران میں غیر ملکی سیاست دانوں، تاجروں اور مبلّغوں کی کتنی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی کی پہلی جلد میں جو اس کے عہد کے متعلق مستندترین تاریخ ہی، ان سب باتوں کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہی۔ اس کتاب کا تقریبًا نصف ایک مقدمے پر مشتمل ہی جس میں بارہ مقالے ہیں۔ پہلا مقالہ جس میں شاہ عباس کے اسلاف اور پیش رووں کا ذکر ہی سب سے زیادہ طویل ہی اور میرے نسخے میں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہی۔ دوسرے مقالات اگرچہ اس سے بہت زیادہ مختصر ہیں اور بعض تو صرف ایک یا دو صفحوں کے ہیں، لیکن ان میں تحقیق کا دخل زیادہ ہی۔ ان میں حسب ذیل حالات بیان کیے گئے ہیں:-

شاہ عباس کا مذہبی شغف، اس کی اصابتِ فہم اور وسعتِ معلومات، "صاحب قران" کے لقب سے ملقب ہونے کی وجہ، اکثر موقعوں پر خطرات اور مشکلات سے معجز نما طریقے پر نجات، مدبّرانہ انتظام مملکت اور قیامِ امن کی تدابیر، اس کی سخت مزاجی، مذہبی بنائیں اور خیراتی عطایا، اس کے زمانے کے مشاہیر امرا، علما وزرا، اطبا، خطّاط، نقّاش، منبت کار، شعرا اور مغنیوں کا بیان وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] جدید فارسی میں یہ لفظ انگریزی Institution کے معنوں میں مستعمل ہی۔ ۱۲ مترجم

[2] ملاحظہ ہو صفحہ [illegible]

سخت مزاجی اور سخت گیری

اس کی سخت مزاجی کے بیان میں (مقالہ چہارم) مصنف کتاب اسکندر منشی لکھتا ہی:-

"اگر بادشاہ کسی کو حکم دے تو اس کی مجال نہیں ہی کہ اس کی بجا آوری میں ایک لمحہ کا بھی توقف کرے، مثلاً اگر وہ باپ کو بیٹے کے قتل کا حکم دیتا تو حکم قضا کی طرح اس کی تعمیل فوراً کی جاتی اور اگر باپ محبت پدری یا کسی اور وجہ سے مجبور ہو کر ذرا بھی توقف کرتا تو حکم برعکس ہو جاتا[1] اور اگر بیٹا بھی کسی قدر تامل کرتا تو ایک تیسرا شخص ان دونوں کا کام تمام کر دیتا۔ اس قسم کی دہشت ناک سختیوں کی وجہ سے بادشاہ کے احکام کی تعمیل کمال عمدگی کے ساتھ ہونے لگی اور اس کے حکم قضا شیم کی بجا آوری میں کسی کو ایک لحظہ کے تامل کا بھی یارا نہ رہا۔

قتل گاہ میں موجودگی لازمی قرار دی گئی

اس نے اپنے عمال کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر قتل کے موقع پر قتل گاہ میں حاضر رہیں ورنہ خود انھیں سزائے موت دی جائے گی۔ ہر صوبے کا گورنر اور مقامی فوجدار اپنے تحت کے اضلاع کی شاہراہوں کے امن و امان کا ضامن اور ذمہ دار قرار دیا گیا۔ دروغ گوئی کی سزا تو وہ اس تشدد کے ساتھ دیتا تھا کہ لوگوں کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ اگر کسی نے بادشاہ کے سامنے ذرا بھی غلط بیانی کی تو اسے فوراً عالم ملکوتی کی طرف سے اس کی اطلاع ہو جائے گی۔ ایک طرف تو

---

[1] یعنی بیٹے سے کہا جاتا کہ باپ کو قتل کر دو۔ ۱۲ مترجم

یہ سختیاں تھیں لیکن دوسری طرف وہ اکثر موقعوں پر اپنے درباریوں اور ندیموں کے ساتھ بہت دوستانہ اور بے تکلفی کا برتاؤ کرتا تھا، ان کے حفظ مراتب کا پاس اور جائز حقوق کا خیال رکھتا تھا اور جو کوتاہیاں ان سے اتفاقیہ اور غیر ارادی طور پر سرزد ہو جاتیں، ان سے چشم پوشی کرتا تھا۔ اگرچہ دعوتوں کی شرکت اور شراب نوشی کی رنگ رلیوں سے اسے کوئی خاص پرہیز نہ تھا لیکن اپنے ہمسایہ تاجداروں اور مملکتوں کے صحیح صحیح حالات سے باخبر رہنے کا اسے خاص طور پر اہتمام مدنظر تھا اور اسی وجہ سے اس نے خاص توجہ سے اپنی سلطنت کے محکمہ خبر رسانی کو ترقی دی تھی۔ علم السنہ سے بھی اسے کسی قدر مناسبت تھی اور شعر فہمی کے علاوہ وہ خود بھی کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔

شاہ عباس "درشتی و نرمی بہم در بہ است" کا مصداق تھا

جو شہر اور اضلاع اس کی دریا دلی سے سب سے زیادہ متمتع ہوئے ان میں اس کے دارالسلطنت اصفہان کے علاوہ حسب ذیل شہر تھے: مشہد اور وہاں کا روضہ امام علی رضا (امام ہشتم) جسے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وحشی اور متعصب ازبکوں کی لوٹ اور غارتگری سے بچا کر اس نے نہایت شاندار بنا دیا تھا، اردبیل جو اس کا آبائی وطن تھا، قزوین جو پہلے صفویہ کا دارالخلافت رہ چکا تھا، کاشان جس کے پاس اس نے ایک مشہور بند، بند کوہ رود تیار کرایا، استرآباد، تبریز، ہمدان اور صوبہ مازندران۔ مازندران اس کی محبوب اقامت گاہ تھا۔ یہاں

شہروں پر خاص نظرِ عنایت تھی

اس نے کئی عالی شان قصر تعمیر کرواکر اس کی رونق کو دوبالا کیا اور وہ پختہ اور بلند سڑک بنوائی جو استرآباد سے اشرف گئی ہی اور جس کا بیان لارڈ کرزن نے ایران کے متعلق اپنی زبردست تصنیف میں کیا ہی[1]۔

اس کی فتوحات | اس کی فتوحات کا ایک اجمالی خاکہ یہ ہی کہ اس کی فوجیں شمال مشرق میں مرو، نسا، ابی وَرد، اندہ خود یہاں تک کہ بلخ تک اور شمال مغرب میں نخجوان، اِروان، گنجہ، طفلس، دربند اور باکو تک پہنچ گئی تھیں۔

اس کے عہد کے مشاہیر | اسکندر منشی جس نے اپنی تاریخ کے خاتمہ کا سال بتکرار ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء بتایا ہی، ہر قسم کے بےشمار مشاہیر کا ذکر کرتا ہی، لیکن ہماری رائے میں ان سب کا نام گنوانے سے کوئی خاص فائدہ مترتب نہ ہوگا تاہم علما اور مجتہدین میں سب سے مشہور ہستیاں یہ تھیں:۔

میر محمد داماد اور شیخ بہاء الدین عاملی؛ خطاطوں میں مولانا اسحاق سیاؤشانی، محمد حسین تبریزی، میر معزی کاشی، میر صدرالدین محمد وغیرہم خاص طور پر مشہور اور ممتاز تھے؛ صناعوں اور تصویر سازوں میں مظفر علی، زین العابدین، صادق بیگ اور عبدالجبار خاص پایہ کے لوگ تھے، شاعروں میں ضمیری، محتشم، ولی، وحشی، خواجہ حسین، میر حیدر معمائی، ططے فور اور اس کا بھائی داعی، والہ، ملک قمی، حاتم کاشی صبری روز بہانی، حسابی، قاضی نور اصفہانی حالتی، ہلاکی، نظہری

[1] Persia Vol. I pp. 376-8 etc. ۱۲مصنف

کشمیری اور قزوینی شعرا مثلاً فروغی، تجلی، سلطان الفقرا، کاکا اور شرمی خاص طور پر مشہور تھے۔ مغنیوں اور سرود نوازوں میں حافظ احمد قزوینی، حافظ جلاجل باخرزی، حافظ مظفر قمی، حافظ ہاشم قزوینی مرزا محمد کمانچئی، استاد محمد مومن، استاد شاہ سوار چہار تاری، استاد شمس تنبور غوی ورامینی، استاد معصوم کمانچئی، استاد سلطان محمد طنبوری، مرزا حسین طنبوری، استاد سلطان محمد چنگی وغیرہم[۵۱] تھے۔ ان کے علاوہ قصہ خوانوں اور شاہ نامہ خوانوں میں حیدر، محمد خرسند، اور فتحی مشہور تھے۔ محمد خرسند اور فتحی دونوں بھائی تھے اور خراسان کے رہنے والے تھے۔ میں نے اس آخر الذکر گروہ یعنی مغنیوں، سرود نوازوں اور موسیقی دانوں کے نام محض اس لیے تفصیل کے ساتھ نقل کیے ہیں کہ ان غریبوں کی شہرتیں بہت عارضی ہوا کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان ناموں سے کم از کم یہی معلوم ہو جائے گا کہ شاہ عباس کے دربار میں موسیقی کے کن کن شعبوں کی قدر افزائی خاص طور پر ہوتی تھی۔

شاہ عباس کے دامنِ شہرت کا سیاہ ترین داغ۔

اس میں تو کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ شاہ عباس ہر حیثیت سے "کبیر" کے لقب کا مستحق تھا، باقی رہیں اس کی سخت گیریاں تو یورپی مورخین مثلاً سر جان ملکم[۵۲] وغیرہ نے بھی، اگرچہ ان سے بالکل ہی چشم پوشی نہیں کی ہے لیکن دبی زبان سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس کے

---

۵۱ کمانچہ، چہار تار، طنبورہ یہ سب باجوں کے نام ہیں، تنبور غوی، ایک خاص قسم کا بگل بجانے والا ہوتا ہے۔ چنگ بھی باجے کا نام ہے۔ ۱۲ مصنف

۵۲ تاریخ ایران (طبع ۱۸۱۵ء) جلد اول ص ۵۵۵ - ص ۵۵۶ ۱۲ مصنف

عہدِ حکومت کی اس شاندار تاریخ میں، جس کا خاتمہ اوائل ۱۶۲۹ء میں اس کے انتقال کے ساتھ ہوا، ایک سیاہ صفحہ بھی نظر آتا ہے، یعنی اپنے سب سے بڑے لڑکے صفی مرزا کو قتل کرانا، دوسرے لڑکے خدا بندہ مرزا کی آنکھیں نکلوانا۔ اور اسی سلسلہ کے دوسرے المناک واقعات[1]۔ ۱۶۲۹ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا پوتا سام مرزا اپنے بدنصیب باپ کے نام یعنی شاہ صفی اول کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

مسلمانوں میں ایک نہایت مشہور روایت ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو باری تعالیٰ کی طرف سے پیغام قضا پہنچا تو آپ ایک عصا سے سہارا لگائے ہوئے کھڑے تھے، عین اسی حالت میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ لیکن جو اجنہ آپ کے حکم سے مسجد سلیمانی کی تعمیر میں مصروف تھے، انھیں ایک سال تک آپ کی موت کی مطلق خبر نہ ہوئی یہاں تک کہ عصا کو دیمک چاٹ گئی اور آپ کا جسم زمین پر آرہا۔ یہ روایت اس یک صدسالہ صفوی دَورِ حکومت پر بھی صادق آتی ہے جو شاہ عباس کبیر کے انتقال کے بعد سے شروع ہوا۔ شاہ عباس نے اپنی قوت اور حسنِ تدبیر سے ایران کے لیے امن و امان اور ظاہری خوش حالی اور فارغ البالی کا ایک ایسا دَور شروع کر دیا تھا کہ محض اسی کے نفوذ و سطوت کی وجہ سے اس کے جانشین کامل ایک سو سال تک اپنی نالائقی اور نا اہلی کے نتائج بد دیکھنے سے بچے رہے۔ افغانی حملے کے وقت تک جس نے ۱۷۲۲ء

---

[1] تاریخ ایران (طبع ۱۸۱۵ء جلد اول صفحہ ۵۶۰۔ صفحہ ۵۶۵۔ ۱۲ مصنف

شاہ عباس کبیر کے جانشین

میں صفویہ کا چراغ ہی گل کر دیا، عباس کے خاندان کے چار تاجدار یکے بعد دیگرے تخت ایران پر بیٹھے، یعنی اس کا پوتا شاہ صفی جس کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے، ۱۶۲۹ء تا ۱۶۴۲ء، اس کا پرپوتا شاہ عباس ثانی ۱۶۴۲ء۔۱۶۶۶ء شاہ عباس ثانی کا لڑکا صفی جو بعد کو سلیمان کے نام سے تخت نشین ہوا ۱۶۶۶ء سے ۱۶۹۴ء تک اور صفی کا لڑکا شاہ حسین، ۱۶۹۴ء سے ۱۷۲۲ء تک)۔ عباس کبیر کے بیٹے اور جانشین شاہ صفی کے متعلق

شاہ صفی ۱۶۲۹ء۔۱۶۴۲ء

کروسن سکی (Krusinski) خون آشام اور ظالم بادشاہ تھا کہتا ہے[1]:۔

"یہ امر یقینی ہے کہ ایران میں اس کے عہد سے زیادہ خونریز اور ظالمانہ کوئی عہد حکومت کبھی نہ ہوا ہوگا"

اور اس کے زمانے کو "مظالم کا ایک لا تناہی سلسلہ" بتاتا ہے۔ ہین وے Hanway اس کے متعلق لکھتا ہے[2]:۔

"وہ انتظام سلطنت کی طرف سے اتنا بے پروا تھا کہ اگر اس کے ظلم وستم کے متعدد واقعات نہ پیش آتے رہتے تو ایرانیوں کو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ ان کا کوئی بادشاہ بھی ہے یا نہیں"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:۔

---

[1] انگریزی ترجمے کا صفحہ ۲۷ (طبع لندن ۱۷۲۸ء) ۱۲ مصنف

[2] انقلاب ایران (Hanway) Revolution in Persia (طبع لندن ۱۷۵۳ء) جلد اول صفحہ ۲ ۱۲ مصنف

"اس نے اپنے دو اہم ترین سرحدی شہر قندھار اور بغداد (Babylon) محض اپنی حماقت سے کھو دیے"

شاہ عباس ثانی ۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۶ء

لیکن شاہ صفی کے جانشین شاہ عباس ثانی کے متعلق کروسن سکی (Krusinski) کی رائے ہے کہ[1]:-

"شاہانِ صفویہ میں اسمٰعیل اول اور شاہ عباس کبیر کے بعد اس سے بہتر بادشاہ ایران کو نصیب نہیں ہوا"

اگرچہ وہ بھی اپنے پیش رو اور باپ کی طرح

"شراب کا بڑا دھتی تھا اور بعض مظالم بھی اس نے کیے لیکن بجز چند الزامات کے جو اس پر واقعتاً عاید ہو سکتے ہیں اور دوسری حیثیتوں سے وہ ہر طرح تاج شاہی زیب سر کرنے کا اہل تھا"

یہی جے سوایٹ (Jesuit) آگے چل کر لکھتا ہے:-

"جیسے جیسے اس کی حکومت کا زمانہ گزرتا گیا، رعایا کی محبت اس کے ساتھ زیادہ ہوتی گئی اور اس کی ہمسایہ سلطنتیں اس سے مرعوب ہونے لگیں۔ وہ انصاف پسند تھا اور ان عمال یا عہدہ داروں کے ساتھ جو اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر رعایا کو ستاتے تھے وہ کسی قسم کی رعایت نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ٹے ورنیر (Tavernier) کی کتاب میں اس کی کئی شہادتیں مل سکتی ہیں۔ وہ بہت

---

[1] انگریزی ترجمے کا صفحہ ۴۹ (طبع لندن ۱۷۲۸ء)

عالی ظرف اور شریف النفس تھا - اجنبیوں پر بڑا مہربان تھا
وہ علانیہ عیسائیوں کی حمایت اور حفاظت کرتا تھا اور
کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں محض ان کے مذہب کی وجہ
سے ستائے - وہ کہا کرتا تھا کہ " سوائے خدا کے اور کسی
کو اُن کے ضمیر پر کوئی حق حاصل نہیں ہے - میں صرف
ظواہر پر حکومت کرتا ہوں - میری سب رعایا اس حیثیت سے
کہ سبھی ارکانِ سلطنت ہیں، برابر ہے اور خواہ ان کا مذہب
کیسا ہی بُرا کیوں نہ ہو میرا فرض ہے کہ سب سے یکساں
سلوک کروں "

لیکن شاہ عباس ثانی کی حکومت، خاندان صفویہ کے چراغ سحری کی
آخری بھڑک تھی اس لیے کہ بقول کروسن سکی (Krusinski)

سلیمان ۱۶۶۶ء تا ۱۶۹۴ء ظالم اور عیاش تھا

کے[1] :- اُس کا بیٹا سلیمان اپنے باپ کی
خوبیوں سے بالکل معرا تھا، ہزارہا " مظالم جن کے بیان
کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوجائیں " اس کے عہد کی خصوصیت
خاصّہ تھے - جب وہ نشہ یا غصّہ میں ہوتا تو اس کے
مقربین بارگاہ میں سے کسی کی جان و مال کی خیر نہ ہوتی
تھی - وہ اپنی طبیعت کی ذرا ذراسی لہر پہ لوگوں کی آنکھیں
نکلوالیتا تھا اور انھیں بے دریغ قتل کرادیتا تھا "
بزم نشاط کے ابتدائی دور میں جو شخص اس کا سب سے

---

[1] انگریزی ترجمہ کا ص۵۷ - ص۵۸ - ۱۲ مصنف

زیادہ منظورِ نظر ہوتا، وہی آخر میں اس کا شکار بنتا۔ یہ ہے اس کی سیرت کا بیان جو سر جان شاردن (Sir John Chardin) سے جو ایک حد تک ان واقعات کا عینی شاہد رہ چکا ہے، ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے روبرو جانے سے لوگ اس قدر خائف رہا کرتے تھے کہ اس کے دربار کے ایک بڑے امیر کا بیان ہے کہ جب میں اس کے پاس سے واپس آتا ہوں تو ٹٹول کر دیکھ لیتا ہوں کہ میرا سر اپنی جگہ پر سلامت ہے کہ نہیں۔ ایران کا زوال دراصل اسی بادشاہ کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس کے خیالات منصبِ شاہی کی اہمیت اور ذمہ داری کو دیکھتے ہوئے اتنے "غیر شاہانہ" تھے کہ ایک موقع پر جب اس کی خدمت میں یہ عرض کیا گیا کہ ترک نصاریٰ سے صلح کر چکے ہیں، اور اگر آپ نے ان کی قوت کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ کی تو وہ عنقریب آپ کے بہترین صوبوں پر قابض ہو جائیں گے تو اس کا جواب اُس نے کمال بے اعتنائی سے یہ دیا کہ وہ میرے لیے صرف اصفہان چھوڑ دیں، باقی جو اُن کا جی چاہے کریں، مجھے مطلق پروا نہیں ہے۔

شاہ حسین (۱۶۹۴ء تا ۱۷۲۲ء قتل ۱۷۲۹ء۔ کمزور طبیعت، پابند شرع بادشاہ تھا)

شاہ حسین جو خاندانِ صفویہ کا آخری تاجدار کہا جا سکتا ہے (اس لیے کہ اُس کے برائے نام جانشین طہماسپ ثانی اور عباس سوم نادر شاہ کے

ہاتھ میں نری کٹھ پتلیاں تھے)، مزاج کے اعتبار سے اپنے پیش رووں سے بہت مختلف تھا، اس کی طبیعت میں رحم اور رقیق القلبی اتنی غالب تھی کہ "وہ کسی قسم کا تشدد خواہ وہ کتنا ہی معمولی اور کیسا ہی ضروری کیوں نہ ہو، نہیں کرسکتا تھا"[۱]۔ ایک دن اتفاق سے اس کے طمنچے سے ایک بط زخمی ہوگئی تو:-

"اس پر ایسی دہشت طاری ہوی جیسے کہ اس نے کسی انسان کا خون کیا ہو۔ چنانچہ اس کے منہ سے بے ساختہ وہی جملہ نکلا جو عام طور پر ایران میں انسان کا خون گرانے کے بعد کہا جاتا ہے: یعنی "قان لو اولدم" (میں خون سے نجس ہوگیا) اور اپنے اس فرضی گناہِ کبیر کے کفارے میں اس نے اسی وقت دو سو تومان فقرا اور مساکین کو تقسیم کیے"۔

وہ کسی حد تک عالم اور فقیہ بھی تھا۔ ملاؤں کا اثر اس پر بہت زیادہ تھا۔ اپنے فرائض مذہبی کی ادائی اور تلاوتِ قرآن کا اتنا پابند تھا کہ لوگوں نے اسے مذاق سے "ملا حسین" کہنا شروع کردیا تھا[۲]۔ اگرچہ شروع میں وہ شراب سے بالکل محترز تھا، لیکن بعد کو بادہ آشام درباریوں اور جاہ طلب خواجہ سراؤں نے اس کی دادی کو شہ دے کر اس پر زور ڈالا اور آخرکار اس نے "آبِ حرام" کو منہ لگا ہی لیا۔ رفتہ رفتہ اُسے اس کی ایسی لت ہوئی کہ:-

---

[۱] کروسن سکی۔ انگریزی ترجمہ ص۱۰۰۔ ص۱۰۱ ۱۲ مصنف

[۲] کروسن سکی۔ انگریزی ترجمہ ص۱۰۲ ۱۲ مصنف

"وہ کام کا ذکر تک گوارا نہ کرتا تھا، بلکہ ہر بات اپنے
وزیروں اور خواجہ سراؤں کے فیصلے پر چھوڑ دیتا تھا۔ یہ
لوگ سیہ و سفید کے مالک تھے اور چونکہ ان کا سابقہ
ایک ایسے کمزور بادشاہ سے تھا جو عرائض کو بغیر پڑھے
ہوئے ان کے حوالے کر دیتا تھا، اس وجہ سے وہ اور
بے باک ہو گئے تھے"

ہماری اس تصنیف کا تعلق چونکہ خاص طور پر فارسی ادبیات سے ہے اور ایرانی تاریخ کے ساتھ اس کا تعلق محض ضمنی اور بجز ان چند خاص خاص دوروں کے جن میں ایرانی قوم کے زاویۂ نگاہ میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی، محض عام اور سرسری ہے۔ اس لیے اس موقع پر صفویہ کے آخری دور کی تاریخی بحثیں ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس عجیب و غریب خاندان کے عروج و زوال۔ اور اس زمانے میں ایران کی جو کچھ حالت تھی، اس کے متعلق انگریزی خواں حضرات کے سامنے پہلے ہی سے کئی اعلیٰ درجے کے وقائع موجود ہیں۔ ان میں سے ہم حسب ذیل کتب تاریخ و وقائع کے مطالعہ کی خاص طور پر اپنے ناظرین سے سفارش کرتے ہیں۔

اس زمانے کے متعلق بہترین معاصر وقائع | آدم اولی ایریس (Adam Olearius) اس سفارت کا سکرٹری تھا جو فریڈرک ڈیوک آف ہولسٹائن (Fredrick Duke of Holstain) کی جانب سے روس اور ایران بھیجی گئی تھی، اس کی کتاب "Voyages and Travels" (سفر بحر و بر)

ابتداً لاطینی زبان میں تھی، بعد کو اس کا فرانسیسی ترجمہ ہوا اور پھر جان ڈے ویس (John Davies) نے فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ میں نے جس انگریزی ترجمے سے استفادہ کیا ہے وہ ۱۶۶۹ء کا مطبوعہ ہے، اولی اے ری یس، یا اوائل نشلے گر (Oel Schlager) (یہی اس کا اصل نام تھا) ایک نہایت محتاط محقق تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں اسے کافی دستگاہ تھی۔ سترھویں صدی عیسوی میں ایران کی تاریخ پر یہ تصنیف اپنے زمانے کی بہترین تصانیف میں سے ہے۔

اولی اے ری یس (Olearius) ۱۶۳۶ء۔ ۱۶۳۸ء

لا پیری رے فائیل ڈو مانس (La Pere Raphael du Mans) جو کاپوشی ان (Capuchin) مشن[1] متعینہ اصفہان کا صدر اعلیٰ تھا، ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوا، وہ ۱۶۴۴ء میں ایران گیا تھا اور وہیں ۱۶۹۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی تصنیف Estat de la Perse en 1660 (۱۶۶۰ء میں ایران کی حالت) ہے جس کا ایک اڈیشن، ایم ۔شے فر (M Schefer) نے پیرس سے ۱۸۹۰ء میں شایع کیا ہے۔ اس میں اولی اے ری یس (Olearius) کے زمانے کے بعد کی

رے فائیل ڈو مانس (Raphael du Mans) ۱۶۴۴ء تا ۱۶۹۹ء

[1] ان کا تعلق سینٹ فرانسس (St. Francis) کے حلقہ مریدین سے ہے ان کے حلقے کا امتیازی لباس ایک روئی دار کنٹوپ (Capuchon) ہوتا تھا۔ یہ برہنہ پا رہتے ہیں، خاکستری رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں اور ڈاڑھیاں نہیں منڈواتے ۱۲ مترجم

ایرانی تشکیلات و ادارات کا بیان دیا ہے جو اگرچہ کچھ ایسا زیادہ دلچسپ نہیں، لیکن مفید بہت ہے۔

شاردن (Chardin) ۱۶۶۴ء تا ۱۶۷۷ء

شاردن (Chardin) جو نائٹ بھی تھا ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا وہ دو مرتبہ ایران گیا اور ہر مرتبہ چھ سال تک وہاں مقیم رہا (۱۶۶۴ء تا ۱۶۷۰ء اور ۱۶۷۱ء تا ۱۶۷۷ء)۔ آخرکار وہ ۱۶۸۱ء میں لندن میں رہ پڑا اور یہیں ۱۷۱۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی کتاب Voyages en perse (سفرِ ایران) کے متعدد اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ میں نے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے وہ ایک فاضل شخص لینگ لے (Langles) کا مرتّب کردہ ہے جو پیرس سے ۱۸۱۱ء میں دس جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ آخری جلد میں فاضل مرتب نے ص ۱۵۱ سے ص ۲۴۴ تک "Notice Chronologique de la Perse" (سن واری فہرست واقعات ایران) کے عنوان سے فتح علی شاہ قاچار کے زمانے تک کے حالات نہایت قابلیت اور جامعیت کے ساتھ سن وار بیان کیے ہیں۔

شیخ علی حزیں ۱۶۹۲ء-۱۷۷۹ء

شیخ علی حزیں جو خود کو صفویہ کے مورثِ اعلیٰ شیخ صفی الدین کے مرشد شیخ زاہد گیلانی کی اولاد کہتا ہے ۱۶۹۲ء میں اصفہان میں پیدا ہوا اور ۱۷۳۴ء تک یعنی جس سال وہ ایران کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر ہندوستان چلا گیا، اسی شہر میں مقیم رہا۔ اس نے ۱۷۴۲ء میں اپنی ایک سوانح عمری بھی لکھی تھی جسے

ف۔س۔ بالفور F. C. Balfour نے اصل فارسی میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۳۰ء۔۱۸۳۱ء میں شایع کیا ہے۔ شیخ علی حزیں کا انتقال بنارس میں ۱۷۷۹ء میں بہت کبرسنی میں ہوا۔ اگرچہ وہ خود اس تباہی میں گرفتار رہ چکا تھا جو ۱۷۲۲ء میں اصفہان پر آئی تاہم محاصرۂ افغانان اور باشندگان شہر کے مصائب کا جو بیان اس نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے وہ وضاحت اور تاثیر کے اعتبار سے کروسن سکی اور دیگر یورپی شاہدوں کے بیانات سے بہت پیچھے ہے۔ بہرحال جس چیز نے اس کی خود نوشتہ سوانح عمری کو خاص طور پر وقیع اور اہم بنا دیا ہے وہ اس کے معاصر مدبّرین، فقہا اور شعرا کا حال ہے، جو اس میں دیا ہوا ہے۔

کروسن سکی ۱۷۰۰ء۔۱۷۲۲ء (Krusinski)	فادر (Father) کروسن سکی اصفہان کے جے سوائٹ (Jesuit)

باشندوں کے مختار عام تھے اور ۱۷۲۲ء سے اٹھارہ یا بیس سال پہلے سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے ایک لاجواب کتاب History of the Revolution of Persia (تاریخ انقلاب ایران) لکھی ہے جو خاندانِ صفویہ کے آغاز سے ۱۷۲۲ء تک کے حالات پر حاوی ہے اور جس میں حملۂ افغانان اور اس کے اثرات بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

ہَین وے (Hanway) ۱۷۴۳ء۔۱۷۵۰ء	جوناس ہین وے (Jonas Hanway) ۱۷۴۳ء۔۱۷۴۴ء میں ایران میں تھا۔ اس نے ۱۷۵۳ء میں ایک کتاب "An Historical

Account of the British Trade over the Caspian Sea, with a Journal of Travels"

(بحیرہ خزر میں انگریزی تجارت کا تاریخی بیان مع روز نامچہ سفر) دو جلدوں میں لکھ کر شایع کی ہے۔ اس کتاب کے ضمیمہ کے طور پر اس نے Revolution of Persia (انقلاب ایران) کے نام سے ایک اور کتاب دو جلدوں میں لکھی ہے۔ پہلی جلد میں "شاہ سلطان حسین کا عہد حکومت حملۂ افغانان اور میر محمود اور اس کے جانشین "اشرف" کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں "غاصب مشہور المعروف بہ نادر قلی کی تاریخ من ابتداء ولادت ۱۶۸۶ء لغایۃ وفات ۱۷۴۷ء مع اس کے بدنصیب جانشین عادل شاہ کے حالات" کے لکھی گئی ہے اپنی تاریخ کے ابتدائی حصے میں ہَین وے (Hanway) نے کروسن سکی (Krusinski) سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، لیکن آخری حصے کی تاریخ (یعنی ۱۷۲۶ء - ۱۷۵۰ء) اور نادر شاہ کے پورے حالات کے بیان کے اعتبار سے اس کی کتاب خود ایک مستقل اور قابل قدر ماخذ کا حکم رکھتی ہے اور اس کی تحریر بغایت دل کش اور پڑھنے کے قابل ہے۔

آخری دور صفویہ میں ایرانی مورخین کی جولانی طبع کا کوئی سامان نہ تھا

مذکورۂ بالا نام ان بے شمار مصنفوں اور سیاحوں میں سے صرف ان چند لوگوں کے ہیں جن کی تحریروں سے اس زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ میں نے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر اس

وجہ سے کیا کہ خود میں نے زیادہ تر انھیں سے استفادہ کیا ہے، لیکن اگر کوئی چاہے تو اسے ایم۔ شیفر (M. Schefer) کے اس مقدمے میں جو انھوں نے مذکورۃ الصدر لا پیری رے فائیل ڈو مانس (La Pere Raphæl Du Mans) کے اپنے مرتّب کردہ اڈیشن پر لکھا ہے، مصنفوں اور سیاحوں کی اس سے کہیں زیادہ تعداد کا مفید اور مفصل بیان مل سکتا ہے۔ اس زمانے کے حالات کے متعلق یورپی مصنفوں کی تصانیف ایرانی تاریخوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مفید مطلب ثابت ہوتی ہیں، اور ان سے حالات و واقعات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ بقول سرجان ملکم[1] کے یہ ہے:-

"ہمارے خیال میں ایرانی مورخین کے لیے اس زمانے سے زیادہ نا مساعد کوئی اور زمانہ نہیں ہوسکتا تھا، تقریباً ایک صدی ایسی گزری جس میں ایک بھی اہم سیاسی واقعہ پیش نہ آیا۔ لیکن غیر معمولی سکون کا یہ زمانہ بھی کسی طرح سے ایران کے لیے مفید نہ ثابت ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں شہزادگان، امرا و عہدہ داران ایران داخلی یا خارجی جنگوں کے خطرات سے محفوظ رہے، لیکن ان کی جان اور مال کی سلامتی کا انحصار تمامتر اُن کمزور مزاج، ظالم اور عیاش بادشاہوں کے لطف و کرم پر رہا جو یکے بعد دیگرے ایران کے تخت پر بیٹھے۔ ادنیٰ طبقوں کی مصیبتیں کسی طرح بھی اعلیٰ طبقوں کے مقابلے میں کم نہ تھیں لیکن وہ لوگ دن بدن کمزور ہوتے

---

[1] تاریخ ایران (لندن ۱۸۱۵ء جلد اول ص۵۶۹ - ص۵۷۰ - ۱۲ مصنف

اور جنگ کے لیے ناکارہ ہوتے جا رہے تھے۔ امن و امان
سے اگر تھوڑا بہت فائدہ بھی انھیں حاصل ہوا تو وہ
اس وجہ سے خاک میں مل گیا کہ اب ان میں سلطنت
کی حفاظت کرنے کی قدرت و قوت ہی باقی نہ رہی تھی۔
اس پوری صدی میں ایران میں ایک دَور یا عہد بھی تو
ایسا نہیں گزرا جسے شاندار کہا جا سکے۔ اس سرزمین سے
ایسے افراد ہی نہیں پیدا ہوئے جن کا حال مورخین
جوش اور مسرت کے ساتھ لکھتے۔ پوری ایرانی قوم صرف
سابقہ شہرت و سطوت کے برتنے پر زندگی بسر کر رہی تھی
یہاں تک کہ اندر ہی اندر، آہستہ آہستہ اسے ایسا گھُن
لگ گیا کہ جب مٹھی بھر افغانی قبیلوں نے حملہ کرکے ایران
پر سخت ترین مصیبت اور تباہی نازل کی تو ایرانی قوم میں
اتنی بھی ہمّت نہ تھی کہ وہ اس قومی ابتلا کو دُور کرنے
کی ایک کوشش بھی کرتی۔ افغانیوں کی فتح سے ایرانیوں
کے دامنِ سطوت پر ایسا داغ لگا کہ مورخین کا اس
تکلیف دہ اور توہین آمیز واقعہ کے بیان سے پہلوتہی کرنا ذرا
بھی تعجب خیز نہیں ہو سکتا۔[1]"

شیخ علی حزیں کی بھی بعینہٖ یہی رائے ہے۔ وہ لکھتا ہے[2]:-

"چونکہ صدیوں سے ایران کے خوبصورت صوبوں میں تہذیب
و شائستگی، امن اور امان، غرضکہ تمام برکات دنیوی حد

---

[1] بالفور کے فارسی متن کا ص۱۰ ۔ اور ترجمہ کا ص۱۱۶ ۔ ۱۲ مصنف

کمال کو پہنچ چکی تھیں اس لیے "عین الکمال" کے لیے بھی
یہی صوبے موزوں نظر آئے۔ کاہل بادشاہ اور شہزادوں
نے، نیز اس فوج نے جسے سوائے آرام طلبی کے اور کوئی
کام نہ تھا۔ اور جس نے ایک صدی سے تلوار تک نیام
سے نہیں نکالی تھی، اس شورش[1] کو فرو کرنے کی کوئی
تدبیر ہی نہ کی۔ یہاں تک کہ محمود ایک کثیر فوج لے کر کرمان
اور یزد کے صوبوں میں داخل ہوگیا اور بہت کچھ لوٹ
مار کے بعد اصفہان کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ واقعہ اوائل
۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) کا ہے۔

جوناس ہین وے[2] کا بیان بھی اسی رنگ کا ہے:-

"موجودہ (یعنی اٹھارھویں) صدی کے شروع میں ایران کو
جو کامل امن و امان حاصل تھا وہ کبھی پہلے نصیب نہ ہوا
تھا۔ اس کی ہمسایہ سلطنتیں ان صلح ناموں پر جو اس کے
ساتھ ہوئے تھے، پوری طرح کاربند تھیں اور اس
وجہ سے خارجی حملوں کی طرف سے پورا پورا اطمینان تھا۔
لیکن دوسری طرف امن و امان کی اس طویل مدت کا
نتیجہ یہ ہوا کہ باشندے زنانہ مزاج اور عیش پسند ہوگئے
اور ان کی طرف سے اس کا کوئی اندیشہ نہ رہا کہ
ان کے جذبات ملک گیری و حرص حکومت رنگ لاکر

---

[1] یعنی میر ویس کی سرکردگی میں باغی افغانوں کا قندھار پر قبضہ ۱۲۔ مصنف

[2] Revolution of Persia جلد اول ص۲۲ ۔ ۱۲ مصنف

انھیں شورش پر آمادہ کریں گے۔ غرض کہ یہ سلطنت
جو سنین ماضیہ میں آماج گاہِ حوادث و انقلابات رہ چکی
تھی، اس زمانے میں اتنی مستحکم نظر آتی تھی کہ اس کی
تباہی کی خبر نے ساری دنیا کو تعجب میں ڈال دیا، اور
پھر لطف یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھوں یہ تباہی آئی وہ
ایسے مجہول الحال[۱] تھے کہ ان کے حکمران بھی ان سے واقف
نہ تھے اور آج بھی جو کچھ شہرت انھیں حاصل ہے وہ محض
ان سلطنتوں کی وجہ سے جنھیں انھوں نے مفتوح و مغلوب
کیا۔ ان لوگوں کو بحیثیت مجموعی "افغان" کہا جاتا ہے۔"

شاہ عباس کی پالسی کے نقائص ہم نے صفحات ماسبق میں کسی موقع پر
شاہ عباس کی پالسی کو دور اندیشانہ اور عاقلانہ
کہا ہے، لیکن اس بیان میں کسی قدر ترمیم کی ضرورت ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ اس کی حکمت عملی نے تاج و تخت کے اقتدار کو بہت
کچھ مستحکم کردیا تھا، لیکن وہی آگے چل کر قوم کے ضعف اور بادشاہوں
کے زوال کا سبب بنی۔ اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح جو طماع
عزیزوں، زبردست قبائلی سرداروں اور شورہ پشت شہریوں کے

---

[۱] لیکن عرب مورخ ابن الاثیر نے کئی مقامات پر افغانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے
متعلق سب سے پہلا حوالہ ۳۶۲ھ (۹۷۳ء-۹۷۴ء) کے ذیل میں ملتا ہے۔
چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں بھی ان لوگوں نے جنوبی مشرقی ایران میں
بہت شورش کی تھی۔ ملاحظہ ہو میرا کیا ہوا مختصر ترجمہ تاریخ گزیدہ (سلسلہ
ای۔ جے۔ ڈبلو گب ۱۴، ۲) ص ۱۲۱ الخ۔ ۱۲ مصنف

ہاتھوں عاجز رہا کرتے تھے۔ شاہ عباس کبیر نے بھی اپنی توجہ انھیں عناصر کے روک تھام اور علاج میں صرف کی۔ اپنے شہزادوں کو اعلیٰ انتظامی عہدوں پر مقرر کرنے، یا میدان جنگ میں ان سے نمایاں خدمات لینے کی بجائے، اس نے یا تو ان کی آنکھیں نکلوالیں، یا قتل کرادیا، یا پھر حرم سرا کی چار دیواری میں نظر بند رکھا جہاں بقول کروسن سکی کے:۔

"در عیش اور مسرت کی بجائے، وہ مصیبت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت بہت ناقص ہوتی ہے اور وہ محل سرا کے خواجہ سراؤں کے اثر میں آجاتے ہیں[۱]۔"

چنانچہ آخر میں یہی خواجہ سرا سلطنت کا زبردست ترین عنصر ہوگئے۔ یہ تو ہم پہلے کسی موقع پر بیان کرچکے ہیں کہ شاہ عباس نے اپنے سربرآوردہ امرا اور قبائلی سرداروں کو کس طرح زیر کیا تھا، اور ان سات قبائل کے جواب میں جو اس کے اسلاف کے دست و بازو تھے، اس نے کس طرح "شاہ سیون[۲]" کا طبقہ قایم کیا۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا جو اصول اس نے اختیار کیا تھا، اس کی سب سے زیادہ عجیب و غریب مثال یہ ہے کہ بقول کروسن سکی کے[۳] اس نے قصداً "پلنگ" اور "خلنگ" نام کے دو گروہ پیدا کیے جن میں آپس میں کبھی کبھی سخت خانہ جنگیاں اور

ملنگ و خلنگ

---

[۱] ص۶۵ - ص۶ ۱۲ مصنف

[۲] تصنیف ہذا کا ص۹

[۳] ص۹۵ ۱۲ مصنف

خوں ریزیاں ہُوا کرتی تھیں۔ کروسن سکی لکھتا ہے :-

"یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے اتنے مخالف اور دشمن تھے کہ شاید دو برسرِ جنگ سلطنتوں کے باشندے بھی ایک دوسرے کے خون کے اتنے پیاسے اور ایک دوسرے سے اتنے متنفر نہ ہوں گے۔"

آگے چل کر لکھتا ہے (ص ۹۲) :-

"اگرچہ وہ بغیر اسلحہ کے لڑتے تھے اور سوائے پتھروں اور لکڑیوں کے کسی حربے کا استعمال نہ کرتے تھے، لیکن ان کی لڑائیاں ایسی غضب کی خونریز ہوتی تھیں کہ بادشاہ کو مجبور ہوکر اپنے محافظ دستے کو حکم دینا پڑتا تھا کہ بزورِ شمشیر انھیں علیحدہ کرو اور اس پر بھی انھیں منتشر کرنا مشکل ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۷۱۴ء میں تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جب شاہی دستے کے سپاہیوں نے تقریبًا تین سو آدمیوں کو کھڑے کھڑے قتل کر دیا، تب کہیں یہ لڑنے والے ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔"

مُلّاؤں کا اقتدار جن کی نمایاں مثال محمد باقر مجلسی تھے۔

خواجہ سراؤں کا اثر تو خیر پہلے ہی سے تھا، لیکن بد قسمت اور نیک دل "مُلّا حسین" کے زمانے میں جو آخری صفوی تاجدار تھا، ایک اور طبقہ نے بھی زور پکڑا؛ یعنی مُلّا اور مجتہدین۔ اس طبقہ کے برسرِ اقتدار ہونے سے نہ تو کوئی روحانی یک رنگی پیدا ہوئی؛ اور نہ قومی برتری۔ اس کے انتہائی اثر و اقتدار کی مثال مُلّا محمد باقر مجلسی ہیں

جنھوں نے صوفیا اور ملاحدہ کو بہت ایذائیں دیں جن کا مفصل بیان ہم کسی آیندہ باب میں کریں گے۔ ان کے معتقدین[1] اور مداحوں کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ان کی وفات[2] (۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء تا ۱۷۰۰ء) کے تھوڑے ہی دن بعد ایران پر ان تباہیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو آگے چل کر ۱۷۲۲ء کے سانحہ ہائلہ کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک ایسے مقدس بزرگ کے اُٹھ جانے سے ایران موردِ خطرات و بلیات بنا؛ لیکن ارباب نقد و نظر جانتے ہیں کہ ایران کے اس ابتلائے عظیم کا سب سے بڑا سبب تعصب و تنگ نظری کی وہ آگ تھی جو مُلّائے موصوف اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی لگائی ہوئی تھی۔

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو قصص العلماء ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء ۱۸۸۹ء لیتھو اڈیشن ص ۲۱۶۔ ۱۲ مصنف

[2] ان کی وفات کا مادہ تاریخی غم و حزن سے نکالا گیا ہے۔ ۱۲ مصنف
۱۱۱۱ھ

باب چہارم

گزشتہ دو صدیوں (۱۷۲۲ء تا ۱۹۲۲ء) کی ایرانی تاریخ کا اجمالی تبصرہ

گزشتہ دو صدیوں کی ایرانی تاریخ کو مختصر کرکے ایک باب میں بیان کرنے کا ارادہ میں نے مدت کے غور و خوض اور کئی کوششوں کے بعد کیا ہے۔ اگر اس کتاب کا موضوع ایران کی سیاسی تاریخ ہوتا تو غالباً ایسی کوشش کا خیال تک بھی میں نہ کرسکتا، اس لیے کہ یہ طویل زمانہ گوناگوں اہم واقعات سے بھرا ہوا ہے افغانیوں کا حملہ اور ان کی تاخت وتاراج، اس حیرت انگیز فاتح، یعنی نادرشاہ کا عروج اور پھر شعلے کی طرح بھڑک کر اس کا یکایک ماند پڑجانا، کریم خان زند کا جسے ایران کا بہترین بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے، نیز اس کے بیٹے اور جانشین لطف علی خان کا عین اس حالت میں کہ ایران خلفشار اور مصائب میں گرفتار تھا، عرصۂ شہود پر آنا، دولت قاچاریہ کا قیام جو اب تک برسر اقتدار ہے[1]۔ قاچاریہ کے زمانے کے اہم واقعات اور ان سب سے زیادہ اہم دو حیرت انگیز تحریکات: یعنی ۱۸۴۴ء میں بابی تحریک کی

[1] ناظرین کو یاد رکھنا چاہیے کہ پروفیسر براؤن مرحوم کی زندگی میں ایران میں قاچاریہ ہی کی حکومت تھی اور رضا شاہ خان پہلوی نے مسندنشین ہوکر خاندانِ پہلویہ کی بنیاد نہ ڈالی تھی ۱۲ مترجم

ابتدار اور عروج اور ۱۹۰۶ء کا سیاسی انقلاب جنھوں نے ایران کی ذہنی اور ادبی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا اور جن میں سے ہر ایک اس قابل ہی کہ بجائے ایک باب کے اس پر ایک طویل رسالہ سپرد قلم کیا جائے۔ یہ سب واقعات انھیں دو صدیوں میں ہوئے جن کی تاریخ اس باب میں لکھی جا رہی ہی۔ لیکن چونکہ ہماری کتاب سیاسی نہیں بلکہ ادبی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہی اور اس میں تاریخ کا حصّہ محض ضمنی طور پر شریک کردیا گیا ہی اور وہ بھی اس لیے کہ اکثر تعلیم یافتہ یورپی حضرات کو تاریخ مشرق کی سرسری واقفیت بھی نہیں ہوتی اس لیے اس میں ان دوروں کی بجائے جن میں عقائد اور خیالات کی کش مکش نہیں، بلکہ جذبات حرص و حکومت کی جنگ رہی ہی، ایسے دوروں کا بیان اور ان کی بحث زیادہ تفصیل سے ہونی چاہیے جو اپنی حالت کون و فساد، تخریب و تعمیر اور ذہنی جد و جہد کی وجہ سے ممتاز رہے ہیں۔ جس دو صد سالہ دور کی تاریخ ہم اس باب میں لکھ رہے ہیں وہ اول الذکر قسم کا دور تھا۔ فارسی زبان تو کم سے کم چودھویں صدی عیسوی ہی میں مستقل اور مکمل ہوچکی تھی۔ اس کا ایک ادنیٰ سا ثبوت یہ ہی کہ حافظ کی غزلیں اگرچہ اپنی دل کشی میں آج بھی بے نظیر ہیں اور ان کا جواب نہیں پیدا ہوا ہی لیکن محض زبان کی حیثیت سے دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہی جیسے کل لکھی گئی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ان دو صدیوں میں ادبی زبان میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا۔ انیسویں صدی کے وسط تک جدید اصناف شعر شاذ و نادر ہی پیدا ہوئے۔ اگرچہ بابی تحریک کا آغاز ۱۸۴۴ء میں ہوا لیکن اس سے پہلے جو دور گزرا اُس میں ایسے خیالات بہت

کم پیدا ہوئے جن سے تشیعیت کے اس جوش میں جو صفویہ کے زمانے سے شروع ہوا تھا، کوئی تبدیلی ہوتی۔ اور خود اس بابی تحریک کا جو کچھ اثر ادبیات پر پڑا، وہ بمقابلہ ان اثرات کے جو ۱۹۰۶ء کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے پیدا ہوئے، بہت کم تھا۔ مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ اس زمانے کی تاریخ کو قصداً اختصار اور اجمال کے ساتھ بیان کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ حملۂ افغانان، نیز نادرشاہ اور ابتدائی قاچاریہ دور کے متعلق کئی اعلیٰ درجے کے وقائع پہلے ہی سے انگریزی زبان میں موجود ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ اگر ان سب بیانات کو مختصر کر کے اس کتاب میں شامل کیا جاتا تو اس سے اُن کی اہمیت اور کم ہو جاتی۔ نظر بایں حالات مجھے یہی مناسب نظر آیا کہ اس باب میں صرف گزشتہ دو صدیوں کے خاص خاص واقعات اجمالی طور پر بیان کر دوں۔

حملۂ افغانان ۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۰ء

افغانیوں کی سیرت ان عربوں، مغلوں، تاتاریوں اور ترکوں کے برخلاف جنھوں نے پچھلے زمانے میں غیر ملکی فوجوں کی مدد سے ایران کو زیر کیا تھا، افغانی ایرانی الاصل ہی ہیں اور چاہے طبایع کے اعتبار سے وہ ایرانیوں سے بہت کچھ متفاوت ہوں لیکن اصل میں یہ دونوں قومیں ہم نسل ہیں۔ چنانچہ افغانیوں کے غیر آباد اور کوہستانی ملک میں فارسی زبان ہی عام طور پر بولی جاتی ہے اور جیمس ڈارمس ٹی ٹر (James Darmesteter) کی تحقیق کی رُو سے تو خود ان کی

خاص بولی پشتو زرتشتیوں کی الہامی کتاب اَوستا کی یادگار ہے۔ یہ لوگ ایرانیوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تند مزاج، قوی اور جنگ جو ہیں لیکن تہذیب، شایستگی اور ذہانت میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔ افغان مالی سنی ہوتے ہیں۔ یہی چیز ان دونوں قوموں کی شدید مخالفت کا سبب ہے اور اسی اختلاف عقائد سے فائدہ اُٹھاکر افغانیوں نے اپنے حملۂ ایران کو جہاد کا رنگ دے دیا تھا۔

قندھار میں شورش کی ابتدا۔ سنہ۱۷۰۹ء میں قندھار پر جو ہمیشہ ایران کے شاہانِ صفویہ اور ہندوستان کے سلاطین مغلیہ کے درمیان مابہ النزاع تھا، ایرانیوں کا قبضہ تھا اور ایک گرجی امیر مسمی گرگین خان کمال مطلق العنانی کے ساتھ اس پر حکومت کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک افغانی سردار میرولیں بھی تھا جس کا اثر و اقتدار اس کے ہم وطنوں پر بہت زیادہ تھا۔ گرگین خان کو اس کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا اور اس نے اسے سرکاری قیدی قرار دے کر اصفہان میں نظر بند کر دیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرولیں کو وہاں بہت کچھ آزادی حاصل تھی اور وہ باقاعدہ شاہ حسین کے دربار میں باریاب ہوا کرتا تھا۔ چونکہ یہ شخص قدرتاً بہت فریس اور تیز نظر تھا اور ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا ایک خاص ملکہ رکھتا تھا، اس نے بہت جلد تاڑ لیا کہ ملک میں چند خاص خاص گروہ پیدا ہوگئے ہیں جن کی باہمی رقابتیں سلطنت کا خاتمہ ہی کیا چاہتی ہیں۔ چنانچہ اس نے کمال احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ان شبہات اور بدگمانیوں کو شہ دینا شروع کیا جو ہر بڑے ایرانی سپہ سالار یا گورنر صوبہ کے دل میں

دوسروں کی طرف سے پہلے ہی موجود تھیں۔ اگرچہ گرگین خان پر غداری کا شبہ کرنے کی کوئی کافی وجہ نہ تھی تاہم چونکہ وہ گرجی امرا کے خاندان سے اور مذہبًا عیسائی تھا اس لیے اس کی طرف سے یہ بدگمانی پیدا کر دینا بہت آسان اور قرین قیاس بھی تھا کہ وہ بجائے ایرانی سلطنت کے بقا اور استحکام کے اپنی اور اپنے اہل ملک کی شہرت و ناموری کا خواہاں ہے۔

میر ویس کا سفر مکہ معظمہ غرض کہ جب میر ویس نفاق اور عداوت کا بیج بو چکا اور ایرانی دربار میں اس کا رسوخ اچھی طرح ہو گیا تو اس نے حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی اجازت طلب کی اور روانہ ہو گیا۔ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد، اس نے اپنی مقصد برآری کے لیے ایک اور چال چلی یعنی وہاں کے سربرآوردہ علما سے استفتا کیا کہ آیا کسی شیعہ حکمراں کی سنّی رعایا کے لیے بادشاہ کا حکم ماننا مذہبًا فرض ہے یا نہیں اور وہ رعایا اگر موقع ہو تو اپنے بادشاہ کے خلاف تلوار اٹھا سکتی ہے یا نہیں۔ جو فتوے اس نے حاصل کیے ان میں آخرالذکر استفسار کا جواب اثبات میں دیا گیا تھا اور وہ انھیں لیے ہوئے اصفہان پہنچا اور وہاں سے قندھار جانے کی اجازت لے کر اور گرگین خان کے نام پُر زور سفارشی خطوط لے کر قندھار پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے بہت جلد گرگین خان کے خلاف بغاوت کا مواد تیار کر لیا اور ایک موقع پر جب کہ قندھار کی ایرانی فوج عارضی طور پر پاس ہی کسی مقام پر مہم کے سلسلے گئی ہوئی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دفعتًا باقی ماندہ فوج پر ٹوٹ پڑا۔ ان میں سے اکثر کو تہ تیغ کیا (گرگین خاں بھی مارا گیا)

اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ مکہ معظمہ میں جو فتوے حاصل کیا گیا تھا، وہ اب
اس کے کام آیا، کیونکہ شروع میں اس کے چند کمزور دل ساتھی اس
طرح دفعتًا ایرانی حکومت کا جُوا اُتار پھینکنے سے گھبراتے تھے۔ لیکن جب
اس فتوے سے ان کے ضمیر کو مطمئن کر دیا گیا تو وہ بھی اپنے پُرجوش
ہم وطنوں کے شریکِ کار بن گئے اور سب نے باتفاق رائے میر ویس
کو "شاہ قندھار و سر عسکر افواج ملّیہ" منتخب کیا[1]۔

باغیوں کی فتح ایرانیوں نے اس باغی شہر کو زیر کرنے کی کئی کوششیں
کیں، لیکن ناکامی ہوئی۔ بالآخر ایرانی حکومت کی طرف سے گرگین خان
کے بھانجے خسرو خان کو تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس بغاوت کو
فرو کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اگرچہ شروع میں خسرو خان کو کامیابی
ہوئی اور باغی افغانوں نے بعض شرائط پر ہتھیار ڈالنا بھی قبول کر لیا
لیکن اس کی ضد نے انھیں آخری مرتبہ قسمت آزمائی پر مجبور کر دیا۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ ایرانی فوجوں کو شکست فاش نصیب ہوئی، ان کے صرف سات سو
آدمی زندہ بچے اور ان کا سپہ سالار خسرو خان مارا گیا۔ اس کے دو
سال بعد یعنی ۱۷۱۳ء میں ایک اور ایرانی فوج رستم خان کی سرکردگی
میں روانہ کی گئی لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اور اب پورے صوبہ
قندھار پر باغیوں کا تسلط ہو گیا۔

میر ویس کا بیٹا میر محمود اس کا جانشین ہوا میر ویس جس نے پانچ یا چھ سال
کے اندر ہی اندر افغانی حکومت کی داغ
بیل ڈال دی تھی ۱۷۱۵ء میں مر گیا اور اس کا بھائی میر عبداللہ

[1] کروسن سکی۔ ص ۱۸۱۔ ۱۲ مصنف

اس کا جانشین ہُوا، لیکن چونکہ میر عبداللہ بعض شرائط پر ایرانی سیادت قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا اس لیے اس کے بھتیجے یعنی میر ویس کے بیٹے میر محمود نے اسے مار ڈالا اور فوراً اپنی بادشاہی کا اعلان کرادیا۔ جب

ایرانی حکومت کے خلاف دوسری بغاوتیں

ایرانی حکومت کا بھرم اس طرح کھل گیا اور اس کی کمزوری سب پر ظاہر ہوگئی تو سلطنت کے دوسرے حصّوں کو بھی افغانانِ قندھار کی تقلید کا شوق ہُوا۔ چنانچہ ہرات کے ابدالی افغان، ماوراء النہر کے اُزبک کُرد، لزگی، بحرین کے عرب سب یکے بعد دیگرے بغاوت کر بیٹھے۔ اور اگرچہ ایرانی سپہ سالار صفی قلی خاں نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ، اُزبکوں کی بارہ ہزار فوج کو شکست دی، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد خود اسے ابدالی افغانوں کے ہاتھوں بُری طرح شکست ہوئی۔

کرمان پر افغانوں کا قبضہ

۱۷۲۰ء میں میر محمود نے جارحانہ کارروائی شروع کردی اور سیستان کے ریگستانوں کو عبور کرکے کرمان پر حملہ کردیا اور اس پر قبضہ بھی کرلیا۔ لیکن چار مہینے بعد ایرانی سپہ سالار لطف علی خاں نے اسے وہاں سے نکال دیا اور اس فتح کے بعد شیراز پہنچ کر اس نے افغانیوں کی سرکوبی اور قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے "ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی فوج منظم کرنا شروع کی جس کی نظیر کئی سال سے ایران میں نہ پیدا ہوئی تھی" لیکن وہ ابھی اپنے اس ارادے کی تکمیل ہی میں لگا ہُوا تھا کہ ان درباری سازشوں کی بدولت جو اس زمانے میں ایرانی سلطنت کو بسرعت تمام بربادی کی طرف لیے جارہی تھیں، اس کی بھی جڑ

کاٹ دی گئی۔ وہ معزول کر دیا گیا اور قیدی بنا کے اصفہان لایا گیا اور وہ فوج جسے اس نے محنت سے منظم اور مرتب کیا تھا، پراگندہ ہوگئی، جس سے افغانیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اسی اثنا میں شماخی پر لزگیوں کا قبضہ ہوگیا، آسمان پر عجیب و غریب علامتیں نظر آنے لگیں جن سے ایرانیوں کے حوصلے اور پست ہوگئے اور شاہ حسین کے اس حکم نے کہ ساری سلطنت میں عام طور پر ماتم اور استغفار کیا جائے قوم کی مایوسی اور پست ہمتی کو اور بڑھا دیا۔

زرتشتی افغانیوں کے شریکِ کار بن گئے

۱۷۲۲ء کا منحوس سال اس طرح پر شروع ہوا کہ میر محمود نے کرمان کا دوبارہ محاصرہ کرکے اس پر پھر قبضہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم واقعہ یہ ہوا کہ "گبروں[1]" کی ایک کثیر جماعت اس سے جا ملی۔ یہ گبر ان ایرانیوں کی اولاد میں سے ہیں جو قدیم زرتشتی مذہب کے پیرو تھے ان کی زیادہ تعداد کرمان اور یزد اور ان دونوں کے درمیانی علاقہ رفسنجان میں پائی جاتی ہے جس کا سب سے بڑا شہر بہرام آباد ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے غیر ملکی مسلمانوں کا ساتھ کیوں دیا اور اپنے مسلمان ہم وطنوں پر حملہ کیوں کیا۔ اس کی اگر کوئی وجہ قرینِ قیاس نظر آتی ہے تو یہی کہ شیعہ مجتہدین کے تعصب نے انھیں اس طرزِ عمل پر مجبور کر دیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب (بہ شرطے کہ صحیح ہو) ہین وے (Hanway) کا یہ بیان ہے کہ انھیں

[1] ہین وے (Hanway) Revolution of Persia جلد اول ص۹۹ - ۱۲ مصنف

میں کا ایک شخص میر محمود کے بہترین سپہ سالاروں میں تھا، جس کا نام نصر اللہ، اگرچہ مسلمانوں کا سا تھا، لیکن بقول ہین دے (Hanway) [1] کے:-

"وہ دراصل آتش پرست تھا اور اسی لیے سلطان کے حکم سے دو موبد خاص اس کام کے لیے نوکر رکھے گئے تھے کہ اس کی قبر پر مقدس آگ کو ہمیشہ روشن رکھیں۔"

اصفہان کی طرف افغانیوں کی پیش قدمی۔ کرمان سے میر محمود یزد ہوتا ہوا اصفہان کی طرف بڑھا۔ اس نے کوشش تو یہ کی تھی کہ یورش کرکے یزد کو بھی فتح کرلے لیکن اس میں اسے ناکامی ہوئی۔ جب اس نے اصفہان کی طرف پیش قدمی شروع کی تو اس سے کہا گیا کہ پندرہ ہزار تومان [2] لے کر واپس چلے جاؤ، لیکن اس نے رشوت کے قبول کرنے سے انکار کردیا اور گلنا باد میں جو صفویہ کے دارالخلافہ (اصفہان) سے تقریباً ۹ میل کی مسافت پر تھا پڑاؤ کیا۔ ایرانی فوج بہت کچھ جھگڑوں اور اختلافِ رائے کے بعد بالآخر ۸ مارچ کو افغانیوں سے جنگ کرنے کی غرض سے نکلی اور دوسرے دن والیٔ عربستان کی غداری کی وجہ سے شکست فاش نصیب ہوئی۔

---

[1] ہین وے (Hanway) Revolution of Persia جلد اول ص۱۸۶ ۱۲ مصنف

[2] اس زمانے میں بقول ہین وے کے (انقلاب ایران ص۱۰ حاشیہ ۱) ۱۵۰۰۰ تومان ۳۷ ½ ہزار پونڈ کے مساوی تھے۔ ۱۲ مصنف

یعنی آج کل کی شرح سے پانچ لاکھ چھ ہزار دوسو پچاس روپیہ کلدار۔ ۱۲ مترجم

جنگ گلنا باد
۸ مارچ ۱۷۲۲ء

جس طرح ۶۳۵ء کی جنگ قادسیہ نے ساسانیوں کا اور ۱۲۵۸ء میں بیرونِ بغداد خلیفہ (مستعصم) کی فوجوں اور تاتاریوں کی جنگ نے عباسیوں کا خاتمہ کر دیا تھا، اسی طرح سے گلنا باد کی جو لڑائی ۸ مارچ ۱۷۲۲ء کو ایرانیوں اور افغانیوں کے درمیان ہوئی، اس نے صفویہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ان جنگوں میں ایک عجیب مشابہت پائی جاتی ہی کہ ان تینوں میں مدافعین ظاہری حیثیت سے پُر شکوہ اور قوی تھے اور حملہ آور بظاہر آثار خستہ حال اور کمزور نظر آتے تھے۔ کتاب الفخری میں ایک مقام پر جنگ قادسیہ اور جنگ بغداد کی اس مشابہت کا بیان کیا گیا ہی[۱]۔ جنگ گلنا باد کے متعلق ہین دے (Hanway) کا مندرجۂ ذیل بیان[۲] کتاب الفخری کے محولہ بالا بیان سے بہت ملتا ہی:-

"آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوا ہی تھا کہ دونوں فوجوں نے ایک دوسرے کو اس تجسس سے دیکھنا شروع کیا جو ایسے خوفناک موقعوں پر فطری طور پر دلوں میں پیدا ہو جاتا ہی۔ ایرانی فوج میں جو ابھی دارالخلافہ سے نکلی تھی، پوری درباری آن بان تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

---

[۱] اس عبارت کے لیے ملاحظہ ہو میری تاریخ ادبیات ایران جلد ۲ ص ۴۶۲ ۱۲ مصنف
اصل عبارت کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الفخری (اہوارڈٹ اڈیشن۔ ص ۹۷ - ص ۹۸) ۱۲ مصنف

[۲] Revolution of Persia (لندن ۱۷۵۳ء) جلد اول ص ۱۰۴ - ص ۱۰۵ ۱۲ مصنف

کہ بجائے لڑنے کے وہ نمایش کے لیے نکلی ہے۔ ان کے زرق برق اسلحہ اور لباس، خوبصورت گھوڑے، گھوڑوں کی سنہری اور مرصع جھولیں، خیموں کی بھڑک چمک ان سب چیزوں نے ایرانی فوجوں کی فرودگاہ میں ایک عجیب جگمگاہٹ اور شان پیدا کردی تھی"

"دوسری طرف سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی اور تھکن اور دھوپ کی تمازت سے ان کی صورتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ اتنے لیے دھاوے کی وجہ سے ان کے کپڑے بوسیدہ ہوکر پھٹ گئے تھے اور اس قابل بھی نہ رہے تھے کہ موسم کی سختی سے ان کو محفوظ رکھ سکیں۔ ان کے گھوڑوں پر صرف چمڑے اور پیتل کا ساز و سامان تھا اور سوائے نیزوں اور تلواروں کے ان کے پاس چمک دمک کی کوئی اور چیز نہ تھی"

عربوں، مغلوں اور افغانوں کے حملۂ ایران کا مقابلہ و موازنہ

یہ تینوں عظیم الشان اور فیصلہ کن لڑائیاں کئی حیثیتوں سے ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں ایک ایسے زبردست تاریخی خاندان کا خاتمہ ہوا جس کو ظاہری شان و شوکت کے پردے کے نیچے اندر ہی اندر گھن لگ رہا تھا اور جو محض اس وجہ سے قوی اور پُرشکوہ نظر آتا تھا کہ اس کا مقابلہ اب تک کسی زبردست قوت سے نہ پڑا تھا۔ نیز ہر صورت میں ان خاندانوں کا قلع قمع کرنے والے ایسے لوگ تھے جن کو اس وقت تک کوئی جانتا بھی نہ تھا

اور جنھیں وحشیوں اور بربریوں سے کچھ ہی بہتر سمجھا جاتا تھا۔ متتبّع مورّخ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ تینوں خاندان (یعنی ساسانیہ، عباسیہ اور صفویہ) کم و بیش طویل زمانے سے، آہستہ آہستہ، لیکن یقینی طور پر کچھ ایسے زوال پذیر ہورہے تھے کہ خواہ ان کے انجام بد کا پورا پورا اندازہ اس وقت تک نہ ہوسکا ہو جب تک وہ جنگ کی کسوٹی پر نہ کسے گئے، لیکن اتنا بہرحال یقینی تھا کہ دیر ہو یا سویر ان کا انجام بد ضرور ان کے سامنے آنے والا ہے۔ چونکہ تینوں حملہ آوروں (عرب، مغول، افغان) کے طبایع اور استعداد مختلف تھے اس لیے ان کی فتوحات کے نتائج بھی مختلف ہوئے۔ ساتویں صدی عیسوی کے عرب حملہ آوروں نے تو ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو چھ صدیوں تک باقی رہی اور جن ممالک و ملل کو اُنھوں نے زیرِ نگیں کیا ان پر اُن کا مستقل اثر پڑا۔ مغلوں کی فتوحات وسعت میں عربوں سے کہیں زیادہ تھیں اور چین اور تبت سے لے کر جرمنی تک ان کا سکّہ رواں ہوگیا تھا لیکن جو وسیع سلطنت اُنھوں نے قایم کی وہ شیرازہ بندی اور استحکام کے اعتبار سے عربوں کی قایم کی ہوئی سلطنت کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ درجہ کی ثابت ہوئی۔ باقی رہیں افغانی فتوحات جو فی الوقت ہمارا موضوعِ بحث ہیں تو ان کی حیثیت ایک زبردست اور برباد کن یورش یا یلغار سے زیادہ نہ تھی۔ ان کی پون صدی کی حکومت محض ایک دورِ سلب و نہب تھی جس کی ظلمت میں ایرانی نپولین نادرشاہ نے شعلہ کی طرح بھڑک کر چند دن کے لیے اُجالا کردیا تھا۔ اس دور کے خاتمہ پر خاندان قاچاریہ کی جو اب تک برسرِاقتدار ہے

بنیاد پڑی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران پر افغانیوں کا تسلط در اصل صرف ۸ یا ۹ سال رہا۔[1]

شہزادہ طہماسپ اصفہان سے قزوین کی طرف فرار ہوگیا

جنگ گلناباد کے سات مہینے بعد بدنصیب شاہ حسین صفوی نے ہر طرح کی ذلت و خواری اٹھاکر ہتھیار ڈال دیے۔ کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں ایران کا سارا توپخانہ، ساز و سامان اور خزانہ غنیم کے قبضہ میں آگیا اور پچاس ہزار سپاہیوں میں سے پندرہ ہزار کھیت رہے ۱۹۔ مارچ ۱۷۲۲ء کو میر محمود نے شاہ کے محبوب قصر اور تفرج گاہ فرح آباد میں جو اصفہان سے صرف تین میل کے فاصلہ پر تھا، سکونت اختیار کی اور اس وقت سے یہی مقام اس کا مرکز اور مستقر بنا۔ دو دن بعد افغانیوں نے جُلفا کے نواح پر جہاں ارمنی آباد تھے، قبضہ کرلیا اور زرِ نقد اور جوان لڑکیوں کو بطور تاوان حاصل کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یورش کرکے اصفہان پر بھی قبضہ کرلیں، لیکن دونوں مرتبہ (۱۹۔ اور ۲۱ر مارچ کو) انھیں ناکامی ہوئی۔ اب انھوں نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ تین ماہ بعد شہزادہ طہماسپ مرزا جو اپنے باپ کی جگہ شاہ بنایا گیا تھا، اس محصور شہر سے قزوین کی طرف بھاگ نکلا، جہاں پہنچ کر دارالخلافہ (اصفہان) کو دشمنوں سے بچانے کےلیے اس نے ایک فوج تیار کرنی چاہی، لیکن اس میں اسے کامیابی

---

[1] محمود افغانی نے جنوری ۱۷۲۲ء میں کرمان کا محاصرہ کیا اور اسی سال اکتوبر کے مہینہ میں اصفہان پر قبضہ کرلیا۔ اس کا چچازاد بھائی اشرف جو اس کا جانشین ہوا، ۱۷۳۰ء میں بلوچیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ۱۲ مصنف

نہیں ہوئی۔

اصفہان میں قحط اس کے تھوڑے ہی دن بعد، رعایا نے قحط کی مصیبت سے عاجز آکر شور مچایا کہ ہمیں محاصرین سے مقابلہ کرنے کے لیے لے چلو، لیکن چونکہ والی عربستان نے جو ان بُرے دنوں میں برابر بدنصیب بادشاہ کا مشیر بد اندیش و منحوس تھا، پھر غداری شروع کردی تھی اس لیے رعایا کا یہ سرفروشانہ ہلّہ بھی بے سود ہوا۔ ایرانی اہلِ دربار کی عقلیں ان دنوں کچھ اس بُری طرح مسخ ہو گئی تھیں کہ وہ غداروں پر اعتماد کرتے اور لطف علی خاں کے جیسے بہادر اور وطن خواہ عہدہ داروں پر شبہ کرکے یا تو ان کا تنزل کردیتے، یا برطرف کردیتے تھے۔ محاصرہ اُٹھنے کے تین چار مہینے پہلے ہی سے رعایا قحط کی سخت ترین مصیبتوں کا شکار ہو رہی تھی۔ کتّے، بلّی، حتیٰ کہ مردہ عزیزوں کی لاشیں تک کھانے کی نوبت آگئی تھی۔ کثرت سے جانیں ضائع ہوئیں ان سب واقعات کی دل ہلادینے والی تفصیلیں کروسن سکی اور ہن دوسے کی تحریروں، نیز ان وقائع میں ملتی ہیں جو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض کارندوں نے جو اس زمانے میں اصفہان میں مقیم تھے، لکھی ہیں۔ ڈچ کمپنی کے کارندوں کی اصل تحریریں ایچ۔ ڈن لاپ (H. Dunlop) نے ایران پر اپنی لاجواب کتاب Perzie Haarlem, 1912 صفحہ ۲۴۲۔ صفحہ ۲۵۵ میں شریک کردی ہیں۔

اصفہان افغانوں کے حوالے کردیا گیا ۲۱۔ اکتوبر ۱۷۲۲ء اواخر ستمبر ۱۷۲۲ء میں شاہ حسین نے خود کو اور اپنے دارالخلافہ کو افغانی حملہ آوروں کے سپرد کردینا چاہا، لیکن میر محمود نے

اس مصلحت سے کہ قحط کی تکلیفوں سے محصورین کی تعداد گھٹ جائے اور ان کے حوصلے کچھ اور پست ہوجائیں، تین چار ہفتہ تو گفت وشنید ہی میں ٹال دیے۔ آخرکار ۲۱ر اکتوبر کو شاہ حسین تاج سلطنت پیش کرنے کے لیے پا پیادہ فرح آباد کی طرف چلا جو کسی زمانے میں اس کا محبوب تفرج گاہ تھا اور اب اس کے ظالم دشمن کا مستقر بنا ہوا تھا۔ اس کے چھ دن بعد میر محمود نے تاج ایران سر پہ رکھا۔ جب قزوین میں شہزادہ طہماسپ کو شاہ حسین کی تخت سے دست برداری کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کرایا، لیکن ۲۰ر دسمبر کو افغانی جنرل امان اللہ خان نے پہنچ کر اسے وہاں سے نکال دیا۔ اثنائے راہ میں قم اور کاشان کے شہروں نے بھی امان اللہ خان کی اطاعت قبول کرلی۔

طہماسپ کا روس اور ترکی سے امداد طلب کرنا

اب طہماسپ کو حد درجہ مجبور ہوکر چار و ناچار روس اور ترکی سے مدد کی درخواست کرنی پڑی جن کی حریصانہ نظریں پہلے ہی سے جاں بلب ایرانی سلطنت پر جمی ہوئی تھیں اور جن میں سے روس گیلان پر اور ترکی طفلس پر پہلے ہی سے قبضہ جا چکے تھے۔ ۲۳ر ستمبر ۱۷۲۳ء کو ایک عہدنامہ مرتب ہوا جس میں طہماسپ نے وعدہ کیا کہ اگر افغانوں کو نکال دیا جائے اور مجھے ازسرنو بادشاہ بنادیا جائے تو بحیرہ خزر کے قریب کے صوبجات یعنی گیلان، مازندران اور گرگان اور دو شہر یعنی باکو اور دربند مع ان کے ماتحت علاقوں کے روس کے حوالے کردوں گا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ترکوں نے اریوان، نخجوان

خوئے اور ہمدان پر قبضہ کرلیا، لیکن تبریز میں ان کو ناکامی ہوئی۔
۸۔ جولائی ۱۷۲۴ء کو بمقام قسطنطنیہ روس اور ترکی میں ایران کے حصّے بخرے کرنے سے متعلق ایک عہد نامے کی بھی تکمیل ہوگئی[۱]۔

افغانوں کے مظالم اس اثنا میں اصفہان میں میر محمود کے مظالم اسی طرح ہورہے تھے۔ ۱۷۲۲ء میں اس نے تقریبًا تین سو امرا و عمائدین کو کمال بے دردی سے تہ تیغ کیا اور اس خونریزی کے تھوڑے ہی دن بعد ان مقتولین کے خاندانوں کے تقریبًا دو سو خورد سال بچوں کو مروا ڈالا۔ معزول شاہ کے محافظ دستہ کے تین ہزار سپاہی بھی قتل کردیے گئے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ جن کے حالات یا رسوخ کی طرف سے کچھ بھی اندیشہ ہوسکتا تھا، مارڈالے گئے اس کے دوسرے سال یعنی ۱۷۲۴ء افغانی جنرل، زبردست خاں نے شیراز پر قبضہ کرلیا جس کو فتح کرنے کی کوشش میں اس کا پیش رو نصراللہ[۲] پہلے زک اٹھاکر جنگ میں کام آچکا تھا۔ آخر سال میں میر محمود نے یزد پر حملہ کی تیاری کی جس نے اب تک اطاعت قبول نہ کی تھی۔ اس شہر کے مسلمان باشندوں نے اس ڈر سے کہ کہیں یہاں کی زرتشتی آبادی بھی کرمان والوں کی طرح افغانوں سے نہ مل جائے، ان میں سے بہتوں کو مار ڈالا۔

---

[۱] اس کی پوری دفعات ہین دے کے "انقلاب ایران" جلد اول صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲ پر دی ہوئی ہیں۔ ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۱ ۱۲ مصنف

میر محمود کا شہزادگانِ صفویہ کو قتل کرنا (۷۔ فروری ۱۷۲۵ء) اور اپنے برادرِ عم زاد اشرف کے ہاتھوں مارا جانا۔ ۲۲۔ اپریل ۱۷۲۵ء

اس زمانے میں میر محمود نے اپنے چچازاد بھائی اشرف کی روز افزوں خود سری سے خائف ہوکر نیز (کم از کم ہمارا خیال ہو کہ) اپنے ظالمانہ افعال پر دل ہی دل میں پشیمان ہوکر شدید نفس کشی اور ریاضت شروع کردی تھی۔ لیکن اس سے اس کا حزن و ملال اور مزاج کی درشتی اور بڑھ گئی اور ۷۔ فروری ۱۷۲۵ء کو اس نے سوائے معزول شاہ حسین اور اس کے دو خوردسال بچوں کے، شاہی خاندان کے بقیۃ السیف افراد کو بھی قتل کردیا۔ اس کی خشونت روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ۲۲۔ اپریل ۱۷۲۵ء کو اس کے چچازاد بھائی اشرف نے اسے قتل کردیا اور خود بادشاہ بنا۔ میر محمود کی عمر قتل کے وقت صرف ۲۷ سال تھی، اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہی:-

"وہ اوسط قد کا ایک بد قوارہ شخص تھا، اس کی گردن اتنی چھوٹی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سر کندھوں پر لگا ہُوا ہی۔ اس کا چہرا چوڑا، ناک چپٹی اور ڈاڑھی بہت چھدری اور سرخ رنگ کی تھی۔ اس کی نظریں خونخوار تھیں، اور چہرہ بہت سخت اور کریہ منظر تھا۔ اس کی آنکھیں نیلگوں اور کسی قدر بھینگی تھیں، اور ایسے شخص کی آنکھوں کی طرح جو کسی گہرے سوچ میں ہو، ہر وقت نیچے جھکی رہتی تھیں۔"

پی ٹر اعظم کی وفات اور ایران پر ترکوں کا حملہ

اس زمانے میں پی ٹر اعظم کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے روس کا پڑوس اب ایران کے لیے اتنا خطرناک نہ رہا، لیکن ترک برابر ایرانیوں کو دباتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ۳ ۔ اگست ۱۷۲۵ء کو ان کا قبضہ تبریز پر بھی ہوگیا۔ وہ تو پیش قدمی کرتے ہوئے اصفہان سے تین یوم کی منزل تک پہنچ گئے تھے، لیکن وہیں سے واپس ہوگئے اس کے بعد ۱۷۲۶ء میں انھوں نے قزوین اور مراغہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن کرمان شاہ کے پاس اشرف نے انھیں شکست دی۔ اس اثنا میں قسطنطنیہ میں صلح کی گفت و شنید برابر جاری تھی۔ اشرف کی طرف سے اس کا سفیر میر عبدالعزیز وہاں موجود تھا، اس نے یہ تجویز پیش کی کہ میرا آقا (یعنی اشرف) خلیفۂ مشرق ہو اور سلطان روم خلیفۂ مغرب۔ ظاہر ہے کہ اس گستاخانہ تجویز پر باب عالی کتنا چیں بجبیں نہ ہؤا ہوگا، لیکن ترکی فوج اور رعایا جنگ کے مخالف تھے اور

ترکوں اور افغانوں کی گفت و شنید

کہتے تھے کہ ایک ملحد شیعہ خاندان کو دوبارہ تخت دلوانے کے لیے ہم اپنے سنّی بھائیوں سے کیوں لڑیں۔ لیکن علما نے جنگ کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا، ان کی دلیل یہ تھی کہ شکستہ اور منقسم خلافت اسلام کے وقار اور استحفاظ کے منافی ہے بالآخر ستمبر ۱۷۲۷ء میں بمقام ہمدان ایک صلح نامہ مرتب ہؤا اور فریقین نے اس پر دستخط کردیے[1]۔

---

[1] یہ صلح نامہ ۹ دفعات پر مشتمل ہے، جن کے لیے ملاحظہ ہو ہین وے (Hanway) کی Revolution of Persia Vol I. PP. 254-255 ۱۲ مصنف

نادر کا عروج ترکوں کی طرف سے افغانیوں کو جو اندیشہ تھا وہ ابھی رفع ہوا ہی تھا کہ نادر قلی کے ظہور نے (جو بعد کو نادر شاہ کے نام سے مشہور ہوا) ان کے لیے ایک اور خطرہ پیدا کردیا جو آگے چل کر ان کے حق میں بہت مہلک ثابت ہوا۔ سرزمین ایران سے یوں تو کئی حیرت انگیز اور خداداد فوجی قابلیت رکھنے والے ظالم اُٹھے، لیکن یہ شخص ان میں بھی فرد تھا۔ اگرچہ اس وقت اس کی عمر ۴۰ سال کی ہوچکی تھی، لیکن اب تک کسی نے اس کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ مگر سال زیرِ بحث (۱۷۲۷ء) میں وہ اپنے اس طبعی اور مستحکم قلعہ سے نکلا جو اس کے نام پر قلاتِ نادری[1] کہلاتا ہے، ایک افغانی فوج کو شکست دی اور شاہ طہماسپ ثانی کی طرف سے اور اس کے نام سے نیشاپور پر قبضہ کرلیا۔ شاہ طہماسپ اس زمانے میں بمقام مازندران فرح آباد میں سخت نازک حالت میں سکونت پذیر تھا، جہاں کے ایک قاچاری امیر فتح علی خان نے بہت کچھ آن بان دکھانے اور احسان جتانے کے بعد اس کی حمایت کا ذمّہ لیا تھا۔ اس فتح کے بعد نادر شاہ

فتح علی خاں قاچار کا قتل شاہِ طہماسپ سے ملا اور اس کے مزاج میں درخور ہوکر اس نے اس کو فتح علی خان قاچار کی طرف سے بدظن کردیا، چنانچہ اسے قتل کردیا گیا۔ دوسرے سال (۱۷۲۹ء) ۱۵ مئی کو بادشاہ نادر کے ساتھ (جس نے عارضی طور پر اپنا نام

---

[1] اس قلعہ کی حفاظت انتہائی احتیاط کے ساتھ کی جاتی ہے۔ لارڈ کرزن نے اسے دیکھنا چاہا تھا، لیکن اجازت نہ ملی، ملاحظہ ہو ان کی کتاب Persia, Vol (i) pp. 125-1 صفحہ ۱۲۴ خصوصاً وہ تصویر جو بلندی پر سے اس قلعہ کی لی گئی ہے ۱۲ مصنف

طہماسپ قلی رکھ لیا تھا) تزک و احتشام کے ساتھ نیشاپور میں داخل ہؤا، باشندگان شہر نے اس موقع پر نہایت مسرت اور شادمانی کا اظہار کیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد اس نے مشہد اور ہرات پر قبضہ کرلیا اور اپنا ایک سفیر قسطنطنیہ روانہ کیا، وہاں سے جواب میں ایک شخص مسمی سلیمان آفندی سفیر کی حیثیت سے ایران بھیجا گیا۔

دامغان میں اشرف کی شکست

اس اثنا میں یزد اور کرمان پر قبضہ کرنے کے بعد اشرف شاہ طہماسپ کے مقابلے کے لیے تیس ہزار فوج لے کر خراسان کی طرف بڑھا، لیکن ۲ر اکتوبر کو اسے دامغان میں نادر کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔ دوسرے سال اصفہان کے نزدیک بمقام مورچہ خور ایک اور فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں افغانوں کو پھر شکست ہوئی۔ اور ان کے بارہ ہزار

تخلیہ اصفہان اور افغانوں کے ہاتھوں شاہ حسین کا قتل۔

آدمیوں نے اصفہان کا تخلیہ کردیا، لیکن جس شہر کو وہ برباد کرچکا تھا، اُسے چھوڑنے سے پہلے اشرف نے بدنصیب شاہ معزول شاہ حسین کو قتل کردیا اور شاہی خاندان کی اکثر خواتین، نیز شاہی خزانے کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب ۹ر دسمبر کو طہماسپ ثانی اصفہان میں داخل ہؤا تو اسے وہاں صرف اپنی ضعیف والدہ نظر آئی جو ملازمہ کا بھیس بدل کر اخراج سے بچ گئی تھی۔ شہر میں ہر طرف ویرانی اور بربادی کے یہ آثار دیکھ کر طہماسپ ثانی کی آنکھیں بھر آئیں نادرشاہ نے اس کو سمجھا بجھا کر پہلے تو اپنے اختیار سے محصول عائد کرنے کی اجازت اس سے لی اور پھر ہزیمت خوردہ افغانوں کے

اِستخر کے پاس افغانوں کی شکست اور اشرف کی وفات

تعاقب میں جنوب کی طرف بڑھا اور اِستخر کے پاس انھیں آلیا۔ افغانوں کو بُری طرح شکست ہوئی اور اشرف نے شیراز سے اپنے وطن کی طرف راہ فرار اختیار کی، لیکن جاڑے کی شدت، بھوک اور جن علاقوں سے ہوتا ہُوا وہ بھاگا، وہاں کے باشندوں کی شدید مخالفت کی وجہ سے اس کی فوجیں پراگندہ اور منتشر ہوگئیں اور وہ اسیرانِ جنگ اور خزانے کو چھوڑنے پر مجبور ہُوا۔ آخرکار بلوچی قبائل کی ایک جماعت نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور اس طرح ساڑھے سال کے بعد، یعنی ۱۷۳۰ء ایران میں افغانوں کے تباہ کن تسلط کا خاتمہ ہُوا

نادر کے حالاتِ زندگی

(۱۷۴۷ء یعنی اس کی تاریخ قتل تک)

اگرچہ ۱۷۳۶ء تک نادر شاہ نے خطاب شاہی اختیار کرنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا تھا، لیکن ۱۷۳۰ء سے دراصل وہی ایران پر بادشاہی کر رہا تھا۔ اس موقع پر ہم اس کے ادنیٰ درجہ کے خاندان میں پیدا ہونے اور ابتدائی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا بیان غیر ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ہن وے (Hanway) ملکم (Malcolm) اور دوسرے مورخین ایران نے اپنی تصانیف میں ان واقعات کو کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاہ طہماسپ ابتدا ہی سے محض نام کا بادشاہ تھا، اس نے ذاتی قوتِ عمل طہماسپ کی نا اہلیت کا صرف ایک ہی مرتبہ ثبوت دیا، یعنی جب وہ ۱۷۳۱ء میں ترکوں کے مقابلے کے لیے میدان میں اُترا، لیکن اس میں اسے ایسی فاش شکست نصیب ہوئی کہ تبریز اور ہمدان دونوں اس کے قبضے سے نکل گئے اور جنوری ۱۷۳۲ء میں اسے مجبور ہوکر ترکوں کے ساتھ نہایت حقیر شرائط پر صلح کرنی پڑی، اور اس نے ارمنستان (Armenia) اور گرجستان کے علاقوں کو اس شرط پر ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے شریکِ کار ہوکر گیلان، شروان اور دربند سے روسیوں کو نکال دیں۔ نادر نے یہ خبر سُنی تو آگ بگولہ ہوکر اگست ۱۷۳۲ء میں اصفہان پہنچا، اور پہلے تو

اپنی چالوں سے طہماسپ کو نظر بند کرکے اس کے شیر خوار بچے کو (جو اس وقت صرف چھ مہینے کا تھا) شاہ عباس ثالث کے لقب سے تخت پر بٹھایا، پھر فوراً بغداد میں احمد پاشا کے نام ایک تہدید آمیز خط روانہ کیا اور اسی سال ماہ اکتوبر میں اعلان جنگ کر دیا۔

نادر کی مزید فتوحات

دوسرے سال (۱۷۳۳ء) کے ماہ اپریل میں نادر کرمان شاہ کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد آٹھ ہزار کی فوجی جمعیت کے ساتھ بغداد کے سامنے پہنچ گیا۔ لیکن ۱۸ر جولائی کو اسے شکست ہوئی اور وہ اپنی فوجوں کو تازہ دم کرنے اور نئی بھرتی کرنے کے لیے ہمدان چلا گیا۔ اسی سال، موسمِ خزاں میں اس نے دوبارہ حملہ کیا، اور ۲۶۔ اکتوبر کو ایک سخت معرکے کے بعد ترکوں کو شکست دی اور ان کا بہادر اور شریف النفس سردار طوپال عثمان اس جنگ میں کام آیا۔ اہلِ فارس نے اس عرصہ میں معزول شاہ طہماسپ کی حمایت میں بغاوت کر دی تھی۔ اسے فرو کرنے کے بعد نادر نے ۱۷۳۴ء میں گرجستان پر حملہ کر دیا۔ طفلس، گنجہ اور شماخی فتح کر لیے اور روس سے گیلان، شروان، دربند، باکو اور رشت واپس لے لیے۔ دوسرے سال (۱۷۳۵ء) اس نے پھر ترکوں کو اریوان کے پاس شکست دی اور اس پر نیز ارز روم پر قبضہ کر لیا۔

نادر کی بادشاہی کا اعلان

عیدِ نوروز (۲۱ر مارچ ۱۷۳۶ء) کے موقع پر نادر نے فوجوں اور قوم کے نمایندوں کو جمع کرکے شیر خوار شاہ عباس ثالث کی موت کا اعلان کیا اور انھیں

دعوت دی کہ تین روز کے اندر یہ تصفیہ کرلیں کہ آیا شاہ عباس ثالث کا والد یعنی معزول شاہ طہماسپ دوبارہ تخت پر بٹھایا جائے، یا ایک نئے بادشاہ کا انتخاب کیا جائے۔ اس بارے میں اس کی ذاتی خواہش جو کچھ ہوگی، وہ محتاجِ اظہار نہیں ہے۔ اور اس کے اکثر افسر اور سپاہی بھی اس کے ہم خیال تھے۔ غرض کہ مخالفوں کی قلیل تعداد مرعوب ہوگئی اور باتفاق رائے تاجِ ایران اس کی خدمت میں پیش کیا گیا جسے اس نے تین شرطوں پر قبول کیا (۱) اس کے خاندان میں بادشاہت موروثی قرار دی جائے۔ (۲) صفویہ کے عود کا چرچا تک نہ ہونے پائے اور اگر اس خاندان کا کوئی فرد تخت کا دعوے دار ہو تو نہ کوئی اس کی مدد کرے۔ نہ کسی قسم کی حوصلہ افزائی کرے، اور نہ اپنے یہاں پناہ دے۔ (۳) پہلے تین خلفا، پر تبرّا بازی، ماتمِ حسین اور مذہبِ شیعیت کے دوسرے مخصوص مراسم ترک کردیے جائیں۔ یہ آخری شرط ایرانیوں کو بہت ناگوار تھی۔ اور جب مجتہد العصر سے اس بارے میں استفتا ہوا تو انھوں نے بھی صاف صاف فتوے دے دیا کہ یہ حکم "فلاحِ مومنین کے منافی ہے" لیکن یہ صاف بیانی ان کے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور نادر کے حکم سے فوراً انھیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ نادر نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ قزوین پہنچ کر درگاہوں کے تمام اوقاف اپنی فوج کے مصارف کے لیے منضبط کرلیے اور کہا کہ ایران پر پیروں سے کہیں زیادہ فوجیوں کا حق ہے۔ ختمِ سال پر اس نے ترکوں کے ساتھ اچھی اور فائدہ بخش شرطوں پر صلح کی جس سے ایران کو اپنے تمام صوبے جو نکل چکے تھے،

دوبارہ حاصل ہوگئے۔ اسی سال، دسمبر کے مہینے میں اس نے اپنے بیٹے رضا قلی کو اپنا نائب بناکر ایران میں چھوڑا اور خود ایک لاکھ فوج لے کر افغانستان اور ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا۔

نادر کی ہندوستانی جنگیں (۱۷۳۸ء-۱۷۳۹ء)

آیندہ دو سالوں یعنی ۱۷۳۸ء-۱۷۳۹ء میں اس نے اپنا سب سے بڑا فوجی کارنامہ دکھایا:- یعنی حملۂ ہندوستان، لاہور، اور دہلی کا فتح کرنا اور بے شمار مالِ غنیمت، روپیہ اور اجناس کے ساتھ جو اس نے بدنصیب ہندوستانیوں سے چھینا تھا ایران واپس آنا۔ ہین وے (Hanway) نے[1] اس مالِ غنیمت کا اندازہ پونے نو کرور پونڈ کیا ہے۔ ۱۷۳۸ء میں اس نے قندھار، کابل اور پشاور فتح کیے اور دوسرے سال کے شروع میں دریائے سندھ عبور کرکے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ فروری ۱۷۳۹ء میں اس نے کرنال کے میدان میں محمد شاہ کی دو لاکھ ہندوستانی فوجوں کو شکستِ فاش دی اور بغیر کشت و خون کے دہلی پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن چند روز بعد شہر میں بلوہ ہُوا جس میں نادر کے کچھ سپاہی مارے گئے اور اس نے ان کا انتقام لینے کے لیے دہلی کے باشندوں کے قتلِ عام کا حکم دیدیا جو آٹھ بجے صبح سے تین بجے سہ پہر تک برابر جاری رہا اور جس میں ایک لاکھ دس ہزار آدمی مارے گئے۔ چونکہ ہندوستان کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کا اسے کوئی خیال نہ تھا، اس لیے مذکورہ بالا تاوان وصول کرکے اور بدنصیب محمد شاہ

---

[1] Revolution of Persia جلد دوم ص۱۸۵۔ وہ کہتا ہے کہ ہندستان کو سب ملاکر ۱۲ کروڑ پونڈ کا مالی نقصان ہُوا اور دو لاکھ جانیں ضائع ہوئیں (ص۱۱۱) ۱۲ مصنف

کو اس دھمکی کے ساتھ تخت پر بٹھاکر کہ اگر ضرورت پڑی تو میں پھر آؤں گا، وہ ماہ مئی میں واپس ہوگیا۔ اثنائے راہ میں سیدھے راستہ سے ہٹ کر وہ خیوا اور بخارا کے سرکش اُزبکوں کی گوشمالی کے لیے ان شہروں کی طرف متوجہ ہُوا اور ۲۸ نومبر ۱۷۳۹ء کو بخارا پر قبضہ کرلیا۔

نادر کے بیٹے رضا قلی کی بغاوت اور اس کا اندھا کیا جانا۔ نادر کی عدم موجودگی میں اس کے بیٹے رضا قلی نے بمقام سبزوار بدنصیب طہماسپ اور اس کے اکثر اراکینِ خاندان کو قتل کردیا اور باپ نے جو اختیارات عارضی طور پر اس کے تفویض کیے تھے، اُنھیں مستقلاً اپنے ہاتھ میں رکھنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ اس شبہ میں کہ اس نے نادر کو قتل کرنے کی سازش کی تھی (جو کامیاب نہیں ہوئی) اسے اندھا کردیا گیا۔ لیکن اس ظالمانہ فعل کے ارتکاب

نادر کے مذہبی خیالات کے بعد ہی سے اقبال اور ظفر نے جو اب تک نادر کے ہمراہِ رکاب تھے، یاوری چھوڑ دی۔ کچھ تو اس کے روز افزوں مظالم، بے رحمی، حرص و آز اور استحصال ناجائز کی وجہ سے، لیکن سب سے زیادہ اس سبب سے کہ اس نے اپنی شیعہ رعایا کو بجبر سُنّی عقاید کا پابند بنانا چاہا تھا، لوگوں میں دن بدن اس کی طرف سے نفرت کے جذبات بڑھنے لگے۔ دوسری بدعتوں کے علاوہ ایک بدعت اس نے یہ کی کہ قرآن اور انجیل کے فارسی ترجمے کرائے۔ انجیل کے ترجمے کے لیے کئی عیسائی نوکر رکھے گئے تھے۔ جب اس نے اس ترجمے کو طہران میں پڑھواکر سنا تو کہا

کہ فرصت ملی تو میں بھی (غالباً اکبر کے نمونے کا) ایک نیا مذہب
بناؤں گا جو یہودیت، مسیحیت اور اسلام تینوں مذاہب کو میدان
سے ہٹادے گا[۵]۔ اس زمانے میں اس کی فوج کشیاں بھی ناکام ہونے
لگیں۔ ۱۷۴۱ء، ۱۷۴۲ء میں لازگیوں سے جو جنگ وہ لڑا، وہ باردور
نہ ہوئی۔ اسی طرح سے ۱۷۴۳ء میں ترکوں سے جو جنگ اسے کرنا پڑی
اس میں وہ موصل پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ فارس
اور شروان میں جو بغاوتیں ہوئیں وہ بھی بہ دقّت اور بہت کچھ
کشت و خون کے بعد فرو ہوئیں۔ لیکن ۱۷۴۴ء میں بمقام استرآباد
اس نے قاچاریوں کی شورش کو دبادیا اگست ۱۷۴۵ء میں اریوان کے
پاس ترکوں کو ایک گھمسان لڑائی کے بعد شکست دی اور ۱۷۴۶ء
میں ان کے ساتھ مناسب شرائط پر صلح کرلی۔ دوسرے سال وہ
کرمان گیا جہاں اس کے مظالم اور استحصال ناجائز کی وجہ سے
ایک آفت برپا ہوگئی۔ وہاں سے روانہ ہوکر اواخر مئی ۱۷۴۷ء میں
وہ مشہد پہنچا۔ چونکہ اس کی فوج کے اکثر سپاہی ترکمان اور اُزبک
تھے اور سُنّی مذہب رکھتے تھے، اس لیے مشہد پہنچ کر اس نے اپنے تمام
ایرانی افسروں اور سپاہیوں کو قتل کردینے کا ناپاک منصوبہ باندھا،
لیکن ایک گرجی غلام نے اس کی اس نیت کی خبر چند ایرانی افسروں
کو کردی جنھوں نے بغحوائے فارسی ضرب المثل "پیش ازیں کہ برما
شام کند، بہ او صبح کنیم" دوسرا انتظام کرلیا۔ چنانچہ ایک شخص مسمّی

---

[۵] ملاحظہ ہو سرجان ملکم کی History of Persia (ed. 1815)
جلد دوم ص۱۰۲ ۔ ۱۲ مصنف

صالح بیگ نے چار معتبر اور معتمد علیہ آدمیوں کو ساتھ لے کر اس کا بیڑا اُٹھایا[1] اور رات کے وقت نادر کے خیمے میں داخل ہو کر، اسے قتل کیا۔ اور اپنے ملک کو ایک ایسے شخص کے وجود سے پاک کیا جس نے اگرچہ شروع میں ایران کو افغانی سیادت سے نجات دلائی تھی، لیکن اب اسے اس سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت جوئے کے نیچے دبا کر کچل دینا چاہتا تھا۔

نادر کا قتل
۲۰۔جون ۱۷۴۷ء

نادر شاہ اپنی وفات کے وقت ۶۱ سال کا تھا، اور گیارہ سال تین ماہ تک حکومت کر چکا تھا (۱۷۳۶ء۔۱۷۴۷ء)۔ نادر کے بعد اس کا بھتیجا علی قلی خان عادل شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا، لیکن دوسرے سال اسے اپنے بھائی ابراہیم کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ مار ڈالا گیا۔ خود ابراہیم کو بھی ایک سال بعد (۱۷۴۹ء) نادر کے پوتے شاہ رُخ کے ہوا خواہوں نے قتل کر دیا۔ شاہ رُخ بدنصیب رضا قلی خان کا بیٹا تھا اور ایک صفوی شہزادی یعنی شاہ حسین کی بیٹی کے بطن سے تھا اب وہ تخت پر بیٹھا

نادر کے بعد ملک میں ابتری۔

---

[1] تاریخ بعد نادریہ (مرتبہ آسکر مین مطبوعہ لندن ۱۸۹۱ء) ص۱۵ الخ میں اس واقعہ کا بیان بہت شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے بموجب، خاص سازشی یہ چار تھے:- محمد خان قاچار، موسےٰ بیگ افشار، قوجہ بیگ ۔ غندوزلو اور محمد صالح خان، یہ لوگ اپنے ساتھ ستر نوجوان رضاکاروں کو بھی لے گئے تھے، لیکن سوائے چار شخصوں کے اور کسی کی ہمّت نادر کے خیمے میں داخل ہونے کی نہ ہوئی۔ نادر کا قتل یکشنبہ ۱۱ر جمادی الثانی ۱۱۶۰ھ (۲۰ر جون ۱۷۴۷ء) کو ہوا۔ ۱۲ مصنف

وہ کم عمر، حسین اور نیک مزاج[ا] تھا۔ لیکن بدنصیبی کے آگے ان صفات میں سے کسی ایک کی بھی پیش نہ گئی۔ اور تخت نشینی کے تھوڑے ہی دن بعد ایک شخص مسمی سید محمدؐ نے جو صفوی بادشاہ شاہ سلیمان ثانی کا نواسا تھا، اسے اندھا کرکے تخت سے اُتار دیا۔ سید محمدؐ بھی اس عالمگیر بدنظمی اور بد امنی کا شکار ہونے سے نہ بچ سکا جو اس زمانے میں ایران میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی، شاہ رُخ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا، پھر معزول کیا گیا اور تیسری مرتبہ پھر بٹھایا گیا۔ اب وہ مشہد میں بیٹھ کر صوبۂ خراسان پر برائے نام بادشاہی کرنے لگا۔ یہی وہ صوبہ تھا جسے احمد خان ابدالی (جو بعد کو احمد شاہ دُرّانی کے نام سے مشہور اور موجودہ سلطنت افغانستان کا بانی ہوا[۲]) ایران چھوڑنے سے پہلے ایک ایسی حجابی[۳] سلطنت بنا دینا چاہتا تھا جو اس کے ملک (افغانستان) اور ایران کے درمیان حایل رہے۔ نابینا شاہ رُخ کی طویل حکومت کا بقیہ حصّہ اہم واقعات سے خالی ہے، اور پچاس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۹۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[ا] ملاحظہ ہو ملکم کی تاریخ جلد دوم صلااا ۔ ۱۲ مصنف

[۲] ۱۹۲۸ء میں امان اللہ خان کے تخت سے ہٹنے کے بعد دُرّانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اب نادر شاہ غلزئی کی حکومت ہے ۱۲ مترجم

[۳] Buffer State کا ترجمہ ہے یعنی وہ سلطنت جو دو سلطنتوں کے بیچ میں حجاب کی طرح حائل رہے۔ ۱۲ مترجم

خاندان زند
(سنہ ۱۷۵۰ء تا سنہ ۱۷۹۴ء)

کریم خان زند کی اعلیٰ صفات

سر جان ملکم لکھتا ہے[۱]:-

"موجودہ حکمران خاندان کے بانی آقا محمد خان کے عروج کے زمانے تک تاریخ ایران میں اگر کوئی نمایاں چیز نظر آتی ہے تو صرف کریم خان زند کی شخصیت ہے۔ اس بے نظیر بادشاہ کے مبارک عہد کا مقابلہ جب اس کے پیش روؤں اور جانشینوں سے کیا جاتا ہے تو مورخ کو مسرت بخش اطمینان کی بالکل وہی کیفیت محسوس ہوتی ہے جو کسی خستہ حال مسافر کو بے آب و گیاہ ویرانوں کے سفر صعب کے بعد کسی خوش منظر اور فرح بخش وادی میں پہنچ کر ہو۔ کریم خان کے جیسے سردار کے حالات لکھنے میں قلم کو خاص لطف اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوا لیکن اس خوبی کے ساتھ عروج و اقتدار کے انتہائی مدارج تک پہنچا کہ اس کے دامنِ شہرت پر ایک داغ معصیت بھی لگنے نہ پایا۔ اس نے اپنے اقتدار اور قوت کو ایسی خوش اسلوبی اور اعتدال کے ساتھ استعمال کیا جو اس زمانے کے حالات کے اعتبار سے

[۱] History of Persia Vol. II. P 115 ۱۲ مصنف

اتنا ہی عجیب و غریب اور نا قابلِ یقین نظر آتا ہے جتنی اس کی نیک دلی اور عدل پروری"۔

کریم خان کے دو حریف۔ کریم خان نے شیراز کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا تھا اور اس شہر کی آرائش اور زیبائش میں اس نے ایسی کوشش کی تھی کہ آج تک وہاں کے لوگ اسے احسان مندی کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اس کی حدودِ حکومت ساری مملکتِ ایران پر کبھی محیط نہیں ہوئیں اور اس نے کبھی شاہ کا لقب بھی اختیار نہیں کیا، بلکہ "وکیل" کے لقب ہی پر قناعت کی۔ ابتداءً وہ اور ایک اور بختیاری سردار مسمی علی مردان خان دونوں شاہ حسین کے "کسی حقیقی یا فرضی پوتے"[1] کے مشترکہ طور پر وکیل تھے اور اس کے نام سے اصفہان پر قبضہ کرکے اسے تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن ان دونوں میں بہت جلد نا اتفاقی ہوگئی، علی مردان خان مارا گیا اور کریم خان حقیقی معنوں میں جنوبی ایران کا حکمران بن گیا۔ اس کے خاص حریف دو تھے:۔ ایک تو افغانی سردار آزاد، آذربائجان اور شمال مغرب میں، دوسرا محمد حسن قاچار یعنی اس فتح علی خان کا بیٹا جسے نادر نے اپنے دور کے شروع میں مار ڈالا تھا۔ یہی محمد حسن قاچار آقا محمد خان بانی قاچاریہ کا باپ تھا اور بحیرۂ خزر کے صوبجات میں رہتا تھا۔

افغانی سردار آزاد نے بساط خالی کر دی۔ سب سے پہلا شخص جو اس سہ رُخی کش مکش سے خارج ہوا، آزاد افغان تھا،

[1] ملاحظہ ہو واٹسن کی History of Persia صفحہ ۴۵ - ۱۲ مصنف

شروع میں تو اس نے کریم خان زند کو شکست دے کر، اسے نہ صرف اصفہان بلکہ شیراز کا تخلیہ کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا، لیکن اس نے غلطی یہ کی کہ اس کے تعاقب میں بے تحاشا آگے بڑھتا چلا گیا اور جب کمارج کے پہاڑوں میں، ایک درے میں پہنچا، تو دشمن کی گھات میں آ گیا، اس کے اکثر ساتھی مارے گئے۔ اور آخر کو مجبور ہو کر پہلے اس نے بغداد کے پاشا اور پھر ہرقل شہزادۂ گرجستان کے پاس پناہ لی لیکن جب کہیں سر چھپانے کا موقع نہ ملا تو مجبور ہو کر

"کریم خان کا دامن عفو تھاما جس نے اسے بہت مہربانی سے اپنے پاس مہمان رکھا، اپنے اعلیٰ امیروں کے برابر منصب عطا کیا اور اس پر اس قدر فیاضانہ اعتماد اور اعتبار کیا کہ یہ دشمن جانی، دوست صادق بن گیا۔"[۵]

کریم خان اپنے قاچاری حریف کو شکست دیتا ہے

جنگ کمارج کے چار سال بعد ۱۷۵۸ء میں کریم خان کو اپنے دوسرے حریف محمد حسن خان قاچار کے زبردست حملے کی مدافعت کرنی پڑی۔ محمد حسن خان کو پہلے تو نمایاں کامیابی ہوئی، لیکن بعد کو وہ پسپا ہوا اور مازندران کی طرف بھاگ کھڑا ہوا جہاں ۱۷۵۸ء میں کریم خان کے سپہ سالار شیخ علی خان نے اسے شکست دے کر مار ڈالا۔ اس زمانے سے لے کر اپنی وفات تک کے زمانے یعنی ۱۷۷۹ء کے موسم بہار تک کریم خان بجز خراسان کے جہاں

---

[۵] ملاحظہ ہو ملکم کی تاریخ ایران جلد ۲ صفحہ ۱۲۵ اس سے پہلے کے دو صفحات میں مصنف نے بڑی خوبی کے ساتھ جنگ کمارج کی لفظی تصویر کھینچی ہے۔ ملکم نے جن لوگوں سے اس جنگ کے حالات معلوم کیے وہ شریک جنگ رہ چکے تھے۔ ۱۲ مصنف

اب تک نابینا اور کمزور شاہ رُخ برائے نام بادشاہ تھا، سارے ایران پر حکومت کرتا رہا۔ اس کے زمانے کی سب سے بڑی فوجی مہم وہ تھی جس میں اس کے بھائی ایرانیوں نے بصرہ فتح کرلیا صادق نے ۱۷۷۶ء میں ترکوں سے بصرہ چھین لیا تھا۔ کریم خان کی وفات تک بصرہ کا انتظام صادق ہی کے ہاتھ میں رہا، لیکن جب کریم خان مرگیا تو صادق نے اسے ترکوں کے حوالے کردیا اور خود اس جنگ برادرانہ میں شریک ہونے کے لیے چلا آیا جو اب ایرانی تخت و تاج کے لیے شروع ہوگئی تھی[1]

کریم خان کی وفات اور آقا محمد خان کا فرار

"کریم خان کی وفات کے بعد جو واقعہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اہم ترین سمجھا جا سکتا ہے وہ آقا محمد خان کا فرار تھا جو کئی سال سے شہر شیراز میں زیر حراست تھا"[2]

جب آقا محمد خان بچہ تھا تو نادر کے بھتیجے عادل شاہ کے ظالمانہ حکم سے اسے بالکل مختون کردیا گیا تھا[3] اور یہی وجہ ہے کہ آقا یا آغا کا لفظ جو عام طور پر خواجہ سراؤں کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس کے نام کا جزء بن گیا۔ ۱۷۵۸ء میں جب اس کے باپ محمد حسن خان قاچار کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا تو آقا محمد خان کریم خان کے ہاتھ آگیا

---

[1] ملاحظہ ہو علی رضا کی تاریخ زندیہ Ed. Ernest Beer Leyden, 1888 ص ۲، مصنف

[2] ملکم کی تاریخ ایران جلد ۲ ص ۱۵۵، مصنف

[3] ملکم کی تاریخ ایران جلد ۲ ص ۲۶۳، مصنف

جس نے اسے شیراز میں نظر بند کردیا، لیکن حفاظت اور حراست کی احتیاطوں کے علاوہ اور ہر طرح سے اس کے ساتھ مہربانی کا بلکہ فیاضانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اس کو نواح شیراز میں شکار کھیلنے کی بھی اجازت تھی اور صرف اتنی پابندی تھی کہ رات کے وقت شہر پناہ کے دروازے بند ہونے سے پہلے واپس آجایا کرے۔ ۱۲ صفر ۱۱۹۳ھ مطابق یکم مارچ ۱۷۷۹ء کو جب وہ رات کے وقت شہر واپس آیا تو اسے اپنی بہن سے جو شاہی محل میں رہتی تھی، معلوم ہوا کہ کریم خاں بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اس نے اپنے ایک باز کو جسے وہ نہایت عزیز رکھتا تھا، اُڑا دیا اور اس کو پکڑنے کے بہانے سے رات کو شہر کے باہر میدان میں رہنے کی اجازت حاصل کرلی۔ دوسرے دن طلوع آفتاب سے دو ساعت پہلے[1] جب اسے معلوم ہوا کہ کریم خان کا انتقال ہوچکا ہے تو شہر کی عام ابتری اور پریشانی سے فائدہ اُٹھاکر وہ موقع پاکر شمال کی طرف چل دیا اور جلدی جلدی منزلیں طے کرتا ہوا تیسرے روز اصفہان جا پہنچا[2] وہاں سے اس نے مازندران کی راہ لی۔ یہی مقام ان تمام آئندہ کارروائیوں کا مرکز اور مستقر بننے والا تھا جن کی مدد سے اس نے پندرہ سال بعد خاندان زندیہ کا بالکل خاتمہ کردیا اور اپنے خاندان کو وہ عروج بخشا کہ آج تک حاصل ہے۔

---

[1] تاریخ زندیہ صفحہ ۶ سطر ۱۰ ۔۔۔ ۱۲ مصنف

[2] ملکم کی تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۱۵۵ الخ ۱۲ مصنف

کریم خان کے جانشین | اس موقع پر ان برادرانہ جنگوں کا بیان غیر ضروری معلوم ہوتا ہے جو دس سال تک (۱۷۷۹ء ۔ ۱۷۸۹ء) اندر ہی اندر خاندانِ زندیہ کی قوت کو سلب کرتی رہیں۔ اس زمانے میں آقا محمد خان کمال ضبط اور تدبر کے ساتھ قاچاریہ کی قوت کو متحد اور مستحکم بناتا رہا۔ جس سال کریم خان کی وفات ہوئی اسی ایک سال کے اندر اس کے خاندان کے چار افراد یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے، یعنی اس کا بیٹا ابوالفتح، اس کا بھتیجا علی مراد، محمد علی (اس کا بیٹا) اور صادق اس کا بھائی۔ علی مراد نے ۱۷۸۲ء میں صادق اور اس کی سب اولادوں کو، باستثنائے جعفر قتل کر دیا اور دوبارہ تخت نشین ہو گیا لیکن جنوری ۱۷۸۵ء میں اصفہان کے پاس بمقام مورچہ خور اس کا انتقال ہو گیا۔ اب جعفر تخت نشین ہوا اور حاجی سلیمان کاشی المتخلص بہ صباحی نے ذیل کی بدیع رباعی میں اس کے جلوس کا مادہ تاریخی نکالا[۱] ۔ ؎

بضبطِ سالِ جلوسِ مبارکِ میموں
کہ ہست مبدار تاریخ عشرتِ دوران
نوشت کلک صباحی ۔ زقصر سلطانی
علی مراد بروں شد نشست جعفر خان

قصر سلطانی میں سے علی مراد کے اعداد نکال کر باقی ۱۹۵ میں
۵۵۰ ۳۵۵

جعفر خاں کے اعداد (۱۰۰۴) شامل کیے جائیں تو مادۂ تاریخی یعنی ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) متخرج ہوتا ہے۔

---

[۱] تاریخ زندیہ ص۲۴ ۔ ص۲۵ ۔ ۱۲ مصنف

خاندانِ زندیہ کا آخری تاجدار لطف علی خان	جعفر خاں ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ (۲۳ جنوری ۱۷۸۹ء)

کو قتل کر دیا گیا اور اس کا بہادر، لیکن بدنصیب بیٹا لطف علی خان اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ سر ہارفورڈ جونس برجز نے (Sir Harford Jones Brydges) اس کا حال نہایت دلکش پیرایہ میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[1]:-

"مجھے امید ہے کہ اگر میں اس شریف النفس شخص لطف علی کی حکومت اور بدنصیبی کی داستان کسی قدر طوالت کے ساتھ بیان کروں تو میرے ناظرین مجھے معاف کریں گے۔ جس طرح اس کے زمانۂ حکومت میں مجھے اس کے الطاف و عنایات سے بہرہ اندوز ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا، اسی طرح اس زمانے میں بھی جب وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا بھاگا پھرتا تھا، ایک بوسیدہ خیمے کے نیچے ایک ہی زین پوش پر بیٹھ کر اس کے ساتھ باتیں کرنے کی سعادت بھی مجھے نصیب ہو چکی ہے۔ اس کی نیکیوں نے رعایا کا دل موہ لیا تھا اور مصیبت کے زمانے میں جس بہادری، استقلال، ہمت اور قابلیت کا ثبوت اس نے دیا وہ سب آج تک نظموں میں اور عوام کے گیتوں میں

---

[1] The Dynasty of Kajars etc. (London 1833) PP CXX-CXXI

انھوں نے لطف علی خان کو سب سے پہلے شیراز میں ۱۷۸۷ء میں دیکھا تھا۔ (مصنف)

محفوظ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک فارسی زبان زندہ ہے، یہ چیزیں بھی زندہ رہیں گی۔ وہ اگر اپنے تنعم اور کامرانی کے زمانے میں جواں مرد، نیک دل، اور ہر دل عزیز تھا، تو ان سخت ترین مصیبتوں میں بھی جو انسان پر پڑ سکتی ہیں وہ عالی وقار، متحمل اور الوالعزم رہا۔ جائے عبرت ہے کہ ایک ایسے شریف النفس انسان، ایک ایسے شہزادے پر جو فخرِ وطن ہو اور ملک کی آرزو کا چمن جس کی وجہ سے ہرا بھرا ہو، ایک ایسے غدار اور نابکار شخص[1] کے ہاتھوں مصیبت آئے جو اس کی سادہ دلی کی وجہ سے اس کا معتمد علیہ بنا ہوا تھا۔ اس کا خاتمہ ایسی ایسی جسمانی ایذائیں دے کر اور ذلتوں سے کیا جائے جس کو سن کر فطرتِ انسانی کانپ کانپ اُٹھتی ہے، اس کا معصوم بچہ قوت رجولیت سے محروم کر دیا جائے اس کی لڑکیوں کی شادی بجبر ذلیل ترین اشخاص کے ساتھ کردی جائے، اس کی بیوی، ملکہ کی آبرو دریری کی جائے۔ افسوس! سب باتیں سوائے مشیت ایزدی

---

[1] یعنی مردود روزگار حاجی ابراہیم۔ سر ہ۔ برجز اپنی کتاب (Account H. M. Missions etc. Vol. I, PP. 95-96) میں لکھتے ہیں:-

"اس بے ایمان کی کورانہ حرص و آز اور سیہ قلبی کی وجہ سے اس کے بادشاہ پر جو اس پر اتنا اعتماد کرتا تھا، تباہی آئی اور خود اس کے ابنائے ملک کو بھی شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔"

اور مصالح خداوندی کے اور کیا کہی جاسکتی ہیں، لیکن خواہ
ہم کو ان مصلحتوں میں دخل دینے اور دم مارنے کی
مجال نہ ہو، مگر ان پر تعجب کیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔"

لطف علی خاں کا تہور، شجاعت اور مصایب

یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے پاس تیرہ بخت لطف علی خان کے متعلق جو شاہانِ ایران میں آخری جوان مرد بادشاہ تھا، مذکورہ بالا منصفانہ اور بے لاگ بیان موجود ہے۔ ہم نے اس چیز کو خوش قسمتی اس وجہ سے کہا ہے کہ اس کے جن ہم وطنوں نے اس کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں، وہ سب کے سب اس کے سنگ دل دشمن آقا محمد خان کی فتح کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خود ان مصنفین کے ذاتی خیالات لطف علی خان کی طرف سے کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، لیکن اس ظالم قاجار کی ناراضی کے ڈر سے ان کو یہ جرأت نہ ہوسکتی تھی کہ اِس بدقسمت شہزادے کی تعریف کریں۔ خاندانِ زندیہ کا عروج اگرچہ چار دن کی چاندنی ضرور تھا لیکن اس کا آغاز اور انجام دونوں بہت اچھے تھے۔ اگر اس خاندان کا پہلا بادشاہ (کریم خان زند) شاہانِ ایران کے طویل سلسلے کا بہترین بادشاہ تھا تو اس کا آخری نام لیوا، لطف علی خان، ان میں سب سے زیادہ بہادر اور جوان مرد تھا۔

موجودہ خاندان قاچاریہ

(۱۷۹۶ء سے آج تک[1])

آقا محمد خان
تاریخ قتل ۱۷۔ جون ۱۷۹۷ء

چونکہ موجودہ حکمران خاندان قاچاریہ کے متعلق تفصیلی کوائف و وقایع پہلے ہی سے انگریزی داں ناظرین کے سامنے موجود ہیں، اس لیے اس موقع پر اس خاندان کی تاریخ کو مجملاً بیان کرنا بھی غیر ضروری ہے[2]۔ آقا محمد خاں نے

[1] خاندان قاچاریہ کا خاتمہ ۱۹۲۵ء میں احمد شاہ قاچار کی معزولی اور رضا شاہ خاں پہلوی کی تخت نشینی سے ہوا، پروفیسر براؤن مرحوم اس انقلاب سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے ۱۲ مترجم

[2] سر ہارفورڈ جونس بریجز (Sir Harford Jones Brydges) کی تصنیف "Dynasty of the Kajars" (سلسلہ قاچاریہ) مترجمہ از اصل طبع لندن ۱۸۳۳ء کے شروع میں ایک نہایت پُر معلومات مقدمہ ہے جو ص xiii سے ص cxcl تک حاوی ہے۔ اصل کتاب جس کا یہ ترجمہ ہے یعنی مآثر السلطانیہ تبریز میں رجب ۱۲۴۱ھ (مارچ ۱۸۲۶ء) میں شایع ہوئی تھی اور اُس سال تک کے واقعات پر حاوی ہے، لیکن بریجز کا ترجمہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء۔۱۸۱۲ء) کے حالات پر ختم ہو جاتا ہے اور خصوصًا اس کے آخری حصے میں اصل کے مطبوعہ نسخے سے کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ سر جان ملکم کی تاریخ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) پر ختم ہوتی ہے۔ آر۔ جی۔ واٹسن (R. G. Watson) کا اعلیٰ درجے کا مقالہ ۱۸۰۰ء۔۱۸۵۸ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ایران کی جدید ترین تاریخ مصنفہ سر پرسی مولس ورتھ سائکس (Sir Percy Molesworth Sykes) (بار دوم، لندن ۱۹۲۱ء) اپنے سال طباعت تک کے واقعات پر حاوی ہے۔ ۱۲ مصنف

۱۷۹۵ء میں اپنی تاجپوشی کی رسم ادا کی اور دوسرے ہی سال اسے قتل کر دیا گیا، یعنی اس کے سر پر تاجِ ایران صرف ۱۵ ماہ تک رہا[1]۔ لیکن حقیقی معنٰی میں اس کی حکومت ۱۷۷۹ء ہی میں یعنی کریم خان کے انتقال کے بعد سے شروع ہو گئی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا " میں اپنے کو اس وقت تک شاہ کے لقب کا مستحق نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ قدیم سلطنت ایران کی جملہ حدود میں میرا حکم نہ چلے[2]" چنانچہ جب وہ گرجستان فتح کر چکا تب شاہ کا لقب اختیار کرنے پر راضی ہوا۔ سر جان[3] ملکم نے اس کی صورت اور سیرت کو نہایت قابلیت اور جامعیت کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"آقا محمد خان ترسٹھ سال کی عمر میں قتل کر دیا گیا۔ اس نے ایران کے بڑے حصّے پر بیس سال سے زیادہ حکومت کی لیکن سارے ملک کی پوری پوری بادشاہت اسے صرف چند ہی دن کے لیے نصیب ہوئی۔ وہ اتنا کم رُو تھا کہ دُور سے چودہ پندرہ برس کا لڑکا معلوم ہوتا تھا، اس کا بے ریش اور جُھریوں دار چہرہ بالکل بُڑھیا عورتوں کے چہرے کی طرح تھا۔ ایک تو وہ پہلے ہی سے ہنس مُکھ نہ تھا اور پھر جب اس کے بشرے پر غصّہ کے بادل چھا جاتے (جو اکثر ہوتا) تو اس کی ہیئت بالکل ہی دہشت ناک ہو جاتی۔ اس کو اپنی

---

[1] نادر کی طرح سے اس کی تخت نشینی کا اعلان بھی میدانِ موقان میں ۱۷۹۶ء کے موسمِ بہار میں ہوا اور ۱۷ جون ۱۷۹۷ء کو اسے قتل کر دیا گیا۔ ۱۲ مصنف

[2] ملکم کی تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۲۸۶ ۱۲ مصنف

[3] ملکم کی تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۳۰۲-۳۰۳ ۱۲ مصنف

بدصورتی کا احساس تھا اور کسی کا اپنی طرف نظر بھر کر دیکھنا اسے گوارا نہ ہوتا تھا۔ اس شہزادے پر بچپن میں بہت ظلم ہُوا تھا اور اس نے بہت مصیبتیں اُٹھائی تھیں اور غالبًا انھیں واقعات کی یاد نے اس کی ساری زندگی پر یہ رنگ چڑھایا۔ قوت کے اعتبار سے اس کے جذبات میں پہلا نمبر حُبِ اقتدار کا تھا، اس کے بعد حرص اور پھر انتقام۔ ان تینوں جذبات کی حالت میں وہ آپے سے باہر ہوجاتا تھا اور یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے ایندھن کا کام دیتے تھے۔ لیکن جب کبھی ان میں تصادم ہوتا تو حُبِ اقتدار کا جذبہ حرص و انتقام کے جذبات پر حاوی ہوجاتا تھا۔

دوسروں کے خصایل اور مزاج کے پہچان لینے کا اس میں خاص ملکہ تھا، اسی طرح سے اپنے دل کے بھیدوں کو دوسروں سے چھپائے رکھنے کا بھی اس میں خاص سلیقہ تھا۔ اور انھیں دونوں صفات کی وجہ سے اسے اپنے دشمنوں کو زیر کرنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ جب داؤں گھات سے کام نہ چلتا، تب وہ اپنے دشمنوں کے خلاف قوت کا استعمال کرتا اور جنگ میں بھی اس کی تلوار کی کاٹ سے زیادہ اس کی چالیں کارگر ہوتی تھیں۔ جب اس کے معتبر ترین وزیر[1] سے پوچھا گیا کہ کیا آقا محمد خان بہادر ہے تو اُس نے

[1] یعنی مردِ روزگار حاجی ابراہیم جس نے خود سرجان ملکم کے سامنے یہ رائے ظاہر کی تھی۔ ۱۲ مصنف

جواب دیا "بے شک، لیکن اب تک مجھے ایک واقعہ بھی ایسا
یاد نہیں ہے جس میں اسے اپنی بہادری سے کام لینے کی ضرورت
پڑی ہو" اس کے بعد نہایت جوش سے اُس نے اس ٹکڑے
کا اضافہ کیا: "اعلیٰ حضرت کا دماغ اُن کے ہاتھوں کے لیے
کوئی کام باقی ہی نہیں چھوڑتا۔"

آقا محمد خان کے بعد اس کا زن مرید اور کثیر الاولاد بھتیجا فتح علی شاہ[۵]

فتح علی شاہ کا عہدِ حکومت ۱۷۹۷ء - ۱۸۳۴ء

تخت نشین ہوا۔ وہ خرلیص اور خود نما تھا اور اپنے خوبصورت چہرے اور لمبی ڈاڑھی پر اسے بہت ناز تھا۔ لیکن (کم از کم اپنے مرحوم چچا کے مقابلے میں) وہ فطرتاً ظالم نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ پرانے دستور کے مطابق مجرموں اور قصورداروں کو اسی کے سامنے قتل کیا جاتا تھا، لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر وہ منہ پھیر لیا کرتا تھا تاکہ بدنصیب مقتول کی حالت نزع اپنی آنکھوں

---

[۵] ناسخ التواریخ کے بیان کے مطابق فتح علی شاہ سے ۷۰ سالہ زمانۂ پختگی میں دو ہزار اولادیں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ہوئیں۔ یہی مورخ لکھتا ہے کہ اگر ان ۲۱ سالوں کا بھی شمار کر لیا جائے جو اس کی وفات اور ناسخ التواریخ کے سن تصنیف کے درمیان گزرے ہیں تو شاید ان سب کی مجموعی تعداد دس ہزار نفوس ہو جائے۔ بقول اس کے مرتے وقت اس نے ۵۷ لڑکے، ۴۶ لڑکیاں، ۲۹۶ پوتے اور نواسے، ۲۹۲ پوتیاں اور نواسیاں اور ۱۵۸ بیویاں چھوڑیں۔ ر۔ ج۔ واٹسن (R. G. Watson) نے اپنی تصنیف "تاریخ ایران"، ص۲۶۹ پر اس کی اولاد کی تعداد ۱۵۹ بتائی ہے کم از کم اتنا یقینی ہے کہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اس زمانے سے یہ ایرانی مثل مشہور ہو گئی "شتر و شپش و شہزادہ ہمہ جا پیدا است" ۱۲ مصنف

سے نہ دیکھے۔ وہ تھوڑا بہت شاعر بھی تھا اور خاقان کے تخلص سے
اس نے کئی غزلیں کہیں۔ سیاسی حیثیت سے اس کے عہد حکومت کے
خاص خاص واقعات یہ تھے:۔

(۱) انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی رقابت، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ
اگر ایک طرف (یعنی انگریز) سے ملکم اور ہارفورڈ جونس برجز کو سفیر
بناکر ایران بھیجا گیا تو دوسری طرف سے جاؤبرت (Jaubert) اور
جنرل گاردان (Gardanne) وہاں متعین کیے گئے۔

(۲) روس کی روز افزوں قوت جس سے خائف ہوکر ایران نے پہلے
عہد نامہ گلستان (۱۸۱۳ء) اور پھر عہدنامہ ترکمان چائے (۱۸۲۸ء)
پر دستخط کیے۔

(۳) ترکی سے جنگ جو ۱۸۲۳ء کے صلحنامہ ارزروم کے بعد ختم ہوئی۔
اس عہد کے اور دوسرے واقعات یہ ہیں:۔ غدار حاجی ابراہیم کی تذلیل
اور موت اور ۱۸۰۱ء میں اس کے سارے خاندان کا بیخ وبن سے
قلع قمع[1] اور اخراج، ۱۱۔ فروری ۱۸۲۹ء کو طہران میں گریبے یدوف
(Grebaidoff) اور پوری روسی سفارت کا قتل عام[2] اور ۱۸۳۳ء
میں شاہ کے محبوب فرزند، ولی عہد سلطنت عباس مرزا کا قبل از وقت
انتقال جس کے متعلق واٹسن کی رائے[3] ہے کہ "یہ شہزادہ خاندان قاچاریہ
میں سب سے زیادہ شریف النفس تھا" وغیرہ وغیرہ۔ شکستہ دل باپ

---

[1] ر۔ ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۹ ۔ ۱۲ مصنف

[2] ر۔ ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص ۲۴۶ ۔ ۲۵۶ ۔ ۱۲ مصنف

[3] ر۔ ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص ۲۶۹ ۔ ۱۲ مصنف

اپنے بیٹے کی وفات کے بعد صرف ایک سال زندہ رہا اور ۲۳ر اکتوبر ۱۸۳۴ء
میں ۶۸ برس کی عمر میں راہئ ملکِ بقا ہؤا۔ اس نے ۵۷ لڑکے اور
۴۶ لڑکیاں چھوڑیں۔

محمد شاہ ۱۸۳۵ء-۱۸۴۸ء فتح علی شاہ کے بعد اس کا پوتا، یعنی عباس مرزا کا بیٹا محمد تخت نشین ہؤا۔ لیکن تخت نشینی سے
پہلے جو ۳۱۔جنوری ۱۸۳۵ء میں ہوئی، اسے دو زبردست مدعیانِ سلطنت
کا مقابلہ کرنا پڑا، یعنی ایک تو اس کا چچا ظل السلطان اور دوسرا اس کا
بھائی فرمانِ فرما۔ لیکن ایرانی افواج نے جس کی کمان سر ہنری لنڈسے
بتھون (Sir Henry Lindsay Bethune) کے ہاتھ میں تھی، ان
دونوں کو آسانی کے ساتھ شکست دے دی۔ نئے شاہ کو انگلستان اور
روس سے اپنی تخت نشینی میں مدد ملی تھی اور وہ قدرتاً ان دونوں سلطنتوں
کا احسان مند بھی تھا، لیکن ان دو زبردست ہمسایہ سلطنتوں کا اس طرح
سے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا ملک کی تاریخ کے لیے بُرا شگون
اور خطرناک نظیر تھا۔ اسی سال ۲۶۔جون ۱۸۳۵ء کو مشہور قائم مقام مرزا
ابوالقاسم[1] کا ستارہ گردش میں آیا اور اسے قتل کردیا گیا۔ یہ شخص بادشاہ
کا وزیر اور سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اس کے ہم ملک آج بھی اسے
دورِ جدید کے بہترین نثاروں میں سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد منصب وزارت

---

[1] اس کے باپ مرزا عیسےٰ فراہانی کا لقب بھی یہی تھا مجمع الفصحاء جلد دوم صفحہ ۴۲۵
پر ان دونوں کے حالات دیے ہوئے ہیں۔ اپنی اس تصنیف کے حصہ سوم میں
جب ہم عہدِ قاچاریہ کے نثر نگاروں کا حال بیان کریں گے، اس وقت اس شخص
کے ادبی کارناموں کا بھی تھوڑا بہت حال لکھیں گے۔ ۱۲ مصنف

اس بدنام شخص مرزا آغاسی کو ملا جس کے متعلق اب تک ایران میں کئی مضحکہ خیز قصے مشہور ہیں[1]۔ ۱۸۳۸ء میں ایرانیوں نے ہرات کا جو طویل اور بے نتیجہ محاصرہ کیا تھا اور اس موقع پر روسیوں اور انگریزوں کی رقابت جس طرح ظاہر ہوئی تھی اس کا بیان اس محل پر غیر ضروری ہے۔ علیٰ ہذا دربار ایران سے انگریزی سفیر سر ج۔ میک نیل (Sir J. Mcneill) کا واپس جانا، ۱۸۴۲ء میں سرحد کے متعلق ترکوں اور ایرانیوں کے مناقشات نیز اوائل ۱۸۴۳ء میں بمقام کربلا ترکوں کے ہاتھوں ایرانیوں کا قتل عام ان سب کا بیان بھی اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ واقعات، جنھیں ر۔ ج۔ واٹسن اور دوسرے مورخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اتنے دلچسپ اور اہم نہیں ہیں جتنا کہ ۱۸۴۴ء میں یا اسی کے قریبی زمانے میں اسمٰعیلی بغاوت یا بابی مذہب کی تحریک۔

جدید زمانہ میں اسمٰعیلیوں کے حالات

فرقہ سبعیہ (یا اسمٰعیلیہ) کے آغاز اور ان کے مذہبی عقائد کا تھوڑا بہت بیان اس تصنیف کی پہلی جلد میں کیا جا چکا ہے[2]۔ اور تیرھویں صدی عیسوی

---

[1] ملاحظہ ہو گوبی نو (Gobineau) کی تصنیف Les Religion et les Philosophies dans l' Asie Centrale (2nd Edn. Paris 1886) PP. 160-166 نیز میری کتاب "Year amongst the Persians" کا ص۱۱۶، ص۱۱۸ ۔ ر۔ ج۔ واٹسن نے اپنی تاریخ ایران میں بھی (ص۲۸۸، ص۲۸۹) اس کی سیرت کا حال لکھا ہے۔ ۱۲

[2] Literacy History of Persia Vol. I. PP. 391-415

ہیں ہلاکو خان مغل کے ہاتھوں ان پر جو تباہی آئی اس کا ذکر دوسری جلد میں ہو چکا ہے[1]۔ لیکن خواہ اس فرقے کا زور ٹوٹ گیا ہو مگر اس میں پھر بھی تھوڑی بہت جان باقی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً تاریخ ایران کے صفحات پر اپنے نقوش چھوڑتا رہا۔ ناسخ التواریخ کی اس جلد میں جو خاندانِ قاچاریہ کے متعلق ہے، ان کا ذکر بار بار ملتا ہے، اور سب سے پہلے ان کا بیان ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء کے ذیل میں ملتا ہے جب کہ اس فرقے کے شیخ شاہ خلیل اللہ ولد سید ابوالحسن خان کو یزد میں قتل کر دیا گیا

شاہ خلیل اللہ کا یزد میں قتل (۱۲۳۲ھ - ۱۸۱۷ء)

تھا۔ زندیہ کے زمانے میں ابوالحسن خان کرمان کے گورنر تھے۔ اور برطرفی کے بعد محلات قم میں خانہ نشین ہو گئے تھے، جہاں بیٹھ کر وہ اپنے ہندوستان اور وسطِ ایشیا کے کثیر التعداد مریدوں سے نذرانہ وصول کیا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ اگر یہ مرید اصالتاً حاضر ہو کر نذرانہ نہ پیش کر سکتے تو انھیں سمندر میں ڈال دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ہمارے امام تک پہنچ جائیں گے لیکن حتی الوسع یہ لوگ خود درِ دولت پر حاضری دینا اور ان کی ادنیٰ سی ادنیٰ خدمت کی بجا آوری کو اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کرتے تھے۔ ابوالحسن خان کے بعد ان کے بیٹے خلیل اللہ نے یزد میں سکونت اختیار کر لی، لیکن وہاں ان کے قیام کو دو برس ہی ہوئے تھے کہ ایک شخص ملا حسین کے اشارے سے ان کے مریدوں اور مسلمانانِ یزد میں جھگڑا ہو گیا جس میں یہ شہید کر دیے گئے۔ شاہ نے اس جرم کے بانیوں کو شدید سزائیں

[1] انگریزی کتاب، جلد دوم صفحہ ۱۹۰ تا صفحہ ۲۱۱، اور صفحہ ۴۵۳ - صفحہ ۴۶۰

دیں اور اپنی ایک بیٹی ان مقتول کے فرزند اور جانشین امام آقا خان کے حبالۂ نکاح میں دے دی اور انھیں قم اور محلاتِ قم کا گورنر بنا دیا۔

آقا خان کی بغاوت اس کے بعد ہمیں آقا خان کا حال ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) یا ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء)[1] کے ذیل میں ملتا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وزیرِ سلطنت حاجی مرزا آقاسی کے ایما سے ایک شخص مسمی حاجی عبدالمحمد محلاتی نے ان کے ساتھ گستاخانہ برتاؤ کیا جس پر بگڑ کر انھوں نے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا اور بام کی گڑھی کو مسخر کرلیا لیکن فیروز مرزا والی کرمان کے مقابلے میں انھیں اطاعت قبول کرنی پڑی اور وہ طہران بھیج دیے گئے۔ یہاں حاجی مرزا آقاسی نے نہایت عزت اور احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور چند دن بعد انھیں قم کے ضلع میں اپنی سابقہ ولایت پر واپس جانے کی اجازت دے دی اب انھوں نے آزادیٔ عمل حاصل کرنے کے لیے پہلے تو اپنے اہل و عیال اور مال کو براہِ بغداد کربلاے معلا بھیج دیا اور خود تیز رفتار اور مضبوط گھوڑے خریدنا اور بہادر اور وفادار سپاہیوں کو بھرتی کرنا شروع کردیا۔ جب یہ سب انتظامات مکمل ہوگئے تو وہ ریگستانوں اور میدانوں کو عبور کرتے ہوئے کرمان کی طرف روانہ ہوئے اور جس نے وجہ پوچھی اس کو یہ جواب دیا کہ مجھے والی کرمان مقرر کیا گیا ہی، اور سر دست میں براہ بندر عباس مکہ معظمہ جارہا ہوں۔ جب ان کے اصلی ارادوں کی اطلاع شہزادے بہمن مرزا علاء الدولہ کو ہوئی تو اس نے ان کا تعاقب کیا اور **بہمن مرزا سے شکست کھاکر براہِ لار ہندوستان بھاگ گئے**

[1] رجوع ۔ واٹسن نے اپنی تاریخ ایران میں اس بغاوت کا مفصل حال لکھا ہی صفحہ ۳۳۱ ۔ ۳۳۴ ۔ ۱۲ مصنف

جس وقت وہ شہر بابک اور سیرجان کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے، انھیں آلیا۔ اس جنگ میں شہزادے کے ۸ سپاہی اور آقا خاں کے ۱۶ آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد ایک اور اس سے زیادہ خوں ریز جنگ ہوئی جس میں آقا خان کو شکست ہوئی اور وہ لار کی طرف بھاگ نکلے۔ یہاں سے وہ آخر میں ہندوستان کی طرف چل دیے جہاں ان کی اولاد میں سے ایک صاحب آج کل بھی آقا خان کے منصب پر فائز ہیں[۱] اور جب ممالک یورپ کی وسیع اور متعدد سیاحات سے فرصت پاتے ہیں تو بمبئی میں نہایت ثروت اور تمول کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسمٰعیلیوں کی بغاوت سے کہیں زیادہ اہم واقعہ جس کے اثرات بہت دیرپا ثابت ہوئے، محمد شاہ کے آخر عہدِ حکومت میں بابی فرقہ یا مذہبِ باب کا عروج ہے اور اس پر نہ صرف فارسی اور عربی میں بلکہ انگریزی، فرانسیسی، المانی، روسی، اور دوسری یورپی زبانوں میں

---

[۱] یعنی ہز ہائی نس آغا خان سلطان محمد شاہ، جی۔سی۔ سی۔آئی وغیرہ جو ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔

ملاحظہ ہو "Who Is Who" میں آغا خان کا بیان، نیز اس کے لیے مسیو لا گویارد (Stanislas Guyard) کا دلچسپ مضمون بعنوان Un grand Maitre des Assassins au temps de Saladin'' کا آخری حصہ۔ یہ مضمون رسالہ Journal Asiatique بابتہ ۱۸۷۷ء میں شایع ہوا تھا۔ ۱۲ مصنف

کافی مواد موجود ہے[1] چونکہ اس ہنگامہ خیز تحریک کی تاریخ اور اس کے وسیع

بابی تحریک

اثرات کا پورا پورا بیان اس موقع پر مناسب نہیں معلوم ہوتا، اور اس مذہب کے مبلغوں کو امریکہ میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کی بدولت خصوصیت کے ساتھ انگریزی زبان میں اس کے متعلق پوری پوری معلومات موجود ہیں۔ اس لیے اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ سید علی محمد باب نے اپنے بیان کے مطابق خود اپنی تاریخ ظہور ۵ر جمادی الاول ۱۲۶۰ھ (۲۳ رمئی ۱۸۴۴ء) بتائی ہے یعنی امام دوازدہم حضرت امام مہدی (جن کے "باب" ہونے کے وہ مدعی ہیں) کی غیبت کے ٹھیک ایک ہزار سال بعد۔ واضح رہے کہ یہ عقیدہ، یا اس کی یہ شکل نئی نہیں ہے۔ امام مہدی کے یکے بعد دیگرے چار "باب" ہو چکے ہیں جن کے توسط سے انھوں نے اپنی "غیبت صغریٰ" کے زمانے میں اپنے مریدوں کے ساتھ سلسلۂ پیام جاری رکھا ہے "شیخی" مذہب (جس کے مطابق باب کی تعلیم ہوئی تھی) کا "شیعہ کامل" بھی امام محجوب اور ان کے مریدوں کے درمیان ایک "وسیلہ" تھا۔ بعد کو باب بقول اپنے مریدوں کے "بالاتر رفت" اور پہلے انھوں نے "نقطۂ اعلیٰ" یا "نقطہ بیان"

---

[1] ۱۸۸۹ء تک اس مذہب پر کتب حوالہ کے نام مطلوب ہوں، تو ملاحظہ ہو میری کتاب "Traveller's narrative written to illustrate the Episode of the Bab" (مطبوعہ کیمبرج ۱۸۹۱ء) جلد دوم ص۱۷۳۔ ص۲۱۱۔ بعد کے تاریخی حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو میری تصنیف Materials for the Study of the Babi Religion (طبع کیمبرج ۱۹۱۸ء) ص۱۶۵۔ ص۲۴۳۔ ۱۲۰۔ مصنف

ہونے کا دعویٰ کیا پھر "قائم" بنے پھر ایک "نجات تازہ" کے بانی اور
سب سے آخر میں "ظہور" الٰہی ہونے کے مدعی ہوئے۔ ان کے بعض
مرید تو ان سے بھی آگے بڑھ گئے، وہ خود کو خدا اور باب کو "خدا
آفرین" کہتے تھے۔ ایک شخص نے تو جوش میں بہاء اللہ کے متعلق یہ
لکھ دیا تھا:-

خلق گویند خدای در من اندر غضب آیم
پردہ برداشتہ ہیند بخود ننگ خدای[1]

اس میں شک نہیں کہ بابی تحریک بہت کچھ کشت و خون کا
باعث ہوئی، لیکن یہ سب کچھ محمد شاہ کے انتقال کے بعد ہوا۔ جس
کی تاریخ ۵۔ستمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ اس واقعہ سے پہلے ہی خود باب قلعہ ماکو
میں جو ایران کی انتہائی شمال مغربی حد پر واقع ہے، قید تھے، اور خراسان
مازندران اور دوسرے مقامات میں ان کے مسلح مرید چکر لگاتے، مہدی
موعود کے ظہور اور "حکومت اولیاء" کے آغاز کا اعلان کرتے، اور سب
کو شرکتِ جنگ کی دعوت دیتے پھرتے تھے۔ چنانچہ جب محمد شاہ کا
انتقال ہوگیا، اور سارے ملک میں عام بدامنی اور بدنظمی کی لہر دوڑ گئی،
تو ان بابیوں اور ان کے مخالفوں میں بھی سخت خون ریز معرکے شروع
ہوگئے۔

---

[1] ہشت بہشت (میرے نسخے کے ص ۲۴۴) میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے یہ نبیل زرندی
سے منسوب کیا جاتا ہے، جس نے ۲۸ مئی ۱۸۹۲ء کو بہاء اللہ کے انتقال کی خبر
سُن کر عکہ میں خودکشی کر لی تھی ۱۲ مصنف

ناصر الدین شاہ (۱۸۴۸ء تا ۱۸۹۶ء)

نئے دور حکومت کے آغاز کے وقت ملک کی فضاء نہایت مکدر اور تیرہ و تار تھی، ولی عہد سلطنت ناصر الدین باپ کی وفات کے وقت تبریز میں تھا، جو اس کی ولایت کا مستقر تھا، اور اس کے ورود طہران تک اس کی والدہ مہد علیا زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے چکی تھی۔ حاجی مرزا آقاسی کو جس کی طرف سے رعایا میں بہت بد دلی پھیلی ہوئی تھی، صرف وزارت ہی سے علیحدہ نہیں کیا گیا، بلکہ اسے اپنی جان بچاکر بھاگنا اور درگاہ شاہ عبد العظیم میں پناہ گزین ہونا پڑا[1]۔ خود شہر میں شورشیں شروع ہوگئی تھیں، اور بروجرد، کرمان شاہ، کردستان، شیراز، کرمان، یزد اور خراسان میں تو اچھی خاصی بغاوت کی سی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ آخرکار نوعمر شاہ جو اس وقت صرف ۱۷ سال کا تھا[2]۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو دار الخلافت پہنچا، اسی رات کو اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی، اور اس نے فوراً مرزا تقی خاں کو جو زیادہ تر امیر نظام کے لقب سے معروف ہے، اپنا وزیر مقرر کیا۔ یہ شخص اگرچہ معمولی خاندان سے تھا اور اس کا باپ قایم مقام[3] کا باورچی تھا، لیکن وہ ایران کے زمانۂ حال کے وزیروں میں سب سے بڑا، سب سے زیادہ دیانت دار، قابل ترین

---

[1] ملاحظہ ہو ر۔ ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص ۳۵۷ - ۳۵۹ - ۱۲ مصنف

[2] اس کی ولادت ۱۷ جولائی ۱۸۳۱ء کو ہوئی تھی۔ ۱۲ مصنف

[3] یہ لقب باپ بیٹے دونوں کا تھا، اور جلد ہذا کے حصہ سوم میں جب جدید زمانے کے نثاروں کا ذکر کیا جائے گا وہاں ان دونوں کے حالات بھی مختصراً بیان کیے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو جلد ہذا کا ص ۱۴۶ اور حاشیہ۔ ۱۲ مصنف

اور ذہین ترین وزیر ہوا ہے۔ واٹسن نہایت جوش کے ساتھ لکھتا ہے[1]:-

"جدید ایرانی نسل کو مردہ کون کہہ سکتا ہے، جب کہ ابھی حال میں اس نے امیر نظام جیسا شخص پیدا کر دکھایا۔"

آنریبل لارڈ کرزن نے اپنی کتاب "آرمینیا اور ارز روم" میں اس کے متعلق لکھا ہے:-

"ترکی، ایران، روس اور برطانیہ کی طرف سے کمیشن کے جتنے اراکین ارز روم میں جمع ہوئے تھے، ان میں اس (امیر نظام) کی شخصیت سب سے بمراتب زیادہ دل کش اور دلچسپ تھی۔"

وہ صرف تین سال تک وزارت کے منصب جلیلہ پر فائز رہا اور اس قلیل مدت میں بھی اس نے ایران کے لیے بہت کچھ کیا، لیکن افسوس کہ حاسدوں کے حسد اور نیش زنی نے ان سب توقعات کا خاتمہ کردیا جو اس کی ذات سے ملک کو تھیں۔ وہ جلا وطن ہونے کے بعد کاشان کے پاس فین کے خوبصورت اور خوش نما محل میں اپنی زندگی کے دن گزارتا تھا،

مرزا تقی خاں کا الم ناک انجام - ۹- جنوری ۱۸۵۲ء

اور جس افسوس ناک حالات میں، اس کو بے دردی کے ساتھ یہاں قتل کیا گیا وہ سب پر روشن ہیں، اور اس موقع پر ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اس کی بیوی کی، جو شاہ کی اکلوتی بہن تھی قابل تعریف وفاداری اور فداکاری ایسی نہیں ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ واٹسن لکھتا ہے[2]:-

---

[1] رجوع - واٹسن کی تاریخ ایران ص ۴۰۳ ۱۲ مصنف

[2] تاریخ ایران - ص ۴۰۴ ۱۲ مصنف

"جس خلوص اور محبت بھرے دل سے شاہ کی ہمشیرہ
نے اپنے بدنصیب شوہر کا حق رفاقت و فدا کاری
ادا کیا، وہ ہرگز کسی عیسائی دربار کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور
تاریخ عالم کی بہترین خواتین کی زندگیوں پر غور کرنے
والی شہزادی سے کم نہ تھا۔ لیکن اس ننگ روزگار
حاجی علی خان حاجب الدولہ کی چالوں کے آگے اس کی
بیوی کی بے تکان مستعدی اور حزم و احتیاط کی بھی پیش
نہ گئی۔ اس شخص نے جس وزیر سلطنت (مرزا تقی خان)
کی زندگی کا چراغ ۹۔ جنوری ۱۸۵۲ء کو گل کیا، اس نے
اپنی زندگی میں اُس پر ہزاروں احسانات کیے تھے"

بابی شورشیں بابی مرزا تقی خان کے دشمن تھے، اس لیے کہ اُن کارروائیوں کے علاوہ جو وہ ان کے خلاف کرتا رہتا تھا، ۹۔جنوری ۱۸۵۰ء میں تبریز میں باب کا قتل بھی اسی کے ایما سے ہوا تھا۔ یہ لوگ مرزا تقی خان کو قتل کرنے کی پہلے ہی کوشش کر چکے تھے اور اس کی موت کو انھوں نے عقوبت الٰہی سے تعبیر کیا۔ اگرچہ خود باب ایک بے دست و پا قیدی تھا، لیکن جو آگ اس نے لگائی تھی، وہ بجھنے والی نہ تھی، اور ناصرالدین شاہ کے عہدِ حکومت کے ابتدائی چار سالوں میں اس کے شعلے خوب ہی بھڑکے۔ بابیوں کے حیرت انگیز فوجی کارناموں کا بیان، جو انھوں نے طبرسی (مازندران)، زنجان، یزد، نیریز اور دوسرے مقامات پر دکھائے، جس خوبی کے ساتھ کاؤنٹ دی گوبی نو (Comte de Gobineau) نے اپنی لاجواب کتاب

"Les Religions et les Philosophies dans l' Asie Centrale" (مذاہب و فلسفہ ایشیائے وسطی)

میں کیا ہی، اس سے بہتر بیان ہونا مشکل ہی، اس لیے کہ یہ کتاب خوش طبعی ہمدردانہ نظر اور بصیرت کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہی۔ ذاتی حیثیت سے میں نے جتنی خوشہ چینی اس کتاب کی کی ہی، اتنی ایران کے متعلق کسی دوسری کتاب کی نہیں کی۔ اسی کتاب کی بدولت، نیز خوش قسمتی سے اصفہان میں اُس کے مصنف کی اتفاقیہ ملاقات کی وجہ سے میں بابیوں کے عقائد اور ان کی تاریخ کی گتھیاں سلجھا سکا، اور یہی چیز سب سے پہلے بحیثیت مستشرق کے میری شہرت کا سبب بنی۔ کچھ زمانے تک گوبی نو کے وطن نے اس کی قدر نہ کی، لیکن چاہے فرانس نے اُس کی طرف توجہ نہ کی ہو، لیکن جرمنی نے ایک "ادارۂ گوبی نو" قایم کر دکھایا[1]۔ اور اس کی سوانح اور تصنیفات پر کئی کتابیں لکھیں[2]۔

---

[1] اس کی تاسیس ۱۸۹۴ء میں ہوئی تھی۔ ۱۲ مصنف

[2] میرے پاس لڈوگ شےمان (Ludwig Schemann) کی دو کتابیں Quellen und Unter Suchengun (ایک سوانح عمری) اور Eine Biographie (مآخذ اور تحقیقات) مطبوعہ اسٹراس برگ (۱۹۱۳ء و ۱۹۱۶ء) موجود ہیں ماہانہ رسالے یورپ نے اکتوبر ۱۹۲۳ء کا نمبر (۱۱) میں ایک نہایت اہم گوبی نو نمبر شایع کیا ہی جس میں (صفحہ ۱۱۶۔ ۱۳۶) ایم۔ والدیمیر مینارسکی (M. Valdimir Minorsky) نے ایک لاجواب مضمون گوبی نو اور ایران (Gobineau et la Perse) کے عنوان سے لکھا ہی۔ اس مضمون کے بعد ہی صفحہ ۱۳۷۔ ۱۴۱ پر اس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست، اس کے حالاتِ زندگی اور تحریک گوبی نو کا بیان لکھا ہی: "Le Mouvement Gobiniste en Allemagne et en France" ۱۲ مصنف

تین بابیوں کی شاہ کو قتل کرنے کی کوشش بابیوں کی جنگی کارروائیوں کی انتہا یہ ہوئی کہ اس فرقے کے تین افراد نے ۱۵۔ اگست ۱۸۵۲ء کو شاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اب ان کی تعزیر اور سرکوبی کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں ۲۸ بابیوں کو جن میں سے بعض کم اور بعض زیادہ مشہور تھے شدید تکالیف کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ انھیں مقتولین میں حسین اور قابل بابی شاعرہ قرۃ العین بھی تھی[۱]۔ جو مشہور اور سر بر آوردہ بابی قتل سے بچ گئے تھے وہ یا تو ہجرت کر گئے یا بغداد میں جلاوطن کر دیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ کے بعد ایران میں اس فرقے کے پیرووں کی تعداد برابر بڑھتی رہی۔ لیکن اب ان کی جد و جہد کا مرکز خواہ بغداد، ایدریانوپل، قبرس یا عکہ میں ہو، لیکن ایرانی حدود سے باہر رہا۔

انگلستان اور ایران کی جنگ ۱۸۵۶ء۔ ۱۸۵۷ء ایرانیوں کے ہرات پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے جو مختصر لڑائی ۱۸۵۶ء۔ ۱۸۵۷ء میں ایران اور انگلستان میں ہوئی۔ اس کے اسباب اور واقعات کی بحث اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ انگریزوں نے ۴ دسمبر ۱۸۵۶ء کو خلیج ایران کے جزیرہ خارک پر قبضہ کر لیا اور اس کا خاتمہ اس صلح نامہ سے ہوا، جس پر ۴۔ مارچ ۱۸۵۷ء کو بمقام پیرس لارڈ کوولی (Lord Cowley) اور فرخ خان نے دستخط کیے تھے

---

[۱] ملاحظہ ہو میری تصانیف Travellers' Narrative جلد دوم ص۲۶۔ ص۳۳۳ اور Materials for the Study of the Babi religion ص۲۶۵۔ ۲۷۱ ۱۲ مصنف

چونکہ اس زمانے میں ترسیل اطلاعات میں بہت تعویق ہوا کرتی تھی، اس وجہ سے صلح نامہ پر دستخط ہوجانے کے ایک ماہ بعد تک بھی کچھ لڑائیاں ہوتی رہیں۔ برطانیہ کی خوش قسمتی سے یہ جنگ خوب موقع پر ختم ہوئی، اس لیے کہ صلح کے کاغذات ابھی بعد تصدیق و توثیق ایک دوسرے کے پاس واپس بھی نہ آنے پائے تھے کہ ہندوستان میں غدر ہوگیا۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ترسیل اخبارات کے وسائل کو بہتر بنانا چاہیے، چنانچہ ۱۸۶۴ء میں ایران میں

ایران میں تار برقی کی تنصیب

تار برقی نصب کی گئی اور ۱۸۶۷ء و ۱۸۷۲ء میں اس میں مزید توسیع ہوئی۔ بقول سر مولس ورتھ پرسی سائکس (Sir Molesworth Percy Sykes) کے (جن کی کتاب تاریخ ایران[1] ہی صرف ایک ایسی کتاب ہی جس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۱ء تک واقعات کا سلسلہ وار اور مربوط بیان کیا گیا ہی) تار برقی کے قیام کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ہوئے[2]۔ اور یہ بھی منجملہ ان چند عوامل کے ہی جنھوں نے ایرانی تجدد میں بہت کچھ حصہ لیا ہی۔ دوسرے عوامل یہ تھے پریس کی توسیع

دیگر عوامل تجدد ایران

(جسے سب سے پہلے تقریباً ۱۸۱۶ء میں عباس مرزا نے تبریز میں قایم کیا تھا) اور اس کی وجہ سے ادبیات کا نثر

---

[1] میری مراد ان کی کتاب History of Persia کے دوسرے اور ضخیم تر ایڈیشن سے ہی جو ۱۹۲۱ء میں شایع ہوا ہی۔ اس کے صفحہ ۵۲۶ پر لکھا ہی کہ اس تصنیف کی صحیح تاریخ مارچ ۱۹۲۳ء ہی۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو ان کی تاریخ کا ص ۳۶۹ ۱۲ مصنف

و اشاعت صحافت کی تدریجی ترقی جس کی بنیاد ۱۸۵۱ء میں پڑی[1] اور جس نے ایک تو ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۱ء کے زمانے میں اور دوسرے روسیوں کی شکست کے بعد بہت زیادہ ترقی کی۔ ۱۸۵۱ء میں بمقام طہران دارالفنون کا قیام اور یورپی علوم اور یورپی طرزِ تعلیم کی ابتدا اور سب سے آخری اثر شاہ کی سیاحات یورپ جو ۱۸۷۳ء ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۹ء میں کی گئیں۔ ان سیاحات کے متعلق یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہو کہ بادشاہ اور اس کے رفقائے سفر نے یورپ کی سیروں میں جو کچھ دیکھا اس سے خود ان کو زیادہ فائدہ پہنچا۔ یا شاہ کے لکھے ہوئے سیاحت نامے سے ایرانی ادب کو زیادہ فائدہ حاصل ہوا

ناصرالدین شاہ کا عین جوبلی کے دن قتل۔ یکم مئی ۱۸۹۶ء | ناصرالدین شاہ اپنی تخت نشینی کے وقت جو ۲۴۔ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ

مطابق ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو ہوئی، صرف ۱۷ سال کا تھا، اور ۲۴ محرم ۱۳۱۳ھ مطابق ۵۔ مئی ۱۸۹۶ء کو اس کی تخت نشینی کو پورے پچاس سال ہوجاتے، اس کی جوبلی کے جشن کی سب تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں کہ تاریخ مقررہ سے چار روز پہلے مرزا رضا کرمانی نے، جو جمال الدین الافغانی جیسے بے چین اور ہنگامہ آرا شخص کا مقلد تھا اسے طہران سے چند میل جنوب کی طرف یعنی شاہ عبدالعظیمؒ کی درگاہ میں گولی سے ہلاک کردیا، اس سانحے کی تفاصیل اور اس کے اسباب سے

[1] ملاحظہ ہو میری تصنیف (Press and Poetry in Modern Persia) کا صفحہ ۱۔ اس کتاب میں ایرانی صحافت پر بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہی۔ ۱۲ مصنف

میں اپنی تصنیف History of Persian Revolution
(تاریخ انقلاب ایران ۱۹۰۵ء۔ ۱۹۰۹ء) میں مفصل بحث کر چکا ہوں
اور اس موقع پر ان کا اعادہ کرکے فضول کاغذ سیاہ نہ کروں گا۔ اس
انقلاب کے بیج تو اسی وقت بوئے جا چکے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ
پھوٹ بھی چکے تھے، جب شاہ نے اپنے تیسرے اور آخری سفر یورپ
میں یورپی دول کے ساتھ نا عاقبت اندیشانہ مراعات کی تھیں۔ یہ
مراعات ہی (اور خصوصاً ۱۸۹۰ء میں تمباکو کے ٹھیکے کی رعایت) ملک
میں ان سیاسی ہیجانات کا بڑا سبب ہوئیں، جن کا آغاز ۱۸۹۱ء
میں تمباکو والی شورش سے ہوا، اور جن کی انتہا ۱۹۰۵ء کے انقلاب
کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اور اگر ان خارجی تعلقات سے قطع نظر کر لی
جائے جو ایران کے دولِ خارجہ خصوصاً انگلستان اور روس کے ساتھ
تھے اور جن کا مفصل بیان سر پرسی مولس ورتھ سائکس اور دوسرے
مورخوں نے اپنی تاریخوں میں کیا ہے — تو ناصر الدین شاہ کے عہدِ حکومت
کی تلخیص یوں کی جاسکتی ہے | ناصر الدین کے عہد کے ابتدائی اور
کہ اس کے ابتدائی چار سال | آخری سال خاص طور پر اہم تھے۔
(۱۸۴۸ء۔ ۱۸۵۲ء) بابیوں کی پیدا کی ہوئی مذہبی شورشوں کے اعتبار
سے اہم تھے اور آخری چھ سال (۱۸۹۰ء۔ ۱۸۹۶ء) ان سیاسی
ہیجانات کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے تھے جو آنے والے دور
میں انقلاب کا سبب بنے۔ اس آغاز اور انجام کے علاوہ اس کی
حکومت کا درمیانی حصہ کم از کم ظاہری حیثیت سے کسی قدر امن و
امان اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ اس دور کے آخری حصے میں یعنی

۱۸۸۷ء - ۱۸۸۸ء میں ایران کی حالت -

۱۸۸۷ء - ۱۸۸۸ء میں مجھے خوش قسمتی سے سیاحت ایران کا اتفاق ہوا تھا، مجھے اس وقت نہ صرف اس امن و امان سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا جو ملک میں قایم تھا بلکہ میں نے ایران کے دور متوسطہ کی آخری حالت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا[1] وہاں سے واپس آنے کے بعد جو حالات سفر میں نے لکھے تھے[2] ان میں میں اس دور امن و امان کی تعریف کا پورا پورا حق ادا نہ کرسکا کیونکہ اس وقت مجھے اس کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ میری سیاحت سے پہلے، نیز اس کے بعد ایسے زمانے ایران میں بہت کم گزرے ہیں جب کہ میری طرح کا ایک نوعمر غیر ملکی باشندہ جو نہ کوئی سرکاری حیثیت رکھتا ہو، اور نہ سرکاری حفاظت میں ہو، شمال مغرب سے جنوب مشرق تک اور شمال سے جنوب تک صرف ایک ایرانی ملازم اور چند خچر رانوں کے ساتھ ملک کا سفر کرسکتا اور پھر بھی خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہو اور یہی نہیں بلکہ پورے دوران سفر میں ایک بھی حادثہ یا ناگوار واقعہ اسے پیش نہ آیا ہو! غرض کہ ملک کے امن و امان کی یہ حالت کسی طرح بھی اکثر یورپی ممالک کی حالت سے کم نہ تھی، اور خواہ ابتدا ہیں اس کے

---

[1] مصنف مرحوم کا مطلب یہ ہے کہ ناصر الدین شاہ کے بعد سے ایران میں "دورۂ تجدّد" شروع ہوتا ہے: یعنی یورپی تہذیب اور تعلیم کے اثرات کا دور ۱۲ مترجم

[2] یعنی A year among the Persians (London A and C Black 1893) یہ کتاب عرصہ سے خارج از طباعت ہے اور آج کل بہت نایاب ہے ۱۲ مصنف

قایم کرنے کے لیے قزاقوں اور جرایم پیشہ لوگوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئی ہوں، لیکن اُس زمانے میں (جب کہ میں نے سفر کیا) ایسی سزائیں بھی موقوف ہوگئی تھیں اور اپنے قیام ایران کی پوری مدت میں، میں نے کسی کو قتل ہوتے، یا لکڑیوں سے زد و کوب کیے جاتے نہیں دیکھا، اور جہاں کہیں میرا قیام ہوا، وہاں اس قسم کی سزا کا واقعہ میرے علم میں نہیں آیا۔ البتہ شیراز کی شہر پناہ کے باہر گچ کے کچھ ایسے مینار میرے زمانے میں بھی موجود تھے، جن سے انسانوں کی ہڈیاں باہر کی طرف نکلی ہوئی زبانِ حال سے شاہ کے چچا فرہاد مرزا معتمد الدولہ کے تشدد آمیز عہدِ حکومت کا حال کہ رہی تھیں۔ میں نے جب فرہاد مرزا کو دیکھا ہے اس وقت ان کی حیثیت صرف ایک درباری کی سی رہ گئی تھی، اور وہ ایک عالم اور مطالعہ کتب کے شوقین شخص کی حیثیت سے معروف تھے۔ لیکن، جیسا کہ میں کہ چکا ہوں ان تمام باتوں کے باوجود ملک کی فضا از منہ وسطیٰ کی سی تھی، سیاسیات اور ترقی کا تو چرچا تک نہ ہوتا تھا اور گفتگو کا موضوع زیادہ تر تصوف مابعد الطبیعات، یا مذہب ہوا کرتا تھا، اور آنحضرت صلعم کے خلفا کا مسئلہ (جو ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا) اس زمانے میں بھی ایران کا اہم ترین سیاسی مبحث تھا۔ دو سرکاری جرائد ایران اور اطلاع تو خود ایران سے نکلتے، اور اختر قسطنطنیہ سے شایع ہوتا تھا، جس کا لب و لہجہ مذکورہ بالا دو اخباروں کی بہ نسبت ذرا سخت تھا ان اخباروں کی وجہ سے البتہ کوائفِ خارجہ سے کچھ یوں ہی سی دلچسپی ہوجایا کرتی تھی، لیکن کرمان کو بیرونی دنیا سے واصل کرنے والی

صرف ایک ڈاک تھی جو ہفتہ وار آیا کرتی تھی۔ کہاں یہ حالات، اور کہاں ۱۸۹۱ء کا دورۂ اضطراب و انتشار ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک

طوفانی دور (۱۸۹۱ء کے بعد)

کا سیاسی ہیجان ۱۹۱۱ء کا بڑا دن (۲۵ دسمبر) جب کہ روسیوں کے خوفناک مظالم اور حرکات سے ملک سکتہ کے عالم میں تھا اور پھر گزشتہ جنگ جس میں ایران تین غیر ملکی فوجوں کا جولان گاہ اور بے شمار سازشوں کا بازی گاہ رہا! غرض کہ بعد کے ان واقعات اور پہلے کے جو واقعات اور حالات اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان میں کس قدر زمین و آسمان کا فرق ہے! اگر اب روسی شہنشاہیت کے زوال نے ایران کو ایک صدی کے دہشت ناک اور پریشان خواب سے جگا دیا ہے۔ ایرانیوں کے عقیدہ میں روس کا یہ انقلاب اس کے حق میں ایک عذاب الٰہی ہے جو اپریل ۱۹۱۲ء میں مشہد مقدس کی درگاہ کی بے حرمتی کی پاداش میں اس پر نازل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف انگریزی ایرانی معاہدہ کے ختم ہونے اور ایران سے انگریزی فوجوں اور مشیروں کی واپسی کی وجہ سے، اب آج کل ایران اپنے داخلی معاملات میں آزاد ہے اور اپنے مستقبل کو شاندار بنانا، یا اسے برباد کر دینا یہ دونوں صورتیں اب صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

ناصرالدین شاہ کے جانشین

ناصرالدین شاہ کے قاتل کی گولی سے ہلاک ہونے کے بعد حسب ذیل بادشاہ ایرانی تخت پر بیٹھ چکے ہیں:-

(۱) مظفرالدین شاہ، ناصرالدین شاہ کا بیٹا، جس نے ملک کو مشروطہ عطا کی۔

(۲) ناصرالدین کا پوتا محمد علی جس نے مشروطہ کو توڑنا چاہا تھا اور جسے ۱۶- جولائی ۱۹۰۹ء کو قوم خواہوں نے تخت کا خلع کرنے پر مجبور کر دیا چنانچہ وہ آج کل قسطنطنیہ کے مضافات میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

(۳) ناصرالدین کا پر پوتا سلطان[۵] احمد شاہ جو آج کل سریر آرائے سلطنت ہے۔ اس آخرالذکر شاہ کے عہدِ حکومت اور اس کی سیرت و خصائل کی بحث ابھی قبل از وقت ہے۔ اس کے باپ (محمد علی) اور دادا (مظفرالدین) کی متضاد سیرتوں کا بیان میں اپنی کتاب History of Persian Revolution (تاریخ انقلاب ایران) میں کر چکا ہوں۔ اتنا بہر حال ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ناصرالدین شاہ کے قتل کے بعد سے، جسے آج ۲۷ سال ہوئے ہیں[۵]، ایران میں شاہ کی بجائے اب جمہور زیادہ دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہے، اور جہاں تک کہ مستقبل کا تھوڑا بہت اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب سرزمین ایران سے کوئی دوسرا اسمٰعیل[۵] دوسرا نادر یا خدانخواستہ دوسرا آقا محمد خان نہیں اُٹھے گا۔

---

۵۱ ۱۹۲۵ء میں (مصنف مرحوم کی وفات کے بعد) اسے بھی رضا شاہ خاں کی سر کردگی میں خلعِ تخت پر مجبور کر دیا گیا۔

مترجم

۵۲ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس حصّے کی ترتیب ۱۹۲۳ء میں کی تھی، اس لیے کہ ناصرالدین شاہ کو ۱۸۹۶ء میں گولی سے ہلاک کیا گیا تھا ۱۲۔ مترجم

۵۳ آج کل عود پہلویہ کے ہوا خواہ رضا شاہ خاں کو دوسرا اسمٰعیل ہی سمجھتے ہیں ۱۲ مترجم

حصّہ دوم

گزشتہ چار صدی کی ایرانی شاعری

باب پنجم

(دوَرِ آخر کی ایرانی شاعری، خصوصًا مذہبی شاعری پر ایک سرسری نظر)

فارسی ادبی زبان کی عجیب و غریب یک رنگی

اب سے چار سو سال پہلے فارسی زبان یا کم از کم تحریری فارسی زبان (اس لیے کہ بہت ممکن ہو کہ اس درمیان میں جدید روزمرہ یا عامیانہ محاورے پیدا ہوئے ہوں) ہر حیثیت سے ویسی ہی تھی جیسی آج ہو اور اگر کچھ نئے اصناف ادبیات نظر آتے ہیں تو وہ انیسویں صدی کے وسط، یعنی ناصرالدین شاہ کی تخت نشینی (۱۸۴۸ء - ۱۸۹۶ء) سے پہلے کے نہیں ہیں۔ درحقیقت اس بادشاہ کا دور ایران کا "وکٹورین دور"[۱] کہا جاسکتا ہو۔ اس تصنیف کی پہلی تین جلدوں میں میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ہر تاریخی باب کے بعد اس دور کی ادبیات پر ایک باب ہوتا تھا، لیکن مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر مجھے ربط واقعات میں اس طرح خلل ڈالنا مناسب نہ نظر آیا، بلکہ میں نے یہ زیادہ بہتر سمجھا کہ اس جلد کے پہلے حصے میں پورے دوَر کی تاریخ کا اجمالی تبصرہ اور دوسرے اور تیسرے حصوں میں مختلف اصنافِ ادبیات نظم و نثر کا بیان کردوں۔

---

[۱] ویسے بھی ناصر اور وکٹر ہم معنے ہیں۔ ۱۲ مصنف

اب تک صرف فارسی شاعری پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی گئی ہی

بحث کے لیے ادبیات کے مختلف اصناف کی ترتیب اور تقسیم ایک ایسا کام تھا جس پر مجھے بہت کچھ غور و فکر صرف کرنا پڑا ہی۔ جن حضرات نے فارسی ادبیات پر قلم اُٹھایا ہی، انھوں نے (کم از کم میرے خیال میں) نظم اور شعر پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہی اور معری لیکن حقیقت آگیں اصناف ادبیات مثلاً تاریخ و سیر، عقاید و فلسفہ اور علوم قدیمہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہی۔ اگر ادبیات کے محدود معنے لیے جائیں اور اس میں صرف نظم یا نثر کی ایسی اصناف کو داخل سمجھا جائے جو حُسن صوری رکھتی ہیں تو بے شک مذکورہ بالا نقطۂ خیال بجا اور درست ہی، لیکن اگر ادبیات کے وسیع تر معنے ذہن میں رکھے جائیں اور اسے قوم کی دماغی اور ذہنی فعلیتوں کا مظہر سمجھا جائے تو یہ خیال ہرگز درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم عام رائے اور خیال کا لحاظ کرکے ہم بھی جدید فارسی ادبیات کے اس تبصرے کو حصۂ نظم ہی کی بحث سے شروع کرتے ہیں۔

فارسی نظم کے اصناف

اس زمانے میں سب سے پہلے ہمیں نظم کے چھ اصناف ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں یعنی (۱) قدیم یا کلاسکل شاعری (۲) ہنگامی یا عصری شاعری[1] (۳) مذہبی شاعری یا منقبت جس میں بڑے بڑے شعرا مثلاً محتشم کاشی کے مراثی سے لے کر ان سادہ اور مقبول عام نظموں کی تمام اصناف داخل ہیں جو عزائے

---

[1] یعنی Topical Verse ایسی شاعری جس میں شاعر اپنے زمانے کے کسی واقعہ سے بحث کرے۔ ۱۲ مصنف

محرّم کے طور پر کہی جاتی ہیں (۴) بابیوں کی کہی ہوئی کمیاب، لیکن پُرجوش نظمیں جو ۱۸۵۰ء کے بعد سے شروع ہوتی ہیں، اس صنف کو در اصل آخرالذکر صنف ہی کی فرع سمجھنا چاہیے۔ (۵) تصانیف (Ballads) یعنی ایک خاص قسم کی نظمیں جنھیں پیشہ ور مغنی گاتے پھرتے ہیں اور جن کے آغاز یا قدامت کے متعلق کوئی تحقیق نہیں کی جاسکتی (۶) زمانۂ حال کی سیاسی شاعری جس کی ابتدا ۱۹۰۶ء کے انقلاب کے بعد سے ہوتی ہے اور جس کی مفصل بحث میں اپنی ایک اور تصنیف میں کرچکا ہوں۔

موجودہ باب میں، میں صرف مذہبی شاعری سے بحث کروں گا دوسری اصناف کی بحث آیندہ دو ابواب میں ہوگی۔

۱۔ قدیمی یا کلاسکل شاعری

قدیم طرز پر زمانۂ حال کی نظمیں۔ صورتًا اور معنًا دونوں حیثیتوں سے کم ازکم پانچ یا چھ صدی سے فارسی ادبیات ایک ہی ڈگر پر رہی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی قصیدہ یا غزل یا رباعی کے ایسے حصے کو نظر انداز کردیا جائے جس کے واقعات یا اشخاص کے نام سے اس کے زمانۂ تصنیف کا پتہ چلتا ہو تو یہ حکم لگانا مشکل ہوجائے کہ یہ چیز جامی (وفات ۱۴۹۲ء) کے کسی ہم عصر کی کہی ہوئی ہے، یا قاآنی کے جیسے کسی زمانۂ حال کے شاعر کی تصنیف ہے۔ میں فارسی ادبیات کی انتہائی رسمیت اور "وضعداری" کا ذکر کسی پہلی جلد میں کرچکا ہوں [1]

[1] تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد دوم ص۸۳۔ ص۸۹ ۱۲ مصنف

اور اسی سلسلہ میں ابن خلدون کی یہ رائے بیان کرچکا ہوں کہ "اسالیب نظم و نثر کا تعلق معنے سے نہیں بلکہ صورت سے ہوتا ہے" پس اس قسم کی جدید سے جدید نظم (غزل) میں بھی ہمیں جدید باتوں مثلاً چار نوشی، تمباکو کشی، ریل، تار، اخبارات وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں نظر آتا[1]۔ بلکہ زمانۂ جدید کے اکثر مشاہیر شعرا شلاً قاآنی، داوری وغیرہ نے تو مسمّط[2] اور ایسی ہی دوسری اصناف کی تجدید کرکے اپنی جدت دکھائی ہے جو گیارھویں یا بارھویں صدی سے متروک ہوچکی تھیں۔

ایرانیوں نے ادبی تنقید پر کبھی توجہ نہیں کی

گزشتہ پیراگراف کے شروع میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے، وہ شاید بہت زیادہ سرسری ہے اور اس میں کسی قدر ترمیم کی ضرورت اس لیے ہے کہ ترکی اور ہندستانی نقّادوں کا خیال ہے کہ بعد کے چند فارسی گو شعرا میں ایک خاص قسم کی "تازہ گوئی" پائی جاتی ہے جس سے فن شعر کی ترقی اور ایک جدید مذہب شاعری کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ خود ایرانی ادبی تنقید کے عادی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جس طرح لوگ اپنی جسمانی صحت کا ذکر اور اس کے متعلق گفتگو اسی وقت

---

[1] ملاحظہ ہو گِب کی "تاریخ ادبیات عثمانی" جلد چہارم ص۱۲۲

موجودہ باب کے خاتمہ پر میں نے نعیم کا جو قصیدہ نقل کیا ہے اس میں بعض جدید چیزوں کے حوالے مل جاتے ہیں، اگرچہ صنف شعر کے اعتبار سے اس کا طرز بالکل قدیم قصیدوں کا سا ہے۔　۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد دوم ص۱۲۹ - ص۲۲ ۱۲ مصنف

کرتے ہیں جب وہ خراب ہوتی جا رہی ہو، اسی طرح سے ادبی تنقید میں صرف انھیں لوگوں کو لطف آتا ہے جنھوں نے کبھی پہلے اچھا ادب پیدا نہیں کیا، یا اب اس کے پیدا کرنے کے اہل نہیں رہے ہیں۔ گِب نے لکھا ہے کہ جامی، امیر علی شیر نوائی، عرفی شیرازی، (وفات ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء - ۱۵۹۱ء) فیضی ہندی (وفات ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۵ء - ۱۵۹۶ء) اور صائب اصفہانی (وفات ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء - ۱۶۷۰ء) ان سب کے اثرات ہی وہ خاص غیر ملکی اثرات تھے جو یکے بعد دیگرے ترکی ادبیات پر پڑے۔ چنانچہ ترکی نقادوں نے ان شاعروں پر بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ جہاں تک میری ناقص رائے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ شروع سے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر تک کے تمام ممتاز فارسی شعرا کے کلام کی بہترین اور مکمل ترین تنقید مشہور ہندی محقق اور عالم شبلی نعمانی کی تصنیف "شعر العجم" ہے جو بدقسمتی سے اردو میں ہے۔ اس تصنیف کی تیسری جلد میں جو ۱۳۲۴ھ - ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۶ء - ۱۹۰۷ء میں ختم ہوئی، سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے حسب ذیل سات شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۱) فغانی (وفات ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۱۹ء) (۲) فیضی (وفات ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۵ء - ۱۵۹۶ء) (۳) عرفی (وفات ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء - ۱۵۹۱ء) (۴) نظیری (وفات ۱۰۲۱ھ مطابق ۱۶۱۲ء - ۱۶۱۳ء) (۵) طالب آملی (وفات ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۶ء - ۱۶۲۷ء) (۶) صائب (وفات ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء - ۱۶۷۰ء) اور (۷) ابو طالب کلیم (وفات ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۱ء) یہ سب شعرا، سوائے فیضی کے ایرانی الاصل تھے اور دربار مغلیہ کی قدر افزائی اور فیاضی انھیں ہندوستان کھینچ لے گئی تھی۔ فیضی کے متعلق شبلی

کا خیال ہی کہ امیر خسرو کے بعد صرف وہی ایک ایسا ہندی شاعر ہوا ہی جس کا فارسی کلام ٹھیٹ ایرانیوں کا سا معلوم ہوتا ہی۔ عرفی اور صائب ان ساتوں میں مشہور ترین تھے، لیکن ان کی شہرت بھی ان کے وطن کی بہ نسبت ہندوستان اور ترکی میں زیادہ ہوئی[۱]۔ میرے بعض ایرانی احباب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ خالص ایرانی مذاق کی لطیف اور نازک شاعری غیر ایرانی حضرات کی فہم سے بالاتر ہی لیکن ان کے (عرفی اور صائب) کلام کو وہ آسانی کے ساتھ سمجھ لیتے ہیں اس لیے اُن لوگوں میں ان دونوں کو مقبولیت حاصل ہی۔ مجھے شرمندگی کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہی کہ اس بارے میں میں بھی غیر ایرانی حضرات کا ہم مذاق ہوں اور خصوصیت کے ساتھ مجھے صائب بہت پسند ہی جس کی وجہ اس کے طرز کی سادگی اور بے تکلفی اور صنایع حسنِ تعلیل اور ارسال المثل[۲] پر اس کی قدرت ہی۔ اب سے چالیس سال پہلے (۱۸۸۵ء میں) مجھے حسن اتفاق سے تین زبانوں کی شاعری کے اس معرکۃ الآرا انتخاب کو دیکھنے کا موقع ملا تھا جو خرابات کے نام سے مشہور ہی[۳] اور جس میں عربوں، ترکوں اور ایرانیوں کی عشقیہ شاعری کا بیان ہی اور تینوں زبانوں کی غزلیں اور

---

[۱] رضا قلی خان نے تو ان دونوں کے متعلق صاف صاف کہہ دیا ہی کہ جدید ایرانی ان کے طرز کو پسند نہیں کرتے۔ ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو گب کی "تاریخ ادبیات عثمانی" جلد اول ص۱۳۰ - ص۱۱۴ ۱۲ مصنف

[۳] خرابات مرتبہ ضیا پاشا یہ کتاب ۱۲۹۱ھ - ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۴ء - ۱۸۷۵ء میں قسطنطنیہ سے تین جلدوں میں شایع ہو چکی ہی۔ ۱۲ مصنف

ابیات نقل کیے گئے ہیں۔ میں نے اس کے فارسی حصّہ کو پڑھا اور ایک بیاض میں جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہی، ان شعروں کو نقل کرتا رہا جو مجھے پسند آئے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ شعر کس کے تھے۔ اس بیاض پر اب جو میں نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہی کہ اگرچہ میرے منتخبہ ۴۴۳ اشعار میں سے اکثر بے نام ہیں، لیکن ان کا دسواں حصہ (یعنی ۴۵) صائب کے اشعار کا ہی!

شاہانِ مغلیہ کے ابتدائی دور میں ایرانی شاعروں نے ہندوستان کا رخ کیا

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے بڑے حصّے میں اہلِ کمال شعرائے ایران کی ایک کثیر تعداد ہندوستان آتی رہی اور جس قدر و منزلت سے وہ اپنے وطن میں محروم کردیے گئے تھے، وہ یہاں آکر انھیں نصیب ہوئی۔ ان لوگوں کے ہندوستان آنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمایوں، اکبر اور خشک اور پابند شرع اورنگ زیب کے زمانے تک ان کے جانشین، نیز ان کے امرا جیسے بیرم خانخانان اور اس کا بیٹا عبدالرحیم خانخانان جو ۱۵۶۱ء میں اپنے باپ کے قتل کے بعد اس کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ یہ سب کے سب علم و ادب کی قدر افزائی بہت دریا دلی کے ساتھ کرتے تھے۔ بداؤنی نے[1] ایسے ایک سو ستر (۱۷۰) شاعروں کا ذکر کیا ہی جو ایران چھوڑ کر ہندوستان آ بسے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض ہندی نژاد بھی تھے، لیکن زیادہ تر ایرانی الاصل تھے شبلی[2]

---

[1] منتخب التواریخ (طبع کلکتہ ۱۸۶۹ء) جلد سوم ص ۱۷۱۔ ص ۳۹۰ ۱۲ مصنف

[2] شعر العجم جلد سوم ص ۵۔ ۱۲ مصنف

نے ایسے ۱۵ شعرا کی فہرست دی ہے جو اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے اور دربار شاہی میں باریاب ہوئے تھے۔ اسپرنگر (Sprenger) نے[۵۱] بھی ایک طویل فہرست دی ہے۔ شبلی نے ایسے اشعار بکثرت نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایرانی شعرا میں ہندوستان آنے اور یہاں قسمت آزمائی کرنے کا شوق کس قدر تھا۔ مثلاً صائب کہتا ہے ؎

ہمچو عزمِ سفرِ ہند کہ در ہر دل ہست　　شوق سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

یا ابوطالب کلیم کے یہ اشعار :-

اسیرِ ہندم و زیں رفتنِ بیجا پشیمانم
کجا خواہد رساند پرفشانی مرغ بسمل را

بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں
بہ پائے دیگراں ہمچو جرس طے کردہ منزل را

ز شوقِ ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم
کہ رو ہم گر بہ رہ آرم نمی بینم مقابل را

اسی طرح سے علی قلی سلیم کہتا ہے :-

نیست در ایراں زمیں سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سوئے ہندستاں حنا رنگیں نشد

شاعر درویش منش رسمی خانخاناں کی قدر افزائی شعرا کی یاد میں لکھتا ہے[۵۲] :-

---

۵۱ فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ جلد اول ص۵۵ ۔ ص۶۵ ۱۲ مصنف

۵۲ شعر العجم جلد سوم ص۱۳۵ ۔ ۱۲ مصنف

زمینِ مدح تو آں نکتہ سنج شیرازی[1]

رسید صیتِ کمالش بہ روم[2] از خاور

بطرزِ تازہ ز مدحِ تو آشنا گردید

چو روئے خوب کہ یابد ز ماشطہ زیور

زفیض نام توفیضی گرفت چوں خسرو[3]

بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر

ز ریزہ چینی خوانت نظیریؔ شاعر

رسیدہ است بجائے کہ شاعرانِ دگر

کنند بہرِ مدیحش قصیدۂ انشا

کہ خونِ رشک چکد از دلِ سخن پرور

سواد شعر شکیبیؔ چو کحل صفاہاں

بہ تحفہ سوئے خراساں برند اہلِ نظر

ز مدحتِ تو حیاتیؔ حیات دیگر یافت

بلے مقوی طبع عرض بود جوہر

حدیث نوعیؔ و کفویؔ بیاں چہ سازم من

چوں زندہ اند بمدحِ تو تا دمِ محشر

ز نعمتِ تو بہ نوعیؔ رسید آں مایہ

کہ یافت میر معزیؔ ز مدحتِ سنجر

---

[1] شبلیؔ نے اس پر حاشیہ لکھا ہو کہ یہ عرفیؔ کی طرف اشارہ ہی ۱۲ مصنف

[2] یعنی ترکی۔ ملاحظہ ہو ص [illegible] حاشیہ [illegible]

[3] ملاحظہ ہو ص ۱۵۷ جلد ہذا ۱۲ مصنف

ص ۱۳۵

؟

ص ۳۴۸

سولھویں اور سترھویں صدی کے ان شاعروں کے فیض سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے مرحوم پروفیسر ایتھے (Ethe) نے نہایت لطف کے ساتھ "فارسی شاعری کی ہندی بہار" کہا ہے اور جب تک فارسی زبان کا استعمال ہندوستان میں تہذیب اور شائستگی کی علامت سمجھا گیا، تب تک ان شعرا کے بے شمار مقلد اور جانشین وہاں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک غیر زبان کے محاورہ بندوں کی سی تھی اور میں ان کا تذکرہ نہ کروں گا، بلکہ خالص ایرانی الاصل شعرا میں سے بھی، خواہ وہ ہندوستان میں مقیم ہوگئے ہوں یا اپنے وطن ہی میں سکونت پذیر رہے ہوں، صرف گنتی کے چند مشہور ترین شعرا کے تذکرے کی گنجائش ان صفحات میں نکل سکے گی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی اور خصوصاً اس کا وہ پُر آشوب زمانہ جو صفویہ کے زوال اور قاچاریہ کے عروج کے درمیان گزرا (یعنی ۱۷۲۲ء-۱۷۹۵ء) ادبی کمالات اور ترقیوں کے اعتبار سے سب زمانوں سے ادنےٰ درجے کا تھا، لیکن اس کے بعد ہمیں ادبیات میں ایک نمایاں نشاۃ ثانیہ نظر آتی ہے اور انیسویں صدی کے اکثر شعرا: مثلاً قاآنی، یغما فروغی، وصال اور اس کا خاندان — یہ سب بہ استثناے ایک یا دو نہایت ہی بلند پایہ پیشروؤں کے بقیہ سب سے ہم سری کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کا زمانہ ادبی حیثیت سے بالکل مفلس تھا

۲- ہنگامی یا عصری شاعری

(Topical Verse)

ہنگامی شاعری کی مثالیں شاعری کے اکثر نہایت دلچسپ نمونے ایسے اشعار ہوا کرتے ہیں جو کسی خاص مقصد سے یا کسی خاص موقع پر کہے گئے ہوں۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ ان اشعار کے کہنے والے پیشہ ور شاعر ہی ہوں۔ ایسے اشعار دواوین کی بجائے زیادہ تر معاصر تواریخ میں نظر آتے ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر احسن التواریخ سے (جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے) حسب ذیل اشعار نقل کرتے ہیں۔ سنہ ۹۶۱ھ مطابق سنہ ۱۵۵۳ء/۱۵۵۴ء میں ہندوستان میں تین بادشاہوں کا انتقال ہوا محمود ثالث شاہِ گجرات، اسلام شاہ ولد شیر شاہ افغان شاہِ دہلی اور نظام الملک بحری شاہِ دکن۔ ذیل کے اشعار میں اسی "قران" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مادۂ تاریخی نکالا گیا ہے:-

سہ خسرو را قران آمد بہ یک سال — کہ ہند از عدل شان دار الاماں بود

یکے محمود[۱] شاہنشاہِ گجرات — کہ ہمچو دولتِ خود نوجواں بود

دوم اسلام شہ[۲] سلطانِ دہلی — کہ در ہندوستاں صاحب قراں بود

---

[۱] ملاحظہ ہو لین پول کی Mohammadan Dynasties ص۳۱۳۔ ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو لین پول کی Mohammadan Dynasties ص۳۰۰ و ص۳۰۳ ۱۲ مصنف

سلیم آمد نظام الملک بحری[1] کہ در ملکِ دکن خسرو نشاں بود
زمن تاریخ فوت آں سہ خسرو
چہ می پرسی ، زوالِ خسرواں بود
سنہ ۹۶۱ھ

اسی طرح سے مذکورۂ بالا واقعہ کے ایک سال بعد سنہ ۹۶۲ھ مطابق سنہ ۱۵۵۴ء۔سنہ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کے انتقال پر مولانا قاسم نے حسب ذیل اشعار کہے تھے :-

ہمایوں پادشاہِ ملکِ معنی | ندارد کس چو او شاہنشہی یاد
زبامِ قصرِ خود افتاد ناگہ[2] | وزو عمرِ گرامی رفت برباد
پئے تاریخ او قاسم[3] رقم زد
ہمایوں پادشاہ از بام افتاد
سنہ ۹۶۲ھ

---

[1] ملاحظہ ہو لین پول کی Mohammadan Dynasties صفحہ ۳۲۲۔ مجھے بحری کے صحیح ہونے میں شک ہے غالباً یہ لفظ برہان ہے جو احمد نگر کے نظام شاہ ثانی کا نام تھا جس نے سنہ ۹۱۴ھ سے سنہ ۹۶۱ھ تک (سنہ ۱۵۰۸ء۔سنہ ۱۵۵۳ء) حکومت کی ۱۲ مصنف

[2] میرے نسخۂ احسن التواریخ میں اس جگہ "گاہے" لکھا ہوا ہے جسے میں نے ناگہ بنا دیا ہے۔ ہمایوں کے انتقال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ارسکن (Erskine) کی تصنیف "History of India under the first two, Sovereigns of the House of Timur, Baber, and Humayun (London 1854) Vol. II, PP. 527-528.

[3] یہ مادۂ تاریخی غیر معمولی طور پر سادہ برمحل اور بے ساختہ ہے۔ ۱۲ مصنف

ذیل کے اشعار جن میں باشندگانِ قزوین کو بُرا بھلا کہا گیا ہے، حیرتی کی تصنیف ہیں جو ۹۶۱ھ مطابق ۱۵۵۳ء - ۱۵۵۴ء میں بمقام کاشان گزرا۔

وقت آں آمد کہ آساید سپہرِ بے مدار
چوں زمیں در سایہ ات ای سایۂ پروردگار
بادشاہا! مدت نُہ ماہ شد کیں ناتواں
ماندہ در قزویں خراب و خستہ و مجروح و زار
یافتم رسم تسنن در وضیع و در شریف
دیدم آثارِ تخرج در صغار و در کبار
در مقابر پائے شستہ از فقیر و از غنی
در مساجد دست بستہ از یمین و از یسار
در زمانِ چوں تو شاہے دست بستن در نماز
ہست کارے دست بستہ ای شہِ عالی تبار
قاضی ایں ملک نسل خالدِ ابن الولید
مفتی ایں شہر فرزندِ سعیدِ نابکار
کشتہ گردیدہ ز تیغِ شاہ غازی ہر دو را
ہم برادر ہم پدر ہم یار ہم خویش و تبار
خود بفرما ای شہِ دانا کہ اکنوں ایں گروہ
داعی خصم اند یا مولائے شاہِ کامگار
قتل عامی گر نباشد، قتل خاصے می تواں
خاصہ از بہرِ رضائے حضرتِ پروردگار
نیستند ایں ہا رعایائے کہ باشد قتل شاں

موجبِ تکلیف مال و مانعِ خرجِ دیار
بلکہ ہر یک مبلغے از مالِ دیوان می خورند
سر بسر صاحب سیور غالند و ہم ادرار وار

ان ہنگامی یا عصری نظموں کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ ہم کو اُن واقعات کا صحیح صحیح علم نہیں ہوتا جو ان کی تصنیف کے محرک ہوئے تھے اور ہم ان کے اشارات اور تلمیحات کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مثلاً اسی نظم میں جسے ہم نے ابھی ابھی نقل کیا ہے یہ کسی طرح سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ باشندگانِ قزوین نے شاعر کے ساتھ ایسا کون سا سلوک کیا تھا جس کی وجہ سے وہ یوں اپنے دل کا بخار نکال رہا ہے؟ جس قاضی اور مفتی کو اس نے بُرا بھلا کہا ہے، وہ کون تھے؟ ان کے عزیزوں کو بادشاہ نے کیوں قتل کیا تھا؟ وہ کس "خصم" کے "داعی" تھے، وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ہم ان اشعار کی تاریخ تصنیف سے واقف نہیں ہیں اور نہ ہمیں اس کا علم ہے یہ شاہ طہماسپ کے عہد میں لکھے گئے تھے یا اس کے والد اور پیش رو شاہ اسمٰعیل کے زمانے میں، اس لیے ہم مذکورہ بالا سوالات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ تاہم یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ اس زمانے میں جب یہ اشعار لکھے گئے قزوین میں سنی عقائد کس قدر پھیلے ہوئے تھے۔
آج کل کی ہنگامی یا عصری شاعری کی تلمیحیں، اشارے اور حوالے البتہ بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں، اس لیے کہ زمانۂ انقلاب کے اخبارات میں خصوصاً سنہ ۱۹۰۶ء۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے دور کے جرائد میں اس قسم کی شاعری کے نمونے بکثرت نظر آتے ہیں۔

۳۔ مذہبی شاعری یا منقبت

صفویہ دَور کے جن بے شمار شعرا نے ائمہ علیہم السلام کی منقبت لکھی یا ان کے ابتلا اور مصائب کا حال بیان کیا ہو ان میں محتشم کاشی (وفات ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۸ء) سب سے زیادہ مشہور ہو۔ جوانی میں اس کی شاعری کا رنگ عاشقانہ تھا، لیکن بعد میں اس نے اپنی ساری ذہنی قوتوں کو مذہبی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ رضا قلی خان نے اپنے مجمع الفصحا میں (جلد دوم ص۲۶ ۔ ص۳۸) اس کی دونوں رنگوں کی شاعری کے نمونے دیے ہیں، لیکن سردست ہماری بحث صرف اس کی مذہبی رنگ کی شاعری سے ہو۔ تاریخ عالم آرائے عباسی[۱] کے مصنف نے شاہ طہماسپ کے عہد کے نامور شاعروں کے بیان میں لکھا ہو کہ اگرچہ اوائل عمر میں بادشاہ کو شاعروں کی صحبت میں لطف آتا تھا اور شعر و سخن سے حظ حاصل ہوتا تھا، لیکن بعد کو اپنی طبیعت کی روز افزوں خشکی اور مجتہدین کے کہنے سننے سے وہ شاعروں سے ناخوش رہنے اور اُنھیں "وسیع المشرب" سمجھنے لگا، حتیٰ کہ جب محتشم نے دو نہایت بلند پایہ قصیدے ایک خود شاہ کی تعریف میں اور دوسرا شہزادی پری خانم کے لیے کہے تو اسے ایک حبّہ بھی صلہ کے طور پر نہ ملا اور شاہ نے فرمایا

شاہانِ صفویہ عقائد کی طرف التفات نہ کرتے تھے۔

[۱] میرے نسخہ ۱۱۳ کا ورق H ص۱۳۸ الف ۔ ص۱۳۹ ب
بدقسمتی سے یہ اہم تاریخ ہنوز غیر مطبوعہ ہو۔ ۱۲ مصنف

کہ بفحوائے عربی مثل "اکذب الشعر احسنہٗ" ایسے قصیدوں میں دروغ بافیوں اور مبالغوں کا طومار ہونا لازمی ہے، لیکن چونکہ نعت پیغمبرؐ اور منقبت ائمہ علیہم السلام میں جتنا بھی غلو کیا جائے کم ہے اس لیے ان میدانوں میں شاعر نہ صرف اپنی طبیعت کی جولانی دکھا سکتا ہے بلکہ مادّی صلے کے بدلے ثواب اُخروی کی دولت سے بھی مالامال ہوسکتا ہے۔ چنانچہ شاہ کی اس فرمایش ہی پر محتشم نے منقبت ائمہ میں اپنا مشہور روزگار "ہفت بند" لکھا اور انعام و اکرام سے سرفراز ہُوا۔ اس کی تقلید میں اور کئی شعرا نے بھی یہی روش اختیار کی اور تھوڑی ہی سی مدت میں پچاس ساٹھ ہفت بند تیار ہوگئے۔ اشعار کے جن جن انتخابات میں محتشم کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں یہ ہفت بند بھی ضرور نقل کیا گیا ہے، لیکن اس کی پوری پوری نقل صرف ضیا پاشا کی خرابات[۱] (جلد دوم ص۱۹۷-ص۲۰۰) میں ملتی ہے۔ اس پوری نظم میں (۱۲ بند ہیں) ہر بند میں سات اشعار ہیں اور ہر بند کی ٹیپ دوسری بحر میں ہے۔ غرضکہ کل ۹۶ اشعار ہیں۔ اس کی زبان میں غیر معمولی سلاست اور بے ساختگی پائی جاتی ہے اور اس میں وہ لفظی صنایع و بدایع بالکل نہیں ہیں جن سے اکثر یورپی حضرات منغص ہُوا کرتے ہیں، بلکہ اصلی درد اور مذہبی احساس کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ ہفت بند اسی قسم کے اور دوسرے ہفت بندوں کا سچّا نمونہ ہے اس لیے میری آرزو تھی کہ اس کی

---

[۱] عربی، فارسی اور ترکی اشعار کا یہ لاجواب انتخاب ۱۲۹۱ھ-۱۲۹۲ھ (۱۸۷۴ء-۱۸۷۵ء) میں قسطنطنیہ سے تین جلدوں میں شایع ہوچکا ہے ۱۲ مصنف

پوری نقل کرنے کی گنجایش ان صفحات میں نکل سکتی لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں ہے اس لیے میں نمونے کے طور پر بارہ بندوں میں سے صرف تین (چوتھا، پانچواں اور چھٹا) یہاں نقل کیے دیتا ہوں:-

محتشم کا مشہور ہفت بند

برخوانِ غم چو عالمیاں را صلا زدند
اول صلا بسلسلۂ انبیا زدند
نوبت بہ اولیا چو رسید آسماں طپید
زاں ضربتے کہ بر سرِ شیرِ خدا زدند
پس آتشے ز اخگرِ الماس ریزہ ہا
افروختند و بر حسنِ مجتبیٰ زدند
وانگہ سرادقیکہ ملک محرمش نبود
کندند از مدینہ و در کربلا زدند
وز تیشۂ ستیزہ دراں دشتِ کوفیاں
بس نخلہا ز گلشنِ آلِ عبا زدند
پس ضربتے کزاں جگرِ مصطفیٰ درید
بر حلقِ تشنۂ خلفِ مرتضیٰ زدند
اہلِ حرم دریدہ گریباں کشادہ موے
فریاد بر درِ حرمِ کبریا زدند
روح الامیں نہادہ بزانو سرِ حجاب
تاریک شد ز دیدنِ او چشمِ آفتاب

چوں خونِ حلق تشنۂ او بر زمیں رسید
جوش از زمیں بذروۂ عرشِ بریں رسید
نزدیک شد کہ خانۂ ایماں شود خراب
از بس شکستہ ہا کہ بہ ارکانِ دیں رسید
نخلِ بلند او چو خساں بر زمیں زدند
طوفاں بہ آسماں زغبارِ زمیں رسید
باد آں غبار را بہ مزارِ نبی رساند
گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمیں رسید
یک بارہ جامہ در خمِ گردوں بہ نیل زد
چوں ایں خبر بہ عیسیٰ گردوں نشیں رسید
پُر شد فلک ز غلغلہ چوں نوبتِ خروش
از انبیا بحضرتِ روح الامیں رسید
کرد ایں خیال وہم غلط کار کیں غبار
تا دامنِ جلالِ جہاں آفریں رسید
ہست از ملال گرچہ بری ذاتِ ذوالجلال
او در دل است و ہیچ دلے نیست بے ملال

ترسم جزائے قاتلِ او چوں رقم زنند
یک بارہ بر جریدۂ رحمت قلم زنند
ترسم کزیں گناہ شفیعانِ روزِ حشر
دارند شرم کز گنہِ خلق دم زنند

دستِ عتابِ حق بدر آید ز آستیں
چوں اہلِ بیت دست بر اہلِ ستم زنند
آہ از دمیکہ باکفنِ خوں چکاں زخاک
آلِ علی چو شعلۂ آتش عَلَم زنند
فریاد از آں زماں کہ جوانانِ اہلِ بیت
گلگوں کفن بعرصۂ محشر بہم زنند
جمعے کہ زد بہم صفِ شاں شور کربلا
در حشر صف زناں صفِ محشر بہم زنند
از صاحبِ حرم چہ توقع کنند باز
آں ناکساں کہ تیغ بصیدِ حرم زنند
پس بر سناں کنند سرے راکہ جبرئیل
شوید غبار گیسویش از آب سلسبیل

اس قسم کی شاعری میں اصلی درد اور احساس ہوتا ہے۔ مذکورۂ بالا اشعار کو خواہ بہ اعتبار شاعری اچھا نہ کہا جا سکے اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے خشک ترجمے میں جس میں جابجا ایسی ایسی باتوں پر حاشیوں کا طومار ہو جنھیں ہر ایرانی سمجھتا ہے لیکن جو غیر ملکیوں اور غیر مسلموں کی فہم سے بالا تر ہیں — ان اشعار کا اصلی حسن ظاہر نہیں ہو سکتا[1]۔ لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا

[1] ناظرین کو شاید یہ جملہ بے ربط نظر آئے، پروفیسر براؤن نے محتشم کے اشعار نقل کرنے کے بعد ان کا انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے جس میں جابجا ایسی چیزوں جیسے کوفیاں، سلسبیل آلِ عبا وغیرہ پر حواشی بھی ہیں اور یہ استعذار اسی ترجمے سے متعلق ہے ۱۲ مترجم

کہ ان اشعار میں اس گہرے دلی درد کی جھلک ضرور نظر آتی ہے جو خفیف سے خفیف مذہبی احساس رکھنے والے سنجیدہ خیال ایرانی کے دل میں بھی کربلا کے ناقابل فراموش سانحہ کی یاد سے پیدا ہو جاتا ہے ناصر خسرو کے اشعار کی طرح جو محتشم سے پانچ سو برس پہلے گزرا ہے ان اشعار کی بڑی خوبی ان کا خلوص اور حقیقت نگاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان میں ہمیں وہ سچی اور اصلی شاعری نظر آتی ہے جسے ہم اکثر ان فارسی شعرا کے پُر صنعت اشعار میں بھی نہیں پاتے جو اپنے وطن میں محتشم سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

قاآنی کا مرثیہ شہادت امام حسینؑ اس موقع پر میرا دل بے اختیار یہ چاہتا ہے کہ شہادت امام حسین علیہ السلام کے متعلق ایک اور مرثیہ کی نقل بھی دوں۔ اس مرثیہ میں نہ صرف صنعت شاعری کے اعتبار سے جدّت پائی جاتی ہے بلکہ یہ ایک ایسے شاعر (قاآنی وفات ۱۸۵۳ء) کا کہا ہوا ہے جو اپنے زمانہ میں غالباً جدید شعرائے ایران میں سب سے بڑا اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے سب سے گرا ہوا تھا۔ یہ نظم اس قسم کی نظموں کے ایک لیتھو گراف مجموعے سے لی گئی ہے جو بغیر کسی عنوان یا صراحت سن و مقام طباعت ایران میں شایع ہوا ہے۔ اس میں ۲۲۰ صفحے ہیں جن پر نمبر نہیں درج ہیں اور چھ شاعروں وصال، وقار، محتشم، قاآنی، صباحی اور بیدل کا کلام اس میں نقل کیا گیا ہے۔

بارد چہ؟ خوں، کہ؟ دیدہ، چساں؟ روز و شب، چرا؟
از غم، کدام غم؟ غم سلطان کربلا

نامش چہ بود؟ حسینؓ، ز نژاد کہ؟ از علیؓ

مامش کہ بود؟ فاطمہؓ، جدّش کہ؟ مصطفیٰؐ

چوں شد؟ شہید شد، بہ کجا؟ دشتِ ماریہ

کی؟ عاشرِ محرم، پنہاں، نہ برملا

شب کشتہ شد؟ نہ روز، چہ ہنگام؟ وقتِ ظہر

شد از گلو بریدہ سرش؟ نے، نے، از قفا

سیراب کشتہ شد؟ نہ، کس آبش نداد؟ داد

کہ؟ شمر، از چہ چشمہ؟ ز سرچشمۂ فنا

مظلوم شد شہید؟ بلے۔ جرم داشت؟ نہ،

کارش چہ بُد؟ ہدایہ، و یارش کہ بد؟ خدا

ایں ظلم را کہ کرد؟ یزید، ایں یزید کیست؟

ز اولادِ ہند، از چہ کس؟ از نطفۂ زنا[1]

خود کرد ایں عمل؟ نہ، فرستاد نامۂ،

نزد کہ؟ نزد زادۂ مرجانۂ دغا

ابنِ زیاد زادۂ مرجانہ بد؟ نعم

از گفتۂ یزید تخلّف نہ کرد؟ لا،

ایں نابکار کشت حسینؓ را بدستِ خویش

نہ، او روانہ کرد سپہ سوئے کربلا

---

[1] یزید، حضرت علیؓ کے حریف معاویہؓ بانی خاندان اُمیہ کا بیٹا تھا، معاویہ ابوسفیان اور ہند (آکلۃ الاکباد) کی اولاد تھے۔ پس "نطفۂ زنا" کا اطلاق یزید پر نہیں بلکہ ابنِ زیاد پر ہونا چاہیے دیکھو کتاب الفخری ایڈیشن اہلوارڈٹ (Ahlwardt) صفحہ ۱۳۳۔ ۱۳۵۔ ۱۲ مصنف

میرِ سپہ کہ بُد؟ عمرِ سعد، او یزید
حلقِ عزیزِ فاطمہ؟ نہ شمرِ بے حیا
خنجر یزید خنجرِ او را، نہ کرد شرم؟
کرد، از چہ پس بُرید؟ نپذیرفت از قضا
بہر چہ؟ بہر آں کہ شود خلق را شفیع
شرطِ شفاعتش چہ بود؟ نوحہ و بُکا
کس کُشتہ شد ہم از پسرانش؟ بلے، دو تن
دیگر کہ؟ نُہ برادر، و دیگر کہ؟ اقربا
دیگر پسر نداشت؟ چرا، داشت، آں کہ بود؟
سجّاد، چوں بُد او؟ بہ غم و رنج مبتلا
ماند او بہ کربلائے پدر؟ نے بہ شام رفت
با عز و احتشام؟ نہ با ذِلّت وعنا
تنہا؟ نہ بازنانِ حرم، نام شاں چہ بود؟
زینب، سکینہ، فاطمہ، کلثوم، بے نوا
برتن لباس داشت؟ بلے، گردِ رہ گزار
بر سر عمامہ داشت؟ بلے، چوب اشقیا
بیمار بد؟ بلے، چہ دوا داشت؟ اشکِ چشم
بعد از دوا غذاش چہ بُد؟ خون دل غذا
کس بود ہمرہش؟ بلے، اطفالِ بے پدر
دیگر کہ بود؟ تپ کہ نمی گشت از و جدا
از زینتِ زناں چہ بجا ماندہ بود؟ دو چیز

طوقِ ستم بگردن و غلطالِ غم بہ پا
گبر ایں ستم کند؟ نہ، مجوس و یہود؟ نہ
ہندو؟ نہ، بت پرست؟ نہ، فریاد ازیں جفا
قاآنی است قایل این شعرہا؟ بلے،
خواہد چہ؟ رحمت، از کہ؟ زحق، کی؟ صفِ جزا

عامیانہ مذاق کی مذہبی شاعری

قدیم طرز کے ان مراثی کے علاوہ، ائمہ علیہم السلام اور اہلِ بیتِ اطہار کے مصائب کی یاد کی وجہ سے ادبیات کا ایک اچھا خاصہ عام پسند ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے جو نظم اور نثر دونوں میں ہے۔ ماہ محرم کی عزا داری صرف ان مصیبت ناک واقعات کی شبیہ[1] ہی تک محدود نہیں ہوتی جن کی تعداد کم سے کم چالیس ہوتی ہے اور جن میں سے بعض ائمہ علیہم السلام کے علاوہ انبیا و اولیائے اسلام کے متعلق بھی ہوتی ہیں ان کے علاوہ، ان مصائب کا زبانی بیان بھی ہوتا ہے جسے "روضہ خوانی" کہتے ہیں۔ چونکہ اس موضوع پر ایک نہایت قدیم اور مشہور حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا پہلے سے موجود ہے، اس لیے ذکر مصائب کو بھی عام طور پر روضہ خوانی کہا جاتا ہے، خواہ وہ اسی کتاب سے ہو، یا ایسی ہی دوسری کتابوں مثلاً طوفان البکا، اسرار الشہادت وغیرہ سے۔ ایسی مجالس عام طور پر ماہ محرم میں امرا، عمائدین، یا تجار وغیرہ کی طرف سے ترتیب دی جاتی ہیں۔

---

[1] واقعاتِ کربلا کے ناٹک کو ایران میں "شبیہ" کہتے ہیں ۱۲ مترجم

ان میں پیشہ ور روضہ خوانوں کی کافی تعداد بلائی جاتی ہی اور روضہ
خوانی کے بعد شام کا پُر تکلف کھانا ہوتا ہی۔

عزائے محرم پر ایک طنزیہ حملہ

میرے پاس ایک عجیب و غریب کتاب، کتاب السفرہ فی ذم الریا[1] کا ایک نسخہ ہی جس میں میزبانوں
کی خود نمائی و نمود اور مہمانوں کی طمع اور دست درازیوں پر خوب
نمک مرچ لگاکر فقرے چست کیے گئے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں جو
اس کتاب سے نقل کیے جاتے ہیں، یہ بتایا گیا ہی کہ یہ خبریں کہ کس
کی مجلس میں ترمال زیادہ ہوگا، کس طرح مشہور ہوتی ہیں۔

کنوں بشنو از من یکے داستاں　　کہ رنگیں تر است از گلِ بوستاں
کسانیکہ گیرند عزائے حسینؑ　　بمجلس نشینند با شور و شین
برائے جگر گوشۂ فاطمہ　　سیہ پوش گردند یکسر ہمہ
نمایند برپا عزا خانہ ہا　　بگیرند عزائے شہِ کربلا
بہر گوشہ بزمے مہیّا کنند　　یکے مجلسِ تعزیہ برپا کنند
مفرّش نمایند صحن و اُطاق　　منقّش نمایند طاق و رواق
ہمہ گسترانند فرشِ لطیف　　بچینند اسباب ہائے ظریف
گروہے ز مردانِ اشکم پرست　　ز جامِ طمع جملہ بیخویش و مست
بایشاں طمع کردہ زانساں اثر　　کہ مانندۂ سکّہ بر روئے زر
بہ پیشانئ خویش بنہادہ داغ　　نمایند ازیں گونہ مجلس سُراغ
یکے زاں میاں گوید اے ہمرہاں　　پسندیدہ یارانِ کارآگہاں

[1] مصنف کا نام ترکی شیرازی بتایا گیا ہی اور یہ چھوٹی سی کتاب (۴۸ صفحات) ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء-۱۸۹۲ء) میں بمبئی میں لیتھو میں چھپی ہی۔ ۱۲ مصنف

من و حاجی عباس رفتیم دوش * سوئے بزمِ آں شخص سبزی فروش
نبود اندر آں مجلسِ مختصر بجز چاہے و قہوہ چیزے دگر
ندیدیم آں جا کس از مرد ماں بجز بانی و یک دوتن روضہ خواں
نشستن دراں بزم نبود روا کہ بے قند و چاہے ندارد صفا
خداوند ازاں بندہ خرسند نیست کہ در مجلسش شربتِ قند نیست
ولیکن بروزی دہ انس و جاں فلاں جاست بزمے چو بزمِ شہاں
عجب مجلسِ خوب و راحت فزاست یقیں دانم آں مجلس بے ریاست
درآں بزم چاہے بود آق پر ہمش قند یزدے بجائے شکر
زنے پیچ قلیان ہائے بلور کہ یابد دل از قلقل دے سرور
رود عطر تنبا کویش چند میل درخشد بہ سر آتشش چوں سہیل
نخواہد درآں جا شود آب صرف بجز شربتِ قند و لیمو و برف
نمودہ است بانی عالی جناب ز ہر کشورے ذاکرے انتخاب
یک از ذاکراں میرزا کاشی است کہ گویند او روضہ خواں باشی است
دگر زاں کساں ذاکر رشتی است کہ دریائے آواز را کشتی است
ز کرمان و از یزد و کرماں شہاں ز شیراز و از شوستر و اصفہاں
ہمہ موسقی داں و خوش صوت و نغز بود دیگراں قشر و ایشاں چو مغز
حقیقت عجب مجلسِ بے ریاست بجانِ شما رفتن آں جا بجاست
چوں یاراں کنند ایں سخن استماع بداں بزم یکسر کنند اجتماع

عزائے محرم کے خلوص کے متعلق بعض یورپی حضرات کی شہادتیں | مذکورہ بالا اشعار سے قطع نظر کرکے بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے

کہ محرم کی عزاداری کے سلسلے میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، خواہ شبیہیں دیکھنے سے ہوں یا روضہ خوانی سننے سے، نہایت گہرے اور سچے ہوتے ہیں اور غیر ملکیوں اور غیر مسلموں کو بھی ان کے مخلصانہ اور موثر ہونے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ سر لیوس پے لی (Sir Lewis Pelly) نے جن ۳۷ مجالس عزا کا ترجمہ کیا ہے[1] اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:-

"اگر کسی تمثیل کی کامیابی کا معیار اس تاثیر کو قرار دیا جائے جو اس کی وجہ سے ان لوگوں کے قلوب پر جن کے لیے وہ لکھی گئی ہے یا ناظرین کے دلوں پر ہوتی ہے تو ماننا پڑے گا کہ دنیا کا کوئی المیہ (ٹریجڈی) اس المیہ سے زیادہ کامیاب نہیں ہوا ہے جو مسلمانوں میں شہادت نامہ حسن و حسین کے نام سے مشہور ہے۔"

مسٹر میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) نے اپنی کتاب (Essays on Criticism) (مقالات بر تنقید ادبی) میں ایرانی شبیہوں کے نفس قصہ اور ان کے اثرات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسٹر میکالے (Macaulay) کے Essay on Clive (مقالہ بر کلائیو) نے تو اسرارِ محرم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر فانی بنا دیا ہے۔ اور تو اور خود گبن (Gibbon)

---

[1] The Miracle plays of Hassan and Hussain (2 Vols. London 1879)

جو بڑا نکتہ چیں اور شکی مزاج ہے، لکھتا ہے[۱]:-

"بعید سے بعید زمانے اور دُور سے دُور ملک میں بھی شہادتِ حسین کا الم ناک منظر بے حس سے بے حس ناظر کے جذبات کو متحرک کر دے گا۔"

ایرانی اپنے اس ہر دلعزیز آقا کو "سید الشہدا" کہتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کی نظروں میں ان کا درجہ اس سے بھی بمراتب زیادہ ہے؛ اس لیے کہ وہ تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب گنہگار امتیوں کی بخشش کے لیے خود پیغمبر کی سفارش بھی کام نہ دے گی تو امام حسینؑ کی شفاعت انھیں بخشوا دے گی۔

"حشر کے دن حضرت رسولِ مقبول امام حسینؑ سے ارشاد فرمائیں گے کہ جا اور ہر اُس شخص کو جس نے اپنی تمام عمر میں تیرے لیے ایک آنسو بھی بہایا ہے، یا تیری کسی طرح مدد کی ہے، یا تیرے روضہ کی زیارت کی ہے، یا غم میں مرثیہ کا ایک شعر بھی کہا ہے سب کو جہنم کے شعلوں سے نجات دلا اور اپنے ساتھ جنت میں لے جا[۲]۔"

غرض کہ ایرانی شیعہ کی نظروں میں حضرت امام حسین کا وہی درجہ ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو پروفیسر جے۔ بی۔ بری (J. B. Bury) کی مرتبہ کی ہوئی "Decline and fall of the Roman Empire" سات جلدوں میں طبع لندن ۱۸۹۸ء۔ جلد پنجم ص ۳۹۱۔ ۱۲ مصنف

[۲] (Sir Lewis Pelly' Miracle Play) جلد دوم ص ۳۴۷۔ ۱۲ مصنف

کفارہ کے متعلق ایرانیوں کا عقیدہ | جو عیسائیوں کی نگاہوں میں حضرت عیسیٰ کا ہے، حالانکہ کفارہ کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔ ہم ذیل میں ایک شعر نقل کرتے ہیں اور ایک انسان کی الوہیت کے متعلق جو مبالغہ اس میں ہے وہ شاید کسی دوسرے فارسی شعر میں نہ ملے گا:-

خلق گویند خدائی و من اندر غضب آیم
پردہ برداشتہ بینند بخود ننگ خدائی[1]

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ذیل کے اشعار پڑھ کر جو بابی شاعر نبیل[2] کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں کسی ایرانی شیعہ کو جتنا تعجب ہوگا وہ مذکورہ بالا شعر سے بھی نہ ہوا ہوگا:-

شہدائے طلعتِ نارِ من | بدوید سوئے دیارِ من
سر و جاں کنید نثارِ من | کہ منم شہنشہِ کربلا

طبری اور شروع کے دوسرے عرب مورخین نے حضرت امام حسین ؑ کی شہادت کے واقعات کی جو مختصر اور مبہم تاریخی بنیاد پیش کی ہے

[1] خرقیہ ازلیہ کے ایک مناظر کی رائے اس شعر کے متعلق یہ ہے کہ یہ بہاء اللہ کے کسی مرید نے ان کی شان میں کہا ہے، لیکن مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ یا اسی سے ملتا جلتا کوئی اور شعر دراصل امام حسین ؑ کی شان میں کہا گیا تھا۔ ۱۲ مصنف

[2] نبیل بابیوں کے نزدیک محمد کا بدل ہے، اس لیے کہ از روئے جمل دونوں کے اعداد ۹۲ ہیں۔ باب کی وفات کے بعد ایک مرتبہ نبیل نے خود باب ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور شاید یہ اشعار اسی زمانہ میں کہے گئے ہیں۔ بعد کو وہ بہاء اللہ کا راسخ مرید بن گیا اور ۱۸۹۲ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو خود بھی عکہ میں ڈوب کر مرگیا۔ ۱۲ مصنف

وہاں سے شروع کرکے درجہ بدرجہ ان مدارج کا مطالعہ کرنا جن میں سے گزر کر اس قصہ نے آج کل کی عزاداری اور روضہ خوانوں کی بنائی ہوئی پیچ درپیچ شکل اختیار کرلی ہی۔ دلچسپ ضرور ہی، لیکن افسوس کہ موجودہ تصنیف کی حدِّ نظر سے باہر ہی۔ اس داستان میں رومانی عنصر شروع ہی سے نظر آتا ہی، حتّٰی کہ ابو مخناف لوط ابن یحییٰ کی کتاب میں بھی موجود ہی جو دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں گزرا ہی[۱]۔ بعض لوگوں نے تو یہ رائے تک ظاہر کی ہی کہ شاید حضرت حسینؑ کو باستانی عہد کے کسی ہیرو (بطل) مثلاً Adonis کی صفات سے متصف کیا گیا ہی۔ اتنا بہرحال ضرور صحیح ہی کہ اگر آج کوئی شخص عاشورہ یا روزِ قتل کے خونی مناظر | بعل (Baal) کے پجاریوں کے مراسم کا اندازہ کرنا چاہے تو اسے ان کا بہترین نمونہ روزِ قتل کے ان مہیب مناظر میں مل سکتا ہی جو ہر اس مقام پر جہاں شیعہ حضرات کی تھوڑی بہت آبادی بھی ہی اور خاص کر ایران میں عشرۂ محرم کے روز نظر آتے ہیں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو وسٹن فیلڈ (Wustenfield) کی کتاب

Die geschichtsch nıeber der Aarber

مورخینِ عرب ۱۸۸۱ء صـ ۶

نیز ابو مخناف کی کتاب کا ترجمہ جو اس نے اس عنوان سے کیا ہی:-

Der Tod des Husein Ben Ali und die Rache : ein historicher Roman aus dem Arabischen (طبع گوٹنگن ۱۸۸۳ء)

(حسین ابن علیؑ کی موت اور اس کا انتقام تاریخی ناول ماخوذ از عربی) ۱۲ مصنف

حضرت امام حسین کے واقعات کے بعض حصوں سے تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایرانی شیعہ اور عیسائیوں کے عقائد بعض باتوں میں ایک سے ہیں۔ یہ مشابہت خصوصیت کے ساتھ کفارہ کے عقیدے میں نظر آتی ہے جس پر شیعہ اور عیسائی دونوں ہم عقیدہ ہیں۔ عقائد کی اس یک رنگی کی بہترین مثال یزید کے دربار میں" فرنگی سفیر[1] کے تبدیل مذہب اور اس کی شہادت کا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ آج بھی تعزیوں اور شبیہوں میں دکھایا جاتا ہے اور اگر مجلسِ عزا میں کچھ یورپی حضرات بھی ناظرین کی حیثیت سے شریک ہوں۔ تو اس کا دکھانا خاص طور پر قرینِ مصلحت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال اسمٰعیل خان سرباز کی کتاب اسرار الشہادت[2] میں ملتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ابن سعد، حضرت امام حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے بعض عیسائیوں سے مدد لینا چاہتا تھا، لیکن جب ان لوگوں کی نظریں سید الشہدا پر پڑیں:۔

کربلا را دید عرشِ کبریا　　　عرش را تر دید از خون خدا[3]

نقش بست اندر دل از کلکِ خیال　　　کیں خدا باشد بدیں فر و جلال

گر خدا نبود یقیں عیسےٰ بود　　　آفتابِ عرش دینِ ما بود

---

[1] ملاحظہ Pelly's Miracle Plays Vol. ii, PP 222-240. ۱۲ مصنف

[2] یہ کتاب بعض بھدّی تصویروں کے ساتھ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء-۱۸۵۶ء) میں طہران میں لیتھو ہوئی تھی۔ ۱۲ مصنف

[3] ایک مسلمان کے قلم یا زبان سے ایسے الفاظ کا نکلنا بہت تعجب خیز ہے۔ ۱۲ مصنف

تب وہ سردارِ اسلام کی صداقت اور حضرت امام حسینؑ کی پاکیزگی کا مُقِر ہو جاتا ہے:

خواست اذنِ جنگ باصد شور و شین
رفت و جاں بنمود قربان حسین

لیکن چونکہ ان مثالوں اور قصّوں کے علاوہ ہمیں ایک ہندی بادشاہ (جو شاید کافر تھا) حتّٰی کہ ایک شیر کے مشرف باسلام ہونے اور حضرت امام حسین کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کے واقعات بھی قصّوں میں نظر آتے ہیں، اس لیے غالبًا ان سب سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جب کافروں اور درندوں کے دل بھی مصائب حضرت امام حسینؑ دیکھ کر پگھل جاتے تھے تو وہ کلمہ گو مسلمان کتنے قسی القلب اور شقی ہوں گے جو ان کی اور ان کے رفقا کی شہادت کا باعث ہوئے۔

شبیہ یا تمثیلِ عزا کی کتابیں تعزیوں میں سوانگ بھرنے والے جو الفاظ استعمال کرتے ہیں ان کے اصل نسخے عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ بعض لکھنؤ کی چھپی ہوئی کتابیں البتہ مل جاتی ہیں اور اپنے مرحوم دوست جارج گریہم (George Graham) کی عنایت سے جو کسی زمانے میں ایران کے مختلف حصّوں میں سفیر کی حیثیت سے رہ چکے ہیں — میرے پاس ایسی چھ کتابیں موجود ہیں ان کے ایک عام نمونے کے طور پر میں ذیل میں شہادت حُر ابن یزید الریاحی[1] کا وہ حصّہ نقل کرتا ہوں جہاں کوفہ سے ایک عرب آتا

---

[1] سر لیوس پیلی (Sir Lewis Pelly) کی کتاب Miracle Plays (جلد اول ص۱۶۱-۱۶۹) میں اس سے متعلق ایک پورا سین (مجلس) علیحدہ موجود ہے۔ ۱۲ مصنف

اور امام حسین کو ان کے برادر عم زاد مسلم ابن عقیل کی شہادت کا واقعہ سناتا ہے :-

آمدن مرد عرب از کوفہ و خبر آوردن از شہادت مسلم ابن عقیل

عرب :- من کہ بینی کہ بصد شور و نوا می آیم
ہدہدم نزد سلیمان ز سبا می آیم
آیم از کوفہ و دارم خبر از مسلم زار
چوں نسیم سحری روح فزا می آیم
بہ سرم شوق لقاے پسر فاطمہ است
کہ بدردِ دلِ مجروح دوا می آیم

عباس :- این درے را کہ بود خاک سرایش کافور
سرمۂ چشم ملک باشد و خدامش حور
ہست ایں در بخدا قبلۂ اربابِ وفا
دردمندانِ بلا را بود ایں دارِ شفا

عرب :- سلام من بتو ای مقتدائے عالمیاں
ز کوفہ می رسم ای پیشوائے اہلِ جہاں
خدایرا، کجا می روی تو ای سرور
بیاں نما تو بحق خدائے جن و بشر

امام :- علیک من بتو ای قاصدِ نکو منظر
روم بہ کوفہ من ایں دم بحالت مضطر

نوشتہ اند بمن نامہ ہائے اشتیاق
فلک کشیدہ عنانم بسوے ملکِ عراق
بمن بگو تو ز مسلم اگر خبر داری
کسے بہ کوفہ بہ او کرد از وفا یاری

عرب :- مپرس از حالتِ مسلم، فدایت
بیا آقا ببوسم دست و پایت
مرو در کوفہ ای سلطان ابرار
کہ می ترسم شوی محزون و بے یار
مرو در کوفہ ای سرور امان است
بکن رحمے، علی اکبر[1] جوان است
مرو در کوفہ زینب خوار گردد
اسیرِ کوچہ و بازار گردد

امام :- عرب، از حالتِ مسلم بیاں کن
عرب :- برائے مسلم محزوں فغاں کن
امام :- بگو در کوفہ چوں شد حالِ مسلم
عرب :- بداں، برگشت شد اقبالِ مسلم
امام :- مگر کوفی تنش در خوں کشیدند
عرب :- سرِ پاکش ز ملکِ تن بریدند

---

[1] یعنی امام حسین کے فرزند اکبر، جنکی Miracle Plays میں ان کی شہادت کو ایک مستقل سین میں بیان کیا گیا ہے (جلد اول صفحہ ۲۸۶ - صفحہ ۳۰۳) - ۱۲ مصنف

امام :- مگر کردند جسمش پارہ پارہ[1]
عرب :- زدند جسم شریفش بر قنارہ
امام :- دگر برگو چہ کردند قوم اشرار
عرب :- کشیدندش میانِ شہر و بازار
امام :- بگو از حالتِ طفلانِ مسلم
عرب :- شدند اندر جہاں مہمانِ مسلم
امام :- کہ بر آں کودکاں ظلم و جفا کرد؟
عرب :- سرِ ایشاں زتن حارث جدا کرد
امام :- فغاں از دیدۂ گریانِ مسلم
عرب :- بود ایں جامۂ طفلانِ مسلم

اے وائے کہ مسلم وفادار
کشتہ شدہ از جفائے اشرار

صفحات گزشتہ میں میں نے اس وسیع ادبیات کی صرف ایک سرسری جھلک ناظرین کو دکھائی ہے جو عام طور پر ایرانی تمثیل عزا (Persian Passion Play) کے نام سے مشہور ہے اور صرف اس کے چیدہ چیدہ نمونے پیش کیے ہیں: یعنی (ا) محتشم اور اس کے مقلدوں کے کہے ہوئے قدیم طرز کے مراثی، (ب) واقعات کربلا کے عام مذاق کے بیانات خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں، یا دونوں میں۔ اس قسم کے بیانات بے شمار غیر معروف

---

[1] نسخہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ شعر ایک نے یا دونوں نے ایک ساتھ پڑھا ہے۔ ۱۲ مصنف

لیتھو نسخوں میں ملتے ہیں اور میں نے ان سب کے نمونے کے طور پر صرف اسرار الشہادت کو لیا ہی، نہ اس وجہ سے کہ اس میں کوئی خاص خوبی ہی، بلکہ محض اس لیے کہ یہ ان چند کتابوں میں سے ہی جن کے نسخے میرے پاس موجود ہیں اور (ج) شبیہیں جو طہران کے شاہی عاشور خانے میں عشرۂ محرم میں دکھائی جاتی ہیں اور ان کی عبارتوں کا نمونہ ۔ مجالس محرم میں جن کتابوں سے روضہ خوانی ہوتی ہی ان کے نسخے عام طور پر فارسی کتب کے ذخیروں میں نظر آتے ہیں اور ان میں سے ایک کا بیان (جو نشان Add. 423 کے تحت کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہی) میں تفصیل کے ساتھ اپنی مرتب کردہ "فہرست مخطوطات فارسی کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی[1] میں کر چکا ہوں ۔ اس قسم کی اکثر نظموں کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہی، لیکن جن جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہی، ان میں مقبل، مخلص، موزون، نسیم، شفیع اور لوحی وغیرہ کا نام بھی ملتا ہی۔ مجھے ان میں سے کسی کے حالاتِ زندگی کے متعلق بھی کوئی مواد کہیں سے نہیں مل سکا۔

۴۔ بابی شاعری

سانحہ کربلا کا اثر ایرانی دماغ پر بہت گہرا ہوا ہی | میرے ایک نوجوان ایرانی دوست نے جو نئی پود کے دوسرے نوجوانوں کی طرح ملّاؤں، روضہ خوانوں، ان کی پیدا کی ہوئی مذہبی فضا اور خصوصًا

[1] No LXVI. PP. 122-142 صفحہ ۱۴۳ پر اس قسم کے اور دوسرے ذخیروں کے متعلق بعض حوالے دیئے گئے ہیں۔ ۱۲ مصنف

مراسم محرم کے بہت شاکی ہیں، میرے سامنے برسبیلِ تذکرہ اعتراف کیا تھا کہ خواہ عزا داری اور اس کے مراسم قابلِ اعتراض ہوں یا نہ ہوں، لیکن اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ جو کچھ کام اس سلسلہ میں کیا گیا ہے، وہ اتنا مکمل طور پر کیا گیا ہے کہ ایران کی جاہل سی جاہل عورت اور ناخواندہ سے ناخواندہ کسان تک واقعاتِ شہادت کی ایک ایک تفصیل سے واقف ہوگئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ بیان کردہ واقعات یا اشخاص متعلقہ کی صحیح تاریخ سے واقف نہ ہوں۔ ملّا محمد باقر مجلسی کی طرح کے جیّد مجتہدین بھی چاہے وہ ان عامیانہ شبیہوں کے مبالغے اور اکثر بے ادبی کے جملوں کو بنظر استحسان نہ دیکھتے ہوں، لیکن سب کے سب اس کی بڑی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ان کے ہم وطنوں کے سامنے اس موضوع پر فارسی کے سہل اور سلیس رسالے آجائیں تاکہ واقعات کربلا کا علم صرف عربی داں طبقہ اور مجتہدین ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ عام ہو جائے۔

ایرانیوں کا جذبۂ شہادت ان شبیہوں کا ایک نمایاں اثر یہ ہوا ہے کہ عام طور پر ہر ایرانی کے دل میں شوقِ شہادت پیدا ہوگیا ہے۔ موریر Morier کی کتاب حاجی بابا میں ایرانی مزاج کی جو یک رُخی تصویر کھینچی گئی ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کا خاکہ اُڑایا گیا ہے، اس کے پڑھنے والے اس شوقِ شہادت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے اور ایرانیوں کو ایک بُزدل قوم سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن جن ایرانی مبلّغین نے اپنی زندگیاں ایران میں بسر کی ہیں اور جنھیں وہاں کے باشندوں کے متعلق دوسرے شعبوں میں کام کرنے والوں کی بہ نسبت

کہیں زیادہ ہمدردانہ بصیرت حاصل ہی، وہ ایرانی قوم سے زیادہ بہتر طریقے پر واقف ہیں۔ چنانچہ پادری نے پی برمیل کم (Rev. Napier Malcolm) نے اپنی کتاب Five years in a Persian Toun (Yazd) (ایک ایرانی شہر یزد میں پنج سالہ قیام) میں بابی اور بہائی شہیدوں کی فداکاری، ہمت اور استقلال کا جو بے لاگ اور مکمل بیان کیا ہی وہ کسی دوسرے مصنف کے یہاں ہرگز نہ ملے گا۔ ایک بابیوں اور بہائیوں کی شہرت کا بڑا سبب ان کے شہیدوں کی فداکاری تھی۔ | اور مشنری بزرگ نے مجھ سے اپنا اصفہان کا ایک چشم دید دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ اس شہر کے بڑے مجتہدین میں سے ایک نے شرک کے جرم میں چند بابیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا تھا اور راوی قصّہ کا بیان ہی کہ میں نے ہمّت کرکے ان مجتہد صاحب سے ان بدنصیبوں کی سفارش کی۔ شروع شروع میں تو انھیں اس دخل در معقولات پر بہت غصّہ آیا، لیکن جب میرے دوست (راوی) نے ان سے کہا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس فرقہ نے جو کچھ زور پکڑا ہی، وہ اس وجہ سے ہی کہ ان کے عقائد زیادہ سچّے ہیں؟ برخلاف اس کے، کیا ان کے اس طرح قوت حاصل کرنے کی یہ اور صرف یہ وجہ نہیں ہی کہ جن بابیوں کو آپ، یا آپ کی طرح کے دوسرے مجتہدین بابی عقائد کے پابند ہونے کی پاداش میں سزائے موت دیتے ہیں وہ نہایت دلیری اور بلند ہمتی کے ساتھ موت قبول کرتے ہیں۔ اگر شروع ہی سے بابیوں کو ایذائیں نہ دی جاتیں اور وہ اسے پکّے استقلال اور اٹل ہمّت کے ساتھ خوشی خوشی گوارا نہ کرتے

تو آج ان کی بھی وہی معمولی حالت ہوتی جو ایران کے اور سینکڑوں غیر معروف مذہبی فرقوں کی ہی، یعنی انھیں کوئی جانتا تک نہیں۔ لیکن یہ آپ اور آپ جیسے دوسرے مجتہدوں کی حرکات کا نتیجہ ہی کہ آج فرقۂ بابیہ تعداد اور قوت میں اتنی ترقی کر گیا ہی، اس لیے کہ اگر آپ ایک بابی کو سزائے قتل دیتے ہیں تو اس کی جگہ سنو آدمی بابی مذہب اختیار کر لیتے ہیں" مجتہد نے ذرا دیر غور کیا اور پھر کہا "آپ سچ کہتے ہیں، میں ان لوگوں کی جان بخشی کر دوں گا[1]"

اکثر بابی شہدا اشعار پڑھتے ہوئے جاں بحق ہوتے تھے۔ جب سلیمان خان کے جسم میں جو زخموں سے چور تھا، مشعلوں کی لو لگائی جا رہی تھی تو وہ لہک لہک کر یہ شعر پڑھ رہا تھا:

یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار
رقص چنیں میانۂ میدانم آرزو است

اسی طرح سے جب "ہفت شہدا" میں سے ایک کی گردن پر جلاد نے تلوار چلائی، لیکن سر کی بجائے اس کی دستار زمین پر گر پڑی تو اس نے فوراً یہ شعر پڑھا:

اے خوش آں عاشقِ سرمست کہ در پائے حبیب
سر و دستار نداند کہ کدام اندازد

---

[1] میرے قابل دوست اور سابق شاگرد مسٹر ڈبلو۔ اے۔ اسمارٹ (W. A. Smart) نے حسن انصاف پسندی کو ایرانیوں کی نہایت محبوب اور پسندیدہ سیرت کہا ہی، مجتہد کا رویہ اس کا ثبوت ہی۔ ۱۲ مصنف

عربی اور ایرانی شجاعت کی خصوصیات

قدیم زمانے کے متعلق وِل فرڈ بلنٹ (Wilfred Blunt) نے خوب لکھا ہے[1]:-

"ان کی شجاعت اس بہادری سے مختلف قسم کی تھی جسے ہم لوگ قابلِ تعریف سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے زود حس اور اشتعال پذیر لوگوں کی شجاعت تھی جو دیکھنے والوں کی واہ واہ اور خود اپنی آوازوں سے اور زیادہ جوش میں آکر بہادری کے جوہر دکھاتے تھے"

تقریباً یہی رائے ایرانیوں کی بہادری کے لیے بھی صحیح ہے۔ شاعری کو سحرِ حلال کہتے ہیں اور اس کی وجہ بقول چہار مقالہ کے مصنف کے یہ ہے کہ[2]:-

"شاعری کا فن ہے جس کی بدولت شاعر چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو چھوٹا کر دکھاتا ہے اور بُرائی کو بھلائی کا اور

---

[1] ملاحظہ ہو اس کی تصنیف The Seven golden odes of Pagan Arabia (سبعہ معلقہ) طبع لندن ۱۹۰۳ء ص ۱۲ مصنف

[2] "شاعری صناعتے است . . . . . . کہ شاعر بدان وجہ آں معنے خرد را بزرگ گرداند و معنے بزرگ را خرد و نیکو را در خلعتِ زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند . . . . تا بدان ایہام طبایع را انقباضے وانبساطے بود و امورِ عظام را در نظامِ عالم سبب شود"
چہار مقالہ نظامی عروضی (گِب میموریل سیریز) ص ۲۶ ۔ ۱۲ مترجم

بھلائی کو بُرائی کا جامہ پہنا دیتا ہی اور یہ سب کچھ اس انداز
سے کیا جاتا ہی کہ انسانوں کے قلب انقباض یا ابنساط
کے جذبات سے بھر جاتے ہیں، غرض کہ اس طرح سے
شاعر نظامِ عالم میں بڑے بڑے کاموں کی تکمیل میں مدد
دیتا ہی۔"

واقعہ کربلا ہی وہ خاص محرک ہی جس نے ایران کے شہدا میں ایسی نفسی حالت پیدا کردی ہی جس میں نہ صرف مصائب کا مقابلہ استقلال کے ساتھ کیا جاتا ہی، بلکہ لذتِ آزار کا ذوق بھی پیدا ہو جاتا ہی۔ بابی شاعرہ اور مجاہدہ قرۃ العین (جو اگست ۱۸۵۲ء کے مظالم کا شکار ہوئی) کی دو مشہور نظموں[1] میں سے ایک میں یہ شعر موجود ہی:-

من و عشق آں مہِ خوبرو، کہ چو شد صلائے بلا برو
بہ نشاط و قہقہہ شد فرو، کہ انا الشہید بکربلا[2]

اپنی ابتدائی اور خالص شکل میں بابیت کا عقیدہ گویا ایک طرح کی مبالغہ آمیز شیعیت ہی اور باب د امام غائب، حضرت مہدی کا "دروازہ" تھے۔ رفتہ رفتہ وہ خود کو "امام غائب" سمجھنے لگے، پھر "نقطہ" یعنی ذات برتر کا حقیقی ظہور بن گئے اور ان کے خاص خاص مریدین ائمہ کے اوتار قرار پائے اور بمقام شیخ طبرسی (مازندران) پورا واقعہ کربلا "ایک نئی فضا" میں پیش کیا گیا۔ باب کی تمام تحریرات میں سب سے زیادہ قریب الفہم اور مربوط تصنیف ان کی فارسی کتاب بیان ہی کہ

---

[1] میری تصنیف Materials for the Study of the Babi Religion کے صفحات ۳۴۳-۳۵۱ پر یہ دونوں نظمیں مع منظوم ترجموں کے موجود ہیں ۱۲ مصنف
[2] دیکھو محتشم کے ہفت بند منقولہ ص۱۶۳ کا پہلا شعر۔ ۱۲ مصنف

اور اس کے ۱۹ ابواب میں جن پر کتاب کا پہلا "واحد" مشتمل ہے، زیادہ تر یہ عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی دور کے تمام سربرآوردہ بزرگوں نے موجودہ دور میں پھر دنیاوی زندگی کی طرف "رجعت"[1] کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے بابی مورخ حاجی مرزا جانی نے جو ۱۸۵۲ء کے مظالم کا شکار ہوا، میدانِ کربلا اور میدانِ شیخ طبرسی کا ایک طول طویل موازنہ کیا ہے اور آخرالذکر کی فوقیت ثابت کی ہے[2]۔

بہائی شاعر مرزا نعیم ساکن سی دہ | اپنی کتاب Materials for the Study of the Babi Religion (صلہ ۲۳۱۔ ۳۵۸)

کے گیارھویں یعنی آخری حصہ میں بابی اور بہائی شعرا کے بعض اشعار کا انتخاب دے چکا ہوں اور اس موقع پر میں ان میں صرف ایک قصیدہ کا اضافہ کروں گا جو ۱۳۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ مرزا نعیم نے جو اصفہان کے پاس ایک مقام سی دہ کے رہنے والے ہیں ۱۸۸۸ء کے موسمِ بہار میں کہا تھا۔ یہ صاحب ایک جوشیلے بہائی تھے اور مجھے اپنے ایک دوست سے جو سفارت خانہ انگریزی میں ملازم ہیں، معلوم ہوا ہے کہ ان کے ایک فرزند آج کل بھی سی دہ میں سکونت پذیر ہیں۔ مرزا نعیم نے[3] ۱۹۰۲ء کے موسم گرما

---

[1] رجعت کے اس خاص مسئلہ کے لیے ملاحظہ ہو میری تصنیف Materials etc. صلہ ۲۳۵۔ ۲۳۹ اور میرا تاریخ جدید کا ترجمہ (Translation of the New History) صلہ ۳۳۴۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو نقطۃ الکاف (سلسلہ گب ۱۵) صلہ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۱۲ مصنف

[3] ان کا ذکر میری تصنیف "A Year among the Persians" (P. 519) میں ہو چکا ہے، وہاں میں نے غلطی سے انھیں آبادہ کا باشندہ لکھ دیا ہے۔ ۱۲ مصنف

میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس قصیدہ کی ایک نقل میرے مرحوم دوست
جارج گریہم (George Graham) کے توسط سے مجھے بھجوائی
تھی اور خاتمہ پر اپنے متعلق یہ لکھا تھا کہ میں ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء۔
۱۸۵۶ء) میں بمقام سی دہ پیدا ہوا اور ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء۔۱۸۸۷ء)
میں طہران آیا۔ یہ قصیدہ اتنا طویل ہے کہ پہلے میں نے یہ خیال کیا تھا
کہ صرف اس کے جستہ جستہ انتخابات ہدیۂ ناظرین کروں گا، لیکن جب
مجھے معلوم ہوا کہ ایسا کرنے میں ربط خیالات میں خلل پڑنے کا اندیشہ
ہے تو میں نے اسے من وعن نقل کرنے کا ارادہ کرلیا، چنانچہ اس
قصیدہ کو ایسے بہائی کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے جس کی تطبیق خود مصنف
کے قلمی مسودہ سے کی جا چکی ہے:۔

ھُواللہ تعالیٰ شانہٗ

(۱) مرا بود دل و چشمے ز گردش گردوں
یکے چو دجلۂ آب و یکے چو لُجّۂ خوں

(۲) چرا ننالم سخت، و چرا نہ گریم زار
کہ از مضیق جہاں رہ نمی برم بیروں

(۳) درونِ دائرہ مقصودِ خود نمی یابم
مرا نہ پائے بروں باشد و نہ جائے دروں

(۴) مرا چہ فائدہ از جاہ اگر شوم قارن[۱]
مرا چہ عائدہ از مال اگر شوم قاروں

---

[۱] قارن: ایران باستانی کے سات خاندان امرا میں سے (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

(۵) چو می نهم چه ثمر می دہد ضیاع و عقار؟
چو بگزرم چه اثر می کند نبات و بنوں

(۶) مرا چه فخر که نوشم عقار یا جلاب
مرا چه فضل که پوشم حریر یا اکسوں[1]

(۷) چو ملک و مال نه ماند چه محتشم چه فقیر
چو روزگار نپاید چه شاد چه محزوں

(۸) بعقل نازم و هر جانور ازاں مسلو
بروح بالم و هر جانگه ازاں مشحوں

(۹) مرا ازیں چه که گویم چه کرد اسکندر
مرا بدیں چه که دانم که بود ناپلیوں[2]

(۱۰) مرا چه کار که مه شد ہلال و بدر از آنک
بقدر تابش خور بروی ہست چہرہ نموں

(۱۱) چه فائدہ است کسوف و خسوف را دانم
که خور زماه و مه از ظل ارض نیلی گوں

(بقیہ صفحہ ۲۹۸)

ایک خاندان کا نام ہے۔ ملاحظہ ہو نولدکی (Noldeke) کی ساسانیاں (Sasaniden) پہلوی کتابوں میں لفظ ہربیتان اور عرب مورخین کی اصطلاح اہل البیوتات سے یہی سات خاندان مراد ہوتے ہیں ۱۲ مصنف

[1] اکسوں (ایک قسم کا سیاہ زریں پارچہ) اس کے متعلق ناظرین کو میرے ترجمۂ چہار مقالہ (سلسلۂ گبیا) کے صفحہ پر ایک حاشیہ ملے گا۔ ۱۲ مصنف

[2] نپولین بونا پارٹ۔ ۱۲ مترجم

(۱۲) چہ لازم است کہ گویم ثوابت و سیار
ہمہ شموس و کُرا تستند در خم گردوں

(۱۳) مرا ازیں چہ کہ دانم کرات گرد شموس
معلقند و رواں وز دو جذبہ اندر زبوں

(۱۴) مرا چہ کار کہ باد آں ہوا کہ موج زند
خفیف خشک بفوق و ثقیل تر سوے دوں

(۱۵) چہ گویم آں کہ قمر بر زمیں زمیں بر شمس
ہم او بشمسِ دگر می چسد بہ پیرامون

(۱۶) چہ گویم ایں رمل سالم است یا محذوف
چہ گویم ایں رجز مطوی است یا مخبوں

(۱۷) ز صرف و نحو و حروف و قرائت و تجوید
ز وقف کوفیین و ز وصل بصریون[۱]

(۱۸) ز اشتقاق و بدیع و معانی و انشار
بیان و خط و عروض و قرائن شعر و فنون

(۱۹) رجال و فقہ و اصول و جدال و استنباط
حدیث و حجت و تفسیر و سنت و قانون

(۲۰) ز رسم[۲] و ہیئت و جبر و مناظر و تاریخ
حساب و ہندسہ جغرافی از جمیع شوؤں

(۲۱) سیاست مدن و شرع و زرع و کان و لغات

---

[۱] ابتدائی عہد اسلامی میں یہ دو زبردست مذاہب لغویین تھے ۱۲ مصنف

[۲] نقشہ کشی ـ ۱۲ مترجم

حقوقِ ملت و خرج و خراج و قرض و قنون

(۲۲) طب و علائم و تشریح و نبض و قارورہ
خواص جملۂ ادویہ مفرد و معجون

(۲۳) طلسم و دعوت و تعبیر و کیمیا و حیل
نجوم و طالع و اعداد و رمل و جفر و فسون

(۲۴) علوم فلسفہ و منطق از قدیم و جدید
تحاشیات حواشی تسفطات متون

(۲۵) بدیں علوم ہلا نقد عمر خویش مدہ
کزیں معاملہ گشتند عالمے مغبون

(۲۶) از ایں علوم سوئے علم دینِ حق بگرائے
کہ غیر معرفتِ حق ہمہ فریب و فسون

(۲۷) فنون فلسفہ مشنو کہ سربسر سفہ است[1]
فنون دہری و کلبی تمام جہل و جنون

(۲۸) چرا ظنون طبیعی شمردۂ تو علوم
چرا علومِ آلٰہی گرفتہ تو ظنون

(۲۹) مقال ایں حکما چیست جملگی مشکوک
کلام ایں جہلا چیست سربسر مظنون

(۳۰) علوم شاں پئے دفع حیا و صدق و صفا
فنون شاں پئے فسق و فساد و مکر و مجون

---

[1] اس مصرع میں فلسفہ اور سفہ میں صنعت تجنیس زاید ہے۔ ۱۲ مصنف

(۳۱) ہمہ اباحۂ ارض است و اشتراک حظوظ[1]
ہمہ اشاعہ فسق است و امتلاء بطون

(۳۲) خیال شاں ہمہ کوتاہ و چشم شاں ہمہ تنگ
فنون شاں ہمہ وہم و شئون شاں ہمہ دل

(۳۳) نبود سدّ شریعت اگر بریں یا جوج
نبود ہیچ کس از عرض مال و جان مامول

(۳۴) بحق حق سخن ایں گروہ ظاہر بیں
بجسم ملت و ملک است بدتریں طاعون

(۳۵) شوی ز علم الٰہی سلالۂ کونین
شوی ز حکمت کلی نبیرۂ میمون[2]

(۳۶) ہر آنچہ گفت نبی ایں زماں مبیں مشہود
ہر آنچہ گفت حکیم ایں زماں مبیں مطعون

(۳۷) علوم شاں ہمہ از انبیا روے ناقص
فنون شاں ہمہ از اولیا ولے مجہول

(۳۸) ولیکن از درِ انصاف در جہاں انساں
بعلم و دانش ممتاز باشد از مادوں

(۳۹) بعلم و حکمت رہ می برد بذاتِ قدیم

---

[1] شروع زمانے کے بابیوں پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ قدیم ایرانی مزدک کی طرح وہ بھی اشتراکیت (Communism) کے پیرو تھے، اس مقام پر ان عقائد کی تردید کی گئی ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] یہ صریحی اشارہ ہے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے متعلق ۱۲ مصنف

بعقل و فکر برد رہ بحضرتِ بیچون

(۴۰) تعلّم است کہ فرمودہ افضل الاعمال

تفکر است کرو ساعتے بہ از سبعون

(۴۱) مفرداتِ قدیمش حکیم ہائے بزرگ

چو سوقراط چو بقراط، ارسطو و زینون

(۴۲) چو بوعلی، و چو اقلیدس و چو بطلیموس

چو طالس و چو فلاطون چو ہرمس و شلون[1]

(۴۳) یقدّسون لہ بالعشیّ والاشراق

یسبّحون اذا یصبحون اذا یمسون

(۴۴) جہاں سرے کہ حکیم اندرو بجائے خرد

زماں تنے کہ علوم اندرو بجائے عیون

(۴۵) ولے تو سست عناں توسن فنون سرکش

ولے تو خام ضعیف ابرشِ علوم حرون

(۴۶) نخواندہ سطرے ریب آوری بر رب قدیم

نہ ہے مزاج کہ قبض آورد ز افتیمون

(۴۷) زمہد تا بلحد علم جو و لو بالصین[2]

زعلم حق کہ بر آنست اعتماد درکون

(۴۸) حقایقِ حِکمش را حکیم ہا مبہوت

جوامعِ کلمش را ادیب ہا مرہون

---

[1] غالباً حکیم سولن (Solon) لیکن مشکوک ۔ ۱۲ مصنف

[2] اشارہ ہے مشہور حدیث کی طرف اطلبوا العلم ولو کان بالصین ۱۲ مصنف

(۴۹) طبایع اند چو اجسام در ظہور و بروز
حقائق اند چو ارواح در خفا و کموں

(۵۰) ز تنگ ظرفی دریں فضائے نا محدود
بود عوالم بے حد بیک دگر مدفوں

(۵۱) امور عادیہ را عام دید و خاصہ خاص
بقدر خود و هُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْں

(۵۲) بکنہِ پست تریں صنعِ حادثش نرسد
چہ جائے ذاتِ قدیمش ہزار افلاطوں

(۵۳) بحکم حق متحرک بود سپہر و نجوم
بلے زجاں متاثر بود عیون و جفوں

(۵۴) زامر نیست پس از کیست جنبشِ اجرام
زآب نیست پس از چیست گردشِ طاحوں

(۵۵) یکے بہ چشمِ تامّل ز روے عقل ببیں
دریں سرا چہ کہ ربعے ازاں بود مسکوں

(۵۶) بہر یکے زجماد و نبات و از حیواں
ہزار عالم نادیدہ ظاہر و مکنوں

(۵۷) ورلے عقل تو عقل دگر بود غالب
درونِ جانِ تو جانِ دگر بود مکنوں

(۵۸) بہ بیں بہ دانہ کہ آں دانہ با ازل ہمدوش
بہ بیں بہ بیضہ کہ آں بیضہ با ابد مقروں

(۵۹) نہاں و ظاہر ازاں صد جہاں طیور و فروخ

قدیم و حادث از آں صد چمن شمار و فصول

(۶۰) کجا بکوے حقیقت گزر توانی کرد
تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیروں

(۶۱) چناں کہ مبنی فیضِ حیات ازیں عالم
بطفل از مدد مام می رسد بیروں

(۶۲) زما ورا ے طبیعت اگر مدد نہ رسد
بدیں جہاں بخدا ایں جہاں شود داروں

(۶۳) زما ورا ے طبیعت دریں مفیق جہاں
عواطے است خدا را ز حد و عد افزوں

(۶۴) گروہے از عقلا بر خلاف عادتِ کل
بطوع و طبع ہمیں غوطہ می زنند بخوں[۱]

(۶۵) خلاف طبع گروہے بدرد و غم خوشنود
خلاف طبع فریقے ز جور کیں ممنوں

(۶۶) بمیل طبع ببیں جمعے از جہاں بیزار
بطیب نفس نگر قومے از وطن سرگوں

(۶۷) ببیں بہ شوق و شغب فرقہ ہمہ مقتول
ببیں بذوق و طرب زمزمہ ہمہ مسجوں

(۶۸) بطوع سلسلۂ در عذاب رنگا رنگ
بطبع طائفۂ در بلائے گونا گوں

---

[۱] اس شعر، اور اس کے بعد کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ بابی شہادت کے لیے کتنے آمادہ رہا کرتے تھے۔ ۱۲ مصنف

(۶۹) جمیع مست و غزل خوانؔ ولے نہ از بادہ
تمام محو و پریشاں ولے نہ از افیوں

(۷۰) چہ گونہ داد خبر دانیال از امروز
چہ گونہ کرد اثر قول اشعیا اکنوں[له]

(۷۱) چہ گونہ گشت وفا وعدہ جمیع کتب
بطبق مصحف و تورات مصحف انگلیوں[ل]

(۷۲) گہے بدار سلام و گہے باورشلیم
گہے بکرمل و گاہے ادوم وگہ صیہوں

(۷۳) معین آمدہ ارضِ مقدس مسعود
مورخ آمدہ یوم مبارک میموں

(۷۴) وَکَیْفَ جَاءَ لَنَا الْحَقّ کَمَا اَشَارَ لَنَا
نَبِیُّنَا الْعَرَبِی وَالْاَئِمَّۃُ الْہَادُوْن

(۷۵) چساں بوعدہ جمال قدم نمود جمال
ازاں جمالِ مبارک زمانہ یافت شگوں

له مثلاً سلیمان خان ۔ ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا ص۱۷۲ نیز میری تصنیف Year amongst the Persians. P. 102 ۱۲ مصنف

له ان پیشین گوئیوں کے صحیح اترنے کی بحث ایک بابی کتاب "استدلالیہ" میں جو لیو دیون کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہے، اور ایک اور انگریزی کتاب 'Bahaullah, the Splendour" مصنفہ ابراہیم خیر اللہ میں کی گئی ہے۔ مثلاً "قرن و قرون ونصف القرن" کا مطلب ۱۲۶۰ دن کے تین سال اور چھ ماہ بتایا گیا ہے یعنی ۱۲۶۰ء جو باب کے ظہور کا سنِ ہجری تھا۔ ۱۲ مصنف

له یعنی بہاء اللہ جنھیں ان کے مرید "جمال مبارک" کہتے تھے۔ ۱۲ مصنف

(۷۶) چہ گونہ گشت عیاں حق بہ وادی و التین
چہ گونہ گشت پدید او بکوہ و الزیتون

(۷۷) چہ گونہ بے سپہ او قاہر است و کل مقہور
چہ گونہ یکتنہ او غالب است و خلق زبوں

(۷۸) سرودہ بے سبب علم خوشتریں آیات
نہادہ بے مدد غیر بہتریں قانوں

(۷۹) چرا ندیدہ باد صد ہزار جاں قرباں
چرا نہ دیدہ باد صد ہزار دل مفتوں

(۸۰) ز جنبش قلمش جنبش قلوب و صدور
ز رامش نظرش رامش ظہور و بطوں

(۸۱) عمایم علما مشعلش نکرد خموش
کتابت امرا رایتش نکرد نگوں

(۸۲) ببیں رود سخنش در جہاں چو در تن جاں
ببین جہد اثرش در رواں چو در رگ خوں

(۸۳) خصومت خصما آب سودہ در ہاون
رقابت رقبا باد بودہ بر ہاموں

(۸۴) ثبوت حکمتش در قلب یاردان ہمدم
دوام امرش در دہر با قروں مقروں

(۸۵) چگونہ آتشے افروختہ است در دلہا
کہ ہیچ آب نیارد نشاندن ایں کانوں

(۸۶) گرفتہ حکمش روے زمیں و زیر زمیں

گزشتہ صیتش از چین دہند و ازژاپون[1]

(۸۷) بیک نظر بکشودہ دو صد بلا د و بلوک
بیک قلم بستاندہ دو صد قلاع و حصون

(۸۸) چہ گونہ کرد بپا محفلے بدعوتِ دیں
کہ تا بحشر نگردند منہی از ناہون

(۸۹) پئے بنائے شریعت زکس نخواست مدد
بلے نداشت بپا آسماں خدا بستون

(۹۰) بفضل و رحمتش اقرار کے نمائی کے
بعلم و قدرتش انکار چوں نمائی چون

(۹۱) تو خود کہ نظم بہ بیک خانوادہ نتوانی
مکن معارضہ با ناظمِ جمیعِ قرون

(۹۲) تو خود کہ مصلحتِ کار خود نمی دانی
مکن لجاج بسلطانِ ملکِ کن فیکون

(۹۳) تو با پدر بستیزی بیک پشیز ضرر
دہند[2] در رہِ او مال و جان و زدمنون

(۹۴) ہزار حیف کہ دارم دریں قوافی تنگ
ہزار نکتہ کہ نتواں نمودنش موزون

(۹۵) سخن ز دست شد و درد دل تمام نشد
روم دوبارہ کنوں بر سرِ ہماں مضمون

---

[1] یعنی جاپان ۱۲ مترجم
[2] دہند کے فاعل بہاءاللہ کے مرید ہیں ۱۲ مصنف

(۹۶) مرا دلیست درین روزگار بوقلموں
فریب خوردہ بازیچہ ہائے گوناگوں

(۹۷) زمانہ جلوہ کند رنگ رنگ چو طاؤس
سپہر عشوہ دہد گونہ گوں چو بوقلموں

(۹۸) بس است تا بشت ای مہر شد دلم بریاں
بس است گردشت ای چرخ شد تنم سطوں

(۹۹) مرا سریست چہ سازد باین ہمہ سودا
مرا دلیست چہ سازد باین ہمہ افسوں (دلیست)

(۱۰۰) بجز بجاناں، جاں را کجاست تاب و شکیب
بجز بہ دلبر دل را کجاست صبر و سکوں

(۱۰۱) گہے بخویش بگویم کہ الکمال و بال
گہے بخویش بخندم کہ الجنون فنون

(۱۰۲) دود خیالم گاہے بدشت چو ماشیں
پرد ہوایم گاہے بچرخ چو بالوں

(۱۰۳) زتن گسستہ ام وجاں نمی رود از تن
زجاں گزشتہ ام ددل نمی شود ماموں

(۱۰۴) دلم گرفت زویراں سرائے فضل وہنر
خوشا ممالکِ عشق وخوشا دیارِ جنوں[۱]

(۱۰۵) زپائے بختی بختم عقال عقل گسیخت

---

[۱] اسی مضمون کا حافظ کا شعر ہے:-

عقل اگر داند کہ دل دربندِ زلفش چوں خوش است عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیرِ ما

مصنف

کجاست لیلیٰ من ای خدا شدم مجنوں

(۱۰۶) بجز ارادۂ رحمانی از در قدرت
کہ می تواند ازیں ورطہ ام برد بیروں

(۱۰۷) بلا ارادۂ حق مَنْ اَرَادَہُ اللّٰہ است[1]
کہ شد ارادۂ حق با ارادہ اش مقروں

(۱۰۸) یگانہ عبد بہاء آنکہ از ارادۂ حق
اِذَا اَرَادَ لِشَیْءٍ یَّقُوْل کن فیکوں

(۱۰۹) شہے کہ مارا حق سوے اوست راہ نما
مہے کہ مارا کہ سوے حق اوست راہ نموں

(۱۱۰) خجستہ گوہر بحرِ وصال سِرُّ اللّٰہ
کہ اوست در صدفِ علم حق دُرِ مکنوں

(۱۱۱) بہ نزدِ فضلش فضل است فاقد الاتصال
بنزد جودش معن[2] است مانع الماعوں

(۱۱۲) عدوے اوست بخود خصم و یار از و بیزار
مطیع اوست ز خود امن و خلق از و ماموں

---

[1] بہاء اللہ کے مریدوں نے ان کے بیٹے عباس آفندی کو جو القاب دیے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ عباس آفندی کا دوسرا لقب "سِرُّ اللہ" ہے، اور اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ عبد البہاء کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ۱۲ مصنف

[2] معن ابنِ زیاد اپنی شجاعت، نیکی اور سخاوت کے لیے ضرب المثل ہے۔ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو زوٹن برگ (Zotenberg) کی Chronique de Tabari تاریخ طبری، چہارم ص۳۲۵ الخ ۱۲ مصنف

(۱۱۳) بوصف طلعتِ من طَافَ حَولَہُ الاَسْمار
سرودمے سخن ار بودمے از و ماذوں

(۱۱۴) بمدح ذاتش می گفتم آنچہ گفتہ خدائے
نہ شعر الشُّعَرا یتّبعُہُمُ الغاؤن

(۱۱۵) تو ای خلیفۂ رحمٰن و ای سفینۂ نوح
غمیں مشو کہ حقیقت ز نقض شدہ بہوں

(۱۱۶) بعہد حضرتِ آدم بجور و کیں قابیل
بدوں جرم و گنہ ریخت از برادر خوں

(۱۱۷) بعہدِ نوح چو کنعاں[1] شکست عہد پدر
بذلِّ نفی نسب شد غریق بحر الہوں

(۱۱۸) بعہدِ حضرتِ یعقوب یوسفِ صدیق
ز قید اخوان در قید بندگی مسجوں

(۱۱۹) بعہدِ حضرتِ موسیٰ ز سبط اسرائیل
یکے چو حضرتِ ہاروں و دیگرے قاروں

(۱۲۰) بعہدِ حضرتِ روح اللہ از حواریین
یک از جفا چو یہودا یک از صفا شمعوں

(۱۲۱) بعہدِ حضرتِ ختمی مآبؐ از امت
یکے بصدق ابوذر یکے ابو شعیوں[2]

---

[1] مسلمانوں کی روایت کے بموجب وہ حضرت نوحؑ کے فرزند یا پوتے تھے جو مومن نہ ہونے کی وجہ سے کشتی نوح میں بچائے نہ گئے بلکہ طوفان میں ہلاک ہوگئے۔ ۱۲ مصنف

[2] مجھے اس نام کے کسی شخص کے متعلق تحقیق نہیں ہوسکی، میرا شبہ ہو کہ کتابت میں کچھ غلطی ہو۔ ۱۲ مصنف

(۱۲۲) بعہدِ حضرتِ اعلیٰ دو تن وحید[۱] شدند
یکے شجاع امین و یکے جبانِ خئوں

(۱۲۳) بعہدِ طلعتِ ابہیٰ ہم ایں چنیں باید
یکے است ثابتِ عہد و یکے ست ناقض دوں

(۱۲۴) بلعن لب نکشایم ولے خدا گوید
ہر آنکہ می شکند عہد من بود ملعوں

(۱۲۵) ز حق بعہدِ مرایں فرقہ چشم می پوشند
کہ حق ز باطل پیداست در جمیع شئوں

(۱۲۶) قسم بروے تو اے مقتدائے کل امم
قسم بموے تو اے پیشوائے کل قروں

(۱۲۷) قسم باصل تو یعنی بحضرتِ مطلق
قسم بحق تو یعنی حقیقتِ بے چوں

(۱۲۸) قسم بوجہ تو یعنی بوجہ المشرق
قسم بسرّ تو یعنی بسرّہٖ المخزوں

---

[۱] شروع میں بابیوں نے وحید کے لقب کو یحییٰ کا ہم عدد سمجھا تھا لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یحییٰ کو بجائے تین ی کے صرف دو ی سے یحیٰ لکھا جائے۔ اگر اس طرح سے غلط املا لکھا جائے تو اس کے عدد "وحید" کے برابر ہوں گے یعنی ۲۸۔ بہرصورت ہمیں مرزا جانی کے نقطۃ الکاف (سلسلہ گب جلد ۱۵، صفحہ ۲۴۳، صفحہ ۲۵۰، صفحہ ۲۵۶، صفحہ ۲۵۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب سب سے پہلے سید یحییٰ دارابی بانی کار بغاوت نیریز کو ملا تھا اور ان کی وفات پر مرزا یحییٰ صبح ازل کو ملا جو بہاء اللہ کے علاتی بھائی اور مدمقابل تھے۔ اسی وجہ سے خود بہاء اللہ کو وحید ثانی کہا جاتا ہے۔ مرزا نعیم نے مرزا یحییٰ صبح ازل ہی کے لیے "جبان خئون" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ۱۲ مصنف
(حاشیہ نمبر ۲ صفحہ ۳۱۳ پر ملاحظہ ہو)

(۱۲۹) بخاکِ پاکِ تو یعنی بہ کیمیاے مراد
بگردِ راہِ تو یعنی بہ توتیاء عیون

(۱۳۰) بموطاء قدم تو بموطن والتین،
بسجدہ گاہِ خلایق بزیب والزیتون

(۱۳۱) کہ بے ثناے تو ام مطمئن نگردد دل
سرِ فراغ بہ بالیں نمی دہد مدیون

(۱۳۲) ولے نعیم کجا مدحِ تو تواند کرد
نیاز مودہ نہادہ است پائے در جیحون

(۱۳۳) مطیعِ امرِ تو از کیدِ نفس باد امین
اسیرِ بندِ تو از شید دہر باد مصون

نعیم کے قصیدے کا خلاصہ اور اس کے یہاں نقل کرنے کے وجوہات

میں سمجھتا ہوں کہ زمانۂ حال کے کسی ایسے شاعر کی جو اپنے ہم مذہبوں کے حلقے کے باہر بالکل غیر معروف ہے۔ اتنی طویل نظم نقل کرنا اور اس کا ترجمہ دینا کچھ نہ کچھ معذرت ضرور چاہتا ہے، اور پھر شاعر بھی ایسا جو خود اپنے قوافی کی تنگی اور موزوں کرنے کی ناقابلیت کا معترف ہے! لیکن دوسری طرف اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ بابی تحریک اور اس کے بعد بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ

بقیہ حاشیہ ۲ صفحہ ۳۱۳) ۵؎ یہاں بہاء اللہ کے بیٹوں عباس آفندی عبد البہا اور محمد علی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علاتی بھائی تھے اور ان میں جانشینی کے متعلق وہی اختلافات ہوئے تھے جو پہلے ان کے والد (بہاء اللہ) اور صبح ازل میں ہوئے تھے ۱۲ مصنف'

اس کا نتیجہ بہائی تحریک یہ دونوں ہمارے زمانے کے ایرانی خیالات کے اہم ترین اور خاص مظاہرات ہیں اور یہ نظم جس میں ہمیں قوتِ اظہار اور غیر معروف اصطلاحات مصروف پیکار نظر آتے ہیں بحیثیتِ مجموعی بہائی Weltanschauung (تصورِ کائنات) کا سچا نمونہ ہے۔ اس نظم میں جس نہج پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے وہ حسب ذیل خلاصہ پڑھنے کے بعد ناظرین کی سمجھ میں بخوبی آجائے گا:-

نعیم کی نظم کا خُلاصہ

عام حالاتِ زندگی کی طرف سے مصنف کی بے اطمینانی اور دنیوی دولت و جاہ اور علوم کی بے ثباتی اور فضول ہونے کا اعتراف (اشعار ۱ تا ۲۵)، اصلی مذہبیت ہی میں روحِ انسانی کو تسکین مل سکتی ہے مادّیت اور اشتراکیت کی برائیاں (اشعار ۲۶ - ۳۷)، معرفت حقیقی اور اس کے جویا اور معلّموں کی (جن میں قدیم فلاسفہ یونان بھی شامل ہیں) تحسین اور تعریف (اشعار ۳۸ - ۴۸)، کائنات کا گورکھ دھندا اور ذاتِ ربّانی کا اس میں جاری و ساری ہونا (اشعار ۴۹ - ۶۰)، جس طرح طفلِ شیر خوار کو دودھ کی احتیاج ہے، اسی طرح سے انسان الہامِ ربّانی کا محتاج ہے (اشعار ۶۱ - ۶۳)، باب اور بہاء اللہ کے مریدوں کا شوقِ شہادت اور جذبۂ آزار طلبی (اشعار ۶۴ - ۶۹)، سابقہ پیشین گوئیوں کا اس عہد میں پورا ہونا (اشعار ۷۰ - ۷۴)، بہاء اللہ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت (اشعار ۷۵ - ۹۴)، اس کے بعد شاعر نے مطلعِ ثانی سے مطلوب کی طرف گریز کیا ہے

۹۵) اور پہلے اپنا ذکر کرکے اپنی حالت بیان کی ہے (اشعار ۹۵۔ ۱۰۵) اس کے بعد بہاء اللہ کے فرزند عباس آفندی کی (جو اپنے والد کے انتقال واقع ۲۸ مئی ۱۸۹۲ء کے بعد عبدالبہا کے لقب سے ملقب ہوئے) تعریف کی ہے اور اس کے علائی بھائی اور اس کے رفقا "نقیضین" نے اس پر جو مظالم کیے ہیں ان کے متعلق قدیم عہدوں کی مثالیں بیان کرکے اسے تسلّی دی ہے (اشعار ۱۱۵ ۔ ۱۲۵)؛ آخری آٹھ اشعار میں (۱۲۶ ۔ ۱۳۳) قصیدہ کا خاتمہ ہیں۔ اس نظم کے سمجھنے کے لیے بابیوں اور بہائیوں کی تاریخ، ان کے عقائد اور مسائل کی واقفیت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اسے قریب الفہم بنانے کے لیے متعدد حواشی دینا پڑے ہیں جو افسوس ہے کہ بہت زیادہ ہوگئے ہیں[1]۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہی ایک نظم ایسی ہے جس میں مصنف نے ہمّت کرکے بابی اور بہائی عقائد و مسائل کی تشریح اشعار میں کی ہے۔

عہدِ آخر کی تصوّفانہ شاعری میں بہت کم جدّت یا ترقی پائی جاتی ہے

غالباً میرے ناظرین مجھ سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہوں گے کہ اس حصّہ میں میں عہدِ آخر کے صوفیا کی تصوفانہ شاعری کی بحث بھی کروں گا۔ اس میں شک نہیں کہ تصوفانہ شاعری ایران میں آج بھی ہوتی ہے، لیکن مجھے آج ایک شاعر بھی ایسا نہیں نظر آتا جو اس صنف شاعری میں سنائی، عطار، جلال الدین رومی،

[1] ہم نے صرف انھیں حواشی کا ترجمہ کیا ہے جو فارسی داں اصحاب کے لیے تحقیق وغیرہ کے اعتبار سے مفید ہوں گے، ایسے حواشی جن میں ایسے الفاظ و مصطلحات کی تشریح تھی جنھیں ہر مسلمان یا کم از کم ہر عربی یا فارسی داں جانتا ہے، نظر انداز کردیے گئے ہیں۔ ۱۲ مترجم

محمود شبستری، جامی اور ان دوسرے صوفی شعرا کی خاکِ پا کو بھی پہنچ سکے جن کا ذکر میں اس تصنیف کی اس سے پہلے کی جلدوں میں کر چکا ہوں۔ تصوّفانہ شعر کے اس فقدان کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس موضوع پر قدماء نے کوئی بات ایسی اُٹھا نہیں رکھی جسے اب کہا جائے یا جسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح کہا جا سکے۔ علاوہ بریں عہدِ صفویہ کے حالات تصوفانہ خیالات کے اظہار کے لیے خاص طور پر نا مساعد تھے۔ غرض کہ جہاں تک مجھے علم ہے اٹھارھویں صدی عیسوی کی تصوفانہ شاعری کا واحد کارنامہ ہاتف کا وہ لاجواب ترجیع بند ہے جو میں نے آئندہ باب کے خاتمہ پر نقل کیا ہے۔

۵۔ تصنیف (Ballads)

تصنیف یا عام واقعاتی گیت فارسی شاعری کی یہ صنف بھی اتنی ہی عارضی اور چند روزہ ہے جتنے خود ہماری زبان کے واقعاتی یا مذاقیہ گیت۔ اور کچھ زمانے کے بعد ادبیات میں سے اس کے نقش و نگار اتنے مدھم پڑ جاتے ہیں کہ (اس کی اہمیت کے مدنظر) تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً جب میں ۱۸۸۸ء کے موسمِ بہار میں[۱] شیراز میں تھا تو اس زمانے میں صاحب دیوان کے متعلق یہ تصنیف بچّے بچّے کی زبان پر تھی:-

دل کشا را ساخت زیر سرسرک   دل کشا را ساخت یا چوب و فلک

حیف دل کشا، حیف دل کشا

[۱] ملاحظہ ہو میری تصنیف Year amongst the Persians ۱۹۲۶ء. ص ۲۸۳

لیکن آج کل شاید اس کی یاد وہاں کے باشندوں کے دلوں سے بھی اتنی ہی محو ہوگئی ہوگی جتنی کہ انگریزوں کے دلوں سے اسی زمانے کے ایک مذاقیہ گیت کی یاد جو کسی ممبر پارلیمنٹ کے متعلق کہا گیا تھا، کہ

''He upset the milk in bringing it home from chelsea''

تصنیف کی قدامت کے متعلق قیاس۔ میرا قیاس ہے کہ خانہ بدوش مغنیوں کے جگہ جگہ تصنیفیں گاتے پھرنے کا رواج ایران میں بہت قدیم زمانے، بلکہ شاید اسلامی زمانے سے پہلے سے ہے۔ غالباً اب سے تیرہ سو برس پہلے باربد اور سکیسا، خسرو پرویز ساسانی کو اسی قسم کے گیت گا گا کر سناتے ہوں گے اور رودکی کے متعلق تو تقریباً قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اپنے محسن و ممدوح ساسانی شہزادے[1] کو وہ اس قسم کی نظمیں اب سے چار سو برس پہلے ضرور گاکر سناتا ہوگا۔ ابوبکر نجم الدین محمد الراوندی نے تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں سلجوقیوں کی جو تاریخ راحت الصدور و آیات السرور کے نام سے لکھی ہے، اس میں جس مقام پر مشرک اور قاتل احمد ابن عطاش[2] کی گرفتاری اور سزائے موت کا ذکر ہے وہیں اس

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد اول صـ۱۴ـ۔ صـ۱۸ـ ۱۲ مصنف

(انجمن ترقی اردو کا ترجمہ جلد اول۔ صـ۲۱ـ صـ۱۹ـ) ۱۲ مترجم

[2] تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد دوم صـ۳۱۳ـ۔ صـ۳۱۵ـ

نیز ملاحظہ ہو راحت الصدور (گب میموریل سیریز جلد ۲) صـ۱۶۱ـ و صـ۴۹۵ـ۔ صـ۴۹۵ـ (حاشیہ بر حوالہ) ۱۲ مصنف

تصنیف کا کچھ حصّہ بھی کر دیا گیا ہے جو اصفہان میں اس واقعہ کے متعلق زبان زد خاص و عام تھی اور جسے اس وقت "حرارہ" کی عجیب و غریب اصطلاح سے موسوم کیا جاتا تھا۔

ان تصنیفوں کے بنانے والوں کے ناموں کے متعلق اکثر بہت کم معلومات ہوتی ہے اور شاذ و نادر ہی وہ قلم بند کی جاتی ہیں۔ لیکن میرے مرحوم دوست جارج گریہم George Graham نے ۱۹۰۵ء میں جب وہ شیراز میں سفیر کی حیثیت سے متعین تھے، تقریباً ایسی چالیس تصنیفوں کا ایک مجموعہ میرے لیے مرتب کرایا تھا، جو اس زمانے میں شیراز، طہران، اصفہان، رشت، تبریز وغیرہ میں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ علیٰ ہذا ۱۹۰۴ء میں، یا اس کے قریبی زمانے میں ایک اور مجموعہ تصانیف شایع ہوا تھا، جس میں ہر تصنیف کو پیانو کے سروں پر بھی جمایا گیا تھا۔ اس مجموعہ کا عنوان یہ تھا:—

بارہ تصنیفات کا ایک انگریزی مجموعہ

Twelve Persian Folk songs collected and arranged for Voice and Pianoforte by Blair Fairchild: English Version of the words dy Alma Strettle (Novello and Co., London and New York.)

اس چھوٹی سی لاجواب کتاب میں جتنے گیت دیئے گئے ہیں وہ بڑی محنت کے ساتھ پیانو کے سروں پر جمائے گئے ہیں، انگریزی میں ان کا ترجمہ بھی خوب ہے، فارسی عبارت کی انگریزی رسم الخط میں نقل

بھی اگرچہ بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں، تاہم قابلِ فہم ضرور ہے۔ ذیل کے اقتباس سے جو اس کے مقدمے سے لیا گیا ہے، ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ان گیتوں کا مرتّب نغمۂ فارسی کے ناقابلِ بیانِ حُسن کا کس حد تک لذت شناس ہے، لکھتا ہے:-

"لیکن ان گیتوں کا اصلی لطف وہی پا سکتا ہے، جو پہلے مشرقی فضا پیدا کرلے۔ ایران کی ہلکی ہلکی گرم راتیں ہوں، مطلع صاف ہو، ایرانی لباسوں کے بھڑکیلے رنگوں پر لیمپوں اور قندیلوں کی روشنی بہار دکھا رہی ہو، چاروں طرف اندھیرا ہو، جس میں ہلکی ہلکی پرچھائیاں اِدھر اُدھر آ، جا رہی ہوں۔ سازوں سے عجیب و غریب صدائیں نکل رہی ہوں۔ گانے والوں کی آوازیں رہ رہ کر نغموں کے اتار چڑھاؤ میں گرتی اور بلند ہوتی ہوں — کس کی مجال ہے جو ان سب چیزوں کو ترجمے میں پیش کر سکے، لیکن ان کا جو اثر قلب و دماغ پر باقی رہ جاتا ہے وہ اتنا اُجاگر اور جادو بھرا ہوتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی شکل میں زندہ رکھنے کی آرزو ہر دل میں پیدا ہوتی ہے"

اس قسم کی اکثر تصنیفیں عام طور پر عاشقانہ گیتوں کی شکل میں ہوتی ہیں، جن میں حافظ یا کسی دوسرے مشہور شاعر کے کسی شعر پر تضمین کی جاتی ہے۔ واقعاتی یا مناظرانہ، یا طنزیہ تصنیفیں بہت کم ملتی ہیں، حالانکہ وہ بہت دلچسپ ہوتی ہیں، لیکن ساتھ ہی بہت عارضی بھی ہوتی ہیں۔ یہ البتہ ہوتا ہے کہ کسی تصنیف پر معارضہ یا

اس کی نقل کی تصنیف نئے حالات کے لیے کہہ لی جائے جیساکہ ہمارے پڑوس میں آئرلینڈ اور ویلز میں ہوتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے پرانی تصنیف میں جس طرح رد و بدل کرلیا جاتا ہے اس کی مثال میری کتاب Press and Poetry in Modern Persia کی نظم ۲۲ (ص ۱۶۷ - ص ۱۶۹) سے ملتی ہے۔ یہ بتانا تو غالباً غیرضروری ہے کہ "تصنیف" میں الفاظ کے مقابلے میں "دھن" کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اور ان کے باقاعدہ مطالعہ کے لیے ایرانی موسیقی کی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے، جس سے بدقسمتی سے میں محروم ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے یورپی حضرات جنھوں نے نظری اور عملی ایرانی موسیقی پر عبور حاصل کرلیا ہو، یا جو کم از کم اس کے بارہ مقام اور ہر مقام کے ۲۴ شعبہ بتا سکیں بہت خال خال ہوں گے۔[۱]

۶۔ جدید سیاسی شاعری

اس صنف شاعری کے متعلق میں اپنی کتاب

Press and Poetry in Modern Persia
(cambridge, 1914)

میں اس قدر تفصیل سے بحث کرچکا ہوں کہ اس موقع پر اس میں کچھ

---

[۱] اس موضوع پر میری نظر سے جو واضح ترین اور ساتھ ہی جامع اور مختصر رسالہ میری نظر سے گزرا ہے، وہ بہجۃ الروح ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ آنجہانی سر۔ اے۔ ہوتم شنڈلر (Sir A Houtam Schindler) کے کتب خانے میں، جواب میرے پاس ہے، محفوظ ہے۔ ۱۲ مصنف

اضافہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ یہ شاعری ۱۹۰۸ء کے انقلاب اور اس کے بالکل بعد کے زمانے کی پیداوار ہے، اور میری رائے میں اس میں اصلی معنوں میں جدّت، خوبی، اور ظرافت پائی جاتی ہے۔ جب میں زمانۂ جدید کی فارسی صحافت سے بحث کروں گا، اُس موقع پر بشرطِ گنجائش اس شاعری کے کچھ اور نمونے پیش کروں گا، اس لیے کہ جدید صحافت اور جدید سیاسی شاعری، ان دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور در اصل موخرالذکر اول الذکر کا نتیجہ ہے۔ اس قسم کے شعر کہنے والوں میں مشہور ترین عارف قزوینی، دخو قزوینی، اشرف گیلانی اور بہار مشہدی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ یہ سب حضرات ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ خصوصاً عارف اور دخو تو بالکل نوجوان ہیں۔ میری مذکورہ بالا تصنیف میں ناظرین کو ان سب کی تصویریں، اور ان کے خاص خاص واقعاتِ زندگی مل سکیں گے۔

باب ششم

قدیم مذاق کے شعرا

زمانۂ قبل قاچاریہ (۱۵۰۰ء - ۱۸۰۰ء)

ایران میں مذاق شاعری بہت وسیع ہے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ تقریباً ہر پڑھا لکھا ایرانی معمولی درجے کے شعر ضرور کہہ سکتا ہے اور کہتا بھی ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد جو بالعادت اور بکثرت شعر کہتے ہیں، اور صاحب دیوان ہیں، ایران میں ہمیشہ اچھی خاصی رہی ہے۔ یہ شاعری اس قدر قدیم طرز کی ہوتی ہے اور (زمانۂ زیر بحث میں) زبان میں اس قدر کم ردّ و بدل ہوا ہے کہ اگر گزشتہ چار صدی کے سنّو مختلف شاعروں کی کہی ہوئی سنّو غزلیں جمع کی جائیں۔ جن میں ایسی غزلیں نہ ہوں جن میں شاعر نے اپنے زمانے کے کسی واقعہ کا ذکر کیا ہو، نیز منتخب شدہ غزلیات کے مقطع خارج کردیے جائیں۔ تو مجھے شک ہے کہ شاید ہی کوئی نقاد بھی محض ان غزلوں کا عام رنگ دیکھ کر اس کا سرسری اندازہ بھی کر سکے کہ یہ کس زمانے کی کہی ہوئی ہیں اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے کسی ہم عصر شاعر اور ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانے کے شاعر کے کلام میں تمیز کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جائے۔ بدقسمتی سے شعرا کے تذکرے بھی ہمیں اس تمیز میں

مشہور اور نامی شعراء میں تمیز کرنے کی دقت — کسی قسم کی مدد نہیں دیتے، اس لیے کہ جب تذکرہ نگار اپنے معاصرین کا حال لکھتا ہے تو وہ صرف اپنے احباب ہی کے ذکر پر قناعت کرتا ہے، اور جن لوگوں سے وہ خفا ہوتا ہے ان کا ذکر تذکرہ میں نہیں آنے دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادنیٰ درجے کے شاعر، اگر وہ ذی اثر یا متواضع المزاج ہوے تو تذکروں میں جگہ پا لیتے ہیں، لیکن ملحدین، ہجو گو، یا ایسے شعرا جن سے تذکرہ نگار ناخوش، یا جن کی طرف سے وہ غیر متعلق ہے، باوصف اعلیٰ قابلیت شعر گوئی کے نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ جب مجمع الفصحا[1] کا جو زمانۂ حال کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ مصنف رضا قلی خان ہدایت اپنے معاصرین کا ذکر کرتا ہے تو ہمیں اس قسم کے جملے اکثر نظر آتے ہیں:-

"با منش ارتباطے خاص بود و مرا بجانبش اخلاص[2]

با ایشان دیتیر از ملاقات کردم[3]

میں اکثر ان کے گھر گیا اور وہ دیرِ گفتگو میرے سامنے

باز فرماتے تھے"[4]

---

[1] سن تالیف ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء-۱۸۶۸ء) سن طباعت ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) بمقام طہران - ۲ جلدوں میں - ۱۲ مصنف

[2] جلد دوم ص ۶۴۴ - بیان آغائے شیرازی

[3] جلد دوم ص ۶۵۷ بیان آزاد

[4] جلد دوم ص ۶۵۶ بیان مرزا ابوالقاسم شیرازی

"کبھی کبھی مجھ سے اُن سے باتیں ہوتی ہیں[1]"

کیونکہ جب وہ فارس میں سکونت پذیر ہوے جہاں مصنف ہذا بھی اسی زمانے میں موجود تھا، تو مجھے اکثر ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوتا تھا اور وہ اپنے احباب پر درِ شادمانی وا فرماتے تھے[2]"

وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ان ۳۵۹ "معاصر شعرا" میں سے جن کا ذکر اس تذکرہ میں کیا گیا ہے[3] کتنے ایسے ہیں جنھیں کسی خاص کمال شاعری کی بنا پر نہیں بلکہ محض مذکورہ بالا قسم کے ذاتی تعلقات کی بنا پر تذکرے میں جگہ دی گئی ہے؟ ایک مرتبہ میں نے اپنے لایق اور محترم عنایت فرما حاجی مرزا یحییٰ دولت آبادی کے ساتھ جو نہایت وسیع الاخلاق بزرگ ہیں، فارسی شاعری پر بہت وسیع نظر رکھتے ہیں اور جنھیں فارسی کے ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں ۔ اس فہرست کا مطالعہ کیا اور ان سے دریافت کیا کہ ان سب شعرا میں آپ کن کن کو اصلی معنوں میں مشہور سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ان ۳۵۹ شاعروں میں سے جن کا ذکر تذکرہ میں ہے صرف پانچ یعنی صبا کاشانی، فروغی بسطامی، قاآنی شیرازی، مجمر اصفہانی اور نشاط اصفہانی کو درجۂ اوّل میں رکھا، دو

---

[1] جلد دوم بیان امید کرمان شاہی

[2] مجمع الفصحا جلد دوم ص۲ بیان الفتنہ کاشانی

[3] ان کا حال جلد دوم ص۸۵ - ص۶۸۹ میں کیا گیا ہے لیکن یہ سب اصلی معنوں میں معاصر نہ تھے، بلکہ ان میں سے بعض کا تعلق تو اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل سے ہے۔ ۱۲ مصنف

یعنی وصال شیرازی اور خود مصنف تذکرہ ہدایت کو درجۂ دوم میں،
اور دو یعنی سروش اصفہانی اور وقار شیرازی کو درجۂ سوم میں۔ مختصر
یہ ہے کہ ان کی رائے میں ہر چالیس شاعروں میں (جن کا ذکر تذکرہ میں ہوا
ہے) صرف ایک شاعر ممتاز اور قابلِ قدر ملتا ہے۔

معیار انتخاب پس یہ امر بہر صورت نہایت ضروری ہے کہ شعرا کا
انتخاب نہایت سختی سے کیا جائے، خصوصاً اس کی ضرورت وہاں اور
زیادہ ہے جہاں ایسے شاعروں سے بحث کی جارہی ہو جن کے کلام کا
حسن صرف لفظی دھوکہ ہی نہیں ہے اور ترجمہ میں بھی کسی قدر باقی
رہ سکتا ہے۔ چنانچہ صفحاتِ آئندہ میں، میں نے انھیں شعرا کے کلام کا
انتخاب کیا ہے جن کو اپنے ملک میں کافی شہرت حاصل ہے، یا بعض
ایسے شعرا بھی جن سے اپنے مطالعہ کے دوران میں مجھے روشناس
ہونے کا موقع ملا ہے اور جن کے کلام کی تاثیر نے میرے دل کو گرمایا
ہے، لیکن ان کی تعداد مجموعی تعداد کا صرف ایک ادنیٰ جزو ہے۔ یہ امر
کہ ایک غیر ملکی ناقد کس حد تک تنقید کا مجاز ہوسکتا ہے، مشتبہ ہے،
وہ یہ البتہ کہہ سکتا ہے کہ ذاتی طور پر مجھے یہ شاعر پسند ہے اور وہ ناپسند،

غیر ملکی اور ملکی مذاق تنقید کا اختلاف لیکن کم از کم مجھے اس میں تامل ہے کہ وہ محض
اس ذاتی بنیاد پر قطعیت اور تعمیم کے ساتھ
کسی شاعر کی درجہ بندی اچھے یا بُرے میں کرنے کا حق رکھتا ہے یا
نہیں۔ ترک اور ہندوستانی، فارسی شاعری سے جتنے روشناس ہیں
اتنے ہم (یورپی) آسانی کے ساتھ نہیں ہوسکتے، لیکن خود ان کا
مذاق بھی ٹھیٹ ایرانیوں کے مذاق سے بہت مختلف ہوتا ہے، اور

ظاہر ہے کہ اپنی ادبیات کے قابل ترین اور مستند ترین نقاد اور مبصر خود ایرانی ہی ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں چاہتا ہوں کہ ناظرین کی توجہ پی۔جی۔ ہیمرٹن (P. G. Hammerton) کی تصنیف 'Intellectual Life' (ذہنی زندگی) کی طرف منعطف کراؤں، جس کی ایک عبارت ہماری موجودہ بحث کے لیے خاص طور پر موزوں اور بر محل ہے۔ ایک ایسے فرانسیسی کا ذکر کرتے ہوئے "جس نے محض درسی کتابوں سے انگریزی سیکھی تھی، لیکن اسے بول نہ سکتا تھا اور انگریزی گفتگو سمجھ سکتا تھا، پھر بھی انگریزی کے متعلق اس نے اس قدر معلومات حاصل کر لی تھی جو اگر کسی مردہ زبان کے متعلق ہوتی تو وہ شخص یقیناً اعلیٰ درجہ کا محقق سمجھا جاتا" یہ مصنف لکھتا ہے:-

> "ہمارے مصنفین خصوصاً شعرا کے متعلق اس کی رائے اور نظر انگریزوں کی تنقید اور انگریزوں کے احساسات سے اتنی مختلف تھی کہ صاف طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح ہم اپنے شاعروں کے کلام کو سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھ سکا ہے، اس کے خاص طور پر دو ثبوت تھے: ایک تو یہ کہ وہ ادنیٰ درجہ کی جو شیلی نظموں کو اعلیٰ درجے کی شاعری سمجھتا تھا اور دوسرے یہ کہ اس کے کانوں میں ہمارے موسیقیت بھرے شعرا جیسے بائرن اور ٹے نی سن کی موسیقیت پہچاننے کا ملکہ ہی نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ وہ انگریزی زبان کی اصوات کے لطف سے بالکل بے بہرہ تھا"

مذکورہ بالا عبارت میں اگر آپ فرانسیسی کی جگہ ہندوستانی یا ترک، انگریزی کی جگہ فارسی اور بائرن اور ٹے نی سن کی جگہ قاآنی رکھ دیں تو یہ ساری عبارت ترکوں اور ہندوستانیوں کے فارسی شاعری کے مذاق پر صادق آئے گی[1]

[1] اس موقع پر ہم کمال ادب کے ساتھ پروفیسر براؤن مرحوم کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کی اس رائے پر یقیناً رضا قلی خان ہدایت صاحب مجمع الفصحا کا رنگ غالب ہے جو اپنی ایرانیت کے جوش میں سرے سے ہندوستانیوں کے فارسی مذاق ہی کا قایل نہیں۔ حتیٰ کہ عرفی، نظیری اور صائب کو جو ہندوستان میں بس گئے معمولی درجہ کا شاعر سمجھتا ہے۔

پروفیسر براؤن مرحوم نے جو عبارت نقل کی ہے وہ ہرگز ہندوستانیوں کے فارسی شاعری کے مذاق پر صادق نہیں آتی۔ ایک تو اس کا آخری حصہ یعنی اصوات کے لطف سے بے بہرہ ہونا ہندوستانیوں کے لیے صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی واحد ملکی زبان اردو فارسی حروف اپنے آغوش میں رکھتی ہے، اس کا رسم الخط لیے ہوتے ہے، اسی کے الفاظ سے بنی ہوئی ہے اور فارسی شاعری سے اس حد تک متاثر ہوئی ہے کہ ہندیت کا رنگ غائب ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں صدیوں تک فارسی درباری زبان رہی ہے، اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، شاہانِ مغلیہ کی فیاضی نے ایرانی باکمالوں کو ملک الشعرا ای کے منصب پر فائز کرکے ملک میں فارسیت کے مذاق کو سنوارا ہے، خصوصاً فن تاریخ میں ہندوستانی فارسی نگار مصنفین نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنی یادگار ہے، پس یہ کہنا کہ ہندوستانیوں کو فارسی زبان سے حقیقی مناسبت نہیں ہوسکتی ہماری ناقص رائے میں صحیح نہیں ہے خصوصاً جب کہ خود پروفیسر موصوف شبلی نعمانی مرحوم کی شعر العجم کو فارسی شاعری کی بہترین تنقید تسلیم کر چکے ہیں، ۱۲۰ مترجم

ان شعرا میں سے جن کی تاریخ وفات ۱۵۰۰ء اور ۱۶۰۰ء کے درمیان ہے، تقریباً دس بارہ ایسے ہیں جو کم از کم قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ ۱۶۰۰ء اور ۱۷۰۰ء کے درمیان وفات پانے والے شعرا میں بھی تقریباً اتنی ہی تعداد قابلِ ذکر ہے۔ ۱۷۰۰ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیانی زمانے میں ایک یا دو اور ۱۸۰۰ء سے ۱۸۸۵ء تک تقریباً بیس ضرور تذکرے کے مستحق ہیں۔ جو شاعر ۱۸۸۵ء کے بعد تک زندہ رہے، وہ آسانی کے ساتھ جدید شعرا کے زمرے میں داخل کیے جاسکتے ہیں اور ان کی بحث علیحدہ ہوگی۔ مذکورۂ بالا چار دوروں میں سے، میں حسب ذیل شعرا کا ذکر کروں گا میں نے ان کی ترتیب سن وار، یعنی بہ لحاظ سال وفات رکھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تاریخ ولادت شاذ و نادر ہی مل جائے تو مل جائے، ورنہ عام طور پر اس کے متعلق تحقیق نہیں ہوسکی ہے۔

۱۔ ۱۵۰۰ء۔ ۱۶۰۰ء

(۹۰۶ھ۔ ۱۰۰۹ھ)

اس دور کے اکثر شعرا کا ذکر میں اپنی تاریخ ادبیات ایران بزمانۂ تاتاریہ (یعنی جلد سوم، مترجم) میں کرچکا ہوں۔ مثلاً میر علی شیر نوای (وفات ۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۰ء۔ ۱۵۰۱ء) ص۵۰۵۔ ص۵۰۶؛ حسین واعظ کاشفی، (وفات ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۴ء۔ ۱۵۰۵ء) ص۵۰۳۔ ص۵۰۴؛

بنائی جو ۹۱۸ھ مطابق ۱۵۱۲ء - ۱۵۱۳ء میں قرشی کے قتل عام میں مارا گیا۔ (ص ۴۵۷) ۔ اور ہلالی جسے شیعہ ہونے کی پاداش میں عبید اللہ خان اُزبک نے ۹۳۶ھ مطابق ۱۵۲۹ء - ۱۵۳۰ء میں قتل کر دیا تھا (ص ۴۵۹)

ان سب میں سے اس تصنیف میں، میں صرف آخر الذکر شاعر ہی کے متعلق کچھ مزید اضافہ کروں گا۔

۱۔ ہاتفی (وفات ۹۲۷ھ مطابق دسمبر ۱۵۲۰ء یا جنوری ۱۵۲۱ء)

ہاتفی (وفات ۹۲۷ھ مطابق ۱۵۲۰ء)	مولانا عبداللہ ہاتفی جو خراسان کے ایک مقام خرجرد کے باشندے تھے، خاص طور پر اس وجہ

سے مشہور ہیں کہ وہ جامیؒ جیسے زبردست شاعر کے بھتیجے تھے۔ ان کے متعلق ایک عام روایت یہ ہے[۱] کہ شعر گوئی کی اجازت دینے سے پہلے جامی رح نے ان کی آزمایش کے لیے یہ فرمایش کی تھی کہ سلطان محمود غزنوی

---

[۱] اس سلسلے میں علاوہ فارسی تذکروں کے، ملاحظہ ہو سر گور آؤس لے (Sir Gore Ouseley) کی تصنیف Biographical Notes of Persian Poets (سوانح حیات شعرائے ایران) طبع لندن ۱۸۴۶ء - صفحہ ۱۴۳ - ۱۴۵ ۱۲ مصنف

کی جو مشہور ہجو فردوسی نے کہی ہے[1] اس کے حسب ذیل اشعار کا جواب لکھا

درختے کہ تلخ است وے را سرشت ‍ ‍ ‍ ‍ گرش در نشانی بہ باغِ بہشت

ور از جوے خلدش بہ ہنگامِ آب ‍ ‍ ‍ ‍ بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

سرانجام گوہر بکار آورد ‍ ‍ ‍ ‍ ہماں میوۂ تلخ بار آورد

چنانچہ ہاتفی نے اس کے جواب میں ذیل کے اشعار لکھے، جن کو جامی نے پسند کیا، لیکن مذاق کے طور پر اتنا ضرور کہا کہ اس نو آموز نے "اثنائے راہ میں انڈے بہت دیے ہیں[2]"

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت ‍ ‍ ‍ ‍ نہی زیرِ طاؤس باغِ بہشت

بہ ہنگامِ آں بیضۂ پرورشش ‍ ‍ ‍ ‍ ز انجیر جنّت دہی ارزنش

دہی آبش از چشمۂ سلسبیل ‍ ‍ ‍ ‍ بداں بیضہ دم در دمد جبرئیل

شود عاقبت بیضۂ زاغ، زاغ ‍ ‍ ‍ ‍ برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

جن کثیر التعداد شعرا نے نظامی گنجوی کے خمسہ کے جواب میں خمسے کہے ہیں ان میں ہاتفی بھی ہیں۔ ان کے پانچ قصّوں میں سے دو تو وہی ہیں جو نظامی کے تھے، یعنی داستان لیلی و مجنون[3] اور شیریں و خسرو۔ ہفت پیکر

[1] یہ ہجو ٹرنر میکن (Turner Macan) کے شاہنامے کے اڈیشن (طبع کلکتہ ۱۸۲۹ء) کے فارسی دیباچے کے صفحہ ۶۳ ۔ صفحہ ۶۶ پر موجود ہے اور اس محولۂ اشعار صفحہ ۶۶ کی سطور ۸۔ ۷ میں ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] مجمع الفصحا۔ جلد دوم صفحہ ۵۶ ۔ ہاتفی کے اشعار ضیا بے کی خرابات جلد سوم صفحہ ۳۶ پر موجود ہیں۔ ۱۲ مصنف

[3] اسے سر و۔ جونس (W Jones) نے ۱۷۸۸ء میں کلکتہ سے شایع کیا ہے۔ ۱۲ مصنف

جواب میں انھوں نے ہفت منظر لکھا ہے اور سکندر نامے کے جواب میں تیمور نامہ[1] اس کے متعلق ہاتفی کا دعویٰ ہے کہ میری یہ نظم نقلوں اور داستانوں پر نہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہے[2] انھوں نے اسی طرز کی ایک تاریخی نظم شاہ اسمٰعیل کے کارناموں کے متعلق بھی شروع کی تھی، لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔ شاہ اسمٰعیل جب ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء-۱۵۱۲ء) میں خراسان کی فوج کشی سے واپس آ رہا تھا تو بغیر کسی اطلاع کے وہ ہاتفی سے بھی ملنے آیا تھا۔ یہ نظم شاہنامہ فردوسی کی طرز اور بحر میں ہے اور اس کا نام شاہ نامہ حضرت اسمٰعیل ہے[3]۔

ابتدائے دور صفویہ کے دوسرے مشاہیر علوم و فنون کی طرح ہاتفی کا تعلق بھی دراصل اس گروہ سے ہے جو آخری تیموری فرماں رواؤں کی سرپرستی اور فیاضی کی بدولت ہرات میں جمع ہو گیا تھا۔

---

[1] طبع (لیتھو) لکھنؤ اکتوبر ۱۸۶۹ء اس میں تقریباً چار ہزار پانچ سو اشعار ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو فہرست کتب فارسی برٹش میوزیم مرتبہ ریو (Rieu) صفحہ ۶۵۴ ۱۲ مصنف

[3] قاسمی کی ایک نظم بھی اسی طرز کی اور اسی نام کی ہے۔ ملاحظہ ہو فہرست کتب فارسی برٹش میوزیم (صفحہ ۶۶۰ - ۶۶۱)۔ قاسمی کے شاہ نامے کا ایک نسخہ کنگس کالج کیمبرج کے کتب خانے میں محفوظ ہے (پوٹلے کا ذخیرہ ۲۳۸) ۱۲ مصنف

۲۔ بابا فغانی شیرازی
وفات ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۱۹ء

فغانی وفات ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۱۹ء

فغانی ان شاعروں میں سے ہیں جن کی شہرت اور قدر اپنے وطن کی بہ نسبت ہندوستان میں بہت زیادہ ہی، اس لیے کہ اگر ایک طرف شبلی نے اپنی شعر العجم (جلد سوم ص۲۷ - ص۳۰) اور والہ داغستانی نے اپنی ریاض الشعرا[1] میں انھیں شاعری کے ایک طرزِ جدید کا موجد قرار دیا ہی، تو دوسری طرف رضا قلی خان نے اپنی ریاض العارفین[2] میں ان کا بہت مختصر تذکرہ کیا ہی اور مجمع الفصحا سے تو انھیں بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہی۔ علی ہذا آتش کدہ اور تحفۂ سامی میں ان کا حال بہت مختصر طور پر درج ہی۔ یہ ایک معمولی خاندان کے فرد تھے، ان کے والد سکاک[3] یا دیگر بیانات کے بموجب شراب فروش تھے اور قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خراسان میں جہاں وہ شیراز چھوڑنے کے بعد سکونت پذیر ہوگئے تھے، کسی نے، حتیٰ کہ جامی رح نے بھی جن سے وہ ملے تھے، ان کی قدر نہ کی، لیکن تبریز میں انھیں آق قویونلو ترکمانوں کا سردار سلطان یعقوب جیسا قدر شناس محسن مل گیا۔ آخر عمر میں اپنی گزشتہ زندگی

[1] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتب فارسی ص۱۵۱ - ۱۲ مصنف

[2] لیتھو طہران ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء - ۱۸۸۹ء - ص۱۲۲ ۔ ۱۲ مصنف

[3] اسی مناسبت سے انھوں نے شروع میں سکاکی تخلص رکھا تھا ۱۲ مصنف

سے تائب ہوکر وہ مشہد مقدس میں سکونت پذیر ہوگئے اور اب شاید ان کا حسب ذیل شعر ان کے حال پر صادق نہ رہا۔

آلودۂ شراب فغانی بخاک رفت
آہ ار ملائکہ کفن تازہ بوکنند

ان کے کلام کے سب سے زیادہ انتخابات مجالس المومنین میں ملتے رہیں، لیکن اس میں تمام تر وہ قصائد ہیں جو آخر عمر میں انھوں نے منقبت علیؑ علیہ السلام میں کہے۔ ان قصیدوں سے یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ شیعہ تھے، لیکن ان سے بحیثیت شاعر کے ان کا مرتبہ ثابت نہیں ہوتا۔

۳۔ امیدی یا امیدی طہرانی
(وفات سنہ ۹۲۵ھ مطابق سنہ ۱۵۱۹ء
یا سنہ ۹۳۰ھ مطابق سنہ ۱۵۲۳ یا سنہ ۱۵۲۴ء)

امیدی کے متعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا نام ارجاسپ تھا[1] اور وہ مشہور فلسفی جلال الدین دوانی کے شاگرد تھے ان کو غزل کی بہ نسبت قصیدہ میں زیادہ دستگاہ تھی۔ اپنے ہم شہر لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت کشیدہ تھے، چنانچہ انھوں نے

---

[1] اس نام کی وجہ سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید وہ زرتشتی تھے، لیکن مجھے اس کا کوئی ثبوت کہیں نہیں ملا۔ ۱۲ مصنف

ان کی کئی ہجویں لکھی ہیں۔ طہران میں کچھ آراضی کے متعلق ایک جھگڑے میں انھیں قوام الدین نوربخشی کے اشارے سے قتل کردیا گیا۔ ان کے ایک شاگرد نامی نے ان کی حسب ذیل تاریخ وفات کہی :-

نادر عصر امیدی مظلوم کو بنا حق شہید شد ناگاہ
شب بخوابِ من آمد و فرمود کاے ز حالِ درونِ من آگاہ
بہرِ تاریخ قتل من بنویس آہ از خونِ ناحقِ من آہ[1]

سنہ ۹۲۵ھ

تصنیف ہذا کے صفحہ پر ہم نے اس قصیدہ کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے نجم ثانی کی مدح میں لکھا تھا، اور غالب گمان یہ ہے کہ ان کی شاعری زیادہ تر مدحیہ قصاید ہی پر مشتمل تھی، اگرچہ ایک قدیم طرز کا ساقی نامہ بھی ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کے نسخے بہت کم یاب ہیں لیکن برٹش میوزیم میں[2] اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جس میں صرف

---

[1] اس تاریخ سے سنہ ۹۲۵ھ نکلتا ہے، لیکن سام مرزا نے ان کی تاریخ وفات سنہ ۹۳۰ھ (سنہ ۱۵۲۳ء۔ سنہ ۱۵۲۴ء) لکھی ہے اور احسن التواریخ میں (جس سے ہفت اقلیم نے بھی نقل کی ہے) سنہ ۹۲۹ھ مطابق سنہ ۱۵۲۲ء۔ سنہ ۱۵۲۳ء) دیا ہوا ہے۔ مصنف

[2] یعنی (میم) Or. 3642 صفحہ ۱۸۰ - صفحہ ۱۹۰

ملاحظہ ہو ریو کا ضمیمہ فہرست کتب فارسی صفحہ ۲۶۹۔ ہفت اقلیم کا مصنف جس نے اپنی کتاب امیدی کی وفات کے ستر سال بعد لکھی اور جو اس کا ہم شہر بلکہ ہم خاندان بھی تھا لکھتا ہے کہ میرے زمانے میں امیدی کا جو کلام مشہور اور معروف تھا وہ سترہ قصائد، تین غزلوں، چند قطعات اور رباعیات اور ایک ساقی نامہ پر مشتمل تھا۔ ۱۲ مصنف

ستره ورق ہیں، یہ تھوڑا بہت کلام بھی ان کے انتقال کے بعد شاہ صفی کے حکم سے جمع کیا گیا، تاہم ان کے حالات اکثر تذکروں میں ملتے ہیں اور آتش کدہ میں ان کے ساقی نامے کے ۴۰ اشعار اور دوسرے کلام سے ۸۰ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ انھیں میں حسب ذیل اشعار بھی ہیں، جنھیں مجمع الفصحا (جلد دوم ص۸۰) میں بھی نقل کیا گیا ہے:-

رواقِ مدرسه گر سرنگوں شود سهل است
قصورِ میکدهٔ عشق را مباد قصور
بنائے مدرسه از جنس عالی و سافل
خراب گشت و خرابات هم چناں معمور

تو ترک نیم مستی من مرغ نیم بسمل
کارِ تو از من آساں کامِ من از تو مشکل
تو پا نهی به میداں من دست شویم از جاں
تو خوے چکانی از رُخ من خوں فشانم از دل
دنبالِ آں مسافر از ضعف و ناتوانی
برخیزم و نشینم چوں گرد تا به منزل
کو بخت آں که گیرم مستش ز خانهٔ زیں
وآں ساعدِ بلوریں در گردنم حمایل
خنجر کشی و ساغر اهلِ وفا سراسر
خوں خورده در برابر جاں داده در مقابل

مدا حیم چو طی شد بشنو حکایت رے
دیوانہ الیست درو یے دیوانہ الیست عاقل

دیوانۂ کہ تدبیر در وے نہ کردہ تاثیر
دیوانۂ کہ زنجیر اورا نہ کردہ عاقل

دیوانہ الیست پُرفن دیرینہ دشمن من
از وے مباش ایمن وز من مباش غافل

بر داور سخنداں ایں نکتہ الیست پنہاں
کاندیشۂ پریشاں نبود بہ نظم مایل

طبعم زہر کہ بودے، گوے سخن[1] ربودی
اما اگر نبودے در خانہ ام محصل

۴-۵- اہلیین

(۱) اہلی ترشیزی وفات ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۷ء	بقول ریو کے[2]
(۲) اہلی شیرازی وفات ۹۴۲ھ مطابق ۱۵۳۵ء	ان دونوں ہم تخلص

شاعروں میں، جن کے کلام کی بہ نسبت نام سے لوگ زیادہ واقف ہیں بخوبی امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک کا وطن

---

[1] یہ تشبیہ پولو (چوگان بازی) کے کھیل سے لی گئی ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] فہرست کتب فارسی ص۶۵۵ - ص۶۵۶ نیز ملاحظہ ہو پروفیسر ایتھے کی (Ethe) فہرست کتب فارسی مخزونہ انڈیا آفس - کالم ۷۸۵ - نمبر تا ۱۴۳۲ جہاں خود مصنف کے ایک قلمی نسخے مرتبہ ۹۲۰ھ مطابق ۱۵۱۴ء کا حال لکھا گیا ہے ۱۲ مصنف

ترشیز (خراسان)، اور سنِ وفات ۹۳۳ھ مطابق ۱۵۲۶ء ہی اور دوسرے کا وطن شیراز اور سالِ وفات ۹۴۲ھ مطابق ۱۵۳۵ء- ۱۵۳۶ء ہی۔ رضا قلی خان نے ان دونوں کو نظر انداز کر دیا ہی۔ دونوں کا تعلق (اہلی ترشیزی کا واقعتاً اور اہلی شیرازی کا معناً) ہرات کے اس حلقۂ مشاہیر سے ہی جو سلطان حسین اور میر علی شیر کی قدردانیوں کی وجہ سے وہاں قایم ہوگیا تھا۔ باکمالانِ ہرات کا یہ جھمکڑا جس سے ظہوری ترشیزی (وفات ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۵ء) کا تعلق بھی تھا، صرف اپنے ہی زمانے میں خراسان میں مشہور ہؤا، بقیہ ایران نے کبھی اس کی شہرت تسلیم نہ کی، لیکن ہندوستان میں اسے کافی شہرت حاصل ہی، جہاں ظہوری کو، جس کا ایران میں کوئی نام تک نہیں جانتا بدیع اور مرصّع نثر نگار کی حیثیت سے غیر معمولی (اور میری رائے میں ناجائز) شہرت حاصل ہی۔ اہلی شیرازی کا خاص کمال تجنیسات اور دیگر صنایع و بدایع لفظی پر اس کی بڑی قدرت ہی۔

۶- ہلالی - وفات ۹۳۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء- ۱۵۲۹ء

ہلالی - وفات ۹۳۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء- ۱۵۲۹ء

اگرچہ ہلالی کا مولد ایران کے صوبہ گرگان کا پایۂ تخت استرآباد تھا، لیکن نسلاً وہ چغتائی ترک تھا۔ عنفوانِ شباب میں وہ میر علی شیر نوائی کے زیرِ تربیت رہا تھا۔ اس کی مشہور ترین نظم شاہ و درویش یا شاہ و گدا

ہی۔ اس پر خود بابر نے بہت سخت تنقید کی ہی[1] اور قریب تر زمانے میں اسپرنگر نے بھی اس پر بہت کچھ اعتراضات کیے ہیں[2] لیکن ایتھے (Ethe) اس کا بڑا مدّاح ہی اور اس نے اس کا ترجمہ المانی زبان میں کیا ہی[3]۔ ہلالی نے ایک اور مثنوی صفات العاشقین بھی لکھی ہی اور صاحبِ دیوان بھی ہی، جو کئی غزلیات پر مشتمل ہی۔ رضا قلی خاں لکھتا ہی کہ[4] "اسے خراسان والے شیعہ اور عراق والے سنّی سمجھتے تھے بدقسمتی سے عبیداللہ خان اُزبک جو سنیٔ غالی تھا، اسے شیعہ ہی سمجھتا تھا، چنانچہ اسی رفض کی پاداش میں اُس نے اسے قتل کرا دیا۔ لیکن تعجّب ہی کہ مجالس المومنین میں جہاں اور دوسرے شیعہ شعرا کا ذکر کیا گیا ہی اس کا کوئی حال نہیں لکھا گیا۔ صاحبِ ہفت اقلیم کی رائے ہی کہ اس کے قتل کا باعث اس کی شیعیت نہیں بلکہ اُزبکوں کے دربار میں اس کے دو زبردست حریفوں بقائی اور شمس الدین کوہستانی کی سازش تھی۔ چنانچہ اسی مصنف کے بقول عبیداللہ خان کو اس کے قتل کروانے کا بہت افسوس ہوا۔ ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد سوم ص۴۵۹ ۱۲مصنف

[2] فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ ص۴۲۷ ۱۲مصنف

[3] (مقالات متعلق بہ مشرق) Morgenlaudische Studien (Leipzig) 1870—PP 197—282 ۱۲مصنف

[4] مجمع الفصحا جلد دوم ص۵۵ ۱۲مصنف

کہ اس کا رجحان شیعیت کی طرف زیادہ تھا[1]۔

محمدِ عربی آبروے ہر دو سرا ست — کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سرِ او
شنیدہ ام کہ تکلم نمود ہمچو مسیح — بدیں حدیث لبِ لعل روح پرورِ او
کہ من مدینۂ علمم علی درست مرا — عجب خجستہ حدیث است من سگِ درِ او[2]

۷- لسانی وفات ۹۴۰ھ مطابق ۱۵۳۳ء-۱۵۳۴ء

لسانی وفات ۹۴۰ھ مطابق ۱۵۳۳ء-۱۵۳۴ء

مجالس المومنین میں جن بائیس[22] شیعہ ایرانی شعرا کا ذکر ہے، اس میں لسانی کا نمبر سب سے آخری ہے۔ وہ اپنے کمال شاعری کے اعتبار سے اتنا قابل ذکر نہیں

---

[1] ہماری ناچیز رائے میں محض یہ اشعار جب تک کہ ان کی مزید تصدیق کسی دوسرے قطعی ثبوت سے نہ ہو، ہلالی کو شیعہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں، اس لیے کہ " انا مدینۃ العلم و علیؑ بابُہا " کی حدیث شیعہ اور سنّی دونوں میں معتبر ہے۔ اسی طرح سے " من سگِ درِ او " سے جو تعظیم حضرت علیؑ کی نکلتی ہے، وہ ایک سنّی کے دل میں بھی اسی قدر ہے جتنی کہ کسی شیعہ کے دل میں البتہ اگر " وصی رسول اللہ " یا " خلیفۃ بلا فصل " کی طرف کوئی اشارہ ہوتا تو یہ شیعیت کا قطعی ثبوت ہوتا۔ ۱۲ مترجم

[2] کلب علی اکثر شیعوں کا نام ہوتا ہے، نیز جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں شاہانِ صفویہ اپنے آپ کو " سگانِ آستانِ علی ابن ابی طالبؑ " کے لقب سے ملقب کرنا بڑا فخر سمجھتے تھے۔ یہ اشعار مجمع الفصحا سے نقل کیے گئے ہیں۔ ۱۲ مصنف

ہی۔ جتنا کہ شیعیت کے غلو کی وجہ سے تھا۔ عام طور پر اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہی، لیکن اس کا کلام بہت کم مشہور اور کمیاب[1] ہی اور اگرچہ آتش کدہ اور ہفت اقلیم میں اس کا ذکر ملتا ہی، لیکن رضا قلی خان نے اسے بالکل نظر انداز کردیا ہی۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ بغداد اور تبریز میں بسر ہوا اور تبریز پر عثمانی سلطان سلیمان کے قبضہ سے کچھ روز پہلے ہی اس کا وہاں انتقال ہوا۔ صاحب مجالس المومنین لکھتا ہی:-

"اس کو بارہ اماموں کے ساتھ اتنی عقیدت تھی کہ وہ تاج دوازدہ ترک[2] ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سر سے نہ اتارتا تھا۔ جب سلطان سلیمان ترک تبریز کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا چلا آرہا تھا تو اس کے شہر کے نزدیک پہنچنے کی اطلاع لسانی کو اس وقت ملی جب وہ مسجد جامع تبریز میں نماز میں مصروف تھا۔ اس خبر کو سُن کر اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور کہا کہ ای بارِ الٰہ یہ غاصب تبریز آرہا ہی، میں نہ تو اس تاج کو سر سے اُتار سکتا ہوں اور نہ مجھے یہ گوارا ہو سکتا ہی کہ اس کو فاتحانہ طور پر تبریز میں داخل ہوتے ہوئے دیکھوں، پس تو مجھے موت دے دے

---

[1] اس کے دیوان کا ایک نسخہ (Or 307) برٹش میوزیم میں موجود ہی ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتب فارسی ص ۶۵۶ - ص ۶۵۷ - ۱۲ مصنف

[2] اس مخصوص کلاہ کا ذکر جس کی وجہ سے ایرانی شیعوں کو قزلباش کہا گیا یعنی "سرخ سر" تصنیف ہذا کے ص ۸۵ پر ہو چکا ہی۔ ۱۲ مصنف

اور اپنے جوارِ رحمت میں مجھے طلب کرے۔ یہ کہہ کر وہ
اپنا سر سجدہ میں لے گیا اور اسی حالت میں اس کی روح
واصل بہ محبوب ہوگئی"

ذیل کی رباعی سے اس کے غالی عقاید کا خاص طور پر اندازہ ہوتا ہے:۔

گر بند لسانی بگسلد از بندش ور خاک شود وجود حاجتمندش
باللہ کہ زمشرق دلش سرنزند جز مہر علی و یازدہ فرزندش

اس کی موت کے بعد اس کا کلام، جس کے محفوظ رکھنے کی طرف سے وہ خود بہت بے پروا تھا، اس کے شاگرد شریف تبریزی نے یکجا کیا، لیکن اس بری طرح سے اسے ترتیب دیا کہ بقول صاحبِ آتشکدہ اس کا نام "سہو اللسان" پڑ گیا۔

۸۔ فضولی بغدادی وفات ۹۷۰ھ مطابق ۱۵۶۲ء-۱۵۶۳ء

فضولی۔ وفات ۹۷۰ھ مطابق ۱۵۶۲ء-۱۵۶۳ء | فضولی کو ایرانی شعرا کی بجائے ترکی شعرا کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے اور گب نے اپنی یادگار تصنیف History of Ottoman Poetry (تاریخ ادبیاتِ عثمانی) جلد سوم۔ باب چہارم ص۷۰۔ ص۱۰۷ پر بہت تفصیل کے ساتھ اس کا حال لکھا ہے۔ اس کے ترکی رعایا بننے کی وجہ یہ ہوئی کہ شہر بغداد جہاں غالباً وہ پیدا ہوا اور ساری عمر رہا، ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں ایرانیوں کے ہاتھ سے نکل کر ترکوں کے قبضے

میں آگیا تھا لیکن بقول گب کے "اس کو ترکی، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہنے کی یکساں قدرت حاصل تھی[۱]" آگے چل کر یہی مصنف اس کے متعلق لکھتا ہی:-

"وہ ان چار مشہور اور زبردست شعرا میں جو قدیم ترکی ادبیات میں بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور جس زمانے یا جس قوم میں بھی ہوتے تو بقائے دوام کے مستحق سمجھے جاتے - قدیم ترین ہی[۲]"

اگر فارسی کے آسمانِ شاعری پر اس کی ضیا کسی قدر مدھم ہی تو اس کا سبب یہ نہیں ہی کہ فارسی زبان پر اسے قدرت اور کمال حاصل نہ تھا[۳] بلکہ صرف یہ کہ اس آسمان کے دوسرے ستارے اس سے بھی زیادہ درخشاں تھے، نیز اس زمانے میں ایران میں معیارِ شعر بہت بلند تھا۔ اس کے اکثر اشعار نیز اس کی تصنیف حدائق السعدا[۴] سے اس کا شیعہ ہونا ظاہر ہی - یہ ترکی زبان میں ایک شہادت نامہ ہی اور حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدا کے طرز پر لکھا گیا ہی۔

چونکہ میں نے ترکی ادبیات پر گب کی زبردست تصنیف کا ذکر

۱؎ تاریخ ادبیات عثمانی ص۷۰ ۱۲ مصنف

۲؎ تاریخ ادبیات عثمانی ص۷۱ ۱۲ مصنف

۳؎ اس کا ایک مکمل فارسی دیوان باقی ہی جس کا ایک قلمی نسخہ (Add 7785) برٹش میوزیم میں موجود ہی اور تبریز میں چھپ بھی چکا ہی۔ ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتبِ فارسی ص۶۵۹ - ۱۲ مصنف

۴؎ ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتبِ ترکی ص۲۹ ـ ص۵۰ ۱۲ مصنف

کیا ہے اس لیے برسبیل تذکرہ اس موقع پر اس کے اس خیال کے متعلق[۱] بھی اپنا شبہ ظاہر کیے دیتا ہوں کہ نظم کی وہ صنف جسے "شہر انگیز" کہتے ہیں، ترکوں کی ایجاد ہے اور "فارسی ادبیات میں اس قسم کی کوئی نظم نظر نہیں آتی"۔ سام مرزا نے اپنے تذکرے تحفۂ سامی (سنِ تالیف ۹۵۷ھ مطابق ۱۵۵۰ء) میں کم از کم ایسے دو شاعروں وحیدی قمی اور حرفی اصفہانی کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس قسم کی نظمیں لکھی تھیں اور اگرچہ ان نظموں کا سن تصنیف مسیحی کے اس ترکی "شہر انگیز" کے بعد کا ہے جو ایڈریانوپل پر لکھا گیا تھا، لیکن یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ اس قسم کی نظمیں ایران میں تازہ ایجاد سمجھی جاتی تھیں۔ حرفی کی نظم جس کا نام "شہر آشوب" تھا، بہت سخت تھی، کیونکہ بقول سام مرزا کے اس کی پاداش میں بدنصیب شاعر کی زبان کھینچ لی گئی تھی۔

"شہر آشوبے جہت آنجا (گیلان) گفتہ و اورا با مریدے متہم ساختہ زبانش را بریدند، امّا این جائزہ اورا از برائے اشعار دیگرش می بایست نہ جہت ہجو گیلان"۔

۹۔ وحشی بافقی

(وفات ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء)

وحشی۔ وفات ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء | وحشی کی ولادت تو ولایت کرمان

---

[۱] تاریخ ادبیات عثمانی جلد دوم صفحہ ۲۳۲ ۱۲ مصنف

کی ایک جاگیر بافق میں ہوئی تھی، لیکن اس کی زندگی زیادہ تر یزد میں گزری۔ اس کے کلام، خصوصاً اس کی مثنوی فرہاد و شیریں اور غزلیات کی تعریف تاریخ عالم آرائے عباسی، آتش کدہ اور مجمع الفصحا میں بہت کچھ کی گئی ہے۔ اس نے شاہ طہماسپ اور اس کے امرائے دربار کی شان میں قصاید بھی لکھے ہیں، لیکن ان کے متعلق صاحب مجمع الفصحا کی رائے یہ ہے کہ اس صنف (قصیدہ) میں طبقہ متوسطین میں سے کوئی شاعر بھی قدما کی برابری نہیں کرسکتا۔ وحشی فرہاد و شیریں ختم نہ کرسکا اور اس کے بہت زمانے بعد ۱۲۶۵ھ (۴۸-۱۸۴۹ء) میں وصال نے اس کی تکمیل کی۔ اس نے دو اور مثنویاں خلدِ بریں اور ناظر و منظور نیز غزلیں، قطعات وغیرہ بھی کہے ہیں جن کے بکثرت انتخابات مجمع الفصحا اور آتش کدہ (ص ۱۱۱ - ص ۱۲۰)[2] میں موجود ہیں۔ ذیل کا مربع بھی جو بغایت دلکش اور معمولی طرز سے الگ ہے ان دونوں تذکروں میں ملتا ہے:-

دوستاں شرح پریشانیٔ من گوش کنید
داستانِ غمِ پنہانیٔ من گوش کنید
قصۂ بے سر و سامانیٔ من گوش کنید
گفتگوئے من و حیرانیٔ من گوش کنید

شرح ایں قصۂ جاں سوز نہفتن تا کے
سوختم سوختم ایں راز نگفتن تا کے

---

[1] جلد دوم ص ۱۵ - ص ۵۴ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتب فارسی ص ۶۶۳ - ص ۶۶۴ ۱۲ مصنف

روزگارے من و دل ساکنِ کوئے بودیم
ساکنِ کوئے بُتے عربدہ جوئے بودیم
دین و دل باختہ ویرانۂ روئے بودیم
بستۂ سلسلۂ سلسلہ موئے بودیم

کس دراں سلسلہ غیر از من و دل بند نبود
یک گرفتار ازیں جملہ کہ ہستند نبود

نرگسِ غمزہ زنش ایں ہمہ بیمار نداشت
سنبلِ پُرشکنش ہیچ گرفتار نداشت
ایں ہمہ مشتری و گرمیٔ بازار نداشت
یوسفے بود ولے ہیچ خریدار نداشت

اوّل آں کس کہ خریدار شدم من بودم
باعثِ گرمیٔ بازار شدم من بودم

عشقِ من شد سببِ خوبی و رعنائی او
داد رسوائیِ من شہرتِ زیبائی او
بسکہ کردم ہمہ جا شرحِ دل آرائی او
شہر پُر گشت ز غوغائے تماشائی او

ایں زماں عاشقِ سرگشتہ فراواں دارد
کے سر و برگ منِ بے سر و ساماں دارد

چوں چنین است پئے کارِ دگر باشیم بہ
مرغ خوش نغمۂ گلزار دگر باشیم بہ
عندلیبِ گلِ رخسارِ دگر باشیم بہ

چند روزے پئے دلدار دگر باشیم ہ
تو گلے گو کہ شوم بلبلِ دستاں سازش
سازم از تازہ جوانانِ چمن ممتازش
تا چہ از خاطرِ وحشی ہوسِ روئے تو رفت
وز دلش آرزوئے قامتِ دلجوئے تو رفت
شد دل آزردہ آزردہ از کوئے تو رفت
بادلِ پُر گلہ از ناخوشی روئے تو رفت
حاشا للہ کہ وفائے تو فراموش کنیم
سخنِ مصلحت آمیزِ کساں گوش کنیم

۱۰۔ محمود قاری یزدی وفات ۹۹۳ھ مطابق ۱۵۸۵ء

۱۱۔ محتشم کاشی وفات ۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۷ء ۱۵۸۸ء

محمود قاری یزدی "شاعر ملبوسات" کا انتقال وحشی کے انتقال کے دو برس بعد اور محتشم کی وفات سے تین سال پہلے ہوا۔ اس کا ذکر میں تصنیف ہذا سے پہلے کی جلد میں[1] دوسرے ہزل گو شعرا عبید زاکانی اور بسحاق (ابواسحٰق) شیرازی کے سلسلے میں کرچکا ہوں۔ محتشم کاشی محمود قاری سے کہیں زیادہ مشہور ہے اور اس کا ذکر گزشتہ باب میں

[1] تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص۲۵۴ نیز ص۳۵۱ ۔ ص۳۵۳ ۱۲ مصنف

صلہ ۱۶۲ - صلہ ۱۶۴ مذہبی شاعری کی بحث میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے اور در اصل اس کو شہرت بھی اسی صنفِ شاعری میں حاصل ہے۔ اس کے زمانۂ شباب کی عشقیہ شاعری اور شاہ طہماسپ کی مدح میں جو قصاید اس نے کہے، ان کے انتخابات آتش کدہ میں بکثرت موجود ہیں، لیکن حضرت امام حسین اور دیگر ائمہ کی شہادت پر جو مراثی اس نے کہے ہیں (مجمع الفصحا[1] میں زیادہ تر قصاید ہی کے انتخابات ہیں) ان کے مقابلے میں اس کا دوسرا کلام نہ تو زیادہ مشہور ہے اور نہ کوئی خاص خصوصیت اس میں پائی جاتی ہے۔

۱۲- عرفی شیرازی وفات ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء یا ۱۵۹۱ء اور اس کا حلقہ

عرفی شیرازی وفات ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء یا ۱۵۹۱ء

اگرچہ عرفی کی قدر ہندوستان اور ترکی کے مقابلے میں خود اپنے وطن میں بہت کم ہوئی ہے، تاہم غالبًا مجموعی حیثیت سے اپنی صدی (۱۵۰۰ء - ۱۶۰۰ء) میں ایران کا مشہور ترین اور سب سے زیادہ

محمود کے حالات نہ آتش کدہ میں ملتے ہیں اور نہ ہفت اقلیم یا مجمع الفصحا میں مجھے اس کے سوانح حیات کا مطلق علم نہیں ہے اور اس کی جو تاریخ وفات بتائی گئی ہے اسے بھی مشتبہ ہی سمجھنا چاہیے۔ ۱۲ مصنف

[1] جلد دوم ص ۳۶ - ص ۳۸ ۱۲ مصنف

مقبولِ عام شاعر وہی ہے[1] اگرچہ وہ شیراز میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی پرورش بھی ہوئی، لیکن اس کی مختصر زندگی زیادہ تر ہندوستان میں بسر ہوئی اور یہیں اُس نے ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء-۱۵۹۱ء) میں عمر ۳۶ سال انتقال کیا۔ بعض لوگ اس کی موت کا سبب عارضۂ پیچش قرار دیتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاید اسے زہر دے دیا گیا۔ سولھویں صدی کے جن تین شاعروں کا ذکر شبلی نے اپنی شعر العجم[2] میں کیا ہے، ان میں ایک تو عرفی شیرازی ہے اور بقیہ دو میں ایک تو اس کا ہم وطن بابا فغانی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے[3] اور دوسرا اکبر کے مشہور وزیر ابو الفضل کا بھائی فیضی ہے۔ فیضی، بقول شبلی نعمانی کے ان دو ہندوستانی شعرا میں سے تھا جن کا کلام ٹھیٹ ایرانیوں کا سا معلوم ہوتا ہے[4]۔ عبد القادر بداؤنی لکھتا ہے[5]:

---

[1] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتب فارسی ص۶۶۷ ۱۲ مصنف

[2] جلد سوم ص۸۳-ص۱۳۳ ۱۲ مصنف

[3] ص۱۹۲-ص۱۹۳ ۱۲ مصنف ص ۲۴۲-۲۴۳

[4] دوسرے امیر خسرو دہلوی تھے۔ ۱۲ مصنف

[5] "او (عرفی) و حسین ثنائی از شعر عجب طالعے دارند کہ ہیچ کوچہ و بازارے نیست کہ کتاب فروشاں دیوان این دوکس را در سر راہ گرفتہ نایستند۔۔۔ بخلاف شیخ فیضی کہ چندیں زرہائے جاگیر صرف کتابت و تہذیب تصانیف خود ساختہ و ہیچ کس بہ آں مقید نمی شود مگر یہاں یک سواد کہ خود باطراف فرستادہ"

(منتخب التواریخ طبع کلکتہ جلد سوم ص۲۸۵) ۱۲ مترجم

"میرے زمانے میں ہندوستان میں فارسی کے دو سب سے زیادہ مقبول شاعر عرفی اور ثنائی تھے اور اُن کے کلام کے نسخے ہر بازار میں اور ہر کتب فروش کے یہاں مل سکتے تھے، لیکن فیضی کے کلام کو باوصف اس کے کہ اس نے ان کی کتابت اور تذہیب میں بہت کچھ خرچ کیا تھا، کوئی پوچھتا بھی نہ تھا"

فیضی اور عرفی کو ترکی اور ہندوستان میں بہت مقبولیت حاصل تھی

گب لکھتا ہے[۱] کہ جامی علاوہ جن فارسی شعرا کا اثر ترکی ادبیات پر بہت گہرا پڑا، وہ فیضی اور عرفی تھے، لیکن بعد کو صائب نے ان کی جگہ لے لی۔

" اس نئے طرز کی خصوصیتِ خاصّہ صرف یہی نہ تھی کہ شاعری کے پرانے بندھے ہوئے لفظی سرمایہ میں نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوا، بلکہ صنائع پر اب اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا اور اس کی بجائے طرز ادا کی رفعت اور الفاظ کی شوکت پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی[۲]"

ضیا پاشا نے جو منظوم مقدمہ خرابات پر لکھا ہے اور جس میں اس نے فارسی شعرا کا ذکر کیا ہے، اس میں جامی کی تعریف کے بعد عرفی اور فیضی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

فیضی اَبلہ عرفی ہم عنانِدر سر جملہ آخر الزماندر

---

[۱] تاریخ ادبیاتِ عثمانی جلد اول صفحہ ۵، صفحہ ۱۲۷ اور صفحہ ۱۲۹ ۱۲ مصنف

[۲] تاریخ ادبیاتِ عثمانی جلد اول صفحہ ۱۲۹ ۱۲ مصنف

فیضیده بلاغت و طراوت — عرفیده عذوبت و حلاوت
فیضی ده مواعظ آتشین در — عرفی ده قصیده رتبتیں در
اما آرا نورسه اولویت — فیضیده قالور رینه فضیلت
فیضی معجم ایکن سراپا — تفسیرینه نقطه قو نماز اصلا
بولدی او یگانه فضیلت — شاگردی یده ایله شهادت

(ترجمہ) ”فیضی اور عرفی دونوں، دونوں ہم عنان ہیں اور دورِ آخر کے سردار ہیں۔ فیضی میں بلاغت اور تازگی ہے، عرفی میں شیرینی اور روانی ہے: فیضی کے یہاں آتشیں مواعظ ہیں اور عرفی کے یہاں بلند پایہ قصیدہ۔ لیکن اگر فضیلت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سہرا فیضی ہی کے سر ہے۔ وہ از اول تا آخر سلیس اور صاف ہے۔ اس کی تفسیر میں ایک نقطہ کے اضافہ کی بھی گنجایش نہیں ہے[۵۱] لیکن افسوس کہ وہ یگانہ فضیلت اپنے شاگرد کے ہاتھ سے شہید ہوا۔“

فیضی کی عبرتناک وفات | مذکورہ بالا اشعار کے آخر میں فیضی کی شہادت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کی تائید میں مجھے کوئی اور شہادت نہیں ملی۔ فیضی کی موت کا یہ بیان اس بیان سے بہت مختلف ہے جو بداؤنی نے چبا چبا کر اور مسرت کے ساتھ فیضی کے دردناک اور بُرے انجام کا کیا ہے[۵۲]۔ اس دشمن جانی نے اس کے متورم چہرے اور سیاہ ہونٹوں کا حال کمال شقاوت کے ساتھ لکھا ہے[۵۳] جس سے یہ شبہ پیدا ہونا ممکن ہے

---

۵۱ یہ لطیف اشارہ فیضی کی بے نقط تفسیر کی طرف ہے ۱۲ مترجم

۵۲ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۹۹۔ ص ۳۱۰ خصوصاً ص ۳۰۰ ۱۲ مصنف

۵۳ ”روے او ورم کردہ ولب ہا تمام سیاہ شدہ بود“ (طبع کلکتہ جلد سوم ص ۱۰۱) ۱۲ مترجم

کہ اسے زہر دیا گیا۔ اسی متعصب مورّخ نے ایسے کئی جلے کٹے تاریخی قطعات بھی نقل کئے ہیں جو" راسخ العقیدہ" لوگوں نے فیضی جیسے "ملحد" کی موت پر کہے تھے۔ مثلاً :-

فیضئ بے دین چو مُرد سال وفاتش فصیح
گفت سگے از جہاں رفتہ بحالِ قبیح
سنہ ۱۰۰۴ھ

ایسی تاریخوں میں سے سادہ ترین تاریخیں یہ ہیں " بود فیضی ملحدے" (سنہ ۱۰۰۴ھ) " چہ سگ پرستے مرد" (سنہ ۱۰۰۴ھ) "قاعدہٗ الحاد شکست" (سنہ ۱۰۰۴ھ) وغیرہ ان سب سے مادہٗ تاریخی سنہ ۱۰۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اپنی مذہبی بدنامی اور رسوائی کے داغ دھونے کے لیے فیضی نے ایک بے نقط تفسیر بھی لکھی تھی اور پھر اس ٹکڑے کا اضافہ کیا ہے کہ " اس کو لکھتے وقت وہ سرمست اور نجس تھا[۱]" صاحب مجمع الفصحا نے[۲] صرف اس بے نقط تفسیر کے بیان میں (جس کا اس نے صرف ذکر ہی سُنا تھا، دیکھا نہ تھا) اتنا لکھا ہے کہ " کلفتے بے حاصل کشیدہ" اور اس کے دوسرے کلام کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے اور صاحب آتش کدہ نے

[۱] تفسیر بے نقط برائے شستن بدنامی کہ تا روز جزا بصد آب دریا نشستہ گرد در عین حالت مستی و جنابت می نوشت ۔"
(منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۳۰۰) ۱۲ مترجم

[۲] جلد دوم۔ صفحہ ۲۶۔ بقول شبلی کے اس تفسیر کا نام سواطع الالہام تھا (شعر العجم جلد سوم صفحہ ۶۵)۔ ۱۲ مصنف

لکھا بھی ہو تو یہ مزیدار فقرہ کہ "چنداں بد نبود"۔ فیضی کے متعلق جو مفصل ترین اور مبصرانہ بیان میری نظر سے گزرا ہو وہ وہ ہو جو شبلی نے شعرالعجم میں[1] کیا ہو۔ اس نے نظامی کے خمسہ کی تقلید میں ایک خمسہ بھی لکھا تھا جس کی پانچوں مثنویوں کے عنوانات یہ تھے۔ مرکز ادوار؛ سلیمان و بلقیس؛ نل و دمن (یہ سب سے زیادہ مشہور ہو)؛ ہفت کشور؛ اور اکبر نامہ، لیکن ان میں سے بعض مکمل نہ ہوسکیں۔ اس نے بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی ہیں اور کئی سنسکرت کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ شبلی نے اس کے کلام کا جو انتخاب دیا ہو، اس میں مجھے سب سے زیادہ پُر درد ذیل کے اشعار نظر آئے جو اس نے اپنے بچّے کی موت پر لکھے تھے:-

ای روشنئ دیدۂ روشن چگونۂ؟ — من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونۂ؟

ماتم سرا ست خانۂ من در فراق تو — تو زیر خاک ساختہ مسکن، چگونۂ؟

بر خار و خس کہ بستر و بالین خواب تست — ای یاسمیں عذار سمن تن، چگونۂ؟

فیضی کا کتب خانہ فیضی کی ذات جامع العلوم تھی، کتابوں کا اسے بہت شوق تھا۔ اس کے کتب خانے میں چار ہزار چھ سو نہایت لاجواب قلمی نسخے موجود تھے، جن میں سے اکثر یا تو خود مصنفین کے قلم کے، یا ان کی زندگی میں لکھے گئے تھے[2]۔ وہ بہت فیاض اور مہمان نواز تھا۔ جو لوگ اس کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہوئے، انھیں میں عرفی بھی تھا اور اب ہم اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

---

[1] جلد سوم ص۳۱ - ص۸۱ - ۱۲ مصنف

[2] جلد سوم ص۵۸ و منتخب التواریخ جلد سوم ص۳۰۵ ۱۲ مصنف

عرفی کا حال | عرفی کا پورا نام جمال الدین محمد تھا۔ والد کا نام بدرالدین۔ وہ شیراز میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی تعلیم ہوئی، لیکن کم سنی ہی میں ہندوستان چلا آیا اور جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے فیضی کے متوسلین میں شامل ہو گیا۔ لیکن تھوڑے زمانے بعد دونوں میں ناچاقی ہو گئی۔ بداؤنی لکھتا ہے[1] کہ ایک دن وہ فیضی سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ ایک کتّے کے بچّے کو پیار کر رہا ہے۔ عرفی نے پوچھا کہ "مخدوم زادے" کا نام کیا ہے۔ فیضی نے جواب دیا "عرفی" اس پر فوراً عرفی نے جواب دیا "مبارک باشد" جس کے ایک معنی تو ظاہر ہیں، لیکن دوسرا اشارہ فیضی کے باپ شیخ مبارک کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد عرفی نے حکیم ابوالفتح گیلانی[2] کے مزاج میں درخور حاصل کیا اور اسی کے توسط سے اس کی رسائی امیر کبیر قدردانِ علوم و فنون عبدالرحیم خان خاناں کی بارگاہ تک ہوئی جو اپنے باپ بیرم خان کے قتل (۹۶۸ھ مطابق ۶۱-۱۵۶۰ء) کے بعد اس کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ دربارِ اکبری تک رسائی ہو گئی اور جب بادشاہ ۹۹۷ھ (۸۹-۱۵۸۸ء) میں کشمیر گیا تو عرفی بھی ہمراہِ رکاب تھا۔

عرفی کی بد دماغی | ان مواقع اور خود اپنی مسلّمہ قابلیت کے باوجود عرفی کے ناقابلِ برداشت غرور اور بد دماغی نے اسے ہر دل عزیز

---

[1] منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۲۸۵ ۱۲ مصنف

[2] منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۶۷۔

اس کا انتقال ۹۹۷ھ (مطابق ۸۹-۱۵۸۸ء) میں ہوا۔ ۱۲ مصنف

نہ ہونے دیا اور اس کے کئی دشمن پیدا ہو گئے۔ رضا قلی خاں نے اس کا حال بہت مختصر لکھا ہے[1] اور لکھا ہے کہ "آج کل کے لوگ اس طرز کلام کو پسند نہیں کرتے[2]" جو شاعر خود اپنے متعلق یہ دعوے کرے کہ:

نازشِ سعدی بمشتِ خاک شیراز از چہ بود
گر نمی دانست باشد مولد و ماوائے من

وہ گویا خود اپنے ہاتھ سے تنقید اور تنقیص کے دروازے کھولتا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا شعر اس کی تعلّیوں کی واحد مثال نہیں ہے۔ وہ اسی طرح سے خود کو انوری، ابوالفرج، خاقانی اور دوسرے مشہور فارسی شاعروں سے بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے۔ اپنے اپنائے وطن میں مقبول نہ ہونے کی بڑی وجہ اس کی یہی بد دماغی ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کہ ایرانی اپنی قوم اور اپنے مشاہیر ملک کی اس طرح توہین و تذلیل کیوں گوارا کرنے لگے۔ برخلاف اس کے، جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، ترکی اور ہندوستان میں اس کی شہرت اور اس کا اثر اچھا خاصا ہوا۔ چنانچہ شبلی نے اپنی تصنیف شعر العجم (جلد سوم) کے ۵۲ صفحات (ص۹۲ - ص۱۳۳) میں اس کا حال لکھا ہے، جو نہ صرف فیضی، بلکہ ان ساتوں شعرا کے حال سے بہت زیادہ ہے جن کا ذکر اُس جلد میں کیا گیا ہے، لیکن خود شبلی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ عرفی کی بد دماغی ہی نے اس کے دشمن پیدا کیے۔ ذیل کی نظم سے[3] معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی اس کوتاہی سے

---

[1] مجمع الفصحا جلد دوم ص۲۴ - ص۲۵ - ۱۲ مصنف

[2] "بارے در شاعری طرز غریب دارد کہ اکنوں پسندیدہ نیست" ۱۲ مترجم

[3] شعر العجم جلد سوم ص۹۲ - ص۹۳ ۱۲ مصنف

واقف تھا۔ ان اشعار میں وہ اپنے ان "دوستوں" کی جھوٹی ہمدردی کا خاکہ اُڑاتا ہے جو اس کی علالت کے زمانے میں عیادت کے لیے آئے تھے :۔

تنِ اوفتاده دریں حال و دوستانِ فصیح
بدور بالشش وبستر ستاده چوں منبر
یکے بریش کشد دست ویکے کند گردن
کہ روزگار وفا با کہ کرد جانِ پدر
بجاه و مالِ فرومایہ دل نباید بست
کجاست دولت جمشید ونام اسکندر
یکے بہ نرمیٔ آواز وگفتگوئے حزیں
کند شروع وکشد آستیں بدیدۂ تر
کہ جانِ من ہمہ را ایں رہست وباید رفت
تمام راه روانیم ودہر راکب بہ
یکے بجرب زبانی سخن طراز شود
کہ اے وفاتِ تو تاریخ انقلاب خبر[1]
فراہم آے وپریشاں مدار دل زنہار
کہ نظم ونثر تو من جمع مے کنم یکسر

---

[1] میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب خبر کو تاریخی مادہ سمجھنا چاہیے جس سے ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء۔۱۵۷۹ء) برآمد ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو شبلی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "یہ عرفی کی آخری علالت تھی (شعر العجم جلد سوم صفحہ ۹۲) کیونکہ وہ ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء۔۱۵۹۱ء) تک زندہ تھا۔ ۱۲ مصنف

پس از نوشتن و تصحیح می کنم انشار
بمدعائے تو دیباچۂ چوں درجِ گہر
چنانچہ ہستی فہرست دانش و فرہنگ
چنانچہ ہستی مجموعۂ صفات و ہنر
نظم و نثر در آویزم و فرد ریزم[1]
اگرچہ حصرِ کمال تو نیست حدِ بشر
خدائے عزوجل صحتم دہد بینی
کہ ایں منافقکاں را چہ آورم بر سر

افسوس ہے کہ قلت گنجائش کی وجہ سے عرفی کے متعلق شبلی کی دلچسپ اور مفصل تحقیق کو یہاں پوری طرح پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے اس کے کلام کی چھ خصوصیتیں قرار دی ہیں: زورِ کلام، جدتِ ترکیب، ندرتِ تشبیہات و استعارات، تسلسلِ مضامین وغیرہ۔ بجز ایک مختصر سے غیر معروف رسالہ نفسیہ کے جو فنِ تصوف پر ہے، اس کا بقیہ کلام نظم میں ہے اور بقول شبلی کے دو مثنویوں اور ایک دیوان پر مشتمل ہے۔ مثنویوں کے نام مخزن الاسرار اور خسرو و شیریں ہیں اور یہ نظامی کے طرز پر کہی گئی ہیں۔ دیوان ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں یعنی اس کی وفات سے صرف تین برس پہلے مرتب ہوا اور ۲۶ قصائد ۲۷۰ غزلیات اور ۷۰۰ قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ ذیل کی تاریخ سے سالِ ترتیب دیوان برآمد ہوتا ہے[2]۔

---

[1] یہ آخری شعر خود شاعر کی زبانی ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۹۵ ۱۲ مصنف

این طرفہ نکات سحری و اعجازی | چوں گشت مکمل بہ قلم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت | اول دیوان عرفی شیرازی

سنہ ۹۹۶ھ

اس کا ایک نہایت مشہور قصیدہ جس کی نقل خرابات (جلد اول ص ۱۶۹ تا ص ۱۷۱) میں موجود ہے، حضرت علی ابن ابی طالب کی منقبت میں ہے اور ۱۸۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:-

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار | نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

مجالس المومنین میں جن شیعہ شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں، ان میں عرفی کا ذکر نہیں ہے۔

مسٹر ونسنٹ اسمتھ (Vincent Smith) کی سخت رائے

جو لاتعداد ایرانی: مجتہدین، علما، فلاسفہ اور شعرا کشاں کشاں اکبر کے شاندار دربار کی طرف کھنچ آئے تھے، ان سب کے حالات کے لیے بداؤنی کی منتخب التواریخ (جلد سوم) معلومات کا ایک سمندر ہے، لیکن افسوس کہ گنجایش کی کمی ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ سلطنتِ ایران کی حدود کے باہر نظر ڈالیں۔ مرحوم مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے اکبر پر جو کتاب لکھی ہے[۱] وہ ہر حیثیت سے قابلِ تعریف ہے، لیکن شاعروں کے متعلق انھوں نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بہت سخت اور غیر منصفانہ ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں (ص ۴۱۵ - ص ۴۱۶):-

"موزوں گویوں کی جنھیں شاعر کہا جاتا ہے، تعداد بہت زیادہ

---

[۱] اکبر مغل اعظم (Akbar, the Great Moghul)
طبع آکسفورڈ ۱۹۱۷ء ۱۲ مصنف

تھی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اگرچہ اکبر ان کی طرف ملتفت بھی نہ ہوتا تھا لیکن "ہزاروں شاعر برابر دربار میں حاضر رہتے ہیں جن میں سے اکثر صاحبِ دیوان یا کسی مثنوی کے مصنف ہیں" اس کے بعد اُس نے (ابوالفضل نے) ان میں سے ۵۹ بہترین شعرا کا نام بتایا ہے جو دربار میں باریاب ہو چکے تھے اور ان پر تنقید کی ہے، پھر ۱۵ ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ دربارِ شاہی میں باریاب نہ ہوئے تھے لیکن ایران کے مختلف مقامات سے ظلِّ سبحانی کی مدح میں قصائد روانہ کر چکے تھے[1]۔ ابوالفضل نے ان ۵۹ شعرا کے کلام کے انتخابات بھی دیے ہیں۔ میں نے ان کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے اور مجھے ان اشعار میں جن میں اس کے بھائی ملک الشعرا فیضی کے کلام کا انتخاب بھی ہے، جسے ابوالفضل نے "جواہرِ انکار" کہا ہے ایک تخیّل بھی ایسا نہیں نظر آیا جو نقل کرنے کے قابل ہو"۔

بدایونی کا فراہم کیا ہوا لاجواب مواد بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم صرف ان شعرا اور اہلِ علم کی سوانح پر مشتمل ہے جو دربارِ اکبری کی رونق تھے۔ اس جلد میں ۳۸ شیوخ، ۶۹ علما، ۱۵ فلاسفہ اور اطبّا، اور کم از کم ۱۶۷ شعرا کا ذکر ہے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر فارسی

---

[1] "آئینِ اکبری مترجمہ ایچ۔ بلاخ مین اور ایچ۔ ایس۔ جے رٹ H Blochmann and H. S. Jarrett) (طبع کلکتہ ۱۸۷۳ء تا ۱۸۹۴ء۔ در سہ جلد) جلد اول ص۵۴۸ و ص۶۱۱" "مصنف"

زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے اور ایرانی نژاد بھی تھے، لیکن ایران میں کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔

جن مشاہیر کا تعلق اس صدی سے ہے جس کا بیان اب ہم ختم کر رہے ہیں: یعنی سنہ ۱۵۰۰ء تا سنہ ۱۶۰۰ء، ان میں سے چند نام یہ ہیں:۔ شیخ بہاء الدین عاملی، ملا محسن فیض کاشی المتخلص بہ فیض؛ میر داماد؛ اور میر ابو القاسم فندرسکی۔ لیکن ان سب کا بیان مجتہدین یا فلاسفہ کے سلسلہ میں زیادہ مناسب ہوگا۔

سنہ ۱۶۰۰ء۔ سنہ ۱۷۰۰ء مطابق سنہ ۱۰۰۸ھ تا سنہ ۱۱۱۱ھ

شبلی نے اپنی شعر العجم کی تیسری جلد میں جن سات شاعروں کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، ان میں سے چار کا تعلق مذکورہٗ بالا زمانے سے ہے: یعنی نظیری (وفات سنہ ۱۰۲۱ھ مطابق سنہ ۱۶۱۲ء یا سنہ ۱۶۱۳ء) طالب آملی (سنہ ۱۰۳۶ھ مطابق سنہ ۱۶۲۶ء) ابو طالب کلیم (وفات سنہ ۱۰۶۱ھ مطابق سنہ ۱۶۵۱ء)؛ اور صائب (وفات سنہ ۱۰۸۸ھ مطابق سنہ ۱۶۷۷ء یا سنہ ۱۶۷۸ء[1]) رضا قلی خان نے میرخواند کی روضۃ الصفا کے ضمیمہ کے طور پر جو آٹھویں جلد لکھی ہے، اس کے خاتمے پر شاہانِ صفویہ کے عہد کے مشاہیر کا ذکر کیا ہے، لیکن مذکورہ بالا شعرا میں سے ایک کا نام بھی اس نے نہیں لکھا ہے، البتہ زیر بحث دور میں اس نے صرف ظہوری (وفات سنہ ۱۰۲۴ھ مطابق سنہ ۱۶۱۵ء) اور شفائی (وفات سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق سنہ ۱۶۲۷ء) کا حال

---

[1] اس کی وفات کی دوسری تاریخیں بھی بتائی جاتی ہیں، مثلاً سنہ ۱۰۸۰ھ (مطابق سنہ ۱۶۶۹ء۔ سنہ ۱۶۷۰ء)؛ ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتب فارسی صفحہ ۶۹۳ ۱۲ مصنف

لکھا ہے۔ ایک اور شاعر جس کو شبلی اور رضا قلی خان دونوں نے نظر انداز کر دیا ہے شوکت (یا ترکی تلفظ شوکت بکسرۂ ش ک) بخاری (وفات ۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء-۱۶۹۶ء) ہے۔ ترکی میں اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے اور بقول گب کے[1]

"وہ آدھی صدی سے زیادہ مدت تک اکثر عثمانی شاعروں کے لیے دلیلِ راہ کا کام دیتا رہا ہے اور اپنی حیرت انگیز جدت، تخیلات کی تازگی اور رنگینی اور قدرتِ تشبیہ آفرینی کی وجہ سے بجا طور پر مشہور رہ چکا ہے"

ہم ان سات شعرا کی فہرست میں حسب ذیل چھ شعرا کا اور اضافہ کرتے ہیں جو غالبًا اپنے بے شمار حریفوں کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ ممتاز ہیں۔ سحاب استر آبادی (وفات ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۱ء-۱۶۰۲ء)، زلالی خوانساری (وفات تقریبًا ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۵ء)، جلال اسیر (وفات ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء-۱۶۴۷ء)، سلیم طہرانی (وفات ۱۰۵۷ھ مطابق ۱۶۴۷ء-۱۶۴۸ء)، قدسی مشہدی (وفات ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء-۱۶۴۷ء) اور امانی مازندرانی (وفات ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۱ء)۔ ان کے علاوہ چار یا پانچ اور مشاہیر بھی ہیں[2] جو اگرچہ کبھی کبھی شعر کہتے تھے لیکن خاص طور پر ان کا تعلق زمرۂ فلاسفہ سے ہے اور ان کی بحث اُسی سلسلہ میں کی جائے گی۔ صائب کے متعلق اگرچہ ریو (Rieu)

---

[1] تاریخ ادبیات عثمانی جلد اول صفحہ ۱۳۰ نیز جلد چہارم صفحہ ۹۵ ۱۲ مصنف

[2] یعنی میر داماد، شیخ بہاء الدین، ابوالقاسم فندرسکی، محسن فیض اور عبدالرزاق لاہجی المعروف بہ فیاض ۱۲ مصنف

کی یہ رائے کسی قدر مبالغہ آمیز ہی کہ

"وہ باتفاق رائے نئے طرزِ شعر کا موجد اور جدید ایرانی شعرا میں سب سے بڑا ہی"

تاہم اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ سترھوئیں عیسوی کے تمام شعرا میں وہی ممتاز ترین ہی اور باوجود رضا قلی خان کی اس رائے کے[1]:

"بارے درطریق شاعری طرز غریب داشتہ کہ اکنوں لپسندیدہ نیست"

اس قابل ہی کہ اس تصنیف میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جائے۔ ذیل میں ان سترہ شاعروں کا حال بترتیب سِنِ وفات درج کیا جاتا ہی اور مختصراً ان مآخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہی جن سے ان کے تفصیلی حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ ان مآخذ میں ریو (Rieu) کی لاجواب (فہرست کتب فارسی مخزونہ برٹش میوزیم) کے علاوہ حسب ذیل کتب بھی داخل ہیں شبلی کی شعرالعجم جلد سوم؛ آتش کدہ؛ ہفت اقلیم (جو ابھی تک قلمی صورت میں ہی)، روضات الجنات، روضۃ الصفا، مجمع الفصحا؛ اور ریاض العارفین۔

۱۔ سحابی استرآبادی (وفات ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۶۰۱ء یا ۱۶۰۲ء)

مآخذ معلومات | ریو (Rieu) ص۶۷۳؛ آتش کدہ: احوال سحابی

---

[1] مجمع الفصحا جلد دوم ص۲۴۵ ۱۲ مصنف

استر آبادی ص۱۴۱ - ص۱۴۲ ؛ ہفت اقلیم : احوال سحابی استر آبادی ؛
مجمع الفصحا جلد دوم ص۲۱ ؛ ریاض العارفین ص۸۵ - ص۸۶

سحابی نے اپنی عمر کے چالیس سال نجف کی درگاہ کی مجاوری میں بسر کیے تھے - غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی کہتا تھا، جن میں سے چھ ہزار اب تک باقی ہیں -

۲- نظیری نیشاپوری (وفات ۱۰۲۱ھ مطابق ۱۶۱۲ء - ۱۶۱۳ء)

ماخذ | ریو (ص۸۱۸ - ص۸۱۹) ؛ شعر العجم جلد سوم ص۱۳۴ تا ص۱۶۴ ؛ آتش کدہ ص۱۳۱ - ص۱۳۳ ؛ ہفت اقلیم : احوال نظیری نیشاپوری (بہت طویل بیان کیا گیا ہی) ؛ مجمع الفصحا جلد دوم ص۴۸ - ص۴۹ ؛ ریاض العارفین ص۲۳۲ - ص۲۳۳ -

اس کی عمر کے آخری تیس سال ہندوستان، خصوصاً احمد آباد گجرات میں بسر ہوئے اور یہیں اس کا انتقال ہوا - اس کا شمار بھی ان بے شمار شعرا میں ہی جو عبدالرحیم خانخانان کے خوانِ کرم سے فیض یاب ہوتے تھے ؛ ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء - ۱۵۹۴ء میں اس نے خانخانان کی خدمت میں ایک قصیدہ گزرانا تھا اور صلہ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے زادِ راہ پایا، اس کے پہلے ۲ شعر یہ تھے :-

ز ہنر بخود نہ گنجم چو بجم مئے معانی	بدرد لباس بر تن چو بجو شدم معانی
ہمہ عیش ایں جہانی بہ عنایتِ تو دیدم	چہ عجب اگر بیابم ز تو زاد آنجہانی

مذہبی معاملات میں وہ کسی قدر غالی تھا اور اکثر اشعار میں اس نے "ملحد" ابوالفضل پر چوٹیں کی ہیں۔ تنباکو کی تعریف میں بھی اس نے کچھ اشعار کہے تھے، جنھیں شبلی نے نقل کیا ہے (ص۱۳۴)۔

۳۔ زلالی خوانساری وفات سنہ ۱۰۲۴ھ مطابق سنہ ۱۶۱۵ع

ماخذ ریو ص۶۷۶۔ ص۶۷۷، ہفت اقلیم: احوال خوانسار (بہت طویل ذکر ہے) اس کا ممدوح میر داماد تھا۔ اس نے سات مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے ایک "محمود و ایاز" جو سنہ ۱۰۰۱ھ مطابق سنہ ۱۵۹۲۔ ۱۵۹۳ع میں شروع اور اس کی موت سے کچھ ہی پہلے سنہ ۱۰۲۴ھ مطابق سنہ ۱۶۱۵ع میں تمام ہوئی، سب سے زیادہ مشہور ہے۔ دو اور مثنویاں جن کا ذکر ریو نے کیا ہے میخانہ اور ذرہ و خورشید ہیں۔

۴۔ ظہوری ترشیزی وفات سنہ ۱۰۲۴ھ مطابق سنہ ۱۶۱۵ع

یہ اور اس کا ہم عصر شاعر اور خسر ملک قمی دونوں دکن میں ایک نزاع کے سلسلے میں قتل کردیے گئے۔

ماخذ ریو ص۶۷۸۔ ص۶۷۹؛ آتش کدہ ص۶۰۔ ص۶۱؛ روضۃ الصفا خاتمہ جلد ہشتم؛ بقول ریو کے وہ ایران میں بہت کم مشہور ہے، لیکن

ہندوستان میں، خصوصًا مرصع نثر لکھنے والے کی حیثیت سے اس کی بہت قدر ہوتی ہی۔ صاحب آتش کدہ لکھتا ہی کہ "اگرچہ اس کا ساقی نامہ بہت مشہور ہی، لیکن میری رائے میں اس میں کوئی خاص حُسن نہیں ہی۔"

۵۔ بہاء الدین عاملی وفات سنہ ۱۰۳۰ھ مطابق سنہ ۱۶۲۰ء۔ سنہ ۱۶۲۱ء

یہ شیخ بہائی کے نام سے معروف ہیں، ان کی حیثیت زیادہ تر مذہبی عالم کی ہی، فلسفہ اور ریاضی میں بھی مشہور ہیں، لیکن کم از کم دو مثنویوں: نان و حلوا اور شیر و شکر کے مصنف بھی ہیں۔ مجمع الفصحا جلد دوم ص۹-۱۰ اور ریاض العارفین میں ان دونوں کے انتخابات موجود ہیں اور چند غزلیں اور رباعیاں بھی نقل کی گئی ہیں۔ ہندسہ اور فلکیات پر رسائل کے علاوہ، ان کی مشہور ترین تصنیف کشکول ہی جو بُولاق (مصر) میں چھپی ہی اور ایران میں بھی لیتھو میں طبع ہو چکی ہی۔ اگرچہ یہ عربی میں ہی، لیکن اس میں کثرت سے فارسی اشعار بھی ہیں۔ مصری اڈیشن میں سے اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں ملا محمد تقی مجلسی (وفات سنہ ۱۰۷۰ھ مطابق سنہ ۱۶۵۹ء- سنہ ۱۶۶۰ء) سب سے زیادہ مشہور رہیں۔

۶۔ طالب آملی وفات سنہ ۱۰۳۶ھ مطابق سنہ ۱۶۲۶ء۔ سنہ ۱۶۲۷ء

ماخذ ریو ص۶۷۹، شعر العجم جلد سوم ص۱۶۵-۱۸۸؛ آتش کدہ ص۱۵۵-۱۵۶

اس میں ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہو کہ ان کا طرز عجیب وغریب تھا جسے فصیح شاعر پسند نہیں کرتے۔ یہ اوائل عمر میں ہندوستان میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور یہاں ان کی اتنی قدر ہوئی کہ ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۹ء میں جہانگیر نے انھیں اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا۔ طبیعت میں تعلّی بہت تھی اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ بیس برس کی عمر سے پہلے ہفت علوم میں کامل دستگاہ حاصل کرلی تھی[1]:

پا بر دو ثمین پایہ اوج عشر اتم	واینک عدد فہم از آلاف زیادست
بر ہندسہ ومنطقی وہیئت وحکمت	دستے است مرا کش ید بیضا زعبادست
دیں جملہ چو طی شد نمکیں علم حقیقت[2]	کاستاد علوم است بریں جملہ مزادست
در سلسلہ وصفِ خط ایں بس کہ ز کلکم	ہر نقطہ سویدائے دل اہلِ سوادست
پوشم نسبِ شعر چو دانم کہ تو دانی	کایں پایہ مرا ثامن این سبع شدادست[3]

ذیل کی رباعی میں جسے شبلی نے ص۱۶۵ پر نقل کیا ہو اپنے قصد سفر ہند کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی سیہ بختی کو ایران ہی میں چھوڑ جا اس لیے کہ کوئی شخص ہندو کو بطور تحفہ ہندوستان نہیں لے جاتا۔

طالب گل این چمن بہ بستان بگزار	بگزار کہ می شوی پریشاں بگزار
ہندو نبرد تحفہ کسے جانب ہند	بختِ سیہِ خویش بہ ایراں بگزار

---

[1] شبلی نے شعر العجم جلد سوم ص۱۶۶ پر یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] شبلی نے اس سے تصوف مراد لی ہو۔ ۱۲ مصنف

[3] قرآن ۱۲: آیت ۴۸، سبع شداد سے مراد خشک سالی کے سات سال لیے گئے ہیں۔ ۱۲ مصنف

اپنی بہن سے بہت محبت کرتے تھے

ان کی ایک بڑی بہن بھی تھیں جن سے بہت مانوس تھے۔ بہت دنوں کی جدائی کے بعد وہ ان سے ملنے کے لیے ایران سے سفر کرکے آگرے آئیں۔ اس موقع پر ذیل کا قطعہ لکھ کر جہانگیر سے رخصت طلب کی ہے:-

صاحبا، ذرّہ پرورا، عرضے — بزبانِ سخن‌ور ست مرا
پیر ہمشیرہ ایست عنبم خوانم — کہ بہ او مہر مادر است مرا
چاردہ سال بلکہ بیش گزشت — کہ نظر دور منظر است مرا
دور گشتم ز خدمتش بہ عراق — ویں گنہ جرم منکر است مرا
او بیا درد تابِ دوریٔ من — کہ بما در برابر است مرا
آمد اینک بہ آگرہ وز شوق — دل طپاں چو کبوتر است مرا
می کند دل بسوئے او آہنگ — چہ کنم شوق رہ بر است مرا
گر شود رخصتِ زیارتِ او — بہ جہانے برابر است مرا

عاشقانہ کلام تو فارسی میں کثرت سے ہے، لیکن ایسی نظمیں جن میں مذکورۂ بالا قطعہ کی طرح، خالص اور گہری خاندانی محبت کا اظہار کیا گیا ہو بہت خال خال ہیں، اسی لیے میں نے اسے نقل کر دیا ہے۔

۷۔ شفائی وفات ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء

برٹش میوزیم میں (Or 1372 f.a.) شفائی کی ایک تصویر نیز ان کی کہی ہوئی ایک ہجو "سیزدہ بند"[1] (Add 12560 H. 134-140) محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ریو ص۶۸۶ - و ص۸۲۲ - ریو نے لکھا ہے کہ ان کا حال تاریخ عالم آرائے عباسی میں بھی ملتا ہے، لیکن مجھے اپنے قلمی نسخے میں نہیں ملا

[1] اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ اس میں تیرہ بند ہیں۔ ۱۲ مصنف

تاہم رضا قلی خان کے مجمع الفصحا (جلد دوم ملا ۔ صـ۲۳) اور اسی کی دوسری تصنیف ریاض العارفین (صـ۲۱۳ ۔ صـ۲۱۵) نیز آتش کدہ صـ۱۶۵ ۔ صـ۱۶۹ میں ان کے مفصل حالات موجود ہیں ۔ ان کا پورا نام حکیم شرف الدین حسن تھا ۔ اور شاہ عباس کبیر کے درباری طبیب اور ندیم تھے ۔ رضا قلی خان ان کے متعلق لکھتا ہے :-

" فضل حکیم را طبابت و طبابت اورا شاعری محجوب داشتہ "

ہجویات اور غزلیات کے علاوہ انھوں نے سنائی کی مثنوی حدیقۃ الحقیقت کے طرز پر ایک مثنوی " نمکدانِ حقیقت " بھی لکھی ہے ۔

۸ ۔ میر محمد باقر داماد استرآبادی ،

وفات ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰ء یا ۱۶۳۱ء

داماد دراصل ان کے باپ کا لقب تھا جو مشہور مجتہد شیخ علی ابن عبد العالی العاملی کے داماد تھے ۔ میر داماد اگرچہ " اشراق " کے تخلص سے شعر بھی کہتے تھے ، لیکن شاعری کی بہ نسبت وہ عالم اور فلسفی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں ۔

ماخذ | ریو صـ۸۳۵ ؛ مجمع الفصحا جلد دوم صـ۸ ؛ ریاض العارفین صـ۱۶۶ ۔ صـ۱۶۷ ، آتش کدہ صـ۱۵۹ ؛ روضات الجنات (صـ۱۱۴ ۔ صـ۱۱۶) اور تاریخ عالم آرائے عباسی میں بھی جو ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں ، یعنی ان کی زندگی ہی میں تصنیف ہوئی ، ان کے مفصل حالات موجود ہیں ۔ ان سب کتابوں کے مصنفوں نے انھیں اکثر علوم خصوصًا فلسفہ ، لغت ، ہندسہ ،

طب، فقہ، شرح اور حدیث کا عالم کہا ہے اور ان کی بارہ تصنیفات
نثر کا ذکر کیا ہے، وہ مشہور فلسفی ملا صدرا شیرازی کے استاد تھے۔

۹۔ میر ابو القاسم فندرسکی (وفات تقریباً ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء-۱۶۴۱ء)

یہ بھی بجائے شاعر کے، فلسفی کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے،
لیکن مجمع الفصحا جلد دوم ص۶۔ ص۷، ریاض العارفین (ص۱۶۵۔ ص۱۶۶)
آتش کدہ ص۱۴۳۔ ص۱۴۴، ریو ص۸۱۵۔ ص۸۱۶۔ سب نے ان کا ذکر کیا ہے۔
ان کی ایک نظم جو ناصر خسرو کے طرز پر کہی گئی ہے سب تذکروں میں موجود
ہے اور غالباً اگر ان کی بہترین نظم نہیں تو مشہور ترین ضرور ہے۔ اس کے
ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

چرخ با ایں اختران نغز و خوش زیباستی
صورتے در زیر دارد ہرچہ بر بالاستی

صورت زیریں اگر با نردبان معرفت
بر رود بالا ہماں با اصل خود یکتاستی

ایں سخن را در نیابد ہیچ فہم ظاہری
گر ابو نصرستی و گر بو علی سیناستی

ابو القاسم ظاہری رکھ رکھاؤ کی طرف سے بہت بے پروا تھے۔
درویشوں کا لباس پہنتے تھے امرا اور معززین کی صحبت سے دور بھاگتے
تھے، بدنام لوگوں اور اوباشوں سے ربط ضبط تھا۔ ایک دن شاہ عباس نے

ان کی اس خراب صحبت پر فہمائش کرنے کے ارادے سے ان سے کہا "میں سنتا ہوں کہ بعض طالبانِ علم بھی ادنیٰ درجے کے لوگوں کی صحبت میں رہتے ہیں اور ان کی ذلیل حرکات دیکھتے ہیں" تو میر ابوالقاسم نے جواب دیا کہ "میں خود ہمیشہ ایسی ہی صحبتوں میں رہتا ہوں، لیکن میں نے وہاں کبھی کسی طالبِ علم کو نہیں دیکھا"۔ انھوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا اور دبستان[1] کے بیان کے مطابق وہاں انھوں نے آذر کیواں کے بعض پیرووں کی رائے سے متاثر ہوکر زرتشتی، ہندو یا شاید بدھ مت اختیار کرلیا تھا اور یہاں تک کہ بیٹھے تھے کہ میں کبھی حج نہ کروں گا، اس لیے کہ اس میں ایک بے گنہ جانور کی جان لینی پڑتی ہے۔ اگرچہ رضا قلی خان نے ان کے کمالات کی بہت تعریف کی ہے، لیکن ان کے سوانحِ حیات بہت مختصر اور ناکافی طور پر بیان کیے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میر ابوالقاسم شاعر سے زیادہ فلسفی کی اور فلسفی سے زیادہ درویش کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان کا تعلق ان تینوں گروہوں میں سے کسی ایک سے بھی باقی نہ رہا تھا اور کسی گروہ کے مخصوص تذکروں میں ان کے سوانح نہیں ملتے۔

اس دور کے معمولی درجے کے شعرا جو کسی قدر زیادہ معروف ہیں حسب ذیل ہیں:- جلال اسیر (وفات ۱۰۴۹ھ مطابق ۱۶۳۹ء-۱۶۴۰ء)؛ قدسی (وفات ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء-۱۶۴۱ء)؛ سلیم طہرانی (وفات ۱۰۵۷ھ مطابق ۱۶۴۷ء-۱۶۴۸ء)؛ ابو طالب کلیم اور

---

[1] Shea and Troyer's Translation Vol 1 PP. 140-141 ۔ مصنف

امانی مازندرانی (دونوں کی وفات ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں ہوئی) محمد طاہر وحید (وفات تقریباً ۱۱۲۰ھ مطابق ۱۷۰۸ء۔ ۱۷۰۹ء) اور شوکت بخاری (وفات ۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء۔ ۱۶۹۶ء)؛ صائب (وفات ۱۰۸۸ھ مطابق ۱۶۷۷ء۔ ۱۶۷۸ء) کو چھوڑ کر جو ان سب میں افضل ہے مذکورہ بالا شاعروں میں صرف کلیم، محمد طاہر وحید اور شوکت بخاری قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۔ ابوطالب کلیم (وفات ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۱ء)

اس کا مولد تو ہمدان تھا، لیکن سفرِ ہندوستان سے پہلے وہ زیادہ تر کاشان (جس کی وجہ سے وہ اکثر کاشی کہلاتا ہے) اور شیراز میں رہا۔ رضا قلی خان نے (مجمع الفصحا جلد دوم ص۲۵) تو اس کا حال بہت مختصر لکھتا ہے، لیکن شبلی نے (شعر العجم جلد سوم ص۲۰۵۔ ۲۳۰) اس کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ۱۰۲۸ھ (مطابق ۱۶۱۹ء) کے قریب وہ اپنے وطن گیا تھا، لیکن تقریباً دو سال وہاں رہنے کے بعد پھر ہندوستان واپس آگیا اور دربارِ شاہجہانی میں ملک الشعرا کے منصب سے سرفراز ہوا۔ جب شاہجہان کشمیر گیا تو وہ بھی ہمراہ رکاب تھا اور اس ملک کو دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوا کہ وہیں رہ پڑا۔ سیرت کے اعتبار سے وہ خوش مزاج اور رشک و حسد سے پاک تھا، یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصرین میں بہت ہر دل عزیز تھا اور خاص کر صائب اور میر معصوم کے ساتھ اس کے تعلقات بہت دوستانہ تھے، چنانچہ صائب کہتا ہے:-

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج و کلیم
دگر کہ ز اہلِ سخن در دستان یکدگر اند

جب ملک قمی کا انتقال ہوا تو کلیم نے اس کی حسب ذیل تاریخ وفات کہی تھی :

ملک آں بادشاہِ ملک معنےٰ — کہ نامش سکّہٴ نقد سخن بود
چناں آفاق گیر از ملک معنےٰ — کہ حد ملکش از قم تا دکن بود
بجستم سال تاریخش ز ایّام — بگفتا - اوسر اہلِ سخن بود[1]

۱۰۲۵ھ

اکثر ایرانی شعرا ہندوستان سے خوش نہ تھے

بقول شبلی کے، اکثر شعرائے ایران جو دولت یا معاش کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے، زیادہ تر اس ملک کی برائیاں ہی کرتے رہے لیکن کلیم ہمیشہ اس کا ذکر تعریف کے ساتھ کرتا ہے[2]

تواں بہشت دوم گفتنش بہ ایں معنےٰ
کہ ہر کہ رفت ازیں بوستاں پشیماں شد

ایک دفعہ سلطان ترکی نے شاہجہاں کو خط لکھا اور اس سے بازپُرس کی کہ تم صرف ہندوستان کے بادشاہ ہو، تم نے خطاب شاہجہاں کیوں اختیار کیا ہے؟ اس پر کلیم نے ذیل کے شعر میں اپنے آقا کے

---

[1] شعر العجم جلد سوم ص۲۰۹ ۱۲مصنف

[2] اس نے اپنے دوسرے ابنائے وطن کے مقابلے میں دیسی زبان بھی زیادہ سیکھ لی تھی، ملاحظہ ہو اس کی پوری ہندی نظم جو شبلی نے شعر العجم جلد سوم ص۲۱۱ پر نقل کی ہے۔ ۱۲مصنف

خطاب کو حق بجانب ثابت کیا:-

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکیست[1]
شہ را خطاب شاہجہانے مسلّم است

شبلی نے کلیم کے کلام کے محاسن بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں اور اپنی تائید میں اسی کے کئی اشعار نقل کیے ہیں۔ ان محاسن میں وہ خصوصیت کے ساتھ مضمون آفرینی، خیال بندی اور مثالیہ کا ذکر کرتا ہے۔ آخر الذکر خصوصیت میں جس کے ثبوت کے طور پر ہم چند اشعار پیش کرتے ہیں، کلیم اپنے مشہور تر ہم عصر صائب سے بہت ملتا ہے:-

روزگار اندر کمین بخت ماست   دُزدِ دایم درپئے خوابیدہ است

دل گماں دارد کہ پوشیدہ است رازِ عشق را
شمع را فانوس پندارد کہ پنہاں کردہ است

از خاک برگرفتہ دوراں چو نے سوار   دایم پیادہ رفت اگرچہ سوار شد

از ہنر حال خرابم نشد اصلاح پذیر   ہیچ ویرانہ کہ از گنج خود آباد نشد

سفلہ از قربِ بزرگاں نہ کند کسبِ شرف
رشتہ پُر قیمت از آمیزش گوہر نہ شود

---

[1] از روئے جمل دونوں کے اعداد ۵۹ ہوتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

دست ہر کس را بسانِ سُبحہ بوسیدن چہ سود
ہیچ کس نہ کشود آخر عقدۂ کارِ مرا

باسن آمیزش او الفت موج است و کنار
دم بدم باسن و پیوستہ گریزاں از من

چو ہستؔ قدرت دست و دل توانگر نیست
صدف کشادہ کف است آں زماں کہ گوہر نیست

و اصل ز حرف چون در چرا بستہ است لب
چوں رہ تمام گشت جرس بے زباں شود

گر بقسمت قانعی بیش و کم دنیا یکے است
تشنہ چوں یک جرعہ خواہد کوزہ و دریا یکیست

ما ز آغاز و انجام جہاں بے خبریم
اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتادہ است

لہ یہ شعر صائب کے اس شعر سے بہت ملتا ہی :-
شگوفہ با ثمر ہرگز نگردد جمع در یک جا محال است ایں کہ باہم نعمت و دنداں شود پیدا
۱۲ مصنف

زود رفت آں کہ ز اسرارِ جہاں آگہ شد
از دبستان برود ہر کہ سبق روشن کرد

ذیل کی غزل جسے شبلی نے نقل کیا ہے، کلیم کی خصوصیت کا آئینہ ہے اور ہم اپنے اس مختصر تبصرے کو اس پر ختم کرتے ہیں :-

پیری رسید و مستیِ طبعِ جواں گزشت
ضعفِ تن از تحملِ رطلِ گراں گزشت

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست
رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت

از دستِ بُردِ حسن تو بر لشکرِ بہار
یک نیزہ خونِ گل ز سرِ ارغواں گزشت

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

در کیشِ ما تجردِ عنقا[1] تمام نیست
در فکرِ نام ماند اگر از نشاں گزشت

بے دیدہ راہ اگر نتواں رفت پس چرا
چشم از جہاں چو بستی ازو می تواں گزشت

---

[1] اس عجیب و غریب پرند کو عربی میں عنقا اور فارسی میں سی مرغ، کہتے ہیں اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ "موجود الاسم، مفقود الجسم" ہے۔ ۱۲ مصنف

بدنامیٔ حیات دو روزے نبود بیش
واں ہم کلیمؔ با تو چہ گویم چساں گزشت
یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین و آں
روزِ دگر بکندنِ دل زیں و آں گزشت

۱۱- محمد طاہر وحید قزوینی وفات ۱۱۲۰ھ[۵۱] مطابق ۱۷۰۸ء-۱۷۰۹ء

وحیدؔ بڑا شاعر نہیں ہے، لیکن پُرگو ضرور تھا۔ رضا قلی خاں لکھتا ہے[۵۲] کہ اس نے نوے ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا، لیکن اشعار کے متعلق یہ رائے دی ہے کہ "ملاحت نداشت"۔ چنانچہ اس کے "بہترین کلام" کے نمونے کے طور پر اس نے صرف چھ اشعار نقل کیے ہیں۔ نیز ذیل کی رباعی بھی درج کی ہے جس سے اس کے شیعہ عقاید کا پتہ چلتا ہے:

از مہرِ علی طینتِ ہرکس کہ سرشت — ہرچند بود ہمیشہ در دیر و کنشت
در دوزخ اگر در آورندش بمثل — جا گرم نہ کردہ می برندش بہ بہشت

وحیدؔ کے سوانحِ حیات ریوؔ[۵۳] کے یہاں ملتے ہیں، وہ یکے بعد دیگرے ایران کے دو وزیروں: مرزا تقی الدین محمد اور خلیفہ سلطان کا معتمد

---

[۵۱] اس کی تاریخ وفات مشکوک ہے۔ ملاحظہ ہو ریوؔ کی ضمیمہ فہرست کتب فارسی صفحہ ۲۲۰، صفحہ ۲۲۱ اور ایتھے کی فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس کالم نمبر ۹۰۰ تا ۹۰۱۔ ۱۲ مصنف

[۵۲] مجمع الفصحا جلد دوم صفحہ ۵۰۔ ۱۲ مصنف

[۵۳] فہرست کتب فارسی صفحہ ۱۸۹، صفحہ ۱۹۰ نیز ضمیمہ فہرست۔ ۱۲ مصنف

رہا تھا۔ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء۔ ۱۶۴۶ء) میں وہ شاہ عباس ثانی کا درباری وقائع نگار مقرر کیا گیا۔ ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء۔ ۱۶۹۰ء) میں وزیر ہوا۔ اٹھارہ سال بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی اور تقریباً ۱۱۲۰ھ مطابق ۱۷۰۸ء۔ ۱۷۰۹ء میں انتقال کیا۔ ریو اس کی مصنفہ تاریخ کے پانچ نسخوں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے ایک (Or 2940) سنہ ۲۲ جلوس یعنی ۱۰۷۳ھ مطابق ۱۶۶۲ء تک کے حالات پر حاوی ہے[1]۔ آتش کدہ کی یہ رائے کہ اس کے اشعار کی تعریف اس کے مرتبہ کی وجہ سے ہوتی تھی، غالباً صحیح ہے۔ ایتھے کے بقول، صائب کے ساتھ اس کے مراسم دوستانہ تھے۔

۱۴۔ شوکت بخاری[2] وفات ۱۱۰۷ھ ہجری مطابق ۱۶۹۵ء۔ ۱۶۹۶ء

اس شاعر کا آج ایران میں کوئی نام تک نہیں جانتا۔ مجمع الفصحا میں تو اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ریاض العارفین میں اس کا مختصر حال ملتا ہے، اس کے دو شعر نقل کیے گئے ہیں اور شیخ محمد علی لاہجی المتخلص بہ حزیں نے جو اس کا ہم عصر تھا، اس کی مجنونانہ حرکات کا جو کچھ بیان لکھا ہے وہ نقل کر دیا گیا ہے۔ شیخ محمد علی حزیں لکھتا ہے کہ میں نے اسے سخت جاڑوں کے موسم میں برہنہ پا اور برہنہ سر کوچہ گردی

---

[1] ریو فہرست کتب ص ۱۹۵ ایتھے فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس کالم ۸۹۱ ۔ ۸۹۲ ۔ ۱۲ مصنف

کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس کے سر اور شانوں پر ایک نمدپارہ پڑا ہوا تھا جس پر برف گری ہوئی تھی مگر وہ اسے جھٹکتا تک نہ تھا۔

شوکت صرف اس وجہ سے قابلِ ذکر ہے کہ ترکی میں اسے بڑی شہرت حاصل ہے اور ترکی ادبیات پر اس کا اثر بہت گہرا پڑا ہے جس کا بیان گب نے اپنی تاریخ ادبیات عثمانی[۱] میں کئی مقامات پر کیا ہے۔

۱۳۔ صائب[۲] تبریزی (وفات ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء-۱۶۷۰ء)

شبلی[۳] نے اسے افضلِ متاخرینِ شعرائے ایران کہا ہے اور جدت میں قاآنی سے بھی بڑھا ہوا دکھایا ہے جو جدید زمانے کے شعرا میں بزرگ ترین اور مشہور ترین ہے، لیکن جسے شبلی صرف فرخی اور منوچہری کا مقلد سمجھتا ہے۔ برخلاف اس کے رضا قلی خان کی رائے صائب کے متعلق یہ ہے[۴]۔

"بارے در طریقِ شاعری طرزِ غریب داشتہ کہ اکنوں پسندیدہ نیست"

---

[۱] جلد اول صفحہ ۱۳، جلد چہارم صفحہ ۹۶، صفحہ ۹۷، صفحہ ۱۸۵،

نیز ملاحظہ ہو میری تصنیف ہذا کا صفحہ ۲۰۶ ۱۲ مصنف

[۲] اگرچہ وہ تبریز میں پیدا ہوا، لیکن اس کی تعلیم اور تربیت اصفہان میں ہوئی، اسی وجہ سے اسے اکثر 'اصفہانی' کہا جاتا ہے۔ ۱۲ مصنف

[۳] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۱۸۹ ۱۲ مصنف

[۴] مجمع الفصحا جلد دوم صفحہ ۲۷ - ۱۲ مصنف

مختصر یہ کہ عرفی کی طرح صائب بھی ان شعرا میں ہی جن کی ہندوستان اور ترکی میں تو بڑی قدر ہوتی ہی، لیکن ایران میں انھیں کوئی باوقعت نہیں سمجھتا۔ اُس کے محاسن کلام کے متعلق میں اپنی ذاتی رائے جلد ہذا کے صفحہ ۱۵۰ پر ظاہر کرچکا ہوں۔

بقول صاحب آتش کدہ[1] صائب کا پورا نام مرزا محمد علی تھا، اور وہ اصفہان کے پاس ایک دیہات عباس آباد میں پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے خاندان نے شاہ عباس کے حکم سے تبریز چھوڑنے کے بعد سکونت اختیار کر لی تھی۔ اصفہان میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے کم عمری میں یعنی کم از کم ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء۔۱۶۳۰ء) سے پہلے ہی دلّی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کی سیر کی اور ظفر خاں، نیز دوسرے امرائے دربار کے خوانِ کرم سے فیض یاب ہوا۔ ابھی اسے ہندوستان آئے ہوئے دو سال ہی ہوئے تھے کہ اس کا باپ جو ستر سال کا ایک پیر مرد تھا، ہندوستان آیا تاکہ اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ وطن واپس لے جائے، چنانچہ اس موقع پر اس نے اپنے محسن اور ممدوح ظفر خاں کی خدمت میں ذیل کا قطعہ پیش کرکے سفر کی اجازت طلب کی تھی[2]

شش سال[3] بیش رفت کہ از اصفہاں بہ ہند
افتادہ است توسنِ عزمِ مرا گزار

---

[1] بمبئی لیتھو اڈیشن مطبوعہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء۔۱۸۶۱ء صفحہ ۳۰ تا صفحہ ۳۱ ۱۲ مصنف

[2] شبلی شعر العجم جلد سوم صفحہ ۱۹۴ ۱۲ مصنف

[3] اگر شبلی کا یہ خیال صحیح ہی کہ یہ قطعہ تقریباً ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء۔۱۶۳۲ء) میں لکھا گیا تھا تو صائب ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء۔۱۶۲۶ء) میں ہندوستان آیا ہوگا ۱۲ مصنف

آوردہ است جذبۂ گستاخِ شوقِ من
از اصفہاں بآگرہ و لاہورش انکبار
ہفتاد سالہ والدِ پیرست بندہ را
کز تربیت بود بمنش حقِ بے شمار
زاں پیشتر کہ آگرہ بمعورۂ دکن را
آید عناں گسستہ تر از سیلِ بے قرار
ایں راہِ دور راہ ز سرِ شوق طی کند
با قامتِ خمیدہ و با پیکرِ نزار
دارم امید رخصتے از آستانِ تو
ای آستانت کعبۂ امیدِ روزگار
مقصود او از آمدنش بردنِ منست
لب را بحرفِ رخصتِ من کن گہر نثار
با جبہۂ کشادہ تر از آفتابِ صبح
دستِ دعا بیدرقۂ راہِ من برآر

اصفہان واپس آنے کے بعد صائب شاہ عباس ثانی کے دربار میں ملک الشعرا مقرر ہوا، لیکن بدقسمتی سے اس بادشاہ کا جانشین سلیمان اس سے خفا ہوگیا۔ بظاہر ایک پُرسکون زندگی بسر کرنے کے بعد اس نے ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء۔ ۱۶۷۰ء میں اصفہان میں انتقال کیا۔ "صائب وفات یافت" سے مادۂ تاریخی نکلتا ہے[1]۔

---

[1] لیکن اس جملے سے ۱۰۸۰ھ نہیں بلکہ ۱۰۸۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ ۱۲ مصنف

صائب اپنے معاصرین شعرائے ہندوستان کے کمال کا اعتراف عالی ظرفی کے ساتھ کرتا تھا

شبلی نے صائب کی جن صفات کا ذکر کیا ہے، ازانجملہ ایک یہ بھی ہے کہ عام شعرائے ایران کی روش کے خلاف وہ ہندوستانی شعرا کے کمال کا معترف تھا۔ شبلی نے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن میں صائب نے حسب ذیل شعرا کو تعریف کے ساتھ یاد کیا ہے: فیضی، ملک، طالب آملی، نوعی، اوحدی، شوقی، فہمی، شاپور، مطیع، اوجی، ادھم، حاذق، راقم وغیرہ ذیل کے اشعار میں اس نے اس رقابت پر افسوس کیا ہے جو حریف سخن طرازوں میں رہا کرتی تھی:

خوش آں گروہ کہ مست بیان یکدگر اند
زجوش فکر مئے ارغوان یکدگر اند

نمی زنند بسنگ شکست گوہر ہم
پئے رواج متاع دکان یکدگر اند

زنند بر سر ہم گل ز مصرع رنگیں
ز فکر تازہ گل بوستانِ یکدگر اند

سخن تراش چو گردند تیغ الماسند
زنند چو طبع بکُندی فسان یکدگر اند

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج و کلیم[1]
دگر کہ ز اہلِ سخن مہربان یکدگر اند

صائب حافظ کا بڑا مداح تھا اور اپنے محسنوں شکنا اور شفائی کی

---

[1] ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا ص ۲۱۳ ۱۲ مصنف

بھی وہ بہت تعریف کرتا ہے۔ آخر الذکر کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

در اصفہاں کہ بہ درد سخن رسد صائب
کنوں کہ نبض شناس سخن شفائی نیست

نظیری کو وہ نہ صرف اپنے ہی سے بلکہ عرفی سے بھی بڑا شاعر سمجھتا ہے:
شبلی نے لکھا ہے[1]:۔

"اس حد تک تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن افسوس یہ ہے کہ قبول عام اور شہرت سے متاثر ہو کر وہ ظہوری اور جلال اسیر کا بھی مداح ہو گیا ہے . . . . . . بد مذاقی کا یہ پہلا قدم تھا جس نے آگے چل کر ایک شاہراہ بنا دی حتیٰ کہ کچھ دن گزرنے کے بعد لوگ ناصر علی بیدل اور شوکت بخاری کے آگے بھی سر نیاز خم کرنے لگے"

اگرچہ صائب نے ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن اس کا خاص میدان غزل تھا۔ وہ بدیہہ گو بھی تھا۔ اس کے ایک شاگرد نے ایک مرتبہ ذیل کا مہمل مصرع پڑھا:۔

از شیشہ بے مئے، مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے برجستہ اس پر مصرع لگا دیا:۔

حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن

اسی طرح سے ایک اور موقع پر اس کے کسی دوست نے ذیل کا بے معنے مصرع پڑھا:۔

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

---

[1] شعر العجم جلد سوم ص۱۹۵ ۔ ۱۲ مصنف

اور صائب سے فرمایش کی کہ اس پر کوئی ایسا مصرع لگاؤ جس سے اس میں معنی پیدا ہو جائیں، چنانچہ اس نے فوراً ذیل کا مصرع اولیٰ پڑھا:-

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را

وہ اپنے پیش رووں کی، خواہ متاخرین ہوں یا متقدمین، تصانیف کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کرتا تھا، چنانچہ اس نے ان کے بہترین کلام کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا ہے جس کا بقول شبلی[1] ایک نسخہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے اور والہ داغستانی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ شبلی نے صائب کا مقابلہ ابو تمام سے کیا ہے، جس نے عربی کلام کا ایک زبردست انتخاب "حماسہ" مرتب کیا تھا اور لکھا ہے کہ ابو تمام کی طرح صائب کی خوش مذاقی بھی تخلیقی قوت کی بہ نسبت انتخاب اشعار میں زیادہ نظر آتی ہے۔

صائب کے منتخب اشعار | ذیل میں صائب کے چند اشعار نقل کرتا ہوں جنھیں میں نے بہت سال ہوئے خرابات سے ایک بیاض پر اُتار لیا تھا[2]۔ مجھے ان میں اس زمانے میں بھی لطف آتا تھا جب میں مبتدی تھا اور اب بھی ان سے حظ حاصل ہوتا ہے اور مجھے امید ہے کہ کم از کم ان میں سے کچھ تو ایسے ضرور ہوں گے جن سے میرے ناظرین بھی محظوظ ہوں گے:-

چو شد زہر عادت مضرت نہ بخشد بہرگ آشنا کن بتدریج جاں را

---

[1] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۲۰۱ - ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا صفحہ ۱۵۱ میری یہ نقل ۴ ستمبر ۱۸۸۵ء کو ختم ہوئی تھی ۱۲ مصنف

ریشۂ نخل کہن سال از جواں افزوں ترست بیشتر دل بستگی باشد بدنیا پیر را

ہر سرے دارد دریں بازار سودائے دگر ہرکسے بندد بہ آئین دگر دستار را

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ باز آرد سکندر را

تسبیح بر کف، توبہ بر لب، دل پُر از شوقِ گناہ
معصیت را خندہ می آید بر استغفارِ ما

مقامِ گوہرِ شہوار درگنجینہ مے باید
بیاض از سینہ باید ساخت شعرِ انتخابے را

گفتگوئے کفر و دیں آخر بیک جا مے کشد
خواب یک خواب است امّا مختلف تعبیرہا

از تیرِ آہ مظلوم، ظالم اماں نیابد
پیش از نشانہ خیزد از دل فغاں کماں را

چارۂ ناخوشی وضع جہاں بے خبری است
اوست بیدار کہ در خواب گراں است ایں جا

شگوفہ با ثمر ہرگز نگردد جمع در یک جا
محال است ایں کہ باہم نعمت و دنداں شود پیدا

دہ در شود کشادہ اگر بستہ شد درے   انگشت ترجمانِ زبان است لال را

(حال) سادہ لوحساں زود می گیرند رنگِ ہم نشیں
صحبتِ طوطی سخنور مے کند آئینہ را

گردشِ اقبال دارد لغزشِ ادبارہا
یک دو خطوہ باز رفتن پر دہد وثّاب را
موج از حقیقتِ گہر بحر غافل است   حادث چگونہ درک نماید قدیم را

معیارِ دوستانِ دغل روز حاجت است
قرضے برسم تجربہ از دوستاں طلب

درمیانِ اہلِ دنیا مردمِ دانا غریب
ہمچو انگشتِ شہادت در کفِ ترسا غریب

چہ سود ازیں کہ کتب خانۂ جہاں از تست
نہ علم ہر چہ عمل می کنی ہماں از تست

ہستیٔ دنیائے فانی انتظارِ مردن است
ترکِ ہستی ز انتظارِ نیستی وارستن است

ترا ز جاں غمِ مال اے عزیز بیشتر است
علاقۂ تو بدستار بیشتر ز سر است

با کمالِ قرب از جاناں دلِ ما غافل است
زندہ از دریاست ماہی و ز دریا غافل است

گریہ شمع از برائے ماتمِ پروانہ نیست
صبح نزدیک است در فکرِ شبِ تارِ خود است

رفتن از عالمِ پُر شور بہ از آمدن است
غنچۂ دل تنگ بباغ آمد و خنداں برخاست

اگر میانِ دو دل ہست دوستی بہ قرار　　نمی شوند بآمد شدِ خبر محتاج

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد　　خواب در وقتِ سحرگاہ گراں می گردد

خموشی حجّتِ ناطق بود جویائے گوہر را
کہ از غوّاص در دریا نفس بیروں نمی آید

یا سبو یا خُمِ مَی یا قدح بادہ کنند
یک کفِ خاک دریں میکدہ ضائع نہ شود

حریص را نکند نعمتِ دو عالم سیر　　ہمیشہ آتش سوزندہ اشتہا دارد

پیرانہ سرہائے سعادت بمن رسید　　وقتِ زوالِ سایۂ دولت بمن رسید
شد مہرباں سپہر بمن آخرِ حیات　ق　در وقتِ صبح خواب فراغت بمن رسید

از پشیمانی سخن در عہدِ پیری می زنم　　لب بدنداں می زنم اکنوں کہ دندانم نماند

می شود غارتگرِ جاں چو کمال افتد زیاد
شاخ نازک بشکند چوں بیشتر بار آورد

اگر مجنوں منم پس کیست در روئے زمیں عاقل
اگر عاقل توئی دیوانہ در عالم نمی باشد

مرا بروزِ قیامت غمے کہ ہست این است
کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید

لامکانی شو کہ تبدیلِ مکانِ آب و گِل
نقل کردن باشد از زنداں بزندانِ دگر

نہ گویمت کہ دل از حاصلِ جہاں بردار
بہر چہ دست رست نیست دل ازاں بردار

انجام بُت پرست بود بہ زخود پرست درقید خود مباش وبقیدِ فرنگ باش

گر نشیتِ پا بعالمِ صورت نمی زنی تا حشر در شکنجۂ ایں کفش تنگ باش

درونِ خانۂ خود ہر گدا شہنشا ہیست
قدم بروں منہ از حدِّ خویش وسلطاں باش

گر سجودِ گل کنم برسنّتِ بلبل خطاست من کہ در آتش پرستی امتِ پروانہ ام

چوں شمع ہرکہ افراشت گردن بہ افروز در اشکِ خود نشیند بسیار تا بگردن

بیش ازیں بر رفتگاں افسوس می خوردند خلق
می خورند افسوس در ایام ما بر ماندگاں

یا زسیلابِ حوادث سر نباید تافتن یا نباید خانہ در صحرائے امکاں ساختن

ہر لوحِ مزارے زفرامُش کدۂ خاک دستیست بروں آمدہ بہرِ طلبِ تو

شد از فشارِ گردون موے سفید و سر زد
شیرے کہ خوردہ بودم در روزگارِ طفلی

در وطن گرمی شدے ہرکس بآسانی عزیز
کے ز آغوشِ پدر یوسف بزنداں آمدے

سنہ ۱۷۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء
مطابق سنہ ۱۱۱۱ھ - سنہ ۱۲۱۵ھ

اٹھارھویں صدی عیسوی کا ادبی افلاس

ادبی حیثیت سے یہ صدی تاریخ ایران میں سب سے زیادہ تہی دامن نظر آتی ہے[1] حتیٰ کہ کم از کم میرے علم میں اس سو سال کی مدت کی ساری کائنات صرف ایک نظم یعنی ہاتف اصفہانی کا ترجیع بند ہی قابلِ ذکر ہے اور میں آگے چل کر اس سے بحث کروں گا۔ البتہ اس زمانے کے واقعات کے متعلق دو مستند تصنیفیں موجود ہیں جن کے مصنفین خود ان مصیبت ناک واقعات میں شریک تھے جو افغانوں کے حملۂ ایران کے دوران اور اس کے بعد پیش آئے۔ ان حضرات نے اس پُر آشوب زمانے کی واضح اور سچّی تصویریں اپنے قلم سے کھینچی ہیں

اس زمانے کے متعلق دو اہم وقائع

ان میں سے ایک تو شیخ علی حزیں (ولادت سنہ ۱۱۰۳ھ ۱۶۹۲ء، وفات سنہ ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶-۶۷ء)، اور دوسرے

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا صفحہ ۱۵۹ ۱۲ مصنف

لطف علی بیگ المتخلص بہ آذر (ولادت ۱۱۳۴ھ مطابق ۱۷۲۱ء؛ وفات ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء) ہیں۔ یہ دونوں شاعر بھی تھے، خصوصاً شیخ علی حزیں تو نہایت پُرگو تھے اور تین چار دیوان چھوڑے ہیں، لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے ان کی نثر کی تحریریں ان کے کلام سے کہیں زیادہ دلچسپ اور اہم ہیں۔

شیخ علی حزیں شیخ علی حزیں کا پورا نام محمد ابن ابی طالب گیلانی تھا۔ وہ زیادہ تر تذکرات الاحوال کے مصنف کی حیثیت سے معروف ہیں۔ یہ تذکرات انھوں نے اپنے زمانۂ قیام ہندوستان میں ۱۱۵۴ھ مطابق ۱۷۴۱ء۔۱۷۴۲ء میں، یعنی وطن چھوڑنے کے بیس سال بعد لکھے تھے۔ مسٹر ایف۔ سی بالفور (F. C. Balfour) نے اصل نسخہ مع انگریزی ترجمہ کے ۱۸۳۰ء۔۱۸۳۱ء میں شایع کیا تھا جو ناظرین کو آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ شیخ علی حزیں خود اپنے بیان کے مطابق دوشنبہ مورّخہ ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ (۱۷ جنوری ۱۶۹۲ء) کو اصفہان میں پیدا ہوئے۔ وہ شیخ زاہد گیلانی کی اٹھارویں پشت میں تھے جن کا ذکر کسی پچھلے باب[1] میں ہو چکا ہے۔ یہ خاندان بہت عرصہ تک گیلان ہی میں، یعنی پہلے استارا اور پھر لاہجان میں مقیم رہا۔ بالآخر مصنف کے والد شیخ ابوطالب تحصیل علم کی غرض سے ۲۰ برس کی عمر میں اصفہان چلے آئے اور شادی کرکے وہیں رہ پڑے اور ۱۱۲۷ھ مطابق ۱۷۱۵ء میں ۶۹ برس کی عمر میں انتقال کیا، انھوں نے تین بیٹے چھوڑے جن میں مصنف تذکرات

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۳۹ ۔ ۱۲ مصنف

سب سے بڑے تھے[1]۔ شیخ علی حزیں نے اپنے والد کے فضائل اور خصائل کا بیان بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کیا ہے اور ان کے ماتم میں جو مرثیہ انھوں نے کہا تھا، اس کے بعض اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اور وصیتوں کے علاوہ میرے والد نے مرتے وقت مجھ سے یہ پُر معنی الفاظ بھی کہے تھے[2]:

"جہاں تک تمھارے امکان میں ہو اصفہان میں زیادہ قیام نہ کرنا، اس لیے کہ ہمارے خاندان میں سے آخر کسی نہ کسی کا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

اسی سلسلہ میں شیخ علی حزیں لکھتے ہیں:۔

"مرحوم نے جس وقت یہ لفظ کہے تو ان کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا تھا، لیکن چند سال گزرنے کے بعد اس وقت ان کے معنے میری سمجھ میں آئے جب اصفہان میں شورش ہوئی اور شہر لوٹ لیا گیا[3]۔"

تذکرات شیخ علی حزیں چونکہ ہر انگریزی داں جسے ان تذکرات سے دلچسپی ہے، انھیں انگریزی میں پڑھ سکتا ہے، اس لیے اس موقع پران کی تلخیص غیر ضروری ہے۔ صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ یہ مصنف کے زمانے کے چشم دید واقعات ہیں اور اس حیثیت سے بہت اہم ہیں، نیز

[1] ایک چوتھا لڑکا بھی تھا، لیکن وہ حالتِ شیر خوارگی ہی میں مرگیا۔ شیخ علی حزیں کی والدہ اپنے شوہر کے انتقال کے ۲ برس بعد تک زندہ رہیں۔

[2] بالفور۔ اصل کا صفحہ ۱۶۔ ترجمہ کا صفحہ ۱۴ ۱۲ مصنف

[3] بالفور۔ اصل تذکرات صفحہ ۱۰۱ ترجمہ صفحہ ۱۱۷ ۱۲ مصنف

ادبی حیثیت سے جو چند باتیں ان میں دلچسپ ہوں، ان کا بیان بھی کردینا چاہیے۔ شیخ علی حزیں نے ۱۱۳۵ھ مطابق ۲۳-۱۷۲۲ء میں "مدت العمر"[۱] کے نام سے غالباً شیخ بہاء الدین عاملی کے کشکول کے طرز کا ایک مجموعہ مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن چند ماہ بعد جب افغانوں نے اصفہان کو غارت کیا تو ان کی دوسری کتابوں کے ساتھ یہ بھی تلف ہوگیا۔ اسی زمانے میں، یا اس سے کچھ پہلے انھوں نے متعدد فلسفیانہ شرحوں کے علاوہ ایک کتاب فرس نامہ بھی لکھی اور اپنا دوسرا دیوان اور اس کے کچھ ہی دن بعد تیسرا دیوان شایع کیا[۲]۔

افغانوں کے حملے اور اس کی وجہ سے جو تباہی ایران خصوصاً اصفہان پر آئی اس نے چند روز کے لیے شیخ علی حزیں کے علمی مشاغل کا خاتمہ کردیا۔ وہ لکھتے ہیں[۳]:

"محاصرے کے آخری دنوں میں سخت علیل ہوگیا اور میرے دو بھائی میری دادی اور میرے گھر کے سب لوگ یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے گئے، حتیٰ کہ میرے محل

---

[۱] بالفور ترجمہ ص۹۳-۹۴۔ آیندہ صفحات کے حوالے ترجمہ ہی سے متعلق ہوں گے۔ اس مجموعہ "مدت العمر" کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو ریو فہرست کتب فارسی ص۴۸۲ جہاں حزیں کی دو اور تصانیف کا بھی ذکر ہے جن میں سے ایک "شراب اور پیالوں" اور دوسری شکار پر ہے ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو بالفور کے ترجمے کا ص۱۰۶ و ص۱۱۱ اور چوتھے دیوان کا ذکر جو کچھ دن بعد شایع ہوا ص۱۷۶ پر ہے۔ ۱۲ مصنف

[۳] بالفور ترجمہ ص۱۲۵ ۱۲ مصنف

میں سوائے دو یا تین ضعیفہ ماماؤں کے جو میری علالت
کے زمانے میں تیمار داری کرتی رہیں اور کوئی باقی نہیں رہا"
شفایاب ہونے کے بعد وہ فوراً اوائل محرم ۱۱۳۵ھ (اکتوبر ۱۷۲۲ء)
میں یعنی افغانوں کے شہر پر قبضہ اور داخلہ سے چند ہی روز پہلے اصفہان
سے بھاگ کھڑے ہوئے اور دس سال تک مختلف اقطاع ایران
میں خانہ بدوشوں کی طرح پھرتے رہے اور یکے بعد دیگرے ان
شہروں سے ہوکر گزرے یا چند روز وہاں مقیم رہے۔ خرم آباد، خراسان
ہمدان، نہاوند، دزفل، شوستر۔ یہاں سے وہ براہِ بصرہ حج کرنے
گئے اور واپسی میں یمن گئے؛ کرمان شاہ؛ بغداد اور اس کے زیارات
مشہد، کردستان، آذر بائجان، گیلان اور طہران۔ طہران سے وہ
دوبارہ اصفہان گئے۔ وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ[1]:-

"بادشاہ کی موجودگی کے باوجود یہ بڑا شہر بالکل ویران
ہے، اس کی اگلی آبادی اور میرے احباب میں اب شاید
مشکل سے ایک یا دو شخص وہاں باقی تھے"۔

چھ ماہ بعد وہ شیراز پہنچے تو وہاں بھی ابتری دیکھی۔ لکھتے ہیں[2]:-

"یہاں جتنے میرے خاص احباب تھے اور جن سے زیادہ
عزیز میرا کوئی اور دوست دنیا میں نہ تھا، اب ان میں
سے ایک بھی زندہ نہ تھا۔ مجھے ان کے عیال اور اعزا کا

---

[1] بالفور کا ترجمہ صفحہ ۲۰۲ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب نادر شاہ ایران سے
افغانوں کو نکال چکا تھا۔ ۱۲ مصنف

[2] بالفور کا ترجمہ صفحہ ۲۰۸ ۱۲ مصنف

ایک گروہ کثیر نظر آیا جو بالکل بے وسیلہ پڑا ہوا انتہائی
مصیبت کی زندگی گزار رہا تھا۔"

شیراز سے وہ براہ لار بندر عباس گئے، وہاں سے ارادہ یہ تھا کہ کسی
یورپی جہاز پر سوار ہو کر حجاز چلے جائیں کیونکہ بقول ان کے:[1]

"ان لوگوں کے جہاز اور کشتیاں بہت گنجایش دار ہوتے
ہیں کمرے بہت آرام دہ ہوتے ہیں اور ان کے ناخدا
دوسری قوموں کی بہ نسبت بحری سفر میں زیادہ با مہارت
اور اپنے فن میں ہوشیار ہوتے ہیں۔"

لیکن ایک تو اپنی علالت کی وجہ سے اور دوسرے اپنی تہیدستی
کے سبب سے کیونکہ گیلان میں باپ کا جو کچھ ترکہ تھا وہ لٹ گیا تھا
اور اس زمانے میں جبریہ محصولوں کی بہت زیادتی تھی۔ ان کا ارادہ
پورا نہ ہونے پایا۔ بعد کو کوشش کرکے وہ ایک وندیزی جہاز
میں مسقط تک پہنچ گئے۔ یہ مقام انھیں پسند نہ آیا اور یہاں دو
ماہ اور کچھ دن مقیم رہ کر وہ پھر بندر عباس واپس آگئے۔ اس کے
بعد کرمان گئے لیکن یہ دیکھ کر کہ:۔

"بعض بلوچ قبائل کی بغاوت اور دوسرے سانحوں کی
وجہ سے اس جگہ بالکل ابتری پھیلی ہوئی ہے"[2]

وہ چند ماہ رہ کر اس امید میں کہ شاید بغداد اور مقامات مقدسہ کی
زیارت کا ایک اور موقع مل جائے، پھر بندر عباس آگئے، لیکن

---

[1] بالفور کا ترجمہ ص ۲۱۵ ۱۲ مصنف

[2] بالفور کا ترجمہ ص ۲۴۵ ۔ ۱۲ مصنف

چونکہ اس زمانے میں ترکوں کے خلاف نادر کی جنگی کارروائیاں جاری تھیں، اس لیے ان کی اس امید کے پورے ہونے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ علاوہ ازیں سارے ایران میں جو ابتری اور تباہی پھیلی ہوئی تھی اس کا منظر اب ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا، اس لیے آخرکار ۱۰۔ رمضان ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۴۔ فروری ۱۷۳۴ء کو جہاز میں سوار ہوکر وہ ہندوستان چلے آئے، جہاں باوجود اس نفرت کے جو انھیں اس ملک سے ہوگئی تھی، انھیں اپنی طویل عمر کے بقیہ ۴۵ سال بسر کرنا تھے۔ وہ لکھتے ہیں[1]:

"میں اس مدت کو جو اس ملک میں بسر ہوئی اپنی زندگی میں داخل ہی نہیں سمجھتا۔ جس دن میں نے اس مملکت کے ساحل پر قدم رکھا ہے، وہ گویا میری زندگی اور روحانی قویٰ کے خاتمہ کا دن تھا۔"

پھر آگے چل کر کہتے ہیں:-

"میری طبیعت کو اس ملک کے طور طریقوں کے ساتھ کوئی مناسبت ہی نہ تھی اور نہ مجھ میں یہاں کے حالات پر شاکر رہنے کی قدرت تھی۔"

اس کے آگے چند سطر بعد لکھتے ہیں:-

"ان بلاد کا نظارہ روز بروز میرے لیے نفرت انگیز ہوتا جاتا تھا اور چونکہ میں ہر وقت یہاں سے بھاگ جانے کی آرزو میں رہتا تھا، اس لیے میں نے اپنی طبیعت کو ایران کے

---

[1] بالفور کا ترجمہ ص ۲۵۳ ۱۲ مصنف

حالات اور واقعات کی طرف متوجہ کیا اور وہاں واپس
جانے کی دُھن میں رہنے لگا۔"

لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی اور انھیں خوش و ناخوش اپنی بقیہ طویل مدّت عمر اسی ملک میں بسر کرنی پڑی جو بقول ان کے

"بے ایمانی کے تار و پود سے بنا ہی اور کمینہ پن اور شقاوت
جس کی سرشت میں داخل کیا گیا ہی"[۱]

"جہان سے تمام حالات اور واقعات کے متعلق شاید مشیّت
الٰہی یہی ہو ان میں مشکلات اور تلخ کامیاں پیدا ہوتی رہیں"[۲]

ہندوستان میں اپنے حالاتِ زندگی کے متعلق انھوں نے ایک لفظ بھی اپنے تذکرات میں نہیں لکھا ہی، بلکہ صرف یہاں کے خاص اور اہم تاریخی واقعات مثلاً نادر شاہ کا حملہ اور ۲۰۔ مارچ ۱۷۳۹ء کو دلّی کا قتلِ عام وغیرہ کے بیان پر اکتفا کی ہی۔ اگرچہ یہ تذکرات "در اواخر ۱۱۵۴ھ" مکمل ہوئے یعنی ۱۷۴۲ء کے شروع میں، لیکن یہ صرف ان ذاتی واقعات پر مشتمل ہیں جو مصنف کو ایران چھوڑنے سے پہلے، یعنی ختم تصنیف سے بیس سال قبل پیش آئے تھے۔ انھوں نے اپنے شناسا معاصر علما اور ادیبوں کے حالات بھی لکھے ہیں جن میں سے اکثر محاصرۂ اصفہان میں کام آئے تھے۔ یہی حصّہ دراصل اس کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ ہی۔

---

[۱] بالفور کا ترجمہ ص۲۵۶ ۱۲ مصنف

[۲] بالفور کا ترجمہ ص۲۶۱ ۱۲ مصنف

شیخ علی حزیں کا تذکرات المعاصرین تذکرات الاحوال کے خاتمہ کے ۱۱ سال بعد یعنی ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں شیخ علی حزیں نے تذکرات المعاصرین کے عنوان سے اپنے زمانے کے تقریباً ۱۰۰ شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی کلیات کا جو اڈیشن لکھنؤ سے ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں لیتھو میں شایع ہوا ہی اس میں تذکرات المعاصرین بھی شریک ہی اور اس کے نسخے برٹش میوزیم اور دیگر مقامات میں موجود ہیں[۱]

لطف علی بیگ آذر (ولادت ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۱ء؛ وفات ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء) اسی زمانے کے شعرا کا ایک اور تذکرہ جو ایک معاصر کا لکھا ہوا ہی اور آسانی سے دستیاب ہوسکتا ہی، وہ ہی جو لطف علی بیگ آذر کے آتش کدہ کے خاتمے پر دیا ہوا ہی۔ اس کتاب کے بیشتر حصّہ میں بقید ردیف و مقام و ملک ولادت (مع ہندوستان و توران) ان شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہی جو مصنف سے

---

[۱] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست کتب فارسی اور اسپرنگر کی فہرست کتب خانۂ شاہانِ اودھ۔ آخرالذکر فہرست میں کتاب کے مضامین کا مفصل بیان کیا گیا ہی۔ اپنے دوست پروفیسر محمد شفیع (پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) کی عنایت سے مجھے حال ہی میں (ستمبر ۱۹۲۳ء) کلیات شیخ علی حزیں کا ایک نسخہ ملا ہی جو ۱۸۹۳ء میں کانپور میں لیتھو ہوا تھا۔ اس میں ص ۱۰۳۲ صفحات ہیں جن میں سے ص ۹۳۱ – ص ۱۰۲۵ پر یہ تذکرہ ہی۔ میرے شمار میں، اس میں ۹۶ شعرا کے حالات ہیں اور ان میں سے صرف چار کے ناموں سے میں گوش آشنا ہوں یعنی طاہر قزوینی، شوکت بخاری، شفیعا اثر شیرازی اور لطف علی بیگ شاملو۔ ۱۲ مصنف

پہلے گزرے ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے ۶۰ معاصرین کا حال لکھا ہی۔ جس کی ابتدا ایران کے اس پچاس سالہ دور آشوب سے ہوتی ہی جو افغانی حملے کے بعد سے شروع ہوکر اس وقت تک رہا جب کہ جنوب میں کریم خان زند نے امن وامان قایم کیا۔ مصنف اس امر کو تسلیم کرتا ہی کہ اس زمانہ میں شاعروں اور ادیبوں کی تعداد میں بہت کمی رہی ہی اور بقول اُس کے اس کی وجہ یہ ہی:۔

"تفریق بال واختلال بحدیست کہ کسے را حال خواندن شعر نیست، تا بہ گفتن شعر چہ رسد"۔

ان شعرا میں سے اکثر کے حال میں مصنف نے صرف چند سطریں ہی لکھی ہیں۔ جن کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہی، وہ یہ ہیں: ملا محمد مومن المتخلص بہ داعی جنھوں نے ۱۱۵۵ھ مطابق ۴۳-۱۷۴۲ء میں ۹۵ سال کی عمر میں انتقال کیا؛ ملا حسین رفیق اصفہانی؛ سید محمد شعلہ اصفہانی سید محمد صادق تفرشی؛ مرزا جعفر صافی اصفہانی صباحی: جو ایک نوجوان شخص اور مصنف کا دوست تھا اور جس کے اشعار اس نے ۱۳ صفحوں میں نقل کیے ہیں؛ مرزا محمد علی صبوح اصفہانی؛ آقا تقی صہبا قمی؛ سید عبدالباقی طبیب جو خود نادر شاہ کے طبیب خاص تھے اور جن کے والد مرزا محمد رحیم شاہ حسین کے درباری طبیب تھے؛ طوفان ساکن ہزار جریب، جس کی تاریخ وفات بھی مصنف نے کہی ہی جس سے ۱۱۹۰ھ (۷۷-۱۷۷۶ء) برآمد ہوتا ہی؛ آقا محمد عاشق اصفہانی وفات ۱۱۸۱ھ مطابق ۶۸-۱۷۶۷ء جن کے حالات میں ۸ صفحے لکھے گئے ہیں اور خود مصنف کا چھوٹا بھائی اسحاق بیگ المتخلص بہ عذری

جس کا سن انتقال حسب ذیل تاریخ سے ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء-۱۷۷۲ء) نکلتا ہے:

بادا در بہشت جاوداں اسحاق بیگ

۱۱۸۵ھ

ان کے علاوہ حسب ذیل دوسرے شعرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے:- محمد علی بیگ ولد ابدال بیگ مصور جو پہلے فرنگی تھا اور بعد کو مشرف باسلام ہوا؛ سید محمد حسین غالب جس نے اوائل عمر کے ۱۴ سال ہندوستان میں بسر کیے اور نواب سرفراز خان کی لڑکی سے شادی کی؛ میر سید علی مشتاق اصفہانی؛ سید محمد صادق برادر زادہ مرزا محمد رحیم جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے اور جو سلطان شاہ حسین کے طبیب خاص تھے۔ سید محمد صادق نے صرف پامال عنوانات مثلاً لیلےٰ و مجنون خسرو و شیریں، وامق و عذرا پر مثنویاں ہی نہیں لکھیں بلکہ خاندان زند کی تاریخ لکھنے میں بھی مصروف تھے؛ میرزا بصیر ولد مرزا عبداللہ طبیب (وفات ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء) اور سید احمد ہاتف جو ان سب شعرا میں ممتاز ترین تھا اور جس کا ذکر ہم ابھی کریں گے۔

لطف علی بیگ نے اپنے آتش کدہ کے خاتمہ پر خود اپنا حال بھی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۲۰- ربیع الاول ۱۱۲۳ھ (۷- جون ۱۷۱۱ء) کو اصفہان میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی عمر کے ابتدائی چودہ سال قم میں بسر ہوئے جہاں افغانی شورشوں کی وجہ سے ان کے

خاندان نے سکونت اختیار کر لی تھی۔ عہد نادر شاہی کے شروع میں ان کے والد کو لار اور سواحل فارس کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور وہ شیراز میں رہا کرتے تھے۔ باپ کے انتقال کے ۲ سال بعد لطف علی بیگ اپنے چچا حاجی محمد بیگ کے ساتھ حج سے مشرف ہوئے اور دیگر اماکن مقدسہ کی زیارات سے فارغ ہو کر ایران واپس آئے۔ جب نادر شاہ کی ظفریاب فوجیں ہندوستان سے واپس ہوئیں تو وہ مشہد میں تھے اور لشکر کے ساتھ مازندران تک گئے۔ پھر وہاں سے اصفہان واپس چلے آئے اور نادر شاہ کے قتل کے بعد کچھ دنوں تک علی شاہ، ابراہیم شاہ شاہ اسمٰعیل اور شاہ سلیمان کی ملازمت میں رہے، اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت سے کنارہ کشی کر کے وہ عزلت نشین ہو گئے اور میر سید علی مشتاق کے زیر تربیت و تعلیم رہ کر مشق سخن کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے تذکرے آتش کدہ کے خاتمہ پر اپنا کلام نقل کیا ہے جو زیادہ تر ان کی مثنوی، یوسف زلیخا سے مقتبس ہے[1]۔

ہاتف اصفہانی اگرچہ سید احمد ہاتف اصفہانی، لطف علی بیگ کا ہم عصر اور دوست تھا، لیکن اس کے حالات زندگی آتش کدہ میں نہیں ملتے ہیں، بلکہ صرف تعریفوں پر اور وہ بھی مبالغہ کے ساتھ اکتفا کی گئی ہے، یعنی عربی کلام میں اسے اعشیٰ اور جریر سے تیسرے نمبر پہ

---

[1] میرے زیر نظر آتش کدہ کا جو نسخہ رہا ہے وہ بمبئی سے ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں لیتھو میں طبع ہوا ہے اس میں تین نقص ہیں ایک تو صفحات کا شمار ۱۸۹ پر ختم ہو جاتا ہے، دوسرے سنین تاریخی اکثر نہیں دیے گئے ہیں اور تیسرے صحت بھی جیسی ہونی چاہیے ویسی نہیں ہے۔ ۱۲ مصنف

اور فارسی شاعری میں انوری اور ظہیر سے دوسرے نمبر پہ رکھا گیا ہی۔ اس کے کلام کی نقل دس صفحوں میں دی ہوئی ہی، لیکن ہمیں صرف اس کے اُس دل کش اور مشہور ترجیع بند سے سروکار ہی جس نے اس کو زندۂ جاوید بنا دیا ہی۔

ترجیع بند ہاتف اصفہانی

بند اوّل

ای فدائے تو ہم دل وہم جاں — وی نثارِ رہت ہم این وہم آں
دل فدائے تو چوں توئی دلبر — جاں نثارِ تو چوں توئی جاناں
دل رہاندن ز دستِ تو مشکل — جاں فشاندن بپائے تو آساں
راہ وصلِ تو راہ پُر آسیب — دردِ عشقِ تو درد بے درماں
بندگانیم جان و دل برکف — چشم بر حکم و گوش بر فرماں
گر سرِ صلح داری اینک دل — ور سرِ جنگ داری اینک جاں
دوش از شورِ عشق و جذبۂ شوق — ہر طرف می شتافتم حیراں
آخرِ کار شوقِ دیدارم — سوئے دیرِ مغاں کشید عناں
چشم بد دور خلوتے دیدم — روشن از نورِ حق نہ از نیراں
ہر طرف دیدم آتشے کاں شب — دید در طورِ موسی عمراں
پیرے آں جا بآتش افروزی — بہ ادب گردِ پیرِ مغ بچگاں
ہمہ سیمیں عذار و گل رخسار — ہمہ شیریں زبان و تنگ دہاں
عود و چنگ و نی ودف و بربط — شمع و نقل و گل و مئے و ریحاں
ساقی ماہ رو و مشکیں موے — مطرب بذلہ گوئے خوش الحاں

مغ و مغ زادہ موبد و دستور — خدمتش را تمام بستہ میاں
من شرمندہ از مسلمانی — شدم آنجا بگوشۂ پنہاں
پیر پُرسید کیست ایں، گفتند — عاشقے بے قرار و سرگرداں
گفت جامے دہیدش از مئے ناب — گرچہ ناخواندہ باشد ایں مہماں
ساقیِ آتش دست و آتش پرست — ریخت در ساغر آتشِ سوزاں
چوں کشیدم نہ عقل ماند نہ ہوش — سوخت ہم کفر ازاں و ہم ایماں
مست افتادم و دراں مستی — بزبانے کہ شرحِ آں نتواں
ایں سخن می شنیدم از اعضا — ہمہ حتّیٰ الورید والشّریاں

کہ یکے ہست و نیست ہیچ جز او
وحدہٗ لا الٰہ الّا ہو

بندِ دوم

از تو ای دوست نگسلم پیوند — ور بتیغم برند بند از بند
الحق ارزاں بود ز ما صدجاں — وز دہانِ تو نیم شکّر خند
ای پدر پند کم دہ از عشقم — کہ نخواہد شد اہل ایں فرزند
پند آناں دہند خلق ای کاش — کہ ز عشقِ تو می دہندم پند
من رہِ کوئے عافیت دانم — چہ کنم کاوفتادہ ام بکمند
در کلیسا بدلبرے ترسا — گفتمش ای دل بدامِ تو دربند
ای کہ دارد بتارِ زُنّارت — ہر سرِ موئے من جُدا پیوند
رہ بوحدت نیافتن تا کے — ننگِ تثلیث بر یکے تا چند
نامِ حقِّ یگانہ چوں شاید — کہ اب و ابن و روحِ قدس نہند

لب شیریں کشودو بامن گفت	وز شکرخند ریخت ازلب قند
کہ گر از سِرِّ وحدت آگاہی	تہمتِ کافری بما مپسند
در سہ آئینہ شاہدِ ازلی	پرتو از روئے تابناک افگند
سہ نگردد بریشم از اورا	پرنیاں خوانی و حریر و پرند
ما دریں گفتگو کہ از یکسو	شد ز ناقوس ایں ترانہ بلند

کہ یکے ہست و نیست ہیچ جز او
وحدہٗ لا الٰہ الّا ہُو

بند سوم

دوش رفتم بکوئے بادہ فروش	ز آتش عشق دل بجوش و خروش
مجلسے نغز دیدم و روشن	میر آں بزم پیر بادہ فروش
چاکراں ایستادہ صف در صف	بادہ خواراں نشستہ دوش بدوش
پیر در صدر و میکشاں گردش	پارۂ مست و پارۂ مدہوش
سینہ بے کینہ و دروں صافی	دل پُر از گفتگو و لب خاموش
ہمہ را از عنایتِ ازلی	چشمِ حق بین و گوشِ رازنیوش
سخن ایں بہ آن ہنیئاً لک	پاسخ آں بہ ایں کہ بادت نوش
گوش بر چنگ و چشم بر ساغر	آرزوئے دو کون در آغوش
بہ ادب پیش رفتم و گفتم	ای ترا دل قرار گاہِ سروش
عاشقم دردمند و حاجتمند	درد من بنگر و بدرماں کوش
پیر خنداں بہ طنز بامن گفت	ای ترا پیرِ عقل حلقہ بگوش
تو کجا ما کجا ای از شرمت	دخترِ رز نشستہ برقع پوش

گفتمش سوخت جانم آبے دہ | و آتشِ من فرو نشاں از جوش
دوش می سوختم ازیں آتش | آہ اگر امشبم بود چوں دوش
گفت خنداں کہ ہیں پیالہ بگیر | ستدم، گفت ہاں زیادہ منوش
جرعۂ در کشیدم و گشتم | فارغ از رنجِ عقل و محنتِ ہوش
چوں بہوش آمدم یکے دیدم | ما بقی را ہمہ خطوط و نقوش
ناگہاں در صوامعِ ملکوت | ایں حدیثم سروش گفت بگوش

کہ یکے ہست و نیست ہیچ جز او
وحدہٗ لا الٰہ الا ہو

بندِ چہارم

چشمِ دل باز کن کہ جاں بینی | آں چہ نادیدنی است آں بینی
گر بہ اقلیمِ عشق رو آری | ہمہ آفاق گلستاں بینی
بر ہمہ اہلِ ایں زمیں بمراد | گردشِ دورِ آسماں بینی
آں چہ بینی دلت ہماں خواہد | و آں چہ خواہد دلت ہماں بینی
بے سر و پا گدائے آں جا را | سر ز ملکِ جہاں گراں بینی
ہم در آں پا برہنہ قومے را | پائے بر فرقِ فرقداں بینی
ہم دراں سر برہنہ جمعے را | بر سر از عرش سائباں بینی
گاہ وجد و سماع ہر یکے را | بر دو کون آستیں فشاں بینی
دلِ ہر ذرّہ کہ بشگافی | آفتابیش درمیاں بینی
ہر چہ داری اگر بعشق دہی | کافرم گر جوے زیاں بینی
جاں گدازی اگر بہ آتشِ عشق | عشق را کیمیائے جاں بینی

از مضیق جہات درگذری — وسعتِ ملک لامکاں بینی
آں چہ نشنیدہ گوش آں شنوی — وانچہ نادیدہ چشم آں بینی
تا بجائے رساندت کہ یکے — از جہان و جہانیاں بینی
با یکے عشق ورزی از دل و جاں — تا بعین الیقیں عیاں بینی

کہ یکے ہست و نیست ہیچ جزاو
وَحدَہٗ لا الٰہ الاّ ہُو

بند پنجم

یار بے پردہ از در و دیوار — در تجلی است یا اولو الابصار
شمع جوئی و آفتاب بلند — روز بس روشن و تو در شبِ تار
گر ز ظلمات خود رہے بینی — ہمہ عالم مشارقِ انوار
کور وش قاید و عصا طلبی — بہر ایں راہ روشن و ہموار
چشم بکشا بگلستاں و ببیں — جلوۂ آب صاف در گل و خار
ز آب بے رنگ صد ہزاراں رنگ — لالہ و گل نگر دریں گلزار
پا براہِ طلب نہ و از عشق — بہرِ ایں راہ توشۂ بردار
شود آساں زعشق کارے چند — کہ بود پیش عقل بس دشوار
یار گو بالغدوّ والآصال — یار جو بالعشی والابکار
صد رہت لن ترانی ار گوید — باز میدار دیدہ بر دیدار
تا بجائے رسی کہ می نرسد — پائے اوہام و دیدۂ افکار
بار یابی بہ محفلے کآں جا — جبرئیلِ امیں ندارد بار
ایں رہ، ایں توشہ تو ایں منزل — مردِ راہی اگر بیا و بیار

ورنہ مرد راہ چوں دگراں — یار میگوئی و پشت سر می خار

ہاتف ارباب معرفت کہ گہے — مست خوانندشان و گہ ہشیار

از مئے و جام و مطرب و ساقی — از مغ و دیر و شاہد و زنار

قصد ایشاں نہفتہ اسراریست — کہ بایما کنند گاہ اظہار

پی بری گر براز شاں دانی — کہ ہمین است سر آں اسرار

کہ یکے ہست و نیست ہیچ جزاو

وحدہٗ لا الہ الا ہو

باب ہفتم

عہدِ قاچاریہ کے شعرا

قاچاریہ عہد کے دور میں شعر و شاعری کا احیا

اگرچہ قاچاریہ کا عہدِ حکومت سخت ضرور تھا، لیکن مستحکم اور زبردست بھی تھا اور اس کی سختیاں بھی ایک ایسے ملک کو جو ستّر سال تک بغاوت اور خانہ جنگی میں رہ چکا تھا، بہت غنیمت معلوم ہوتی تھیں۔ محنت آقا محمد خان[1] کے مختصر اور خونیں عہد میں ایرانی جھنڈا پھر گرجستان پر لہرایا اور طفلس بھی ایرانیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد اس کے بھتیجے فتح علی شاہ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۴ء) کا عہد شروع ہوا۔ جو نسبتہً نرم تھا۔ رضا قلی خان نے مجمع الفصحا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ایران میں شاعری کا احیا اور اعلیٰ ادبی مذاق کا عود اس بادشاہ ہی کے اثر سے ہوا۔ چونکہ وہ خود شاعر تھا اور خاقان تخلص کرتا تھا اس لیے شاعروں کی ایک کثیر تعداد اس کے دربار میں جمع ہوگئی۔ جن کے کلام اور حالات پر کئی کتابیں لکھی گئیں مثلاً زینت المدائح، انجمن خاقان، گلشنِ محمود اور تذکرہ محمد شاہی۔ ریو نے اپنے ضمیمہ فہرست مخطوطات

---

[1] اگرچہ عملاً وہ اٹھارہ سال تک برسرِ اقتدار رہا (۱۷۷۹ء۔۱۷۹۷ء) لیکن اس کی باقاعدہ تخت نشینی ۱۷۹۶ء میں ہوئی اور ۱۷۹۷ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔
۱۲ مصنف

فارسی برٹش میوزیم (صفحہ ۸۴ - صفحہ ۹۱) میں ان سب کا ذکر کیا ہے اور رضا قلی خان نے بھی اپنے تذکرے کی تالیف میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب یعنی گلشن محمود میں فتح علی شاہ کے ۴۸ بیٹوں کا ذکر ہے جو شعر کہتے تھے۔ اسی طرح سے کچھ زمانہ بعد ایران کے شاہی خاندان میں ایک اور شاعر پیدا ہوا یعنی ناصرالدین شاہ (۱۸۴۸ء - ۱۸۹۶ء) لیکن ان رشحات شاہانہ سے اگر مطلب ہوسکتا ہے تو صرف انھیں جو "کلام الملوک ملوک الکلام" کے قائل ہیں، ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

قدیم طرز کی طرف عود ابتدائی قاچاریہ دور کے شعرا کا تذکرہ دراصل گزشتہ باب میں زیادہ برمحل اور مناسب ہوتا، لیکن بخیالِ طوالت یہ نہیں کیا گیا۔ ان شعرا اور ان کے قریبی پیش روؤں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ قاچاری شعرا نے قدیم رنگ کی طرف رجعت کی، اور عرفی، صائب، شوکت وغیرہ جس مذہب شاعری کے نمائندے تھے، یہ اس سے منکر ہوگئے۔ چنانچہ ہمارے اس خیال کی تائید دو مختلف اور متضاد حلقوں سے ہوتی ہے۔ ایک طرف تو جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، شبلی[1] نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فارسی شاعری جو رودکی سے شروع ہوئی تھی، صائب پہ ختم ہوگئی اور قاآنی اور دوسرے متاخرین نے فقط قدیم شعرا مثلاً منوچہری، فرخی وغیرہ کی تقلید کی ہے۔ دوسری طرف رضاقلی خان کی بھی یہی رائے ہے، لیکن دوسرے پہلو سے اس کا خیال

[1] تصنیف ہذا صفحہ ۱۵۶ - صفحہ ۲۱۵ نیز شعرالعجم جلد سوم صفحہ ۱۸۹ ۱۲ مصنف

ہے[1] کہ فارسی شاعری عرصے سے زوال پذیر تھی اور قاچاریہ سے پہلے
جو دوَر گزرا اس کے آخر میں تو بالکل ہی مردہ ہو چکی تھی، پس ابتدائی
قاچاریہ دوَر کے شعرا نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے قریبی پیش رووں
کے طرز سے الگ ہو گئے اور متقدمین کے رنگ کو اختیار کیا۔ ان
متقدمین میں سے اس نے حسب ذیل کے نام بتائے ہیں۔ خاقانی
عبدالواسع جبلی، فرخی، منوچہری، رودکی، قطران، عنصری، مسعود
سعد سلیمان، سنائی، جلال الدین رومی، ابوالفرج رونی، انوری
اسدی، فردوسی، نظامی، سعدی، ازرقی، مختاری، معزّی، لمعی،
ناصر خسرو اور ادیب صابر جو سب کے سب زوال خلافت اور
تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مغلوں کے حملے سے پہلے گزرے
ہیں۔ متاخرین شعرا میں صرف حافظ ہی کی قدر و منزلت اس کے
ابنائے وطن کی نظروں میں بدستور باقی رہی اگرچہ یہ امر مشتبہ ہے کہ
خود اس کے رنگ کی نقل کی کس حد تک کوشش کی گئی۔ بہرحال
اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جامی، عرفی اور صائب کی طرح جو کبھی
اپنے ہموطنوں میں مشہور تھے لیکن اب اپنی شہرت ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے کھو بیٹھے تھے، حافظ بھی غیر مقبول ہو گیا تھا، بلکہ صرف یہ
کہ اس کے طرز کی نقل کوئی کر ہی نہ سکتا تھا۔ غرض کہ اس زمانے
سے ترکی اور ہندوستانی مذاق ایرانی مذاق سے برابر مستبعد ہوتا گیا
اور ہندوستان کے انگریزی حکمرانوں نے ۱۸۳۵ء-۱۸۳۶ء عیسوی

---

[1] مقدمہ مجمع الفصحا ص۵ (نمبر نہیں پڑے ہیں) ۱۲ مصنف

میں[1] فارسی کی بجائے، اردو کو ملک کی مہذب سوسائٹی کی زبان قرار دے کر ہندوستان کا رشتہ جدید ایرانی ذہن اور ادبی رجحانات سے بالکل ہی منقطع کر دیا۔

وصال اور اس کا خاندان مذکورہ بالا تذکروں سے، نیز بعد کے تذکروں سے قاچاریہ دور کے تقریباً سنو یا دو سنو کم وبیش مشہور شاعروں کی فہرست بہت آسانی سے مرتب کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمارے موضوع بحث کے اعتبار سے ان میں سے صرف ان دس یا بارہ شاعروں کا ذکر ہی کافی ہوگا جنھوں نے قدیم روایات شاعری کی پیروی کی۔ ان کی ترتیب ان عہدوں کے اعتبار سے کرنا جن میں وہ گزرے ہیں، بالکل غیر ضروری ہے۔ البتہ اگر بہ ترتیب سال ان کا بیان کر دیا جائے تو اس میں زیادہ سہولت ہوگی۔ ۱۸۸۸ء میں بمقام شیراز[2] مجھے شاعروں کے ایک مشہور خاندان سے شرف ملاقات حاصل ہو چکا ہے یعنی مرزا شفیع وصال المعروف بہ مرزا کوچک (وفات ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء) کے بیٹوں اور پوتوں سے جن میں دو بھائی فرہنگ اور یزدانی بھی تھے۔ یزدانی کے ساتھ خود ان کا لڑکا، نیز ان کے مرحوم بھائی کا لڑکا بھی تھا جو ہمّت

---

[1] اس زمانے میں انگریزوں نے وہ رقمی امداد بند کر دی جو پہلے مشرقی زبانوں کے قدیم نسخوں کی طباعت کے لیے ملتی تھی اور طرح السنۂ مشرقیہ کو بہت صدمہ پہنچایا۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو میری تصنیف (Year amongst the Persians PP. 267-268, also P. 119.) ۱۲ مصنف

تخلص کرتا تھا۔ وصال کے تین بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا وقار ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء۔۱۸۵۸ء میں جب رضا قلی خاں سے اس سے طہران میں ملاقات ہوئی تھی ۴۲ برس کا تھا، دوسرے بیٹے مرزا محمود کا جو طبیب تھا اور حکیم تخلص کرتا تھا ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں انتقال ہؤا۔ تیسرے بیٹے کا نام داوری تھا، اس کے کلام کے کچھ نمونوں کا ترجمہ میں نے تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص۴۱۰۔ ص۴۲۲ پر دیا ہے، اس کی تاریخ وفات کا مجھے علم نہیں ہے۔ چونکہ جہاں تک مجھے علم ہے اس کا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس لیے اس موقع پر میں وہ اشعار نقل کیے دیتا ہوں جن کا ترجمہ میں نے جلد سوم ص۴۱۰۔ ص۴۲۲ پر دیا ہے۔ میں نے یہ اشعار ان کے کلام کے ایک مختصر قلمی نسخہ انتخاب[1] سے لیے ہیں جو ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء کے موسم گرما میں مجھے بمقام طہران اپنے مرحوم دوست نواب مرزا حسن علی خان نے دیا تھا جو داوری کے پرانے مداح تھے:-

داوری کے مسمط کے دو بند

ای بچۂ عرب صبّحک اللہ بخیر ... صبح است صبوحی بدہ آں ساغر می را
زاں می کہ بقطب ار بدہی جرعہ وی را ... بر پای بپاید سر اکلیل جدی را
گردند بنا تش بفدا چوں تو بُخَی را
چوں چرخ زنی گرد خم بادہ جُدی را

---

[1] یہ انتخاب اب میرے قلمی نسخہ نمبر ۲۰۱ کے ساتھ مجلد ہے، اس مسمط میں ۸ بند ہیں جن میں سے پہلے دو کی نقل یہاں کی جاتی ہے۔ ۱۲ مصنف

گر نیست ترا بادہ یکے شیشہ برکش برخیز و عبا را عربی وار بسر کش
ہمچو عَرَباں دامنِ خود تا بکمر کش یکدست عبا شیشہ بداں دست دگر کش
بادامن ترمنت ازاں دامن ترکش
وز خانہ برو تا بدرِ حانۂ خمار

آج کل کے قصیدہ گویوں کے حقیر صلے — اپنے مہربان دوست نواب مرحوم کے ذکر سے مجھے ایک عجیب وغریب واقعہ یاد آیا جو اوائل ۱۹۰۸ء میں طہران میں پیش آیا تھا جب کہ میں اُن کے یہاں مہمان تھا۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگلے زمانے کی قدردانیوں کے مقابلے میں جب اگر شاعر کی کوئی نظم ممدوح کی طبیعت کو پھڑکا دیتی تھی تو اس کا منہ سونے یا موتیوں سے بھر دیا جاتا تھا آج کل شاعری کا پیشہ کس قدر بے منفعت ہوگیا ہے۔ ایک دن ایک معمولی درجہ کا شاعر جس کا نام اگر کبھی مجھے یاد بھی تھا تو اس وقت یاد نہیں آتا، نواب کے مکان پر آیا اور ان کی شان میں ایک قصیدہ پڑھنے کی اجازت طلب کی، چنانچہ اسے اجازت دے دی گئی۔ جب قصیدہ ختم ہوگیا تو صلہ میں اسے ایک تومان (جو اس وقت چھ شلنگ کے برابر تھا) عطا ہوا اور اسے لے کر خوش خوش چلا گیا۔ لیکن اس صلہ کو حقیر سمجھنا تو درکنار، نواب کے بعض دوستوں نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ نے (اتنی بڑی رقم بطور صلہ دے کر) ایک شاعر کا دماغ خراب کردیا ہوگا اور اب وہ یہ سمجھنے لگا ہوگا کہ میں شعر کہہ کر پیٹ بھر سکوں گا۔

قصیدوں کے زوال کا سبب | اُن مختلف اسباب میں سے جنھوں نے قدیم رنگ کی شاعری خصوصاً مدحیہ قصائد کا خاتمہ کردیا ہی، ایک سبب تو وہ ہی جو ابھی بیان ہوا، لیکن اس سے بھی زیادہ موثر سبب یہ ہی کہ ۱۹۰۵ء-۱۹۰۶ء کے انقلاب کے بعد سے ملک میں پریس کا اثر روز بروز قوی ہوتا جاتا ہی اور اب شاعر کا رجحان بجائے کسی خاص ممدوح کی شان میں کچھ کہنے کے بحیثیت مجموعی جمہور کے لیے کچھ لکھنے کی طرف روزانہ زیادہ ہوتا جا رہا ہی۔ اس تبدیلی رجحان کی سچی مثال ناظرین کو بدنصیب مرزا جہانگیر خاں شیرازی کے جیسے شاعروں میں نظر آسکتی ہی۔ وہ اخبار صورِ اسرافیل کے مالک اور مدیر تھے جو دورۂ انقلاب کی پیداوار تھا۔ مرزا جہانگیر خاں کی سوانح عمری، ان کی موت کا بیان اور اس زبردست قومی بحران کے موقع پر ان کی ادبی خدمتیں؛ ان سب کا مفصل تذکرہ میں اپنی سابقہ تصنیف انقلابِ ایران (Persian Revolution) اور

Press and Poetry in Modern Persia

(ایرانِ جدید کا پریس اور شاعری) میں کرچکا ہوں۔ ابھی چند روز ادھر تک میں ان کے متعلق صرف یہی جانتا تھا کہ وہ دورۂ انقلاب کے ایک مشہور اہلِ قلم تھے، لیکن ابھی حال ہی میں مجھے اپنے سابق شاگرد اور اب لائق دوست مسٹر و۔ ا۔ اسمارٹ (W. A. Smart) کے توسط سے جو ان چند ہمدرد عہدہ داروں میں ہیں جنھیں برطانیہ کے سفارتی خدمات کے لیے بھیجا گیا ہی، ایک فارسی قلمی نسخہ کا بڑا حصّہ (۲۹۲ صفحات) ملا ہی[1]۔ اس کا نہ تو کوئی عنوان ہی نہ مصنف کا نام

[1] یہ میرے کتب خانے میں نشان J.19 کے ساتھ محفوظ ہی۔ ۱۲ مصنفہ

درج ہے نہ سرورق ہے اور نہ وہ بذاتِ خود مکمل ہے۔ اس میں ان ۳۸ شعرا کے حالات درج ہیں جو اکثر فارس کے رہنے والے تھے اور ۱۹۱۰ء تک زندہ تھے یا جن کا انتقال گزشتہ چالیس سالوں میں ہوا ہے۔ ان میں مرزا جہانگیر خان کا ذکر بھی ہے (ص۴۴۔ ۶۰) اور ان کے انقلاب سے پہلے کے کلام کے نمونے بھی موجود ہیں اور وہ نظم بھی ہے جو انھوں نے طہران سے اپنے احباب مقیم شیرازنہ کے نام لکھی تھی یہ سب نظمیں پُرانے رنگ کی ہیں اور جدید زمانے کی خصوصیات کا ان میں نام بھی نہیں ہے۔ اسی طرح سے دور تجدّد کے دو اور شاعر ہیں جو جہانگیر خان ہی کے برابر شہرت رکھتے ہیں۔ یعنی ایک تو ابوالحسن مرزا نبیرۂ فتح علی شاہ ہیں جن کی ولادت ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ ان کا عرف شیخ الرئیس ہے اور زیادہ تر اپنی سیاسی اور فلسفیانہ تصانیف کی وجہ سے مشہور رہیں۔ وہ پکّے "اسلام خواہ" تھے اور حیرت تخلص کرتے تھے۔ ان کا ذکر میرے نسخہ کے ص۱۰۳۔ ص۱۲۱ پر ہے۔ دوسرے شاعر ادیب الممالک[1] ہیں۔ یہ ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ مشہور اہلِ قلم ہیں دورۂ انقلاب کے شعرائے تجدّد اور مرزا علی قایم مقام کی تیسری پشت میں ہیں یہ امیری فراہانی کے تخلص سے شعر کہتے ہیں ان کا ذکر میرے نسخہ کے ص۳۹۔ ص۵۰ پر ہے۔ غرض کہ انقلاب کے نئے شعرا، بجز ان چند نوجوان شاعروں کے جو اس یادگار زمانے کے بعد پیدا ہوئے زیادہ تر قدیم مذہب شاعری کے مقلد تھے، لیکن اپنے طبعی جوش

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب (Press and Poetry in Modern Persia) ص۳۷۔ ص۳۹، ۱۲ مصنف

اور اثر قبول طبیعت کی بدولت انھوں نے اپنے آپ کو نئے حالات سے مطابق کرلیا تھا۔ لیکن واضح رہے کہ اسی قسم کے دوسرے تاریخی انقلابات کی طرح دورۂ تجدّد بھی دو علیحدہ علیحدہ مستقل حصّوں میں منقسم ہوسکتا ہے اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء کا زمانہ ان دو حصوں کے درمیان حدِّ فاصل ہے۔ آج بھی ایران میں پُرانے رنگ کی شاعری بہت زیادہ

پُرانے اصنافِ شعر کے متروک ہوجانے کا اندیشہ نہیں ہے۔

ہوتی ہے۔ ۷ر فروری ۱۹۲۲ء کو اپنی ساٹھویں سال گرہ کے موقع پر مجھے تحفہ کے طور پر ایک مجموعۂ اشعار پانے کا شرف حاصل ہؤا تھا جس میں دورِ حاضر کے ۱۶ مشہور ترین شعرا کا کلام تھا، ان کے علاوہ ایک علیحدہ قصیدہ بھی تھا جو ایرانِ جدید کے بن وے نوٹو سے لی نی[1] (Benvenuto Cellini) عماد الکتّاب کا کہا ہؤا تھا۔ غرض کہ اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ پُرانے اصنافِ شعر بہت جلد مٹ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ ان وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے مدحیہ قصیدہ (فلسفیانہ یا اخلاقی قصیدہ نہیں) کا رواج کم ہوجائے، لیکن مثنوی، غزل اور رباعی۔ یہ اصناف اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک کہ ایرانی مزاج کو تصوف، عشق اور نغز گوئی میں لطف آتا رہے گا۔

جدید شعرا کے تذکرے

جدید ترین زمانے کی شاعری کے اس اجمالی اور ابتدائی تذکرے کے بعد اب ہم اس کے بعض خاص خاص علم برداروں کا حال لکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق جن کا زمانہ ۱۸۷۰ء

[1] یہ فلارنس کا ایک مشہور زرگر، سنگ تراش اور حرف کُن تھا۔ ۱۲ مترجم

سے پہلے ہی میری معلومات کا خاص ماخذ رضا قلی خان ہدایت کی تین تصنیفات ہیں: یعنی ایک تو اس کا مفصل تذکرۂ شعرا جس کا نام مجمع الفصحا ہی؛ دوسرا اس سے مختصر تذکرہ یعنی ریاض العارفین جس میں خصوصیت کے ساتھ صوفیا اور عارفوں کا ذکر کیا گیا ہی اور تیسرا وہ ضمیمہ جو اس نے میر خواند کے روضۃ الصفا پر لکھا ہی اور جس میں ۱۸۵۶ء تک کے واقعات سے بحث کی ہی۔ جب مصنف (رضا قلی خان) سفارتِ خوارزم سے واپس ہوا تو ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء تک کے واقعات اس ضمیمہ میں شامل ہو چکے تھے۔ اس سفارت کا مفصل حال اس نے اپنے سفارت نامہ میں لکھا ہی جس کا فارسی نسخہ مرحوم م۔ چ۔ شے فر (M. Ch. Schefer) نے ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۹ء میں فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شایع کیا تھا[۱]۔ روضۃ الصفا کی نویں یعنی ضمیمہ کی دوسری جلد کے خاتمے پر جہاں فتح علی شاہ کے عہد کے حالات ختم ہوتے ہیں متعدد صفحات میں (جو بدقسمتی سے بے نمبر ہیں اور اس وجہ سے ان کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا) اس عہد کے مشاہیر مدبرین، شعرا، علما وغیرہ کے حالات لکھے گئے ہیں اور ان میں کہیں کہیں ان کے سوانح حیات کے متعلق ایسا مواد بھی مل جاتا ہی جو مسبوق الذکر دو تصانیف مجمع الفصحا اور ریاض العارفین میں نہیں ملتا۔ غرض کہ میں نے ذیل کے حالات انھیں تینوں تصانیف

---

[۱] اس مصنف کا (رضا قلی خان) کی مذکورہ بالا اور دیگر تصانیف کے بیان کے لیے ملاحظہ ہو مسٹر اڈورڈ (Edward) کی لاجواب فہرست مطبوعات فارسی مخزونہ برٹش میوزیم (لندن ۱۹۲۲ء) کالم ۶۳۱-۶۳۲، ۱۲ مصنف

سے لیے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور نادر قلمی نسخے سے بھی استفادہ کیا ہے جو شاید خود مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جس کا نام تذکرہ دل کشا ہے۔ اس میں مصنف (مرزا علی اکبر شیرازی المتخلص بہ بسمل) نے اپنے معاصرین کا حال لکھا ہے۔ یہ تقریباً ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء۔ ۱۸۲۲ء میں تصنیف ہوا ہے۔ یہ نادر نسخہ جو از اوّل تا آخر جلی اور روشن نسخ میں ہے اور جس میں جا بجا سُرخی کا استعمال ہے پہلے مرحوم سرالبرٹ ہوٹم شنڈلر (Sir Albert Houtam Schindler) کی مِلک تھا اور اب میرے کتب خانہ میں زیر نشان 18 .I محفوظ ہے رضا قلی خان نے اس کے مصنف کو اپنے زمانۂ شباب میں شیراز میں دیکھا تھا اور اس نے اس کا حال مجمع الفصحا (جلد دوم ص۸۲۔ ص۸۳) اور ریاض العارفین (ص۲۴۳۔ ص۲۴۴) دونوں میں کیا ہے۔

۱۔ سحاب وفات ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء ۱۸۰۸ء

سید محمد اصفہانی المتخلص بہ سحاب سید احمد ہاتف اصفہانی کے بیٹے تھے جن کا ذکر گزشتہ باب کے خاتمہ پر ہو چکا ہے اور جن کے متعلق ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اٹھارھویں صدی میں صرف وہی ایران کے سب سے زیادہ مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ سحاب کے متعلق رضا قلی خاں لکھتا ہے (مجمع الفصحا) جلد دوم ص۲۰۷۔ ص۲۱۱) کہ فتح علی شاہ کی شان میں کئی قصائد لکھنے کے علاوہ انھوں نے اسی کے ایما سے ایک تذکرہ (غالباً شعرا کا) رشحاتِ سحاب لکھا تھا، میری نظر سے یہ تذکرہ اب تک

نہیں گزرا۔ بقول رضا قلی خان کے ان کے دیوان میں پانچ ہزار شعر ہیں، ذیل کے اشعار جن میں اُنھوں نے بعض شعرا کو ان کے غرور اور بد دماغی پر خوب لتاڑا ہی، دلچسپی سے خالی نہیں ہیں[۵۱] :-

کس را کمال نفس بجز حسنِ حال چیست
وآں را کہ حسنِ حال نباشد کمال چیست

شعر است ہیچ و شاعری از ہیچ ہیچ تر
در حیرتم کہ در سرِ ہیچ ایں جدال چیست

یک تن نپرسد از پئے ترتیب چند لفظ
ای ابلہان بے ہنر ایں قیل وقال چیست

از بہرِ مصرعے دو کہ مضمون دیگریست
چندیں خیال جاہ و تمنّائے مال چیست

شعر اصلش از خیال بود حسنش از محال[۵۲]
تا از خیالِ ایں ہمہ فکرِ محال چیست

از چند لفظ یادہ نزد لاف برتری
ہرکس کہ یافت شرم چہ و انفعال چیست

صد نوع از ایں کمال براہلِ رائے وہوش

---

۵۱ مجمع الفصحا جلد دوم ص۲۱۱۔ ۱۲ مصنف

۵۲ عربوں کا قول ہی کہ "اکذب الشعر احسنہ" اور اکثر فارسی قصیدہ نگار اپنے مبالغہ کے لیے بدنام ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد دوم (انگریزی) ص۶۹۔ ص۸۰۔ ۱۲ مصنف

باحسنِ ذات عامی نیکو خصال چیست

گیرم کہ نظم بحرِ دُر و کانِ گوہر است

با نثرِ کلکِ داورِ دریا نوال چیست

۲- مجمر وفات ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء یا ۱۸۱۱ء

ان کا پورا نام سید حسین طباطبائی تھا اور یہ اصفہان کے پاس ایک مقامِ اردستان کے رہنے والے تھے۔ یہ مجتہد الشعرا کے لقب سے ملقب تھے۔ رضا قلی خان نے اپنی تینوں مذکورۂ بالا تصانیف میں ان کا حال لکھا ہے۔ ان کے ایک ہم عصر اور ہم وطن شاعر مرزا عبدالوہاب نشاط کی وجہ سے ان کی رسائی ایران کے شاہی دربار میں ہوگئی تھی۔ ان مرزا عبدالوہاب کا انتقال ان کے انتقال کے ۱۸ یا ۱۹ سال بعد ہوا۔ مجمر نے غالباً جوانی ہی میں انتقال کیا، اس لیے کہ رضا قلی خان نے ان کے کلام کی جس کا بہت مختصر حصّہ انھوں نے چھوڑا، تعریف کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"ان کی عمر کچھ دن اور وفا کرتی تو یہ ضرور اوجِ شہرت تک پہنچ کر رہتے"

لیکن اب بھی وہ ان پانچ شاعروں میں سے ایک ہیں جنھیں میرے لایق اور بزرگ مرزا یحییٰ دولت آبادی نے اوّل درجہ کا شاعر کہا ہے[1]۔

[1] ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا ص ۱۸۹ بقیہ شعرا میں فروغی، صبا (نہ کہ صفا) نشاط اور قاآنی درجہ اول کے ہیں، وصال اور رضا قلی خان ہدایت درجہ دوم کے اور وقار اور سروش درجہ سوم کے ہیں۔ مصنف

ان کے کلام کے نسخے شاذ و نادر ہی ملتے ہیں، لیکن برٹش میوزیم میں ان کے "کلیات"[1] کا ایک نسخہ موجود ہے۔ رضا قلی خان نے ان کے کلام کے جو انتخابات دیے ہیں ان میں مجھے کوئی خاص بات نہیں نظر آئی۔ لیکن ذیل کے دو لُغز جن میں سے ایک "ہوا" پر ہے اور دوسرا "قلم" پر جنھیں میں نے تذکرہ دل کشا سے نقل کیا ہے، ان کے کلام کے نمونے کا کام دیں گے:۔

لُغزِ باد

چیست آں پیکِ مبارکِ مقدمِ فرّخ جناب
روز و شب اندر تحرک سال و مہ اندر شتاب

نافہ اش در دامن و اندر گریبانش عبیر
عنبرش در جیب و اندر آستینش مشک ناب

رہروے بے پا و سر دیوانۂ بے عقل و ہوش
عاشقے بے خان و ماں آوارۂ بے خورد و خواب

کس نمی داند کہ از عشق کہ باشد بے قرار
کس نمی یابد کہ از ہجر کہ دارد اضطراب

آب از وی چوں دلِ عشاق از زلفِ بتاں
گاہ باشد در سلاسل گہ بود در پیچ و تاب

مردہ گہ از او زمین و زندہ گہ از او جہاں
چوں قوی از پیری و ہیچو طبیعت از شباب

---

[1] یعنی Or. 3543 ملاحظہ ہو ضمیمہ فہرست کتب فارسی ۲۵۴ - ۲۲۲ - ۲۲۳ ۱۲ مصنف

لُغزِ قلم

گلبنِ باغِ نفسِ ناطقہ را من یکے ابر گوہر افشانم
ہم شکر ریز و ہم عبیرفشاں لب دلدار و زلف جانانم
در دُر افشانی و گہر ریزی طبع دستور و دست سلطانم

۳۔ صبا وفات ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۳ء

فتح علی خان نام تھا۔ صبا تخلص کرتے تھے، فتح علی شاہ کے دربار میں ملک الشعرا تھے۔ رضا قلی خان جس نے اپنی تینوں تصانیف میں ان کا تذکرہ کیا ہے لکھتا ہے کہ ۰۰، سال سے کوئی شاعر ایران میں ان کے برابر نہیں پیدا ہوا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض نقاد تو ان کے "شہنشاہ نامہ" کو فردوسی کے شاہ نامہ پر بھی ترجیح دیتے ہیں[1] ان کی دوسری تصنیفات خداوند نامہ، عبرت نامہ اور گلشن صبا ہیں ایک دیوان بھی ہے جس میں دس یا پندرہ ہزار شعر بتائے جاتے ہیں۔ وہ پہلے کچھ مدت تک قم اور کاشان کے گورنر رہے، لیکن بعد میں خود کو تمامتر شاہ کی ملازمت کے لیے وقف کر دیا۔ بچپن میں اپنے ہم وطن شاعر صباحی سے تلمذ رکھتے تھے جو ہاتف اور آذر کا ہم عصر تھا جس کا انتقال مجمع الفصحا کے بیان کے مطابق ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۱ء تا ۱۷۹۲ء میں ہوا۔ صبا کی وفات کے بعد ان کے

[1] ریاض العارفین صفحہ ۲۶۴ شہنشاہ نامہ ۱۸۹۰ء میں بمبئی میں لیتھو ہو چکا ہے۔

۱۲ مصنف

فرزند اکبر مرزا حسین خان التخلص بہ عندلیب ملک الشعرا بنائے گئے۔ چوں کہ صبا کے کلام کا بیشتر حصّہ قصائد پر مشتمل ہے۔ اس لیے ہمارے لیے زیادہ دلچسپ نہیں ہے، لیکن جیسا کہ ذیل کے انتخاب سے معلوم ہوگا، پُر ترنم اور موسیقیت آمیز ضرور ہے۔ یہ انتخاب اس قصیدہ کا ہے جسے تذکرہ دل کشا میں نقل کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا حُسن زیادہ تر لفظی اور صوری ہے اس لیے میں اس کا ترجمہ کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں :—

عید است و عشرت را بقا بر درگہ شہ رہ نما
در دم نوائے مرحبا بر لب سرودِ آفریں

عید است و شاہانِ جہاں گویاں بہم در آستاں
برخاست بانگِ بارہاں بنشست شاہ را دہیں

عید است و از نوبت سرا، آوازِ کوس و بانگ و نائے
در کاخ ہفت اختر صدا در کاس نہ گردوں طنیں

شہزادگاں خورشید فر بر کلّہ پروین سپہر
بر جانِ شاں پا تا بسر در آفریں جاں آفریں

بر ز آسماں شاں پایگہ بل آسماں شاں خاک رہ
دیدار رشکِ مہر و مہ گفتار رازِ داد و دیں

شہ را مہیں بر آسماں باشہ سرایاں داستاں
گوہر فشاں بر آستاں چندانکہ ستہ از آستیں

فضل و ہنر آب و گِلش آساں از آں ہر مشکلش
گنج جواہر در دلش گنجور قدرت را دفیں

در پیش گاہے کاسماں بنہادہ سر در آستاں
عکسے ازاں باغ جناں فرشے براں عرشِ بریں
شاہنشہ فرخندہ خو باصدر اعظم راز گو
گلبرگ رو کافور مو آں پس نگراں پیش بیں
برجیس ساں خورشید ساآں در سخن ایں در سخا
چوں پور پیر برخیا، چوں رود راد آبتیں[1]
کار آگہے، فرخ لقا، ازآں صفاہاں در صفا
بر رنج درویشی دوا بر گنج سلطانی امیں
برتر زگردوں پایہ اش افزوں زانجم مایہ اش
زیں دو بہیں پیرایہ اش روئے نکورائے رزیں
زیبِ بساطِ شہ نشاط، آرے نشاط و انبساط
اطفال معنے را قماط، از کلک وازحبرانگبیں
ہرطفل معنے کاورد گر بخروش ازجاں خرد
نہ ہر بلے چوں بگزرد ناقص نثن مثمن ثمیں

۴۔ نشاط۔ وفات ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء، ۱۸۲۹ء

ہم مرزا محمد قلی افشار المتخلص بہ الفت (وفات ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء یا ۱۸۲۵ء) اور آقا علی اشرف آگاہ (وفات ۱۲۴۴ھ مطابق

[1] پور پیر برخیا سے مراد سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف ہیں۔ رود راد آبتیں سے مطلب باستانی بادشاہ فریدوں ہے۔ میں نے اس شعر کے قافیہ اور اس سے پہلے کے لفظ میں کسی قدر ضروری تصرف کر دیا ہے۔ ۱۲ مصنف

۱۸۲۸ء ـ ۱۸۲۹ء برادر بسمل کا تذکرہ نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ ان دونوں سے رضا قلی خان ذاتی طور پر واقف تھا اور مرزا عبدالوہاب اصفہانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو فن خطاطی، نیز شاعری میں بہت مشہور تھے۔ اور تینوں زبانوں، عربی، ترکی اور فارسی کے ماہر تھے۔ اپنی سخاوت نیز شعرا، صوفیا اور ادبا کی مہماں نوازیوں میں اپنا تقریبًا کل سرمایہ خرچ کرنے کے بعد وہ فتح علی شاہ کے دربار تک پہنچے اور معتمدالدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ان کو غزل گوئی میں خاص قدرت حاصل تھی اور ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف "گنجینہ" ہے ذیل کے فقرے سے ان کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

از قلب جہاں نشاط رفتہ

۱۲۴۴ھ

۵۔ مرزا ابوالقاسم قایم مقام
(قتل ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء)

قایم مقام دو مشہور آدمیوں کا خطاب رہ چکا ہے جو باپ بیٹے تھے: یعنی مرزا علی فراہانی المعروف بہ مرزا بزرگ جو شاہ عباس مرزا کے نائب وزیر السلطنہ تھے اور ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء ـ ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا اور اُن کے بیٹے مرزا ابوالقاسم جن کا ستارہ فتح علی شاہ کے انتقال کے بعد گردش میں آگیا اور وہ اس کے جانشین

محمد شاہ کے حکم سے ۲۶ - جون ۱۸۳۵ء کو قتل کر دیے گئے[۱] ادبی حیثیت سے دیکھا جائے تو آخرالذکر یعنی ابوالقاسم قایم مقام ہی زیادہ مشہور ہیں۔ اگرچہ وہ ثنائی کے تخلص سے شعر بھی کہتے تھے، لیکن ان کی شہرت زیادہ تر نثار کی حیثیت سے ہے اور ان کے بے شمار خطوط کو جو شایع بھی ہو چکے ہیں، ان کے ابنائے وطن اعلیٰ انشا پردازی کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ میرے پاس ان کے کلام، نیز ان کی نثر کی تحریروں کا مجموعہ موجود ہے جو شہزادہ فرہاد مرزا مرحوم کے حکم سے ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء ۱۸۶۵ء میں مرتب ہوا اور ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء ۱۸۶۶ء میں تبریز سے لیتھو میں شایع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کا بیشتر حصّہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنے کم و بیش مشہور ہم عصروں کے نام لکھے تھے، لیکن ان میں صرف کہیں کہیں تاریخ کتابت نظر آتی ہے[۲] ان میں اکثر سیاسی مراسلات بھی ہیں جو تاریخی حیثیت سے کسی قدر اہم ہیں، مثلاً وہ مراسلہ جو زار روس کے نام اس کے سفیر گرے بائی دوف (Grebaidoff) اور اس کے ماتحت عملہ کے طہران میں قتل کر دیے جانے کے بعد بطور معذرت لکھا گیا تھا اور جس کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ میں قایم مقام کی انشا پردازی کے نمونے

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ ریج ۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص ۲۷۱ - ص ۲۷۳ اور ص ۲۸۶ - ص ۲۸۸

انھوں نے اس وزیر کی سیرت کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے، وہ رضا قلی خاں کی رائے سے بہت مختلف ہے۔ ۱۲ مصنف

[۲] سب سے پہلی تاریخ جو مجھے ان خطوط میں مل سکی شوال ۱۲۳۸ھ (اجون جولائی ۱۸۲۳ء) ہے ۱۲ مصنف

کے طور پر اس مراسلہ کو یہاں نقل کیے دیتا ہوں :-

نامہ شاہنشاہی بامپراطور اعظم در باب گزشتن خون ایلچی
بآں طور کہ خواہش کردہ بودند

اول دفتر بنام ایزد دانا — صانع پروردگار حی وتوانا

وجودے بے مثل و مانند مبرا از چون و چند کہ عادل و عالم است و قاہر ہر ظالم پاداش ہر نیک وبد را اندازہ وحد نہادہ، بحکمت بالغہ خود بدکاران را زجر و عذاب کند و نیکوکاران را اجر و ثواب بخشد و درود نامعدود بر رواں پیغبران راست کار و پیشوایان فرخندہ کردار باد[1] ولعد بر رائے حقایق نمائے بادشاہ ذی جاہ انصاف کیش عدالت اندیش تاجدار بازیب وفر، شہریار بحر و بر، برادر والا گہر خجستہ اختر امپراطور ممالک روسیہ و مضافات کہ دولتش باجاہ و خطراست و بافتح وظفر مخفی وستور نماند کہ ایلچی آں دولت را در پایۂ تخت ایں دولت باقتضائے حوادث دہر و غوغائے کسان او باجہال شہر آسیبے رسید کہ تدبیر و تدارک آں بر ذمہ کارگزاران ایں دوست واقعی واجب و لازم افتاد، لہذا اولاً برائے تمہید مقدمات عذر خواہی ویاس شوکت واحترام آن برادر گرامی، فرزند ارجمند خود خسرو مرزا[2] را بپائے

---

[1] چونکہ یہ خط ایک عیسائی بادشاہ کو لکھا گیا ہے، اس لیے حضرت محمد پر درود کی بجائے یہ عام طریقہ تحریر اختیار کیا گیا۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو۔ ر۔ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص ۲۵۴، ص ۲۵۶ وہ عباس مرزا کا بیٹا اور اس اعتبار سے فتح علی شاہ کا پوتا تھا۔ ۱۲ مصنف

تخت دولت بہیہ روسیہ فرستاد۔ حقیقت ناگاہی ایں حادثہ وناآگاہی امنائے ایں دولت را در تلونامہ صادقانہ مرقوم ومعلوم داشتیم وثانیاً نظر بکمال یگانگی واتفاق (کہ) مابین ایں دو حضرات آسمان رفعت است انتقام ایلچی مزبور را بر ذمت سلطنت خود ثابت دانستہ ہرکرا از اہالی وسکان دارالخلافہ گماں می رفت کہ دریں کارِ زشت وکردارِ ناسزا اندک مدخلیتی تواند داشت بأندازۂ استحقاق مورد سیاست وحد و اخراج بلد نمودیم حتیٰ داروغہ شہر وکدخدائے محلہ را نیز بہمیں جرم کہ چرا دیر خبردار شدہ وقبل از وقوع ایں حادثہ ضابطہ شہر محلہ را محکم نہ داشتہ اند عزل وتنبیہ وترجمان کردیم۔ بالاتر ازیں ہاہمہ پاداش و سزائے بود کہ نسبت بہ عالی جناب مرزا مسیح، وارد آمد بامرتبہ اجتہاد در دین اسلام واقتفار واقتدائی کہ زمرۂ خواص وعوام باد داشتند بواسطہ اجتماعے کہ مردم شہر ہنگام حدوث غائلہ ایلچی در دائرہ او کردہ بودند، گزشت واغماض را نظر باتحاد دولتین شایستہ ندیدیم وشفاعت ہیچ شفیع وتوسط ہیچ واسطہ درحق او مقبول نیفتاد۔ پس چوں اعلام ایں گزارش بہ آن برادر نیکو سیر لازم بود بتحریر ایں نامۂ دوستی علامہ پرداختند۔ اعلام تفاصیل اوضاع را بفرزند موید موفق نائب السلطنۃ عباس مرزا محوّل داشتیم۔ امید از درگاہ پروردگار داریم کہ دم بدم مراتب وداد ایں دو دولت ابدیت بنیاد درترقی وازدیاد باشد وروابط دوستی ویگانگی حضرتین پیوستہ بآمدوشد رسل رسائل متاکد ومتضاعف گرد والعافیۃ بالعافیۃ۔

تحریراً فی شہر ربیع الاول ۱۲۴۵ھ (ستمبر ۱۸۲۹ء)

"روس منحوس" اگرچہ مذکورہ بالا مراسلہ فتح علی شاہ کی طرف سے ہے لیکن یہ دراصل قایم مقام کا لکھا ہوا ہے۔ جن روسیوں کو وہ اپنی ایک نظم میں جو عباس مرزا کے روسیوں اور ترکوں پر فتح پانے[1] کی تہنیت میں لکھی گئی تھی، ان الفاظ میں یاد کرتا ہے:-

روم شوم و روس منحوس از دو جانب
قصد شاں تسخیر آذربائیجاں شد

ان کو اس قدر تہذیب بلکہ عجز کے ساتھ خط لکھنے میں اس نے کس قدر خونِ جگر نہ کھایا ہوگا! علیٰ ہذا صلح روس کے بعد جو غالباً ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۲۸ء) میں ہوئی وہ مرزا بزرگ نوری کو ایک خط میں کس حسرت سے لکھتا ہے کہ اب میں روس کو "روس منحوس" بھی نہ کہہ سکوں گا۔

"تا لان سیم کہ در مقدمہ روس می ترسم بگویم منحوس"

مرزا تقی خان امیر کبیر قایم مقام کے بعد ایک اور اتنا ہی نیک دل اور اتنا ہی بدنصیب وزیر بھی ایران میں گزرا ہے یعنی مرزا تقی خان امیر کبیر[2] جس نے سرکاری مراسلت کے طرزِ انشا کو اور زیادہ سلیس بنانے کی کوشش کی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ حضرات جو اگلے وقتوں کی عبارت آرائیوں سے واقف نہیں ہیں قایم مقام کے خطوط کو کچھ ایسا زیادہ سادہ اور سلیس نہ خیال کریں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا طرزِ انشا ان کا طرزِ انشا ان نفرت انگیز اور پیچ دار عبارت آرائیوں

[1] مجمع الفصحا جلد دوم ص۴۳ ۱۲ مصنف

[2] اس کی سیرت کے بہترین بیان کے لیے ملاحظہ ہو ر۔ ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران ص۳۶۴۔ ص۴۰۶ ۱۲ مصنف

کے مقابلے میں کہیں زیادہ اصلاح شدہ اور ترقی یافتہ ہو جو بہت زمانے تک داخل فصاحت اور مستحسن سمجھی جاتی ہیں اور جیسا کہ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہو آج کل کے بہترین ادبی مذاق رکھنے والوں اور نقّادوں کی اعلیٰ تعریف کا مستحق و سزاوار ہو۔ ان خطوط کا اگر ایک نقّادانہ اڈیشن مع حواشی شایع کر دیا جائے تو ادبی اور تاریخی حیثیت سے یہ ایک کارِ نمایاں ہو اور اگر کوئی ایرانی محقق جس کی دلچسپیاں صرف ماضی بعید ہی تک محدود نہیں ہیں، اس کام پر محنت کرے تو ہمیں یقین ہو کہ اس کی محنت ضرور فائدہ بخش ثابت ہو گی۔

۶- وصال (وفات ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء) اور اس کے بیٹے

وصال کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ مجھے ۱۸۸۸ء کے موسم بہار میں ان کے بعض لائق بیٹوں اور پوتوں سے شیراز میں ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہو۔ وصال کو ان کے ابنائے وطن باتفاق رائے جدید شعرا میں سب سے زیادہ مشہور تسلیم کرتے ہیں۔ رضا قلی خاں جس نے اپنی تینوں تصانیف میں ان کا حال بہت طوالت کے ساتھ لکھا ہو اور بسمل مصنف تذکرہ دل کشا دونوں ان سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ خصوصاً بسمل کے مراسم تو ان کے ساتھ بالکل بے تکلفانہ تھے۔ وصال شیراز کے رہنے والے تھے۔ ان کا پورا نام مرزا محمد شفیع تھا، لیکن وہ عام طور پر مرزا کوچک کے عرف سے معروف تھے۔ بسمل نے

فنِ خطاطی، موسیقی اور شاعری میں ان کے کمالات کی تعریف بہت شد مد کے ساتھ کی ہے اور ان تینوں فنون میں انھیں "عدیم المثال" بتایا ہے۔ ان کے وسیع اخلاق اور دوستی کی سچائی کو بھی اس نے بہت سراہا ہے، لیکن ساتھ ہی انھیں "اندک زود رنج" بتایا ہے۔ اس کی تائید رضا قلی خان کے ضمیمہ روضۃ الصفا سے اس جملے سے بھی ہوتی ہے کہ جب بادشاہ نے بنظر تعریف وتحسین "باسراف در کمالات نسبت داد" تو وہ بہت چیں بجبیں ہوئے۔ ان کے اشعار کی تعداد بارہ ہزار بتائی جاتی ہے جن میں قصائد اور غزلیات کے علاوہ "بزم وصال" اور وحشی کی فرہاد وشیریں کا تتمہ بھی داخل ہے جسے "اصل سے بھی بہتر" کہا جاتا ہے :-

"فرہاد وشیریں وحشی را تمام فرمودہ وکمال فصاحت ظاہر نمودہ وبمراتب بہ از وحشی گفتہ۔"

انھوں نے زمخشری کی اطواق الذہب کا ترجمہ بھی فارسی زبان میں کیا تھا۔ لسبل نے جس کا دعویٰ ہے کہ میں ان کا تمام کلام پڑھ چکا ہوں، ان کے اشعار کی نسبتاً قلیل تعداد یعنی صرف ۲۱۳ شعر نقل کیے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان کے عام رنگ کا اچھا اندازہ ہوسکتا ہے، نیز یہ اس صنعت کی بھی اچھی مثال ہے جسے فارسی علم بیان میں المدح بمایشبہ الذم کہتے ہیں۔ اس کا مطلع

ہر کس شہانہ بحر و بر و چرخ و اختر است
اقرار می کنند کہ خسرو ستمگر است

حاضرینِ دربار میں تہلکہ ڈالنے کے لیے کافی ہے، لیکن آگے چل کر صراحت

کردی گئی ہو کہ سمندر بادشاہ کی سخاوت کا شاکی ہو، پہاڑ اسے اس وجہ سے ستمگر کہتا ہو کہ اس نے اس کے سینے کے اندر کا چھپا ہوا سونا مٹی کی طرح بکھیر دیا ہو اور ستاروں کی شکایت اس وجہ سے ہو کہ اس کی فوجوں کی تعداد اور چمک دمک نے انھیں ماند کر دیا ہو، وقس علیٰ ہذا۔ چونکہ ترجمہ میں اس قسم کی خیال آفرینیوں کا حسن باقی رکھنا مشکل ہو، اس لیے میں صرف اصل اشعار کی نقل پر اکتفا کرتا ہوں

ہر کسِ تنہا نہ بحر و بر و چرخ و اختر است
اقرار می کنند کہ خسرو ستمگر است

زآنہا یکے ست بحر کہ نالد ز دستِ شاہ
کآبم ازو برفت و کنوں خاک بر سر ست

اندختہ ام تمام بپرداخت و خود نہ گفت
کایں سنگ ریزہ نیست کہ مرجان و گوہر ست

دریا نشست و کوہ بر آورد سر کہ داد
زیں شاہ چود پیشہ مرا دل پُر آذر ست

بر من ہر آنچہ رفت بدریا نہ شہ نہ رفت
مرجاں کجا بہ پایۂ یاقوتِ احمر ست

لعلے کہ جز برافسرِ شاہاں حرام باد
بے آب تر ز افسرِ شاہانش بردر ست

ذرّہ مرا نہ دیدی و آں عزّتے کہ داشت
با خاک رہ نہ جود وے اکنوں برابر ست

کوہ است و سنگِ خویش کنوں از سخائے شاہ

وآں نیز پیشِ حلمِ وے از کاہ کمتر ست

افراخت چرخ سر کہ مرا شکوہ بیشتر

برفش فزوں تراست کہ بامش فزوں تر ست

اختر مرا شمار نہ و پیش لشکرش

اختر مگو کہ مہرۂ چندم بشش درست

خورشید را کہ چشم و چراغِ زمانہ بود

آتش بدل ز مجمر شاہش چو مجمر ست

تا کرد شیرِ رایتش آہنگ آسماں

شیر من از ہراس چو روباہ لاغر ست

از بیشِ نسر گرسنہ چشم بہ بازِ شاہ

صد عجز نامہ بیش بہ بالِ کبوتر ست

ایں شاہ نیست دشمنِ بحراست و معدنست

ایں شاہ نیست آفتِ چرخ است و اختر ست

وصال کے بیٹے | وصال کی فرہاد و شیریں لیتھو میں طبع ہو چکی ہے اور رضا قلی خان نے ریاض العارفین (ص۴۳۴ - ص۴۳۵) اور مجمع الفصحا (جلد دوم ص۵۲۸ - ص۵۴۸) میں ان کے کلام کے انتخابات بھی دیے ہیں۔ مجمع الفصحا (جلد دوم ص۵۴۸ - ص۵۵۵) میں ان کے بڑے بیٹے وقار کا حال بھی بہت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ وہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء میں طہران میں ناصرالدین شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے تھے اور وہیں ان کا سوانح نگار رضا قلی خان "بیس سال کی جدائی کے بعد" ان سے ملا تھا۔ مجمع الفصحا میں وقار کے چھوٹے بھائیوں

مرزا محمود طبیب المتخلص بہ حکیم (وفات ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء - ۱۸۵۲ء) اور مرزا ابوالقاسم فرہنگ کے حالات

مرزا محمود طبیب

بھی موجود ہیں، میں ان دونوں کا ذکر اوپر صفحہ ۲۳۲ پر کر چکا ہوں، لیکن ان کے اور تین بھائیوں؛ داوری، یزدانی اور ہمت کے حالات مجمع الفصحا میں نہیں ہیں۔ داوری کے حسب ذیل مسمط کو جس میں

داوری

بادشاہ کے شکار کا ذکر ہے، میں نے اپنے طور پر اوائل ۱۸۸۹ء میں طہران میں نقل کیا تھا جب میں نواب مرزا حسن علی خان مرحوم کے یہاں مہمان تھا۔ چونکہ یہ مسمط ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور میرے علم میں اس کی کوئی نقل بھی یورپ میں موجود نہیں ہے، اس لیے میں اسے یہاں نقل کرنے پر مجبور ہوں، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کتاب میں نقل کر دیے جانے کی وجہ سے اس کی زندگی کی جو اب تک معرضِ خطر میں تھی، کسی قدر ضمانت ہو جائے گی، اس لیے کہ میری نقل ایک علیحدہ آدھے نوٹ پیپر پر تھی اور ابھی ابھی جب میں کسی دوسرے کاغذ کی تلاش میں تھا، اتفاقاً میرے ہاتھ آگئی ہے:-

یک چند جدا از بر م آن شوخ پسر بود
از وی نہ نشاں بود مرا و نہ خبر بود
با موکبِ منصور ہما نا بسفر بود
از حسرتِ او آتشِ شوقم بہ جگر بود
شب ہائے فراقم ز شب گور بتر بود
روزم ز غمِ ہجر سیہ تر ز شب بود

لہ مجمع الفصحا جلد دوم صفحہ ۱۰۲ - صفحہ ۱۰۵ ۱۲ مصنف

دوشینه ہماں نزاول شب ناشدہ پاسے
زنگی شب افگندہ بہ رُخ تیرہ پلاسے
باتیر بیسندودہ و پوشیدہ لباسے
مہ بر سر گردوں شدہ چوں سیمیں طاسے
آمد ز در آں دلبر بے ترس و ہراسے
یکبارہ ببرد از دل من اندہ و تیمار

بربستہ میان و زدہ خنجر بہ کمر بر
مسکیں دلم از خنجر تیزش بخدر بر
سرداری سنجاب پوشیدہ ببر بر
چو خائے خراسانی آن را بزبر بر
از بس ہوس دیدن من داشت بسر بر
از رہ سوئے من آمدہ با چکمہ و شلوار

پُر خار سر و زلف و رُخ از گرد سیاہش
خشکیدہ دو عناب تر از صدمۂ راہش
از بس نزدہ شانہ بہ زلفینِ سیاہش
درہم شدہ و ریختہ بر گردِ کلاہش
چوں کاسۂ خوں سُرخ شدہ چشمِ سیاہش
از صدمۂ بے خوابی و از زحمتِ بسیار

یک دستہ گلِ سُرخ رہ آورد سفر داشت
از سنبلِ تر نیز یکے دستہ بسر داشت
از لعلِ بدخشانی یک حقہ گہر داشت

از حقۂ عجیب ترکے یکے تُنگ شکر داشت
چوں از دل بیمارِ منِ خستہ خبر داشت
در تُنگ شکر داشت دوائے دل بیمار

گفتم صنما گرچہ بسے رنج کشیدی
صد شکر کہ شاد آمدی و نیک رسیدی
جانِ رہی از دستِ غماں باز خریدی
برگو کہ دریں راہ چہ کردی و چہ دیدی
در موکب منصور چہ دیدی و شنیدی
چوں بود سر انجام و چہ شد عاقبت کار

گفتا کہ نبودی و ندیدی کہ چساں بود
نخچیر گہِ شاہ یکے لالہ ستاں بود
ہر گوشہ زخوں دجلۂ بغداد رواں بود
تا چشم ہمی کار کند تیر و کماں بود
تا ابر ہمی جائے دہد گرز و سناں بود
نہ دشت پدید از ید از لاش و نہ کہسار

دلہا ہمہ آسودہ زرنج و زحُزن بود
در دشت و بیاباں ہمہ گل بود و سمن بود
کبکِ دری از ہر طرفے قہقہہ زن بود
نخچیر گہ از آہو چوں دشتِ ختن بود
ایں ہا ہمہ از بخت شہ شیر شکن بود
کاقبال وے افزودہ بود بختش بیدار

بخ بخ چہ تماشائے و وہ وہ چہ شکارے
آراستہ صحرا و بیاباں چو نگارے
گیتی بزمستاں شدہ چوں تازہ بہارے
ہر گوشہ ز آہو و زنخچیر قطارے
ہر آہوئے آویختہ از ترک سوارے
چوں لاش بقنارہ قصاب نگوں سار

یہ مسمط بہت سلیس اور اس کی بحر بہت سُریلی ہے، اس کے پڑھنے سے آنکھوں کے سامنے اصل واقعہ کی سچی تصویر آجاتی ہے "شوخ پسر" کا جو موسم زمستاں میں شاہ کے ساتھ شکار کھیل کر ابھی ابھی واپس ہوا ہے، شاعر سے ملنے کے لیے اس قدر بے تاب ہونا کہ
از رہ سوے من آمدہ با چکمہ و شلوار[1]
اور پھر اس حال میں کہ بال اب تک بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہیں، آنکھیں دھوپ کی شدت، 'صدمہ رہ' اور 'بے خوابی' کی وجہ سے "کاسۂ سُرخ" بنی ہوئی ہیں، وہ آتا ہے اور تحفہ (رہ آورد) کے طور پر "یک دستہ گل سُرخ" اور "یک دستہ سنبل تر" یعنی اپنے سُرخ رخسار اور زلفیں "لعل بدخشاں" (ہونٹ) "حقۂ گہر" (دانت) لاتا ہے! غرض کہ بہت لاجواب تصویر کھینچی گئی ہے۔ بادشاہ نے جنگل میں جانوروں کا جو قتل عام کیا ہے، اس کے بیان سے اگر ناظرین کو
بیلے ذیریا (Bavaria) کے جنگل میں مسٹر بنکر (Bunker) کا

[1] چکمہ = بوٹ۔ شلوار = شکاری برجس ۱۲ مترجم

جوج اسٹورر کلاؤسٹن (J. Storer Clouston) کی تصنیف "Lunatic Abroad"[۵۱] کے صفحات میں زندہ جاوید بنے ہوئے ہیں، سترھاؤ یاد آجائے تو ساتھ ہی وہ یہ بھی یاد کرلیں کہ چنگیز خان مغل نے تیرھویں صدی عیسوی میں جنگلوں میں شکار کے جو کشتوں کے پشتے لگائے تھے، اس کے واقعات اب تک روایتوں میں محفوظ چلے آرہے ہیں اور یورپ میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی[۵۲]

فرہنگ کا بیان پارلیس (Paris.) داوری کے بھائی فرہنگ سے ملاقات کرنے سے پہلے ہی یعنی ۱۸۸۵ء میں اس کی دو نظمیں لنڈن میں میری نظر سے گزر چکی تھیں اور میں نے ان کی نقل بھی کرلی تھی۔ ان میں سے ایک تو وہ قصیدہ تھا جو ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر میرے پاس بھیجا گیا تھا اور مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ میں اس کا انگریزی ترجمہ کردوں تاکہ وہ ملکہ کی نظر سے گزر سکے، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ دوسری نظم میں، جو مئی ۱۸۸۵ء میں (شعبان ۱۳۰۴ھ) لکھی گئی ہو شہر پیرس کا حال عجیب وغریب انداز سے بیان کیا گیا ہو، اس کے بیشتر حصہ میں تو اس

---

۵۱ ملاحظہ ہو J. Storer Clouston's Lunatic Abroad (Shilling Edition) مطبوعہ ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۴۱۔ ۱۲ مصنف

۵۲ ملاحظہ ہو Baron D'ohsson's Histoire de s Mongols (تاریخ مغول) (طبع ہیگ وامسٹرڈم ۱۸۳۴ء) جلد اول صفحہ ۴۰۴، ۴۰۶۔

شہر کی تعریف ہی، لیکن خاتمہ پر جمہوری طرزِ حکومت پر سختی سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ نظم فرہنگ کے دوسرے کلام سے جو مجمع الفصحا (جلد دوم ص۳۸۴ - ص۳۸۵) میں نقل کیا گیا ہی، الگ رنگ کی ہی۔ اس میں فرانسیسی الفاظ کی کثرت ہی اور ایک عجیب مسخرہ پن اور ظرافت کا رنگ جھلکتا ہی۔ جو غالبًا مصنف نے قصدًا پیدا کیا ہی۔ اس میں ۸۰ شعر ہیں۔ طوالت کے خیال سے میں اس کی پوری نقل تو نہیں دے سکتا، لیکن شروع اور خاتمہ کے بعض اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

چشم بکشا بیا بہ بیں انوار — سوئے پارِس[1] از درو دیوار
دیدۂ راز بینِ خود بکشاے — تا بہ بینی ز ہر طرف اسرار
سرِّ آزادگان و آزادی — حق نمودہ برائے شاں اظہار
ہمگی خواجہ ہائے آزادند — نیست مملوک جملہ شاں احرار
ہمۂ شہر پادشاہ وشند — ہم زن و مرد و ہم صغار وکبار
ہمہ دارائے مکنت و ثروت — ہمہ با مال و دولتِ بسیار
ہمہ دارائے شغل وکارِ خود اند — نیست در ملک یک نفر بیکار
ہمگی صاحبانِ منصب و شغل — ہمہ سرکردہ و ہمہ سالار
شہر آراستہ چو خلدِ بریں — باغے آراستہ چو باغِ بہار
شب ز بس مشعل است و شمع و چراغ — نیست فرقے میانِ لیل و نہار
ماہ رویان و گل عذاراں را — بنگر از ہر طرف قطار قطار
کوچہ ہائے ہمہ چو باغِ ارم — ہر طرف بر نشستہ سرو و چنار

[1] پیرس دار الخلافہ فرانس۔ ۱۲ مترجم

در خیابان و کوچہ ہا بینی | کرسی و صندلی دویست ہزار
ہمہ کالسکہ ہائے پر دلبر | ہمہ واتورہا پُر از دلدار
نہ چہ کالسکہ ہا چہ حجلۂ حور | وہ چہ واتورہائے خوش رفتار
نہ ترم وا[۱] وامنی بوس[۲] بسے | ہست چنداں کہ ناید اوبشمار
راہِ دلِ شہر تا بآخر شہر | در خیابان و کوچہ و بلوار[۳]
گوئیا حجلۂ زِ قصر بہشت | می برندش ہمیں ہمین و لیسار
حجلہ پُر ز حوریانِ بہشت | دوزہ آں حجلہ برنشستہ قطار
ہر طرف بگذری گل و نسرین | ہر طرف بنگری گل و گلزار

✲ ✲ ✲ ✲ ✲

از گل و عطر و بوے ریحانہا | گشتہ پاریس طبلۂ عطار

✲ ✲ ✲ ✲ ✲

تا نیائی و خود نہ بینی تو | نہ کنی بر کلامِ من اقرار

✲ ✲ ✲ ✲ ✲

راست گویند و راست گردانند | راستی شاں شدہ ہمیشہ شعار
ہرچہ گیرند و ہرچہ بفروشند | راست گویند در ہمہ بازار
کس نگوید کلامِ نا مربوط | نشنود کس کلامِ ناہنجار
مہربانی و لطف و خوش خوئی | ہمہ با یک دگر کنند ایثار
ہمہ خلق عیسوی مذہب | ہمہ ملک عیسوی آثار

---

[۱] طرمیوے ۱۲ مصنف

[۲] آہنی لبس - کرایہ کی موٹریں - ۱۲ مترجم

[۳] Boulevard یعنی ٹھنڈی سڑک جس کے دونوں جانب درخت ہوں - ۱۲ مترجم

ہمہ روحانی و مسیحائی — ہمہ در کیش و دینِ خود ہشیار

در کلیسا برائے خدمتِ دیں — ہر کشیشے نمودہ استظہار

آں یکے طیلساں کشیدہ بسر — آں یکے بستہ بر کمر زُنّار

در کلیسائے نُتردام[1] دیدم — معتکف ہر دمے نماز گزار

صورتے نقش کردہ بر لوحے — شکلِ عیسٰے کشیدہ بہ سردار

سجدہ گاہِ ہمہ ہماں صورت — قبلہ گاہِ ہمہ ہماں دیوار

از سرِ صدق واز سرِ اخلاص — ہمہ در دینِ خویش برخوردار

ہمہ پاک و منزّہ و خوش خو — ہمہ عیسٰے صفت ہمہ احرار

ہمہ در کارِ خویشتن محکم — ہمہ در شغلِ خویشتن مختار

ہمہ در مشورت بہم ہم رائے — ہمہ در گفتگو بہم ہم کار

ہمہ با عقل و ہوش و با تدبیر — ہمہ با علم و دانش و افکار

لیک با ایں ہمہ صنایع و علم — رمزِ کے گویمت بکن اقرار

حکمت و طبِ شاں دروغ بود — کس نہ دیدہ کہ بہ شود بیمار

ہمہ شاں بادشاہ و سلطانند — زیں سبب نیست سلطنت درکار

شہرِ شاں منضبط نہ باسلطاں — فوجِ شاں منتظم نہ با سردار

قومے از عاقلاں و دانایاں — متفق مے روند در دربار

محفلے منعقد برائے ہمہ — مے نشینند متحد گفتار

گفتگو مے کنند در ہر امر — مشورت می زنند در ہر کار

مجلسے منعقد ز ہفت صدتن — ہمہ گاں عاقلان و کارگزار

متفق قول و متفق کاراند — متفق رائے و متفق گفتار

۱؎ (Notre-Dame) پیرس کا مشہور ترین گرجا ۱۲ مترجم

نام ایں جمع و نام ایں مجلس ‏ گشتہ جمہور در ہمہ اقطار
ہمہ دولت فرانسہ را ‏ قوم جمہور می دہند مدار
بعد لوئی فلیپ[1] و ناپلیان ‏ کس نہ کردہ بہ سلطنت اقرار
ہمہ سلطان دولت خویشند ‏ ہمگی پادشاہ ملک مدار
از رہِ علم و از رہ دانش ‏ نیست کارے برائے شاں دشوار
ہرچہ ایں گوید آں دگر شنود ‏ نبود شاں بہ قبل ہم انکار
گفتم ایں شعرہا مہِ شعبان
سال ہجری ہزار سی صد و چار

دوسرے معمولی درجے کے شعرا | گنجایش کی قلت کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ بعض کسی قدر کم مشہور شعرا کا بیان نظر انداز کردوں مثلاً آقا محمد حسن زرگر اصفہانی (وفات ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء - ۱۸۵۴ء[2])؛ آقا محمد عاشق جو اصفہان کے باشندے تھے اور خیاطی پیشہ کرتے تھے۔ (وفات ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء بعمر ۷۰ سال[3])؛ مرزا محمد علی سروش ساکن سی دہ الملقب بہ شمس الشعرا (وفات ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء - ۱۸۶۹ء[4]) اور آقا محمد علی جیحون یزدی جن کے حالات میں مجھے بجز ان چند اشارات کے جو ان کے کلام سے ملتے ہیں اور کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ انھوں نے نہ صرف مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی

---

[1] Napoleon و Louis Phillip ۱۲ مترجم

[2] مجمع الفصحا جلد دوم ص۱۵۱ - ص۱۵۲ - ۱۲ مصنف

[3] مجمع الفصحا جلد دوم ص۳۲۶ - ص۳۲۹ - ۱۲ مصنف

[4] مجمع الفصحا جلد دوم ص۱۸۴ - ص۱۹۵ - ۱۲ مصنف

کی ہی، بلکہ گلستان کے طرز پر نثر کی ایک کتاب نمکدان کے بھی مصنف ہیں۔ ان کا کلّیات بمبئی میں ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں لیتھو میں طبع ہوچکا ہی اور ۳۱۷ صفحات پر مشتمل ہی۔ مسبوق الذکر شعرا کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی ہیں جن کا شمار اگرچہ زمرۂ شعرا میں کیا جاتا ہی، لیکن در اصل وہ ادبیات کے دوسرے شعبوں میں ممتاز ہیں:- مثلاً رضا قلی خان ہدایت (ولادت ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء وفات ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء-۱۸۷۲ء)[1] جن کی تصانیف کے حوالے اس کتاب میں جابجا دیے گئے ہیں، مورخ تھے، مرزا محمد سپہر کاشی الملقب بہ لسان الملک[2] ناسخ التواریخ اور ایک اور نثر کی کتاب براہین العجم کے مصنف تھے؛ حاجی ملّا ہادی سبزواری (ولادت ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء-۱۷۹۸ء) فلسفی تھے اور اسرار کے تخلص سے شعر بھی کہتے تھے (وفات ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء)[3]۔ اسی طرح سے اور دوسرے لوگ بھی ہیں۔ ان سب کے علاوہ، ان لوگوں میں

---

[1] مجمع الفصحا جلد دوم کے خاتمے پر (ص ۵۸۱ - ص ۶۷۵) ان کی خود نوشتہ سوانح عمری موجود ہی۔ ۱۲ مصنف

[2] مجمع الفصحا جلد دوم ص ۱۵۶ - ۱۸۱۔ ۱۲ مصنف

[3] ملاحظہ ہو میری تصنیف Year among the Persians ص ۱۳۱ - ص ۱۳۴؛ ریاض العارفین ص ۲۴۱ - ص ۲۴۲ جس میں ان کا سن ولادت ۱۲۱۵ھ (مطابق ۱۸۰۰ء-۱۸۰۱ء) بتایا گیا ہی اور یہ بھی لکھا ہی کہ اختتام کتاب (ریاض العارفین) کے وقت یعنی ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء-۱۸۶۲ء میں ان کی عمر ۶۳ سال تھی۔ ۱۲ مصنف

جنھوں نے زمانۂ جدید میں قدیم مذہب شاعری کی نمایندگی کی ہے سب سے زیادہ مشہور قاآنی ہے اور اس کے بعد یغما، فروغی اور شیبانی کا نمبر آتا ہے، چنانچہ ہم اب انھیں کا حال لکھتے ہیں۔

۷۔ قاآنی (وفات ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء ۱۸۵۴ء)

قاآنی کو باتفاق رائے انیسویں صدی عیسوی کا مشہور ترین ایرانی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ شیراز میں ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء ۱۸۰۸ء کے قریب پیدا ہوا تھا، اس لیے کہ کتاب پریشان کے خاتمے پر خود اس نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ۲۰ رجب ۱۲۵۲ھ (۳۱ اکتوبر ۱۸۳۶ء) کو ختم ہوئی اور اس وقت کی عمر دو یا تین ماہ کم تیس سال کی تھی :-

شکر کہ از یاریٔ یزدانِ من — جمع شد اوراقِ پریشانِ من
نیست درو عاریتِ ہیچ کس — خاص منست آنچہ درو ہست و بس
جز دو سہ بیتے ز عرب و ز عجم — کآمدہ جاری بزبانِ قلم
خاصہ کہ در طیِّ عبارت ہمی — رفتہ بداں جملہ اشارت ہمی
تا ز حسودان نہ رسد دق مرا — سخرۂ باطل نہ شود حق مرا
رفتہ ز ماہِ رجب ایام بیست — پنجہ و دو سال و ہزار و دویست
کم بود از سی دو سہ ماہ سالِ من — لیک بسے خستہ بود حالِ من
بس کہ ز غم کوژتر از ہالہ ام — راست چہ پیران نود سالہ ام
لیک غمِ من غمِ عشق ست و بس — زانکہ جز او نیست کسم دادرس

شادی عالم ہمہ در ایں غم است　　عاشق ازیں غم بجانش خرم است
غم اگر اینست فزوں تر خوش است　　بر صفتِ قندِ مکرر خوش است
ہر کہ ازیں غم بدلش پرتوے است　　در نظرش ملک دو عالم جوے است
یا رب ازایں غم دلِ من شاد کن
وز غمِ دنیا دلم آزاد کن

قاآنی پہلے حبیب تخلص کرتا تھا | قاآنی کا اصل نام حبیب تھا اور اسی تخلص سے وہ پہلے شعر کہتا تھا اور اس کے اکثر ابتدائی کلام میں یہی تخلص نظر آتا ہے، بعد کو جب وہ اور مرزا عباس بسطامی (جو پہلے مسکین تخلص کرتا تھا) حسن علی مرزا شجاع السلطنۃ کے زمرۂ متوسلین میں داخل ہوئے جو کچھ زمانے تک خراسان اور کرمان کا گورنر رہ چکا تھا تو اس شہزادے نے اپنے دو بیٹوں اوگوتائے قاآن اور فروغ الدولہ کے ناموں پر ان دونوں کے تخلص بھی قاآنی اور فروغی رکھے[2]

قاآنی کا باپ گلشن | قاآنی شیراز میں پیدا ہوا، اس کا باپ مرزا محمد علی خود بھی شاعر تھا اور گلشن تخلص کرتا تھا۔ اگرچہ باپ کے انتقال کے وقت قاآنی بچہ تھا، لیکن کتاب پریشاں میں اس کی یہ عبارت:-

" اگرچہ میرے باپ کے انتقال کو پورے تیس سال ہو چکے

---

[1] میرا خیال ہے کہ یہ لفظ "جہان" ہے، اس لیے کہ "جان" سے سکتہ پڑتا ہے۔ ۱۲ مترجم
[2] مجمع الفصحا جلد دوم ص ۴۹۷ - ۱۲ مصنف

ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ دو ہفتہ کی بات ہے[1]
اس دوسرے بیان سے مختلف ہے جو منقولہ بالا قطعہ میں موجود ہے اور
جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کتاب پریشان کے خاتمے کے وقت وہ
پورے تیس سال کا بھی نہ تھا۔ تذکرہ دل کشا میں باپ اور بیٹے
دونوں کے حالات موجود ہیں، لیکن بدقسمتی سے اس کا جو نسخہ
میرے پاس ہے اس میں گلشن کے سالِ وفات کے اکائی اور دہائی
کے اعداد چھوٹ گئے ہیں اور نہ اس مختصر تذکرے سے جو مجمع الفصحا
میں دیا ہوا ہے اس کے متعلق کوئی مزید معلومات حاصل ہوتی ہے[2]۔
قاآنی کی بظاہر بے رنگ اور پھیکی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ
شیراز میں بسر ہوا۔ جب میں ۱۸۸۸ء کے موسم بہار میں شیراز میں نواب
مرزا حیدر علی خان کا مہمان تھا تو مجھے اس کمرے میں قیام کا شرف
حاصل ہوا تھا جس میں قاآنی کی سکونت رہا کرتی تھی۔ جیسا کہ ہم
ابھی بتا چکے ہیں وہ کچھ دن کرمان میں رہا۔ اس کی عمر کا آخری
حصہ یعنی جب اس نے مستقل طور پر درباری شاعر کی حیثیت اختیار
کر لی تھی، طہران میں گزرا اور وہیں اس کا انتقال ۱۲۷۰ھ مطابق
۵۴-۱۸۵۳ء میں ہوا۔ اس کی دو سب سے آخری نظمیں غالباً
وہ ہیں جو اس نے ۱۵ اگست ۱۸۵۲ء کو ناصر الدین شاہ کے تین
بابی قاتلوں کے حملے سے بال بال بچنے کے موقع پر بطور تہنیت و

---

[1] کلیات قاآنی مطبوعہ طہران ۱۳۰۲ھ مطابق ۸۵-۱۸۸۴ء صفحہ ۳۵۰۔ ۱۲ مصنف

[2] مجمع الفصحا جلد دوم صفحہ ۴۲۶ ۔ ۱۲ مصنف

مبارک باد کہی تھیں۔ میں نے اپنی کتاب[1] (Travellers' Narrative) میں ان دونوں کی نقلیں دی ہیں۔

قاآنی کے محاسن اور معائب | قاآنی میں تمام فارسی شاعروں سے زیادہ موسیقیت اور ترنم پایا جاتا ہے۔ زبان پر بھی اسے حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، لیکن بلند نظری اور شرافت کے اصولوں کے اعتبار سے اس کا درجہ بہت پست ہے۔ اس میں صرف یہی عیب نہیں ہے کہ جب کسی بڑے آدمی کی بات بنی ہوئی ہوتی ہے اور اس کا دور دورہ ہوتا ہے تو وہ اس کی خوشامد کرتا ہے، لیکن اگر اس بدنصیب کا ستارہ گردش میں آجائے تو فوراً آنکھیں پھیر کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ بلکہ دوسرا بڑا عیب یہ بھی ہے کہ اس کے کنائے بہت عریاں ہوتے ہیں اور وہ فحش ترین ابتذال پر اُتر آتا ہے۔ مثلاً اس نے حاجی مرزا آقاسی وزیر محمد شاہ کی شان میں کئی قصیدے کہے ہیں[2] اور اس کی خوبیوں اور انصاف کی تعریف میں آسمان سر پر اٹھا لیا ہے، لیکن جب اسی حاجی مرزا آقاسی کا بخت یاور نہ رہا تو اس کے جانشین مرزا تقی خان امیر کبیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں اپنے قدیم محسن کے متعلق کہتا ہے :-

بجائے ظالمے شقی، نشستہ عادلے تقی
کہ مومنانِ متقی کنند افتخارہا

---

[1] جلد دوم ص۳۲۵ - ص۳۲۶ - ۱۲ مصنف

[2] کلیات طہران اڈیشن ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء - ۱۸۸۵ء ص۱۹، ص۳۵، ص۴۰، ص۴۱، ص۴۳، ص۵۰، ص۸۴، ص۹۴، ص۹۵، ص۱۱۵، ص۱۲۳، ص۱۳۰ وغیرہ ۱۲ مصنف

اس کے عریاں کنایہ کی ایک نمایاں مثال درج ذیل ہے:-

خنداں خنداں دوید پیش من آمد دوخت دو لب بر لبم کہ بوسہ بزن ہا
الحق شرم آمدم بدیں لب منکر بوسہ زدن بر لبے چو لالۂ حمرا
کایں لب ہمچو زلوے من نہ سزاوار بر لبکے سُرخ تر زخون مصفّا
گفتمش ای ترک دادہ گیر دو صد بوس کز لبِ لعل تو قانعم بہ تماشا
روئے ترش کرد و گفت کبر فروہل کز تو تولّا نکو بود نہ تبرّا
شاعر و آں گاہ ردّ بوسۂ شیریں کودک و آں گاہ ترکِ جوز منقّا
مادح شاہی ترا رسد کہ بروبد خاکِ رہت را بزلف تا فتہ حورا
بوسہ بزن مر مرا زلطف و گرنہ نزدِ بتاں سرشکستہ گردم و رسوا
در ہمہ عضوم مخیّری پئے بوسہ از سرم اینک بگیر و بوسہ بزن تا
بوسہ چہ باشد کہ مستحق کناری شاکرم اینک بہ بوسۂ تو ولے با
روے و لبم ہر دو نیک در خورِ پوسند ایں من و اینک تو یا ببوس لبم یا

گفتمش ای تُرک ترکِ ایں سخناں گو
بس کن ازیں غمزہ و رمز و عشوہ و ایما

قاآنی کی زبان کی گھلاوٹ اور شیرینی کا صحیح لطف وہی پا سکتا ہے جو اس کی اصل نظموں کو فارسی زبان میں پڑھے۔ اور خوش قسمتی سے اس کا کلام آسانی سے دستیاب بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اس کی کلیات کئی مرتبہ شایع ہو چکی ہے[1]۔ میرے زیرِ استعمال طہران

---

[1] ملاحظہ ہو ای ایڈورڈ کی مرتبہ فہرست مطبوعات فارسی مخزونہ برٹش میوزیم (۱۹۲۲ء) کالم ۲۳۶ تا ۲۳۹ - ۱۲ مصنف

کا لیتھو اڈیشن مطبوعہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء یا ۱۸۸۵ء رہا ہے اور کسی قدر میں نے تبریز کے لیتھو اڈیشن مطبوعہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء نیز ان انتخابات سے[1] استفادہ کیا ہے جو فارسی کی اعزازی سند کے امتحان کے نصاب میں داخل تھے اور ۱۹۰۷ء میں کلکتہ سے طبع ہو کر شایع ہوئے تھے۔

قاچاری دور کے اکثر شعرا کی طرح قاآنی بھی قصیدہ، مسمط اور ترجیع بند میں خاص کمال رکھتا ہے، لیکن اس کی حسب ذیل غزل[2] بھی شکوہ اور ترنم میں کچھ کم نہیں ہے:-

یار مراست رند و بذلہ گو، شوخ و دلربا خوب و خوش سرشت
طرّہ اش عبیر، پیکرش حریر، عارضش بہار، طلعتش بہشت
نقش بند روح گوی از نخست، صورت و لبش تا کشد درست
لعل پارہ را ز آب خضر شست، لیس نمود حل با شکر سرشت
در قمارِ عشق از من آں پسر، بردہ عقل و دیں، جسم و جان و سر
ہوش و صبر و تاب، مال و سیم و زر، قول لوطیاں ہر چہ بود گذشت
پیش ازانکہ خط رویدش ز رخ، بود آں پسر سخت و تند خوے
و نیک از رخش سر زدست موے تا ازاں خطم چیست سرنوشت
چوں خطش دمید، خاطرم فسرد کاں صفائے حسن شد بدل بدرد
نکہت رخش باغ ورد برد، غنچہ از لبش داغ و ورد ہشت

---

[1] یعنی " Selections........recomm en ded for the Degree of Honour Examination in Persian " (Calcutta) 1907

[2] طہران اڈیشن ۱۳۰۲ھ ص ۳۵۵ ۱۲ مصنف

موئے عارضم داشت رنگ قیر، در فراق او شد برنگ شیر
در جوانیم عمر گشت پیر، دہر پنبہ کرد، چرخ ہرچہ رشت
خواہم از خدا، در ہمہ جہاں، یک قفس زمیں، یک نفس زماں
تا بکام دل مُرغ خورم در آں، بے حریف بد، بے نگار زشت
خوش دہد بہار، نشأ سرخ گل، گہ کنار رود گہ فراز پل
گہ بزیر سرو، گہ بپائے گل، گہ بصحن باغ، گہ بطرف کشت
مرد چوں شناخت مغز را ز پوست، ہرچہ بنگرد نیست غیر دوست
ہر کجا رود مُلک مُلک اوست، خواہ در حرم خواہ در کنشت
چوں مَلک مرا گفت کاے حبیب یک غزل بگو نغز و دل فریب
پس ازاں غزل او برد نصیب، زدرع زاں کس است کز نخست کشت
زین عابدین زیب مجد و جاہ، بندۂ امیر، نیک خواہ شاہ،
مُلک را شرف، خلق را پناہ، ہم مَلک لقا، ہم مَلک سرشت

اسی طرح سے جو نظم اس نے مہد عُلیا کی مدح میں کہی ہے وہ بھی اپنے حُسن اور زیر و بم کے اعتبار سے بے نظیر ہے[1]۔ وہ اس بند سے شروع ہوتی ہے:-

بنفشہ رُستہ از زمیں بطرف جویبارہا
و یا گسستہ حور عین ز زلف خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدۂ چساں جہد شرارہا
بہ برگ ہائے لالہ بیں میانِ لالہ زارہا
کہ چوں شرارہ می جہد ز سنگ کوہسارہا

---

[1] طہران اڈیشن ۱۳۰۲ھ ص ۳۰۹ - ۱۲ مصنف

اور یہ نظم[۱] بھی جو مرزا تقی خان امیر کبیر کی شان میں ہے اور حسب ذیل بند سے شروع ہوئی ہے مذکورہ بالا نظم سے کسی حیثیت سے کم نہیں ہے:-

نسیم خلد می وزد مگر ز جویبارہا
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزارہا
فراز خاک وکشتہا، دمیدہ سبزکشتہا
چہ کشتہا، بہشتہا، نہ دہ، نہ صد ہزارہا

قاآنی ان دور از کار اور بعید از فہم تخیلات میں نہیں پڑتا جو اکثر فارسی شعرا کو مرغوب ہیں، بلکہ وہ اپنی تشبیہات جانے بوجھے رسم و رواج اور روز مرّہ کے مشاہدات سے لیتا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں[۲] اس نے ان مختلف مراسم کا ذکر کیا ہے جو ایران میں عید نو روز کے سلسلہ میں منائے جاتے ہیں:-

عید شد ساقی بیا در گردش آور جام را
پشتِ پا زن دورِ چرخ و گردشِ ایام را
سین ساغر بس بود ای ترک مارا روز عید
گر نباشد ہفت سین[۳] رندان دُرد آشام را

[۱] طہران اڈیشن (۱۳۰۲ھ) ص۱۴ - ۱۲ مصنف

[۲] طہران اڈیشن (۱۳۰۲ھ) ص۱۴ - ص۱۵ - ۱۲ مصنف

[۳] نوروز کے موقع پر ایران میں سات چیزیں جن کے نام سین سے شروع ہوتے ہیں ایک خوان میں لگاتے ہیں یعنی سنبل، سیب، سوسن، سیم، سیر، سرکہ اور سپند ۱۲ مصنف

خلق را بر لب حدیثِ جامۂ نو ہست و من[1]
از شرابِ کہنہ می جویم لبالب جام را
ہر کسے شکّر نہد بر خوان و بر خواند دعا
من ز لعلِ شکرینت طالبم دشنام را
ہر تنے را ہست سیم و دانۂ گندم بدست
مائلم من دانۂ خال تو سیم اندام را
سیر بر خوان ست مردم را و من از عمر سیر
بے دل آرامے کہ بردہ است از دلم آرام را
پستہ و بادام نُقلِ روزِ نو روز است و من
بالب و چشمت نخواہم پستہ و بادام را
عود اندر عید می سوزند و من نالاں چوں عود
بے بُتے کز خال ہندو رہ زند اسلام را
یک دگر را خلق می بوسند و من زیں غم ہلاک
کز چہ بوسد دیگرے آں شوخِ شیریں کام را
سرکہ بر دستار خوان و خلق و ہیچو سرکہ دوست
میکند بر ما ترُش رنگیں رُخِ گلفام را
خلق را در سال روزے عید و من از چہر شاہ

---

[1] اس بڑے قومی تہوار کے موقع پر تمام خلقت نئے کپڑے پہنتی ہے، دوستوں میں جوز منقّی تقسیم ہوتا ہے ہاتھوں کو چاندی اور نقلے سے بھرا جاتا ہے۔ پستہ اور بادام کھائے جاتے ہیں، عود اور دوسرے بخورات جلائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو سلام بوسہ دے کر کیا جاتا ہے۔ ۱۲ مصنف

عید دارم سال و ماہ و ہفتہ صبح و شام را[1]
لاجرم ایں عید خاصِ من کہ بادا پایدار
سرّ و فرسش بشکنند بازارِ عیدِ عام را

قاآنی کی نظمِ الکن | قاآنی کا شمار بھی ان گنتی کے چند ایرانی شعرا میں ہو سکتا ہے جنھوں نے تفریحِ طبع کے لیے اصل لب و لہجہ کی نقل نظم میں اُتاری ہے، مثلاً ذیل میں اس کا وہ مشہور مکالمہ درج کیا جاتا ہے، جو ایک پیر مرد اور بچّہ میں ہُوا جو اتفاق سے دونوں الکن تھے۔

پیرکے[2] لال سحر گاہ بہ طفلِ الکن
می شنیدم کہ بدیں نوع ہمی راند سخن
کا ی زِ زُلفت صَ صَ صبحم شَ شَ شامِ تاریک
وی زِ چہرت شَ شَ شامم صَ صَ صبحِ روشن
تَ تَ تریاقیم وا نہ شَ شَ شہد لَ لَبت
صَ صَ صبر و تَ تَ تابم رَ رَ رفت از تَ تَ تن

---

[1] امامی ہراتی کی ایک نظم کے پہلے شعر میں بھی تقریبًا یہی خیال نظم کیا گیا ہے۔ میں نے اس نظم کی نقل تاریخ ادبیات ایران جلد سوم ص۱۱۲ (انگریزی) پر دی ہے۔

۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو میری کتاب Year among the Persians PP 118-119 نیز کلیاتِ قاآنی طہران اڈیشن (۱۳۰۲ھ) ص۳۴۲-۳۴۳

طفل گفتا۔ مَ مَ من را تو تو تقلید بکن
گَ گَ گم شو ز برم ای کَ کَ کمتر از زن
مِ می خواہی، مُ مُ مشتے بہ کَ کلّت بزنم
کہ بیفتد مَ مَ مغزت مَ میان دَ دہن
پیر گفتا وَ وَ واللہ کہ معلوم است ایں
کہ کہ زادم مِن بے چارہ ز مادر الکن
ہَ ہَ ہفتاد و ہَ ہشتاد و سہ سالت فزوں
گَ گَ گنگ دل لَ لالم بہ بِ خلّاقِ زمن
طفل گفتا خُ خُدا را صَ صَ صد بار شکر
کہ برستم بجہاں از مَ لَ لال دمَ محن
مَ مَ من ہم گَ گَ گنگم مِ مِ مثل تُ تُ تو
تُ تُ تو ہم گُ گُ گنگی مِ مِ مثل مَ مَ من

کتاب پریشاں | نظم کے علاوہ، قاآنی نے سعدی کی گلستاں کے طرز پر حکایات اور ضرب الامثال کا ایک مجموعہ موسوم بہ کتاب پریشان بھی لکھا ہے، اس میں ۱۱۳ حکایات ہیں اور آخر میں بادشاہوں اور شہزادوں کو ۳۳ اعلیٰ درجہ کی عیّارانہ نصیحتیں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب جس میں کچھ حصہ قاآنی کی خود نوشتہ سوانح عمری پر بھی مشتمل ہے اس کی کلیات (لیتھو طہران) کے صا۔صنا پر ہے اور اس کے کئی اور اڈیشن بھی نکل چکے ہیں جن کا ذکر مسٹر اڈورڈس نے اپنی فہرست مطبوعات فارسی برٹش میوزیم[۱] میں کیا ہے۔

[۱] کالم ۳۳۷-۳۲۹ ۔ ۱۲ مصنف

۸۔ فروغی (وفات ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ان کا پورا نام مرزا عباس ولد آقا موسے[1] بسطامی تھا اور یہ پہلے مسکین، لیکن بعد میں فروغی تخلص کرنے لگے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے بیس ہزار اشعار کہے ہیں جن میں سے پانچ ہزار کا انتخاب کلیات قاآنی کے طہران اڈیشن (۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء۔۱۸۸۵ء کے آخر میں (ص۲ - ص۵۵) موجود ہے۔ قاآنی میں اور ان میں آپس میں بہت ربط ضبط تھا، لیکن اس کے برخلاف انھوں نے مرثیہ کی بجائے غزل کے میدان میں طبع آزمائی کرنا زیادہ پسند کیا، چنانچہ ان کے کلام کے جس انتخاب کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے وہ تمام تر غزلیات ہی پر مشتمل ہے۔ اس کے شروع میں ان کی جو مختصر سی سوانح عمری بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوفی تھے اور ان کے تصوف میں وہ شدت اور غلو پایا جاتا تھا جو قدیم زمانے میں بایزید بسطامی اور حسین ابن منصور الحلاج کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے انھیں عقاید کی وجہ سے راسخ العقیدہ لوگ ان سے بدظن ہوگئے تھے اور ان پر معترض ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ناصر الدین شاہ نے جس کے عہد کے ابتدائی زمانے تک یہ زندہ تھے، انھیں طلب کیا اور کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ فرعون کی طرح سے تم بھی "انا ربکم الاعلےٰ" کا دعوےٰ کرنے لگے ہو اور الوہیت کے مدعی بنتے ہو۔ فروغی نے زمین بوس ہوکر عرض کی کہ یہ محض تہمت اور افترا ہے، میں ۷۰ سال تک رواں

دوراں رہنے کے بعد تو کہیں "ظل اللہ"[1] تک پہنچ سکا ہوں۔ ان کی پہلی غزل کے شروع کے تین اشعار سے جنھیں میں یہاں نقل کر رہا ہوں ان کے بقیہ کلام کے حسن اور عام رنگ کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا:

کی رفتۂ ز دل کہ تمنا کنم ترا | کی بودۂ نہفتہ کہ پیدا کنم ترا
غیبت نکردۂ کہ شوم طالب حضور | پنہاں نہ گشتۂ کہ ہویدا کنم ترا
با صد ہزار جلوہ بروں آمدی کہ من | با صد ہزار دیدہ تماشا کنم ترا

۹۔ یغما جندقی

مرزا ابوالحسن جندقی خاص طور پر اپنی غزلیات کے لیے مشہور ہیں۔ چونکہ اپنی فحش ہجوؤں میں یہ لفظ "زن قحبہ" بہت استعمال کرتے تھے، اس لیے ان کا نام بھی "زن قحبہ" پڑ گیا۔ مصنف مجمع الفصحا[2] نے ان کا ذکر اپنی کتاب میں سب کے بعد یعنی اپنی خود نوشتہ سوانح عمری سے پہلے، جس پر کتاب ختم ہوتی ہے، کیا ہے۔ یغما کچھ زمانے تک ایک غصہ ور اور بد زبان امیر ذوالفقار خان سمنانی کے یہاں منشیوں میں نوکر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے فحش کلام کا مجموعہ جو "سرداریہ"[3] کے نام سے مشہور ہے، اسی امیر کے اشارے سے مرتب ہوا

---

[1] یعنی بادشاہ ۱۲ مصنف

[2] جلد دوم صفحہ ۵۹۰۔ ۱۲ مصنف

[3] یہ نظمیں جو طہران کے لیتھو اڈیشن طبع ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء ۱۸۶۷ء کے صفحہ ۲۰۳۔ صفحہ ۲۱۱ پر موجود ہیں، ان کی ہزلیات کا صرف ایک جزو ہیں۔ ۱۲ مصنف

تھا۔ اگرچہ انھوں نے سنجیدہ اشعار کی بھی خاصی تعداد کہی ہے اور فارسی نثر میں لاجواب خطوط بھی لکھے ہیں جو ان کی ضخیم کلیات طبع طہران ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء۔۱۸۶۷ء میں شامل ہیں، لیکن ان کی شہرت یا یوں کہنا چاہیے کہ رسوائی تمام تر ان کی ہزلوں کی وجہ سے ہے۔ مصنف تذکرہ دل کشا نے ان کے حالات میں صرف تین سطریں لکھی ہیں[1]۔ وہ اِن سے ذاتی طور پر واقف نہ تھے، لیکن ان کا ذکر خیر سُن چکے تھے یعنی یہ :-

"کہ وہ ایک خوش مزاج اور نیک دل انسان، خوش طبع اور فصیح نوجوان ہیں جو اپنے کلام کی تدوین کے مطلق پروا نہیں کرتے"

قاآنی نے ذیل کے اشعار میں حسب عادت سب وشتم سے کام لیا اور ان پر چوٹیں کی ہیں[2]:-

ہفت اخترِ زن قحبہ و نُہ گنبد دوار
پیر گشتہ ز زن قحبگی مرشدِ اشرار
آں شاعرِ زن قحبہ کہ یغماش ستایند
شعرش ہمہ زن قحبہ و زن قحبگیش کار
گوئی ہمہ زن قحبہ و از خویش نگوئی
خوانی ہمہ زن قحبہ واز خود نہ خبردار

---

[1] میرے نسخہ کا ورق ۳۵ ب ۱۲ مصنف

[2] طہران لیتھو اڈیشن ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء۔۱۸۸۵ء ص ۳۷۲
۱۲ مصنف

زن قحبہ تو زن قحبہ تری از ہمہ مردم

عالم ہمہ زن قحبۂ مجہول و تو مختار

عکسے تو فتادست در آئینۂ عالم

تا آں کہ بہ زن قحبگیِ خود کنی اقرار

کلّیات یغما کے حصّے | کلّیاتِ یغما کا جو مذکورہ بالا اڈیشن طہران سے شایع ہوا ہی وہ حسب ذیل حصص پر مشتمل ہی:-

ا۔ نثر کی تحریریں: (ص ۲ - ص ۱۴۵)، اس حصہ میں وہ متعدد خطوط ہیں جو احباب اور ملاقاتیوں کو لکھے گئے تھے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہی، یہ سب کے سب بدقسمتی سے بے تاریخ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خطوط کے بغور مطالعہ سے اس شاعر کی سوانح عمری کے متعلق بہ کثرت مواد مل سکتا ہی۔ ان میں سے اکثر جن احباب، آشنا اور محسنوں کو لکھے گئے ہیں ان کا نام تک درج نہیں ہی، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے بیٹوں مرزا اسمٰعیل المتخلص بہ ہنر مرزا احمد صفائی، مرزا محمد علی خطر اور مرزا ابراہیم دستان کے نام ہیں۔ بعض ایسے مکاتیب ہیں جو کم و بیش مشہور اشخاص کے نام ہیں، مکتوب الیہ کا نام بھی درج ہی۔ ان میں سے اکثر خطوط میں انھوں نے خالص "پارسی نگاری" کی ہی اور عربی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا ہی۔ علیٰ ہذا بعض مکاتیب جنھیں "نامۂ بسیط" کا عنوان دیا گیا ہی، نہایت سادہ اور سلیس عبارت میں ہیں۔

ب۔ حصۂ نظم۔

(۱) غزلیات قدیمہ (ص ۱۴۶ - ص ۱۸۳)

(۲) غزلیاتِ جدیدہ (ص۱۸۴ - ص۲۰۳)

(۳) سرداریہ، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (ص۲۰۳ - ص۲۱۸) اس میں غزلیات ہیں اور تخلص سردار رکھا گیا ہے۔

(۴) قصابیہ (ص۲۱۸ - ص۲۳۱) یہ حصہ طرز ادا اور موضوع دونوں حیثیتوں سے (۳) کی طرح ہے، فرق اتنا ہے کہ اس میں بجائے سردار کے قصاب تخلص کیا گیا ہے۔

(۵) کتاب احمد (ص۲۳۲ - ص۲۴۷) (۳) اور (۴) کی طرح ہے، لیکن تخلص احمد رکھا گیا ہے۔

(۶) خلاصۃ الافتضاح (ص۲۴۸ - ص۲۶۵) مثنوی ہے، جس میں ایک نہایت شرمناک قصہ بیان کیا گیا ہے، اس قصہ کی پوری تفصیل ص۲۴۸ پر ایک حاشیہ میں کردی گئی ہے۔

(۷) کتاب صکوک الدلیل (ص۲۶۶ - ص۲۹۱) شاہ نامہ کی بحر میں مثنوی ہے، جس میں ایک شخص سید قنبر روضہ خواں (جسے یغما نے رستم السادات کہا ہے) کی ہجو ملیح کی گئی ہے۔

(۸) مراثی ائمہ (ص۲۹۲ - ص۳۰۱)

(۹) ترجیع بند اور ترکیب بند (ص۳۰۲ - ص۳۳۱) ان میں سے بھی اکثر فحش ہیں۔

(۱۰) قطعات (ص۳۳۲ - ص۳۵۵) یہ زیادہ تر فحش اور ہجویہ ہیں

(۱۱) رباعیات (ص۳۵۶ - ص۳۶۹) یہ بھی فحش ہیں۔

یغما کے پھکڑ اشعار| غزلیات قدیمہ اور جدیدہ اور مراثی (یعنی نمبر ۱ ۲ اور ۸ مصرحہ بالا) بس یہی یغما کے سنجیدہ کلام کا حصہ ہے

یعنی کل کلام کا تیسرا حصّہ۔ بقیہ کلام کے متعلق بس اسی قدر عرض
کرنا ہی کہ بجز [1] یعنی کتاب شکوک الدلیل کے ان میں سے کوئی اس
قابل بھی نہیں ہی کہ چھاپا جائے، ترجمہ کا تو ذکر ہی کیا ہی۔ بھکڑ اشعار
میں "زن قحبہ" کا لفظ تکیہ کلام ہی اور یغما اسی نام سے مشہور بھی ہوگیا
تھا۔ اگرچہ خود یہ لفظ بھی کچھ ایسا زیادہ مہذّب نہیں ہی، لیکن
اور جو جو باتیں اس کے اشعار میں ہیں، ان کے مقابلہ میں تو یہ
لفظ ثقاہتِ مجسّم معلوم ہوتا ہی۔

مراثی لیکن دوسری طرف اس کی سنجیدہ غزلیات اور مراثی بھی ہیں
جن سے ثابت ہوتا ہی کہ وہ اعلیٰ درجہ کے اشعار کہنے پر بھی قادر ہی
اور چاہے اس کے کلام میں قاآنی سے کم ترنم ہو، لیکن قدرتِ
زبان میں وہ اس سے کچھ بڑھا ہی ہوا ہی۔ اس نے مرثیہ میں ایک
نیا طرز بھی نکالا تھا، جسے وہ "مرثیۂ سینہ زنی" کہتا ہی۔ میں اب تک
اسے بھی من جملہ ان چند نئے اصناف کے سمجھے ہوئے تھا جو ۱۹۰۵ء
۱۹۰۶ء کے انقلاب کے بعد فارسی ادبیات میں پیدا ہوئے ہیں
چنانچہ میں نے اپنی کتاب Press and Poetry in Modern Persia
میں [1] اس کے نمونے بھی دیے ہیں۔ یغما نے اس قسم کے آٹھ نوحے
لکھے ہیں اور ذیل میں ان میں سے ہر ایک کے ابتدائی بند نقل
کیے جاتے ہیں۔

---

[1] نظم ۱۹ (صفحہ ۲۱۶ - ۲۱۸)
نظم ۳۱ (صفحہ ۲۴۶ - ۲۴۸) ۱۲ مصنف

نوحۂ سینہ زنی

می رسد خشک لب از شطِ فرات اکبرِ من
نوجوان اکبرِ من
سیلاتی بکن ای چشمۂ چشم ترِ من
نوجوان اکبرِ من
کسوتِ عمر تو تا این خم فیروزہ نمون
لعلے آوردہ بخون
گیتی از نیل عزا ساخت سیہ معجرِ من
نوجوان اکبرِ من
تا ابد داغ تو ای زادۂ آزاد نہاد
نتوان برد زیاد
از ازل کاش نمی زاد مرا مادرِ من
نوجوان اکبرِ من الخ

ولہ ایضاً

شکوہ از چرخِ ستمگر چہ کنم گر نہ کنم
چہ کنم گر نہ کنم
گلہ از گردشِ اختر چہ کنم گر نہ کنم
چہ کنم گر نہ کنم
غمِ عباس بلاکش چہ کشم گر نہ کشم
چہ کنم گر نہ کشم
نالہ بر حسرتِ اکبر چہ کنم گر نہ کنم
چہ کنم گر نہ کنم الخ

ولہٗ ایضاً

در شبت پوشیدہ بینم روزِ محشر آفتاب
آفتاب   باز سرکش آفتاب
وز صباحت آشکارا شامِ دیگر آفتاب
آفتاب   باز سرکش آفتاب
سُست ازیں سخت ابتلا ذرّات را بالا و پست
ہر چہ ہست   باز رہ از کار دست
شرم کن آخر نہ از ذرّہ کمتر آفتاب
آفتاب   باز سرکش آفتاب الخ

ولہٗ ایضاً

کوہ و صحرا خصم و شاہِ کم سپہ تنہا دریغ
وا دریغ   نُصرتِ اعدا دریغ
قلب ایماں را شکست و نُصرت اعدا دریغ
وا دریغ   نُصرتِ اعدا دریغ
آہ کز بے دولتانِ دیں بہ دُنیا باختہ
تاختہ   گشت کارش ساختہ
پادشاہِ کشورِ دیں، خسروِ دُنیا دریغ
وا دریغ   نُصرتِ اعدا دریغ الخ

ولہٗ ایضاً

شہرہ بینم عیاں در ہفت کشور آسماں
آسماں   شرے آخر آسماں

شام عاشور است ایں یا صبح محشر آسماں
آسماں شرمے آخر آسماں
آفتابے شُد ز دورت تیرہ اختر آسماں
آسماں شرمے آخر آسماں
باچنیں دوراں نہ گردے کاش دیگر آسماں
آسماں شرمے آخر آسماں الخ

ولہٗ ایضاً

زیں مصیبت نہ ہمیں از خاکیاں ماتم بپاست
کی رواست، سرنگوں گردی فلک
چار ارکان، شش جہت، تا نُہ فلک ماتم سراست
کی رواست، سرنگوں گردی فلک
نعرہٗ جن و ملک در ماتمِ فخرِ اُمم
از قِدم، تا دمِ شامِ عدم
از ثرےٰ تا ہم ثریّا از ثریا تا ثرےٰ ست
کی رواست، سرنگوں گردی فلک

ولہٗ ایضاً

ہفتۂ کیں، مہِ شر، سالِ دغل، قرنِ دغاست
خونِ ہدر مالِ ہباست
شبِ غم، روزِ ستم، شامِ الم، صبحِ عزاست
خونِ ہدر مالِ ہباست
فتنہ بیدار و اماں خفتہ و خصم از درِ کیں
تربت زاں پہ کمیں

رستہ بے شحنہ و خواں چیدہ و فرمان یغماست

خونِ ہدر مالِ ہباست ، الخ

ولہ ایضاً

زادۂ زہرا بہ کامِ زادۂ مرداں نگر

آہ ، آہ ، گردشِ دوراں نگر

ایں بخواری ، آں بعزت ، ایں ببیں وآں نگر

آہ ، آہ ، گردشِ دوراں نگر

آلِ مرداں تیغ برکف ، آلِ یسیں نقدِ جاں

زین واں ، گر نظر داری عیاں

نفیِ حق ، اثباتِ باطل ، کفر بیں ایماں نگر

آہ ، آہ ، گردشِ دوراں نگر

صوری حیثیت سے یہ آخری نوحہ ، میری کتاب :-
Press and Poetry in Modern Persia کی نظم
۱۹ سے بہت مشابہ ہے۔

مذکورہ بالا نوحے صوری حیثیت سے بہت دلچسپ ہیں۔ ذیل میں ایک اور نوحہ درج کیا جاتا ہے ، اس میں یہ گردان (انترہ) نہیں ہے اور اگرچہ یہ روزمرّہ میں ہے ، لیکن بہت سادہ اور کسی قدر دل کش ہے۔ اس کے ۱۹ اشعار میں سے صرف ابتدائی چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں :-

دلم از زندگانی سخت سیرہ ☆ بمیرم ہرچہ زوتر[1] باز دیرہ
زناں را دل سرائے درد و ماتم ☆ تنِ مرداں نشانِ تیغ و تیرہ
پسر در خوں تپاں، دخترعزادار ☆ برادر کشتہ و خواہر اسیرہ
بکامِ مادراں تختِ جگر خوں ☆ بحلقِ کودکاں خوں نابِ شیرہ
اسیراں را بجائے اشک وافغاں ☆ شرر در چشم و آتش در ضمیرہ
خروشِ تشنہ کاماں زیر و بالا ☆ زخاکِ تیرہ تا چرخِ اثیرہ

فحش گوئی و تقوی | یغما اور قاآنی[2] جیسے دو فحش گو شعرا کے دل میں شہدائے کربلا کا درد اور ان میں اس گہرے مذہبی جذبہ کا وجود جس کا ثبوت مذکورۂ بالا نظموں سے ملتا ہے، ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے، غالباً زمانۂ حال کی یورپی ادبیات میں اس کی قریب ترین مثالیں ورلین[3] (Verlaine) ہے۔

سپہر، ہدایت اور شیبانی | ناصر الدین شاہ قاچار کے طویل عہدِ حکومت کا خاتمہ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو اس کے قتل پر سے ہوا اور یہ قتل در اصل اس انقلاب کی پہلی علامت تھا، جس کے اصل نتائج دس سال بعد رونما ہوئے۔ اس زمانے کے بقیہ شعرا میں سے دو، یعنی مرزا محمد تقی کاشی المتخلص بہ سپہر اور مرزا رضا قلی خان ہدایت شاعر کی بجائے مورخ کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، چنانچہ آیندہ

[1] زود تر - ۱۲ مترجم

[2] ص ۱۶۵ ، ص ۱۶۶ پر قاآنی کا دل کش مرثیہ نقل کیا جا چکا ہے - ۱۲ مصنف

[3] (Verlaine) پال ورلین (۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۶ء) فرانسیسی شاعر تھا اس کے کلام میں فحش اور سنجیدہ دونوں مذاق پائے جاتے ہیں - اس کے کلام کا کچھ حصہ مذہبی رنگ میں بھی ہے ۱۲ مترجم

باب میں ہم ان کا ذکر مورخین کے سلسلے میں کریں گے۔ بہرحال ان دونوں کے حالات زندگی ہدایت کے مجمع الفصحا[1] سے، جس کے متعدد حوالے دیئے جا چکے ہیں، مل سکتے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر شاعر ابونصر فتح اللہ خاں کاشی المتخلص بہ شیبانی ہے، اس کے کلام کا ایک ضخیم انتخاب مطبع اختر قسطنطنیہ سے ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء ۱۸۹۱ء میں شایع ہو چکا ہے[2]۔ مجمع الفصحا (ص ۲۲۴ - ص ۲۴۵) میں بھی ان کا طویل تذکرہ موجود ہے، اگر قلت گنجایش مانع نہ ہوتی تو اس دور کے شعرا کی مذکورہ بالا فہرست کو اور طویل بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال ان میں سے جو نام مشہور ترین اور سب سے زیادہ قابل ذکر تھے وہ دیے جا چکے ہیں، اگرچہ مجھے افسوس ہے کہ ان کا بھی جیسا چاہیے تھا، مفصل تذکرہ نہیں کیا جا سکا۔

دورۂ انقلاب کے بعد کا طبقہ شعرا ۱۹۰۶ء کے انقلاب اور اس کے بعد کے زمانے میں جو جدید طبقہ پیدا ہوا ہے اس کا ذکر میں جس تفصیل سے اپنی ایک دوسری تصنیف[3] میں کر چکا ہوں،

---

[1] سپہر کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم ص ۱۵۶ - ص ۱۸۱ خود مصنف کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری ص ۵۸۱ - ص ۶۲۵ پر ملے گی۔ اس زبردست تذکرہ کا سال تصنیف ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء - ۱۸۷۲ء ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] اس کے مرتب مرزا اسمٰعیل ناصری قراجہ داغی ہیں۔ یہ مرزا رضا خان کے ایما سے مرتب ہوا تھا جو بعد کو ارفع الدولہ کے خطاب سے مخاطب ہوئے، اس کا حجم ۲۱۲ ص ہے

[3] یعنی "Press and Poetry in Modern Persia" Cambridge University Press 1914. PP. XL+357

وہ موجودہ جلد میں کسی طرح ممکن نہ ہو سکتی۔ ان معاصر شعرا میں غالباً دخو، عارف، اشرف (وہ حلا) قزوینی، اور بہار

سب سے زیادہ مشہور دخو	اشرف	
عارف قزوینی، سید اشرف گیلانی، اور بہار	اور بہار	

مشہدی ہیں۔ ان سب میں غالباً سب سے زیادہ نوعمر اور قابل ذکر شاعر دخو ہیں، اگرچہ میرا خیال ہے کہ حال میں انھوں نے کچھ زیادہ شعر نہیں کہے ہیں۔ میں نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں ان کی دو نظمیں (ص۳ اور ص۱۷) نقل کی ہیں، جن سے ان کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ایک یعنی "کبلائی" ہنگامہ خیز ظرافت کا نمونہ ہے تو دوسری ان کے سابق شریک کار مرزا جہانگیر خان شیرازی اڈیٹر صور اسرافیل کی یاد میں ہے۔[۱] "کبلائی" والی نظم اس قابلِ تعریف جریدہ (صور اسرافیل) کی اشاعت مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۷ء میں اور دوسری ۸۔ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء کے پرچہ میں شایع ہوئی تھی۔ بہار جو ملک الشعرا کا خطاب بھی رکھتے ہیں، اخبار نوبہار کے مدیر تھے جو بند ہو کر دوبارہ تازہ بہار کے نام سے شایع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کئی لاجواب نظموں کے مصنف بھی ہیں (میری مذکورہ بالا تصنیف کی نظم نمبر ۲، ۳۴ اور ۳۶ تا ۴۷)۔ نظم ۳۳ عارف کے

(بقیہ صفحہ ۴۶۴) اس میں پانچ صفحات کا ایک فارسی مقدمہ بھی ہے، نظمیں (اصل مع انگریزی ترجمہ) ص۱۲۵۔ ص۳۰۲ پر ہیں، ان کی کل تعداد ۶۱ ہے اور یہ علیحدہ بھی ۵۔ شلنگ میں مل سکتی ہیں ۱۲ مصنف

[۱] اس کا عنوان "مصیبت نامہ دوست یگانہ من ہدیہ برادر بے دفا، بہ پیش گاہ آں روح اقدس داعلی ہے" یہ نظم پروفیسر مرحوم کی مذکورہ بالا تصنیف کے ص۲۰۱ ص۲۰۲ پر ہے ۱۲ مترجم

کلام کا نمونہ ہی اور اشرف کی شاعری کا اندازہ نظم ۴ تا ۷، ۹ تا ۱۳، ۱۶ تا ۱۹، اور ۲۷ سے ہو سکتا ہی۔ میرا خیال ہی کہ زمانہ بعد انقلاب کے مذکورہ بالا شعرا کے بجز دوسرے شعرا کا کلام ہنوز یکجا شایع نہیں ہوا ہی۔ یہ ان کا کلام وقتاً وقتاً مختلف جرائد خصوصاً صورِ اسرافیل، نسیمِ شمال اور نوبہار میں نکلتا رہا ہی اور وہیں سے حاصل کیا جا سکتا ہی۔ آج کل کے اکثر ایرانی اخبارات جن کی تعداد اب بہت بڑھ گئی ہی، ادبیات کے عنوان سے ایک الگ حصہ مخصوص کر دیتے ہیں اور اس قسم کی نظمیں اسی میں شایع ہوتی ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ آج کل کی نظموں کا مقصد بجائے ستاہوں، وزیروں اور امیروں کو فرداً فرداً خوش کرنے کے زیادہ تر یہ ہوتا ہی کہ عام مذاق کا جو روز افزوں قوی ہوتا جاتا ہی، لحاظ رکھا جائے اور رائے عامہ کا جو دن بدن زور پکڑتی جاتی ہی، ساتھ دیا جائے۔ اس تبدیلیِ خیال کی اہمیت بھی ہم پہلے بتا چکے ہیں[1]۔

ادیب الممالک مرحوم اس موقع پر مجھے ایک اور شاعر کا بھی حال لکھ دینا چاہیے جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہؤا ہی، یعنی مشہورِ روزگار قایم مقام[2] کے پر پوتے مرزا صادق خان جو زیادہ تر ادیب الممالک کے لقب سے معروف ہیں۔ ان کا انتقال ۲۸۔ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۲۱۔ فروری ۱۹۱۷ء) کو ہؤا۔ ان کے ہم وطنوں میں ان کی بڑی قدر ہوتی ہی لیکن اب تک ان کی تصانیف

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا صفحہ ۲۳۳ ۔ ۱۲ مصنف

[2] مرزا ابوالقاسم قایم مقام کے حالات جلد ہذا کے صفحہ ۲۳۶ ۔ ۲۴۱ پر بیان ہو چکے ہیں ۱۲ مصنف

آسانی سے دستیاب نہیں ہوئیں۔ ان کے حالات کے متعلق میرے پاس حسب ذیل تین ذرایع معلومات ہیں: یعنی (۱) میرے کتب خانے کے قلمی نسخہ ۱۹ ا ؁ کے جو جدید شعرائے ایران کے حالات میں ہے، ص۳۹ - ص۴۰ (۲) کاوہ قدیم شمارہ نمبر۲۰ مورخہ ۱۵-اپریل ۱۹۱۶؁ء میں ان کی وفات پر تعزیتی نوٹ (۳) ان کے برادر عم زاد خان ملک حسینی ساسانی کا ایک رسالہ جو انھوں نے ۱۳۴۱؁ ہجری (۱۹۲۲؁ء) میں مطبع کاویانی سے شایع کیا تھا، اس میں انھوں نے ادیب الممالک کی نظموں کو یکجا شایع کرنے کے ارادے کا اعلان کیا تھا اور جن لوگوں کے پاس ادیب مرحوم کا ایسا کلام تھا جو ان کے پاس نہ تھا، ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔

ان کے ادبی مشاغل | میں نے اپنی کتاب "Press and Poetry in Modern Persia" میں جس موقع پر ان مختلف جرائد کا ذکر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً ان کے زیرِادارت نکلتے رہے، وہیں ان کے کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔ یہ اخبارات حسب ذیل تھے:- ادب جو مختلف زبانوں میں تبریز (ص۳۲ ، ص۳۹)، مشہد (ص۳۸) اور طہران (ص۳۹) سے شایع ہوتا تھا اور ۱۳۱۶؁ھ سے ۱۳۲۲؁ ہجری (۱۸۹۸؁ء-۱۹۰۵؁ء) تک نکلتا رہا؛ اخبار ارشاد جو ترکی فارسی دو زبانوں میں چھپتا تھا (ص۲۹) جسے وہ احمد بیگ آغایف قراباغی

؎ ملاحظہ ہو جلد ہذا کا ص۲۳۳۔ اس حصّہ کی ترتیب کے بعد میرے کرم دوست مرزا سلمان اسدی نے مجھے توجہ دلائی کہ مجلہ ارمغان شمارہ ۱۰ جلد سوم ص۱۵۰ - ص۲۵ پر ادیب الممالک مرحوم پر ایک دلچسپ مضمون شایع ہو چکا ہے۔ -مصنف

کی شرکت میں ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء۔۱۹۰۶ء) میں باکو سے نکالتے رہے، روزنامہ ایران سلطانی (ص۹۰۔ص۹۱) جس میں وہ ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء۔۱۹۰۴ء) میں مضامین لکھا کرتے تھے، عراق عجم (ص۱۱۸۔ ص۱۱۹) جس کے وہ ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں اڈیٹر تھے، اور مجلس (ص۱۳۲۔ ص۱۳۳) جس کے لیے ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں مضامین لکھا کرتے تھے، اپنی مذکورہ بالا تصنیف کے ص۳۰۰۔ ص۳۰۲ پر میں نے ان کی ایک مشہور ترین نظم بھی نقل کی ہے۔

ان کی مختصر سوانح عمری بہ ترتیب سنین۔

ادیب الممالک ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ مرزا عیسےٰ قایم مقام کی تیسری اور امام زین العابدین کی ۳۵ ویں پشت میں تھے۔ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء۔ ۱۸۹۰ء میں وہ تبریز میں امیر نظام (حسن علی خان گروسی) کے یہاں ملازم تھے، چنانچہ انھیں کے اعزاز میں انھوں نے اپنے سابقہ تخلص پروانہ کو بدل کر نیا تخلص امیر رکھا۔ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء۔۱۸۹۴ء) میں وہ امیر نظام کے ہمراہ کرمان شاہ اور کردستان گئے۔ اس کے بعد دو سال تک (۱۸۹۴ء۔۱۸۹۶ء) طہران کے دارالترجمہ دولتی میں ملازم رہے لیکن صفر ۱۳۱۴ھ (جولائی اگست ۱۸۹۶ء) میں امیر نظام کے ساتھ پھر آذربائجان واپس چلے گئے، یہاں ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء۔۱۸۹۹ء) میں انھوں نے کلاہ پہننا چھوڑ دی اور عمامہ باندھنے لگے، تبریز کے مدرسۂ لقمانیہ کے نائب شیخ ہو گئے اور یہیں سے اخبار ادب نکالا جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، وہ بعد کو مشہد اور طہران

سے بھی نکالتے رہے۔ ۱۳۱۸ھ-۱۳۲۰ھ تک (۱۹۰۰ء-۱۹۰۲ء)
وہ قفقاز اور خوارزم کی سیاحت کرتے رہے، یہاں سے وہ مشہد
گئے، لیکن آخرکار ۱۳۲۰ھ (مارچ ۱۹۰۳ء) میں وہ پھر طہران واپس
چلے آئے اور دو سال تک یعنی ۱۳۲۱ھ-۱۳۲۲ھ (۱۹۰۳ء-۱۹۰۵ء)
میں روزنامۂ ایران سلطانی کے لیے مضمون لکھتے رہے۔ ۱۳۲۳ھ
مطابق ۱۹۰۵ء-۱۹۰۶ء میں وہ باکو میں اخبار ارشاد کے شریک مدیر
رہے۔ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں وہ اخبار مجلس کے نامہ نگار خصوصی
رہے جو مرزا محمد صادق طباطبائی کی ادارت میں نکلتا تھا اور
۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں انھوں نے اخبار عراق عجم جاری کیا۔
جولائی ۱۹۰۹ء میں جب مشروطہ خواہوں نے طہران پر قبضہ کر لیا تو
یہ بھی ان کے ساتھ تھے اور بعد کو عراق اور پھر سمنان میں رئیس
عدلیہ کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں
ان کی اکلوتی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ دو سال بعد وہ نیم سرکاری جریدہ
آفتاب کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء-۱۹۱۷ء) میں یزد
میں رئیس عدلیہ مقرر کیے گئے، لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس تقرر
کے چند ہی روز بعد انھوں نے ۵۸ سال کی عمر میں طہران میں انتقال کیا۔[۱]

ان کے کلام پر تبصرہ | بقول ان کے چچازاد بھائی اور مخلص
دوست خان ملک کے، ادیب الممالک کی نظموں کی خصوصیت خاصہ
اور ان کی دل کشی کی بڑی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ ان کے طرز
میں خوبی اور جدت ہے، بلکہ ان کا بڑا کمال یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء

---

[۱] میں نے مذکورہ بالا سنین خان ملک کے رسالہ کے ص۲۲-ص۲۶ سے نقل کیے ہیں۔
۱۲ مصنف

تک کے سانحہ خیز زمانے میں ایرانیوں کے مزاج میں جو انقلابات اور تغیرات ہوتے رہے، انھوں نے اس کی پوری پوری تصویر اپنی نظموں میں کھینچ دی ہے۔ ہجو لکھنے میں انھیں اس قدر کمال حاصل تھا کہ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے کے ہجو نگار سوزنی سمرقندی[1] (انتقال ۵۹۶ھ مطابق ۱۱۷۳ء - ۱۱۷۴ء) کے وقت سے آج تک ایران میں کوئی شاعر ہجو نگاری میں ان کی ٹکر کا نہیں ہوا۔ خان ملک نے اپنے رسالہ میں ان سب نظموں کے ابتدائی اشعار نقل کر دیے ہیں جو ان کے پاس موجود تھیں اور ہر نظم کے اشعار کی تعداد بھی لکھ دی ہے۔ انھوں نے ان سب حضرات کو جن کے پاس ان کے ذخیرے کے علاوہ کچھ اور کلام ادیب الممالک کا ہو، دعوت دی ہے کہ یکم جمادی الاول ۱۳۴۲ھ (دسمبر ۱۹۲۳ء) سے قبل وہ ان سے خط و کتابت کریں، کیونکہ انھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اس تاریخ کو ان کے کلام کا جتنا مکمل اڈیشن ممکن ہو سکے، شایع کر دیں۔ اخبار کاوہ نے ان کی ایک نظم سے جو ایران میں روسی دست درازیوں کے متعلق تھی، حسب ذیل اشعار نقل کیے ہیں اور اس کا مقابلہ سعدی کی اس شہرہ آفاق نظم سے جو مغلوں کے ہاتھوں زوال خلافت[2] کے موقع پر لکھی گئی تھی، انوری کی نظم سے جو اس نے

---

[1] تاریخ ادبیات ایران جلد دوم (انگریزی) ص [illegible] ۱۲ مصنف

[2] تاریخ ادبیات ایران جلد دوم ص ۲۹ - ص ۳۰ (انگریزی) ۱۲ مصنف

ترکان غز[۵۱] سے حملہ کے موقع پر کہی اور حافظ کے اس شعر سے کیا ہو جو اس نے تیمور کی چیرہ دستیوں کے متعلق لکھا ہو[۵۲]۔ بہر حال ادیب الممالک کے وہ اشعار یہ ہیں :-

چون برّہ بے چارہ بچہ پالش نہ پوست
از بیم بہ صحرا درنہ خفت نہ بنشست
خرسے بہ شکار آمد و بازوش فروبست
شد برّۂ ما طعمہ آں خرس زبردست
افسوس براں برّۂ نوزادۂ سرمست
فریاد ازاں خرس کہن سال شکم خوار

میرے کتب خانے کے قلمی نسخہ نمبر ۱۹ ا کھ (۵۴۵) میں ان کی بارہ تصانیف کا ذکر کیا گیا ہو، جن میں عربی اور فارسی کے دیوان، مقامات، سفرنامہ، ہیئت، جغرافیہ، عروض اور دیگر علوم پر کئی کتابیں ہیں -

---

[۵۱] تاریخ ادبیات ایران جلد دوم ص ۳۸۴ - ص ۳۸۹ (انگریزی) ۱۲ مصنف

[۵۲] یہ اس مشہور شعر کی طرف اشارہ ہو :-

فغاں کیں لولیاں شوخ دشنگ شیریں کار شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را

لیکن یہ مقابلہ کچھ یوں ہی سا ہو - ۱۲ مصنف

[۵۳] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا ص ۲۳۳ - ۱۲ مصنف

حصّۂ سوم

گزشتہ چار صدیوں کی فارسی نثر

باب ہشتم

عقیدۂ شیعیت اور اس کے مبلّغین۔ مجتہدین اور مُلّا

زمرۂ مجتہدین | خاندانِ صفویہ کی بدولت شیعیت کا جو احیا ہوا ہے اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ مجتہدوں اور ملّاؤں کا ایک ذی اثر حلقہ پیدا ہوگیا جسے یوروپین مصنّفین اکثر اوقات "The Clergy" (اہلِ کلیسا) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ اصطلاح صحیح نہیں ہے لیکن پھر بھی سُنّی علما کی بہ نسبت جو صرف فقہ اور کتاب اللہ کے عالم ہوتے ہیں اور کسی قسم کی الوہیت یا کوئی حکم الٰہی ان کے پاس نہیں ہوتا، اس کا اطلاق شیعہ مجتہدین پر زیادہ ہوسکتا ہے۔ علماء اہلِ سنت اور مجتہدین شیعہ میں سب سے بڑا علمی اختلاف مسئلہ

مسئلہ اجتہاد | اجتہاد کے متعلق ہے۔ "اجتہاد" ایک عربی لفظ ہے۔ جس کے اصطلاحی معنے "کتاب اللہ اور حدیثوں کا مطالعہ کرکے دقتِ نظر اور "جہد" کے ساتھ ان کے جدید حقایقِ مذہب تلاش کرنا اور سند سے ان کی تشریح کرنا" ہیں۔ جو شخص اس مرتبے پر پہنچ جائے اسے مجتہد کہتے ہیں اور اس کا درجہ تقریباً وہی ہوتا ہے جو کلیسائے روم میں اسقف کا ہوتا ہے۔ سنیوں میں مجتہدین کی طرح کا کوئی رتبہ یا درجہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ ان کا عقیدہ تو یہ ہے کہ چار اماموں یعنی ابوحنیفہؒ (وفات سنہ ۱۵۰ھ مطابق سنہ ۷۶۷ء)، مالک ابن انس رح (وفات سنہ ۱۷۹ھ

مطابق ۷۹۵ء)، الشافعیؒ (وفات ۲۰۴ھ مطابق ۸۲۰ء) اور احمد ابن محمد ابن حنبلؒ (وفات ۲۴۱ھ مطابق ۸۵۵ء) کے بعد باب الاجتہاد (جس کی تشریح اوپر ہو چکی ہے) ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ غرض کہ اجتہاد کا دروازہ جو مجتہدین شیعہ کے لیے اب تک کھلا ہوا ہے، سنّیوں کے لیے ایک ہزار سال سے زیادہ ہوئے کہ بند ہو گیا ہے۔ اگرچہ دوسری حیثیات سے شیعیت، سنّیوں کے عقاید کی بہ نسبت زیادہ تنگ نظری اور غیر روا داری پر مبنی ہے، لیکن مذکورہ بالا اصول کے اعتبار سے اس میں زیادہ لچک اور نئے حالات سے مطابقت کرنے کی زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔

قسمت آزماؤں کا دینیات کی طرف میلان۔

جیسا کہ اس باب میں آگے چل کر بیان ہوگا، ان علمائے دین کو جو رسوخ اور اقتدار حاصل ہوا اس کا اثر یہ پڑا کہ وہ من چلے نوجوان جو درصل یا بخیال خود اس فن کی ضروری صلاحیت رکھتے تھے، شاعری، علم ادب اور ذہن آزمائی کے دوسرے میدانوں کو چھوڑ چھوڑ کر دینیات کی طرف جھک پڑے، چنانچہ صفویہ کے زمانے میں شاعروں کی جو کمی اور علمائے دین کی جو کثرت نظر آتی ہے، اس کی وجہ یہی تھی۔ وہ زمانہ عامہ بندوں "اہل العمایم" کے لیے خاص طور پر سازگار تھا۔ شاہان صفویہ نے جو اپنے آپ کو "سگ آستان ائمہ معصومین" یا "حامی مذہب اثنا عشر" کہنا باعث فخر سمجھتے تھے، اپنی خوش اعتقادی سے جو متعدد مدارس قایم کیے تھے، یا جن کے لیے اوقاف اور رقمیں منظور کی تھیں ان میں درس لینے والا ہر غریب بھوکا طالب علم مجتہد

بن کر لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک ہونے اور شاہانہ اعزازات سے سرفراز ہونے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

جماعتِ علما کا سب سے الگ رہنا

ایران کا کوئی طبقہ غیر ملکیوں اور غیر مسلموں سے اتنا دور دور اور اپنا دامن بچائے ہوئے نہیں رہتا جتنا کہ ملاؤں کا طبقہ۔ ایران میں اگر کوئی شخص اچھی طرح فارسی جانتا ہو تو نہ صرف حکمران طبقے اور عہدے داروں سے میل جول پیدا کر سکتا ہے جو ایران کے اور سب طبقوں سے زیادہ یورپی عادات اور خیالات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ تجّار اہلِ حرفہ، صنّاع، زمینداروں کسانوں، درویشوں، بابیوں، بہائیوں صوفیوں غرض کہ سب سے ربط ضبط پیدا کر سکتا ہے، لیکن ملّاؤں کے ساتھ بے تکلّفی پیدا کرنے کا موقع شاید چند ہی یورپی حضرات کو میسّر آسکتا ہے۔ اس طبقہ کی مخصوص، سب سے الگ تھلگ اور عام طور پر متعصب زندگی پر روشنی ڈالنے والی (کم از کم میری رائے میں) بہترین کتاب قصص العلماء ہے جو زمانۂ جدید میں فنِ سیر پہ لکھی گئی ہے[1]۔ اور حیثیتوں سے یہ کتاب معمولی درجہ کی ہے۔ اس کے مصنف محمد ابن سلیمان تُنکابنی ہیں جو ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کتاب کو انھوں نے تین ماہ اور ۵ یوم میں لکھ کر ۱۷۔ رجب ۱۲۹۰ھ (۱۰۔ ستمبر ۱۸۷۳ء) کو ختم کیا،

قصص العلما

---

[1] میرے پاس اس کتاب کے دو لیتھو نسخے ہیں، ایک تو طہران اڈیشن جو صفر ۱۳۰۴ھ (نومبر ۱۸۸۶ء) میں شائع ہوا تھا اور دوسرا وہ جو (غالباً) لکھنؤ میں ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء - ۱۸۸۹ء میں چھپا۔ ۱۲ مصنف

اس میں چوتھی صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری (دسویں سے انیسویں صدی عیسوی) تک کے شیعہ علما کا حال لکھا گیا ہے۔ ناموں کی ترتیب میں عجیب گنجلک ہے، یعنی نہ وہ سن وار ہیں اور نہ ردیف وار۔ مصنف نے خود اپنی آپ بیتی چوتھے نمبر پر بیس صفحوں میں لکھی ہے اور مختلف شرحوں اور دوسری تحریروں کے علاوہ اپنی ۱۹۶ تصانیف بتائی ہیں۔ میں نے بہت عرصہ ہوا شیخیوں اور بابیوں کے بعض حالات کے متعلق اس کتاب سے تھوڑا بہت استفادہ کیا تھا، لیکن اسے بالاستیعاب پڑھنے کا موقع مجھے ۱۹۲۳ء میں ایسٹر کی تعطیلات میں ملا۔ میں نے کوشش کر کے اس کی خشک، غیر ضروری اور پوچ عبارتوں کے طومار سے کچھ تھوڑی سی معلومات فراہم کی ہیں جو حق یہ ہے کہ اس سے بہتر کتب سوانح میں بھی نہیں دستیاب ہو سکتی اور میں سر دست مختصراً اسی کو پیش کیے دیتا ہوں۔

علم الرجال علم الرجال دینیات کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے، اس لیے کہ مذہب کے تنقیدی مطالعہ کے لیے اس علم کا جاننا ضروری ہے۔ کتب الرجال کی تعداد بے شمار ہے۔ اسپرنگر (Sprenger) نے رجال پر مشہور ترین تصنیف یعنی محمد ابن حسن ابن علی طوسی المعروف شیخ الطائفہ (وفات ۴۶۰ھ مطابق ۱۰۶۷ء) کی فہرست کا جو اڈیشن[1] شایع کیا ہے، اس میں اس نے اسی تصنیف کی ہم پلہ اور چار کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے: یعنی شیخ احمد ابن علی النجاشی (وفات ۴۵۵ھ مطابق

---

[1] سلسلۂ مطبوعات Bibliotheca Indica مصنف

۱۱۶۳ء) کی اسماء الرجال[۱]، محمد ابن علی ابن شہر آشوب مازندرانی (وفات ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ء) کی معالم العلما، حسن ابن یوسف ابن مطہر الحلّی (ولادت ۶۴۸ھ مطابق ۱۲۵۰ء) وفات ۷۲۶ھ مطابق ۱۳۲۶ء) کی ایضاح الاشتباہ، اور یوسف ابن احمد ابن ابراہیم البحرانی (وفات ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء-۱۷۷۳ء) کی کتاب لؤلؤۃ البحرین جو کسی قدر مخصوص حیثیت رکھتی ہے اور جس میں خصوصیت کے ساتھ علمائے بحرین کا حال لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور تصنیف جو ایک خاص مقام کے متعلق ہے محمد ابن حسن ابن علی الحر العاملی (ولادت ۱۰۳۳ھ مطابق ۱۶۲۳ء-۱۶۲۴ء) کی کتاب امل الآمل فی علمائے جبل عامل ہے جو ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۶ء میں لکھی گئی تھی۔

یہ سب کتابیں عربی میں ہیں لیکن اس موضوع پر ایک اور اہم اور قدیم کتاب فارسی میں بھی ہے جو ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں لکھی گئی مجالس المومنین تھی، یعنی سید نور اللہ ابن شریف المرعشی شوستری کی مجالس المومنین۔ ان کو ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء-۱۶۱۱ء) میں غالی شیعہ ہونے کے الزام میں ہندوستان میں قتل کر دیا گیا تھا۔ وسعتِ نظر اور سہل الفہم ہونے کی حیثیت سے یہ کتاب مذکورہ بالا تصانیف سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے بارہ ابواب میں علما کے علاوہ اور ہر شعبہ کے شیعہ مشاہیر کے حالات بھی دیے ہوئے ہیں، نیز اثنا عشری حضرات کے علاوہ، اس میں ان سب لوگوں کے

---

[۱] لیتھو بمبئی ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء-۱۹۰۰ء) کشف الحجب میں (ملاحظہ ہو ص ۲۶ آئندہ) مصنف کی تاریخ وفات ۶۰۵ھ مطابق ۱۲۰۸ء بتائی گئی ہے ۱۲ مصنف

حالات بھی موجود ہیں جو حضرت علی کی خلافت بلافصل کے معتقد ہیں۔

روضات الجنات فن رجال پر جو کتابیں زمانۂ حال میں یعنی گزشتہ ساٹھ سالوں میں لکھی گئی ہیں ان میں علاوہ قصص العلما کے اور تین کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں جامع ترین "روضات الجنات فی احوال العلما والسادات" ہے جو محمد باقر ابن حاجی زین العابدین الموسوی کی تصنیف ہے اور ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء۔ ۱۸۷۰ء میں عربی زبان میں لکھی گئی۔ جلد اول کے صفحہ ۱۲۶۔ صفحہ ۱۲۸ پر مصنف کی خودنوشتہ سوانح عمری درج ہے، سوانح عمریوں کی ترتیب ردیف وار ہے اور شیعہ علما اور دوسرے شیعہ مشاہیر کے علاوہ، ہر دور کے مسلمان عالموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں، چنانچہ اس میں ہمیں مشہور صوفیا جیسے بایزید بسطامی، ابراہیم ابن ادھم، شبلی اور حسین ابن منصور الحلاج، عربی شعرا مثلاً ذوالرمہ، فرزدق، ابن المعتز، ابو نواس اور المتنبی، ایرانی شعرا جیسے سنائی، فریدالدین عطار، ناصر خسرو اور جلال الدین رومی اور دیگر اہل علم حضرات مثلاً البیرونی ثابت ابن قرہ، حنین ابن اسحٰق، ابو سینا وغیرہ کے حالات بھی ملتے ہیں اور ان کے علاوہ قریب تر زمانے کے شیعہ مجتہدین کے حالات بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے یہ کتاب ہمارے موجودہ موضوع کے لیے خاص طور پر اہم ہو گئی ہے۔

نجوم السما نجوم السما[1] کا سن تصنیف وہی ہے جو روضات الجنات کا، لیکن وہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں گیارھویں، بارھویں اور

---

[1] لیتھو لکھنؤ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء تا ۱۸۸۶ء۔ حجم صفحہ ۴۲۴۔ ۱۲۰ مصنف

تیرھویں صدی ہجری کے شیعہ مجتہدین کے حالات درج ہیں، جن کی ترتیب عام طور پر سن وار ہے۔ اس کے مصنف محمد ابن صادق ابن مہدی ہیں۔ اگرچہ اس نوع کی اور دوسری کتابوں کی طرح سے اشاریہ (Index) اور فہرست مضامین کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا افادہ کسی قدر کم ہوگیا ہے، تاہم اس میں مفید معلومات کا اچھا خاصہ ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔

کشف الحُجب | یہ تیسری کتاب ہے جس کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں "کشف الحجب" اگرچہ اصل میں یہ اسامی کتب پر ہے، تاہم تذکروں کا بھی اچھا خاصہ مواد اس میں موجود ہے۔ اس کا پورا عنوان کشف الحُجب والاستار عن اسامی الکتب والاسفار ہے۔ اس میں ردیف وار ۱۴۱۴۳ شیعہ مذہب کی کتابوں کا ذکر ہے۔ کتاب کی زبان عربی ہے۔ اس کے مصنف سید اعجاز حسین ہیں جو ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) میں انتقال کیا۔ اس کے مرتب محمد ہدایت حسین ہیں جنھیں اصل کتاب کا قلمی نسخہ بانکی پور کے لاجواب کتب خانے میں ملا تھا۔ مسٹر ای۔ ڈے نی سن راس نے ہمت افزائی کر کے ان سے اصل کتاب بغرض اشاعت ایڈٹ کرائی جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے خرچ سے شایع ہوئی ہے۔[۵۱]

شیعہ شعرا کا تذکرہ | شیعہ شعرا کے حالات میں ایک اور قابلِ ذکر

---

[۵۱] طبع کلکتہ بیپ ٹسٹ مشن پریس (Baptist Mission Press) ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) حجم ۶۰۶ص ۱۲ مصنف

عربی کتاب تیمیۃ السحر فی من تشیع و شعر ہو جس کے مرتب یوسف ابن یحیٰی الیمنی الصنعانی ہیں۔ یہ کتاب نایاب ہو اور جہاں تک مجھے علم ہو، ہنوز غیر مطبوعہ ہو۔ خوش قسمتی سے میرے پاس اس کا آخری نصف حصہ جو ردیف ط تا ے پر مشتمل ہو، موجود ہو[۱]۔

ان تصنیفات کا موازنہ و مقابلہ

ان کتابوں میں سب سے زیادہ عالمانہ اور جامع کتاب روضات الجنات ہو، لیکن جو حضرات صرف فارسی سے واقف ہیں ان کے لیے مجالس المومنین، نجوم السما اور قصص العلمار بہت کچھ کارآمد اور کسی قدر پر لطف ثابت ہوں گی۔ رجال کی قدیم کتب مثلاً الطوسی، النجاشی وغیرہ کی تصنیفات عام طور پر بہت خشک ہوتی ہیں اور تفصیلی مطالعہ نہیں بلکہ صرف حوالہ کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر ہماری بحث خصوصیت کے ساتھ صفویہ اور ان کے بعد کے زمانے کے مجتہدین سے ہو، لہذا متقدمین شیعہ علما کی نسبت صرف دو ایک باتیں بتادینا ہی کافی ہوگا، ویسے ان کے ناموں، القاب اور ولادت اور وفات کی تاریخوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہر طالب علم کو ہونی چاہیے۔ ان علمائے متقدمین میں مشہور ترین تین محمد ہیں[۲]: یعنی

---

[۱] اس کتاب کے ایک اور نسخہ کے ذکر کے لیے ملاحظہ ہو اہلوارڈٹ کی فہرست کتب عربی در برلن (Ahlwardt's Berlin Arabic Catalogue) جلد ششم ص۵۰۲ - ص۵۰۳ نمبر ۷۴۲۳۔ ۱۲ مصنف

[۲] قصص العلما طبع لکھنؤ ص۲۲۱۔ ذیل عنوان محمد باقر مجلسی ۱۲ مصنف

دینیات شیعہ کے بانی المحامدۃ ثلاثہ والکتب الاربعہ

الکلینی (محمد ابن یعقوب وفات ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۱ء)، ابن بابویہ (محمد ابن علی ابن موسیٰ وفات ۳۸۱ھ مطابق ۹۹۱ء یا ۹۹۲ء)، اور طوسی (محمد ابن حسن، وفات ۴۶۰ھ مطابق ۱۰۶۸ء) جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان تینوں میں سے پہلے نے کافی تصنیف کی، دوسرے نے من لایحضرہ الفقیہ اور تیسرے نے استبصار اور تہذیب الاحکام۔ شیعہ ان چاروں کتابوں کو الکتب الاربعہ کہتے ہیں[۱]۔ کشف الحجب میں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان چاروں کتابوں کا مفصل بیان موجود ہے۔

زمانۂ حال کے تین محمد "المحامد الثلاثہ"

زمانۂ حال میں بھی تین محمد ہوئے ہیں یعنی محمد ابن حسن ابن علی الحر العاملی، جن کی تصنیف امل الآمل کا ذکر اوپر ہو چکا ہے؛ محمد ابن المرتضیٰ المعروف بہ ملا محسن فیض (وفات تقریباً ۱۰۹۱ھ مطابق ۱۶۸۰ء)، اور محمد باقر مجلسی (وفات ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء یا ۱۷۰۰ء)[۲]۔ ان تینوں میں سے بھی ہر ایک نے ایک ایک زبردست تصنیف چھوڑی ہے؛ پہلے نے وسائل لکھی، دوسرے نے وافی اور تیسرے نے بحار الانوار۔ یہ تینوں کتابیں زمانہ جدید کی الکتب الثلاثہ کہلاتی ہیں۔

کتب عقائد عموماً عربی میں ہوتے ہیں

علما و محققین اسلام کی دوسری تصانیف کی طرح، شیعہ عقائد، فقہ اور حدیث کی یہ سات زبردست کتابیں بھی عربی میں ہیں۔ در اصل اسلام میں عربی کی وہی حیثیت ہے جو کلیسائے روم کے مذہبی

[۱] انھیں الاصول الاربعہ بھی کہا جاتا ہے، دیکھو نجوم السماء ص۲۵ ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو تصنیف ہذا کا ص۱۱۴ - ۱۲ مصنف

ادبیات میں لاطینی کی۔ افسوس ہے کہ قلّت گنجایش کی وجہ سے میں ان ساتوں تصانیف پر تفصیلی بحث کرنے سے مجبور ہوں۔ اس موقع پر

قریب تر زمانے کی فارسی مذہبی کتابیں

ہمیں خصوصیت کے ساتھ ان عام فہم عقائد کے رسالوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے جو فارسی میں لکھے گئے ہیں اور جن کے توسط سے عہد صفویہ کے بڑے بڑے مجتہدین نے اپنے مذہبی عقائد کی نشر و اشاعت اس قدر کامیابی کے ساتھ کی لیکن گنجایش کی کمی کی وجہ سے ان کا بھی جیسا چاہیے پورا پورا بیان نہیں کیا جاسکتا۔ صاحب روضات الجنات کا قول ہے[۵۱] کہ کمال الدین حسین اردبیلی المعروف بہ الاٰلہی جو شاہ اسمٰعیل اول کے ہم عصر تھے، پہلے شخص تھے جنھوں نے مذہب شیعہ کی شرعیات پر فارسی میں کتابیں لکھیں:

"نُقِل انہ اول من صنّف فی الشرعیات علی مذھب الشیعۃ بالفارسیۃ۔"

ابتدائی دور صفویہ میں کتب عقائد شیعہ کی کمی

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں[۵۲] کہ جب شاہ اسمٰعیل تبریز فتح کرچکا تو اسے ایسے استادوں اور کتابوں کی تلاش میں کتنی دقت کا سامنا ہوا جو اس کے عقائدِ مذہبی کی، جنھیں وہ اپنی ساری قلمرو میں رائج کرنا چاہتا تھا، اشاعت کرسکیں اور اگرچہ اس امر کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے اور چنداں تعجب خیز بھی نہیں ہے کہ عربی مجتہدین

---

۵۱ جلد اول ص۱۸۵ - ۱۲ مصنف

۵۲ جلد ہذا ص۵۱ ۱۲ مصنف

کو جہاں سے بھی ممکن ہو، ایران میں لانا ضروری ہوگیا تھا۔ ایسے علما خاص طور پر دو ضلعوں سے زیادہ بلائے گئے۔ یعنی ایک تو بحرین سے جو ماورائے خلیج فارس واقع ہی اور دوسرے جبل عامل سے جو شام[1] میں ہی۔ جیساکہ ہم بتا چکے ہیں ان دونوں مقامات کے علما کے حالات میں ایک ایک مستقل تصنیف موجود ہی؛ یعنی لوء لوءۃ البحرین اور امل الآمل۔ ان میں سے اکثر علما جب ایران آتے ہیں تو فارسی زبان سے بالکل ناآشنا تھے۔ مثلاً سید نعمت اللہ الجزائری جب اپنے بھائی کو ساتھ لیے ہوئے ایران آئے تو انھیں اپنے ایک ایرانی دوست سے یہ جملہ سیکھنا پڑا تھا: "مدرسہ منصوریہ را می خواہیم" اور اس آسان جملے کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے، دونوں نے ایک ایک ٹکڑا رٹ لیا تھا اور باری باری سے دُہراتے تھے[2]

(اس حصے کا نوٹ: متن میں ایک حاشیائی خانہ ہے: "ایران میں عرب کے شیعہ علما کا بلایا جانا")

---

[1] ملاحظہ ہو G. Le Strange's Palestine under the Moslems (فلسطین زیرِ سیادتِ اسلامی) ص ۳۵ - ۳۶ و ص ۷۶ ۱۲ مصنف

[2] قصص العلما (طبع لکھنؤ ص ۲۲۹؛ طبع طہران ص ۳۳۳) :-

"پس پابرہنہ آں راہ را طی کردیم و من یازدہ سالہ بودم و در وقت نماز صبح بہ شیراز رسیدیم، پس بخانۂ آں شیخ کہ با ما بود رفتیم و منزلش از مدرسہ منصوریہ دور بود۔ ما می خواستیم کہ در آں مدرسہ منزل کنیم زیرا کہ بعضے از اقارب ما در آں جا بود، پس آں شیخ گفت کہ ایں راہ را بگیرید۔ بگوئید کہ مدرسہ منصوریہ را می خواہیم

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

ایک عالمِ دین کی خود نوشتہ سوانح عمری

انھیں سید نعمت اللہ کی آپ بیتی قصص العلما میں دی ہوئی ہے جس سے ہمیں ان مصائب اور شدائد کا نہایت واضح طور پر اندازہ ہو جاتا ہے جو اس زمانے میں غریب اور نادار طالبانِ علمِ دین کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ سید نعمت اللہ ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء میں پیدا ہوئے اور اپنی سوانح عمری کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۳۹ سال تھی[1]۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اس قلیل عمر میں مجھ پر کیسی کیسی مصیبتیں پڑ چکی ہیں"

وہ اپنے دوسرے کم عمر ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ان کے باپ نے آکر ان سے کہا "آؤ بیٹا، ملّاجی کے پاس چلو تاکہ تم لکھنا پڑھنا سیکھ جاؤ اور اعلیٰ مرتبے پر پہنچو" غرض کہ ان رونے دھونے اور ماں سے داد فریاد کرنے کے باوجود انھیں زبردستی پڑھنے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) و ما فارسی نمی دانستیم، پس ما رفتیم و سخن را تقطیع کردیم، پس یک کلمہ را من ضبط کردم و کلمۂ دیگر را آں دیگرے ضبط کرد۔ پس ہر کرا می دیدیم یکے می گفت "مدرسۂ منصوریہ" آں دیگرے می گفت "می خواہیم" تا باآں مدرسہ رسیدیم" ۱۲ مصنف

[1] کشف الحجب ۵۸ کے بیان کے مطابق ان کا انتقال ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء میں ہوا۔ اس حصہ کی ترتیب کے بعد مجھے اس خود نوشتہ سوانح عمری کی عربی اصل اپنے ایک قلمی نسخہ (C. 15) کتاب الانوار النعمانیہ میں ملی۔ یہ سید نعمت اللہ کی تصنیف ہے اور ۱۰۸۹ھ (۱۶۷۸ء) میں لکھی گئی تھی۔ خود نوشتہ سوانح عمری اس نسخے کے خاتمے پر یعنی ص ۳۲۹ - ص ۳۳۴ پر موجود ہے ۱۲ مصنف

بٹھا دیا گیا۔ مکتب سے پیچھا چھڑانے اور جلدی کھیل کود میں شریک ہونے کے لالچ سے انھوں نے اپنے اسباق پر اتنی محنت کی کہ ساڑھے پانچ برس کی عمر میں قرآن ختم کردیا اور کئی نظمیں یاد کرلیں، لیکن اس سے ان کی گلو خلاصی نہ ہوئی اور اب بھی کھیل کود کا موقع نہ

مُلّا جی کا علم

مل سکا۔ اب انھیں عربی کے صیغے اور زنجانی کی صرف و نحو پڑھنے کے لیے ایک نابینا نحوی کے پاس بٹھا دیا گیا۔ یہ بچارے اپنے نابینا استاد کی رہبری بھی کیا کرتے تھے، ان کے بعد جو ملّا جی انھیں ملے، وہ ان سے اپنے مویشیوں کے لیے چارہ اور ریشم کے کیڑوں کے لیے شہتوت کی پتیاں کٹوا کر منگواتے تھے۔ پھر انھیں ابن الحاجب کی کافیہ پڑھنے کے لیے ایک اور استاد کی تلاش ہوئی،

ایک جاہل استاد سے سابقہ

اب کی جو استاد انھیں ملے وہ ایک سفید پوش رعب دار شخص تھے اور بہت بڑا عمامہ باندھتے تھے "جو ایک چھوٹے سے گنبد کی طرح معلوم ہوتا تھا" مگر انھوں نے جو سوالات ان عالم سے کیے ان کا جواب ان سے نہ بن پڑا۔ اس پر انھوں نے کہا "اگر آپ کو اتنی صرف و نحو بھی نہیں آتی کہ آپ میرے سوالات کا جواب دے سکیں تو آپ اپنے سر پر اتنا بڑا گٹھر کاہے کو رکھے پھرتے ہیں؟" اس پر حاضرین ہنس پڑے اور مولوی صاحب شرمندہ ہوکر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ وہ لکھتے ہیں :—

"اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مجھے عربی کے صیغوں پر حاوی ہونے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی، لیکن اب میں خدا کے

توبہ کرتا ہوں کہ میں نے اس مومن سے ایسے سوالات
کیوں پوچھے تھے اور اس کا شکر کرتا ہوں کہ یہ حرکت مجھ
سے سِنِ تمیز سے پہلے ایسے وقت میں سرزد ہوئی تھی
جب کہ پوری طرح سے اپنے افعال کی مسؤلیت مجھ پر
عاید نہ ہوئی تھی۔"

تلاشِ علم میں سفر کے مصائب اس طرح سے کئی اور اساتذہ سے درس لینے کے بعد انھوں نے اپنے والد سے اپنے بڑے بھائی کے پاس حویزہ جانے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے یہ سفر گھاس سے پٹی ہوئی تنگ نہروں میں کشتی میں بیٹھ کر کیا۔ راستہ میں "بھڑ دل کی برابر" مچھر انھیں ستاتے تھے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے صرف بھینس کا دودھ میسّر آتا تھا۔ غرض کہ اس سفر سے انھیں پہلی بار اس کا اندازہ ہوا کہ غریب طالبِ علموں کو سفر میں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے استاد انھیں جامیؔ اور جار بردی کی شرح اور کافیہ کا درس دیتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ان سے "بہت زیادہ خدمت" لیتے تھے۔ ان کو اور ان کے دوسرے ہم مکتبوں کو ایک مکان کے لیے جو ان کے استاد بنوا رہے تھے، پتھر ڈھونا پڑتے تھے اور پاس کے گانو سے ان کے لیے مچھلی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں لانی پڑتی تھیں۔ استاد اپنے درس املا کی نقل ان لوگوں کو نہ کرنے دیتے تھے، لیکن یہ لوگ موقع پاکر انھیں چرا لیتے تھے اور ان کی نقل کیا کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"غرض ہم لوگوں کے ساتھ ان کے یہ سلوک تھے لیکن اس کے باوجود ہم سب ان کی خدمت

کے لیے کمربستہ رہتے تھے تاکہ ان کے انفاس متبرکہ سے فیض حاصل کریں۔"

مصائب کے باوجود کسب علم

وہ صبح سے بارہ بجے نصف النہار تک مدرسے میں درس اور مباحثہ میں شریک رہتے اور جب گھر واپس جاتے تو بھوک کا اتنا غلبہ ہوتا کہ اگر کچھ اور نہ ملتا تو سڑک پر پڑے ہوئے تربوز کے چھلکے جمع کرتے اور ان کی مٹی دھوکر جو کچھ بچا ہوا حصّہ کھانے کے قابل ہوتا، کھا لیتے۔ ایک دن انھوں نے اپنے ساتھی کو بھی یہی کرتے دیکھا۔ اب تک ایک نے دوسرے پر یہ ظاہر ہونے دیا تھا کہ وہ شکم پروری کے لیے کیا کیا جتن کرتا ہو لیکن اب انھوں نے مل جل کر کام کرنا شروع کیا اور دونوں ساتھ ساتھ چھلکے جمع کرنے اور دھوکر انھیں کھانے لگے۔ چونکہ شمع یا قندیل رکھنے کی مقدرت نہ تھی اس لیے دونوں اپنے کتب درسیہ مثلاً ابن مالک کی الفیہ اور کافیہ کو چاندنی راتوں میں زبانی رٹ لیا کرتے تھے اور اندھیری راتوں میں انھیں مستحضر رکھنے کے لیے ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں گفتگو سے سبق میں خلل نہ پڑے، ایسے موقعوں پر ایک ساتھی درد سر کا بہانہ کرکے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔

بصرے سے شیراز کا سفر

چند روز اپنے گھر رہنے کے بعد انھوں نے شیراز کا قصد کیا اور براہ شط العرب بصرہ جانے کے لیے کشتی میں سوار ہوئے۔ اس ڈر سے کہ کہیں والد انھیں روک کر گھر واپس نہ لے جائیں، دریائی سفر کے شروع میں وہ کپڑے اتار کر کشتی کی پتوار پکڑے ہوئے دور تک پانی میں چلتے رہے اور جب اتنی

دور تک نکل گئے کہ پہچانے جانے کا اندیشہ نہ رہا تو کشتی میں بیٹھ گئے۔ کچھ دور نکل جانے کے بعد انھیں کنارے پر بہت سے لوگ کھڑے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ایک ساتھی نے چلّا کر ان سے پوچھا کہ تم لوگ شیعہ ہو یا سُنّی اور جب جواب ملا کہ سنّی تو انھوں نے (نعمت اللہ نے) انھیں گالیاں دیں اور پہلے تین خلفا پر تبرّا بازی شروع کردی۔ اس کے جواب میں کنارے کے لوگوں نے ان کی کشتی پر پتھر برسائے۔

شیراز کے مدرسے میں تعلیم انھیں بصرے میں جہاں اس زمانے میں حسن پاشا گورنر تھا، بہت کم ٹھہرنا نصیب ہوا، اس لیے کہ ان کے پیچھے پیچھے ان کے والد بھی انھیں واپس لے جانے کے لیے وہاں پہنچے۔ لیکن یہ ان کے آنے سے پہلے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر وہاں سے چل دیے اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے[1] شیراز پہنچ کر مدرسہ منصوریہ میں فروکش ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ جب یہ مدرسہ پہنچے تو ایک استاد ابن مالک کی الفیہ پر درس دے رہے تھے۔ درس کے ختم پر اُنھوں نے ان سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو اور پھر ان کے کان اینٹھے اور کہا " فرزند من، اپنے کو عرب یشیخ مت بنا اور بزرگی کی تلاش مت کر کہیں ایسا نہ ہو کہ ان حرکتوں سے تو خدا نخواستہ عالم بن جائے "۔

سردی اور بھوک کی تکلیفیں اس مدرسہ میں بھی ان کی زندگی بہت تنگی اور ترشی سے بسر ہوئی۔ روز جو روٹی ملتی تھی وہ شکم پُری کے لیے

[1] جلد ہذا ص ۲۹۰۔ ۱۲ مصنف

کافی نہ ہوتی تھی۔ ان کے بھائی نے گھر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن خود انھوں نے وہیں رہنے کا عزم بالجزم کرلیا اور نہایت حقیر معاوضہ پر کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے۔ گرمی کے موسم میں، جب ان کے دوسرے ہم مدرسہ چھت پر سوتے تو یہ دروازہ بند کیے ہوئے ساری ساری رات نقل کا کام کرتے رہتے۔ اکثر یہ ہُوا ہے کہ ان کے پاس لیمپ کے لیے تیل اور کھانے کے لیے روٹی تک میسّر نہ ہوتی، لیکن یہ چار و ناچار بھوک سے نزار، چاندنی راتوں میں کام کیا کرتے اور سردیوں کے زمانے میں صبح کے وقت اس حالت میں کہ جاڑے کی شدت سے ان کی انگلیاں پھٹ جاتیں اور ان سے خون جاری ہوتا، اپنے سبق کے حاشیوں کو لکھا کرتے۔ غرض کہ اس طرح انھوں نے دو تین سال اور بسر کیے اور اگرچہ آنکھوں پر زور پڑتے پڑتے اب ان کی بینائی مستقل طور پر خراب ہوگئی تھی، لیکن انھوں نے اب خود تصنیف شروع کردی۔ کافیہ پر ایک شرح اور ایک اور شرح مفتاح اللبیب کے عنوان سے شیخ بہاء الدین محمد کی تہذیب پر لکھی[1]۔ اب انھوں نے اپنا مطالعہ عربی صرف و نحو سے آگے بڑھانا شروع کیا اور بغداد، الاحسار اور بحرین کے آئے ہوئے مشہور تر اساتذہ کے درس میں حاضر رہنے لگے۔

---

[1] ملاحظہ ہو کشف الحجب ص۱۴۶، ۴۲۵۔ ان مصنف کا انتقال ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۲-۱۶۲۱ء میں ہوا، وہ شاہ عباس کبیر کے عہد کے مشہور علما میں تھے اور ایران میں شیخ بہائی کے نام سے مشہور ہیں۔ ملاحظہ ہو جلد ہٰذا کا ص ۳۰۲۔ ۱۲ مصنف

ایک سخت گیر استاد انھیں میں ایک اُستاد شیخ جعفرالبحرانی بھی تھے، ایک دن اپنے بعض اعزا کے انتقال کی خبر سُن کر فرطِ غم کی وجہ سے یہ درس میں حاضر نہ ہوسکے، دوسرے دن جب سامنے گئے تو شیخ بہت خفا ہوئے اور انھیں پڑھانے سے صاف انکار کردیا اور قسم کھائی کہ "اگر تجھے پڑھاؤں تو میرے ماں اور باپ پر خدا کی لعنت ہو تو کل یہاں کیوں حاضر نہ تھا" اور جب انھوں نے غیر حاضری کا سبب بیان کیا تو کہنے لگے "پہلے سبق میں شریک ہوتے، پھر ماتم کرتے" غرض کہ جب اُنھوں نے قسمیں کھا کر انھیں یقین دلایا کہ آئندہ خواہ کچھ ہی مصیبت کیوں نہ پڑے، درس کا ناغہ نہ کروں گا تو بعد چندے انھیں دوبارہ شرکتِ درس کی اجازت مل گئی۔ آگے چل کر یہی سخت مزاج اُستاد ان پر اتنے مہربان ہوئے کہ اپنی لڑکی ان کے عقد میں دینی چاہی، لیکن انھوں نے اس شرف سے انکار کیا اور کہا "انشاءاللہ جب ختم تعلیم کے بعد فارغ التحصیل بن جاؤں گا، اس وقت شادی کروں گا" اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان استاد کو ہندوستان میں حیدرآباد دکن میں کوئی ملازمت مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔

شیراز میں غریب طالب علم کی زندگی سید نعمت اللہ شیراز میں نو سال رہے اور یہاں ان کا زیادہ تر زمانہ ایسی عسرت سے بسر ہوا کہ دن دن بھر سوائے پانی کے کچھ میسّر نہ آتا تھا۔ راتوں کا پچھلا حصّہ وہ اکثر اپنے ایک دوست کے یہاں بسر

کرتے تھے، جن کا مکان شہر سے کسی قدر فاصلے پر تھا۔ وہ ان کے پاس اس وجہ سے جاتے تھے کہ ان کے چراغ کی روشنی میں کچھ مطالعہ کرلیا کریں اور اندھیری راتوں میں سنسان بازاروں میں ہوتے ہوئے، ان خونخوار کتّوں کو چمکارتے ہوئے جو اپنے آقاؤں کی دُکانوں کی دربانی کرتے تھے، اس مسجد میں واپس آتے تھے جہاں فجر کے وقت انھیں درس دینا ہوتا تھا۔ اپنے والدین کے حکم اور اصرار پر یہ تھوڑے عرصے کے لیے گھر واپس آئے اور شادی بھی کرلی۔ لیکن جب ایک بزرگ نے، جن کی ملاقات کے لیے وہ گئے تھے، انھیں لعنت ملامت کی کہ تم ہنوز حدیث میں کچے ہو اور ابھی سے مطالعہ چھوڑ بیٹھے تو انھوں نے اپنے والدین اور اہلیہ کو (جن سے شادی ہوئے صرف تین ہفتے ہوئے تھے) خیرباد کہی اور مدرسہ منصوریہ شیراز کو واپس چلے گئے، لیکن ان کی واپسی کے چند ہی روز بعد مدرسہ میں آگ لگ گئی جس کی وجہ سے ایک طالبِ علم تو ہلاک ہوگیا اور کتب خانے کا بھی بڑا حصّہ جل گیا۔ اسی زمانے میں انھیں اپنے والد کے انتقال کی خبر ملی۔ ان دو سانحوں نیز دیگر حالات کی وجہ سے انھوں نے شیراز کی سکونت چھوڑ دی اور اصفہان چلے گئے۔

ملّا محمد باقر مجلسی کی نظرِ عنایت

اصفہان میں بھی ان کے قیام کا ابتدائی زمانہ اسی عسرت اور فلاکت سے گزرا جس کے یہ پہلے خوگر ہو چکے تھے۔ یہ اکثر نمکین گوشت کھاتے تھے تاکہ پیاس زیادہ ہو اور بہت پانی پینے سے غذا کی خواہش جاتی رہے۔ لیکن

آخر کار ان کے بھی دن پھرے اور ذی اثر اور غالی مجتہد ملا محمد باقر مجلسی کی (جو تمام گزشتہ اور موجودہ مجتہدین میں سب سے زیادہ مشہور اور ذی اثر تھے) توجہ ان کے حال پر ہوئی اور اِنھیں اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہؤا۔ انھیں اُن کے مکان پر قیام کرنے کی اجازت مل گئی اور یہ چار سال تک ان کے ساتھ رہے اور علم العقاید اور خاص کر حدیث کی تحصیل کرتے رہے[1]۔ کہتے ہیں کہ زیادہ میل جول سے نفرت ہوجاتی ہے لیکن ان کی صورت میں یہ نہیں ہؤا۔ وہ اپنی انوار النعمانیہ میں لکھتے ہیں[2] کہ اگرچہ اس "خسروِ دین کی مجھ پر نظرِ عنایت رہا کرتی تھی لیکن اکثر میری یہ حالت ہوتی تھی کہ جب وہ مجھے اپنے کتب خانے میں باتیں کرنے، یا اپنی تصنیف بحار الانوار کے سلسلے میں طلب کرتے تھے تو میں کچھ دیر تو دروازے کے باہر کھڑا ہؤا فرطِ رعب سے لرزتا رہتا تھا اور بہت دیر بعد کہیں مجھ میں ان کے رُوبرُو جانے کی ہمّت ہوتی تھی" اسی زبردست شخص

---

[1] جیسا کہ اوپر صفحہ ۲۶ پر بیان ہوچکا ہے یہ زبردست مجتہد زمانۂ حال کے "تین محمّد" میں سے تھے اور شیعہ حدیث پر ان کی کتاب بحار الانوار آج بھی اس موضوع پر ایران میں مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو کشف الحجب صفحہ ۔ ۳۲۸ ۔ میرے پاس اس کتاب "انوار النعمانیہ" کا ایک قلمی نسخہ ہے جو حاجی عبدالمجید بلشاہ مرحوم سے ملا تھا اور اب میرے کتب خانے میں زیر نشان (C. 15) محفوظ ہے۔ جیسا کہ اوپر صفحہ ۲۷ ۔ حاشیہ ۱ میں بیان ہوچکا ہے اس کے خاتمے پر اس بیان کی جو یہاں کیا گیا ہے، عربی اصل موجود ہے۔ ۱۲ مصنف

اصفہان میں خدمتِ مُدرّسی مِل گئی۔ | کی سرپرستی کے طفیل میں انھیں ایک مدرسے میں مدرسی کی خدمت مل گئی۔ یہ مدرسہ ایک شخص مرزا تقی کا قایم کیا ہُوا تھا اور اصفہان میں شیخ بہائی کے حمام کے پاس واقع تھا۔ یہ آٹھ سال تک اس خدمت پر رہے، لیکن ان کی بصارت روز بروز خراب ہوتی گئی اور اصفہان کے مشہور کحالوں کے علاج سے بھی فائدہ نہ ہُوا تو انھوں نے پھر سیاحت کا قصد کیا۔ سامرّہ، کاظمین اور عراق کے دوسرے مقدس مقامات کی زیارت سے مشرف ہوکر براہ شوستر اصفہان واپس آئے۔ (۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء - ۱۶۶۹ء) میں ان کے بھائی داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کی موت کا داغ دس سال بعد بھی، یعنی جس زمانے میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے، تازہ تھا۔ مشہد کی زیارت کے بعد وہ حویزہ واپس آئے اور اپنی سوانح عمری کی تحریر کے وقت اسی مقام پر ایک تارک الدنیا اور گوشہ نشین شخص کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ (۱۰۹۰ھ مطابق ۱۶۷۹ء - ۱۶۸۰ء)

اُن کے اس زمانے کے بعد کے واقعاتِ زندگی کا مجھے کہیں پتہ نہ مل سکا، لیکن اتنا بہرحال یقینی ہے کہ وہ ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء تک یعنی اس آشوب سے چار سال پہلے تک بقیدِ حیات تھے۔ جس نے خاندانِ صفویہ کا چراغ گل کر دیا۔

اس سچّی آپ بیتی کی اہمیّت | میں نے صفحات بالا میں ان کی بصیرت افروز روداد زندگی کا بیان کسی قدر اختصار کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خود نوشتہ آپ بیتی

کی طرح کی کتابیں فارسی میں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں اور خود یہ بھی جیسا کہ اوپر صفحہ ۲۷ پر بیان ہو چکا ہے، اصل میں عربی میں ہے۔ اس سے علم مذہب کے ایک ایرانی طالب علم کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور باستثنائے چند جزئیات کے، ازمنۂ وسطیٰ میں یورپی طالب علم کی زندگی بھی ایسی ہی تھی۔ بچپن میں قبل از وقت اپنے محبوب طفلانہ مشاغل اور کھیلوں سے محروم کر دیا جانا، عربی نحو اور علم اللسان کے طویل، کاوش طلب اور خشک نصاب کا مطالعہ، ہر ایک کی شرح، شرح الشرح، حواشی وغیرہ پڑھنا، پھر ان کا لڑکپن کا زمانہ، آرزوؤں کا جوش اور علم العقائد اور فقہ کا مطالعہ، نیم گرسنگی کی حالت، جاڑوں کی ٹھٹھرن اور گرمیوں کی دھوپ کی تکلیفیں، چاند کی مدھم روشنی میں کٹے پھٹے نسخوں کے مطالعے کی وجہ سے بصارت کی بربادی، بے قاعدہ غذا اور مضر صحت کھانوں سے، وہ بھی کئی کئی دن کے فاقوں کے بعد، قوت ہاضمہ کی خرابی، آوارہ وطنی، عزیز و اقارب کی جدائی قشریت اور تعصب میں سر سے پاؤں تک ڈوبی ہوئی زندگی اور پھر خود تصنیف و تالیف کر کے شرح اور حواشی کے اس طومار میں اضافہ کرنا جن سے متن بجائے واضح اور روشن ہونے کے زیادہ مبہم اور گنجلک ہوتا ہے، پھر آخر عمر میں اور وہ بھی اگر قسمت یاوری کرے تو کسی زبردست عالم کی نظر عنایت اور مدرسی یا متولی، یا اگر بہت ترقی کی تو مجتہدی کا منصب — یہ سب سماں ان کی سوانح عمری کو پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اگر ایک طرف، جیسا کہ مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس

زمانے میں غریب طالب علم کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں تھیں، تو دوسری طرف اس کے انجام اور ثمرات اکثر اچھے ہوتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ان تک صرف چند ہی خوش نصیبوں کی دسترس ہو۔

صفویہ اور ان کے جانشینوں کے زمانے میں مجتہدین کا اثر و اقتدار

شاہانِ صفویہ مجتہدین کو امام موعود کا، جن کا نام لیتے وقت وہ یہ دعا ضرور پڑھتے تھے "عجّل اللہ فرجہٗ" قایم مقام سمجھا کرتے تھے۔ مجتہد کو رعایا کی زندگی اور موت پر پورا پورا اختیار ہوتا تھا، حاجی سید محمد باقر ابن محمد تقی رشتی کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے ۷۰ اشخاص کو مختلف گناہوں یا کفر و الحاد کی پاداش میں سزائے موت دی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب انھوں نے سزائے قتل کا پہلا حکم سنایا اور کوئی جلاد اس کام کے لیے نہ مل سکا، تو پہلا وار خود انھوں نے کیا، لیکن وہ بھی کارگر نہ ہوا تو کسی اور شخص نے ان کی مدد کی اور مجرم کا سر تن سے جدا کر دیا۔ لکھا ہے کہ اس کے بعد مقتول کی نمازِ جنازہ کی امامت خود انھی مجتہد صاحب نے کی اور دورانِ نماز میں وفورِ گریہ سے انھیں غش آگیا[1]

اسی طرح سے کریم خان زند کے زمانے کے ایک مجتہد آقا محمد علی نے اتنے عارفوں اور درویشوں کو سزائے قتل دی تھی کہ ان کا لقب ہی "صوفی کش" پڑ گیا تھا۔ ایک اور صاحب ملّا عبداللہ تونی نے شاہ عباس کبیر کو اپنا اس قدر ارادت مند بنا لیا تھا کہ جب وہ گھوڑے پر سوار اصفہان کے میدانِ شاہ سے گزرے تو

[1] قصص العلما طبع لکھنؤ ص ۱۳۸ - ۱۲ مصنف

شاہ عباس ان کے آگے آگے پا پیادہ چل رہا تھا[1]۔ تاکہ عوام الناس کو معلوم ہو جائے کہ علم کی کتنی عزّت کی جاتی ہے۔

ملّا حسن یزدی نے ایک مرتبہ اپنے شہر کے تمام باشندوں کو حکم دیا کہ وہ والی شہر کو جو بہت ظالم اور جابر تھا، ہر طرح سے ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر کر دیں۔ جب اس واقعہ کی خبر شدہ شدہ فتح علی شاہ تک پہنچی تو ملّا صاحب کو جواب دہی کے لیے طہران طلب کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ جب تک یہ اپنی بریت نہ ثابت کریں انھیں سزائے تازیانہ دی جائے۔ چونکہ انھوں نے بریت ثابت کرنے سے انکار کیا اور برابر کہتے رہے کہ اس کارروائی کا ذمّہ دار میں ہی ہوں، اس لیے ان کو باندھ دیا گیا اور اگرچہ سزا شروع نہیں ہوئی، لیکن اس کے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ اسی رات کو شاہ نے حضور سرور کائنات کو خواب میں دیکھا کہ آپ بہت برہم ہیں اور ایک عالم دین و فقہ کے ساتھ ایسے نازیبا سلوک پر بہت ناخوش ہیں۔ دوسرے دن علی الصباح، شاہ نے ملّا صاحب سے بہت عاجزی سے معافی مانگی اور انھیں خلعت شاہانہ سے بھی سرفراز کرنا چاہا، لیکن انھوں نے غصہ سے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا[2]۔

ملّا احمد اردبیلی الملقب بہ مقدس (وفات ۹۹۳ھ مطابق ۱۵۸۵ء) کی خدمت میں ایک شاہی افسر جس سے کوئی قصور ہو گیا

---

[1] قصص العلما طبع لکھنؤ حصّہ دوم ص۵۴۔ ۱۲ مصنف

[2] قصص العلما طبع لکھنؤ ص۹۹۔ ص۱۰۰۔ ۱۲ مصنف

تھا، حاضر ہوا اور سفارش کی درخواست کی، اس پر ان ملّا صاحب نے حسبِ ذیل فارسی رقعہ شاہ عباس کے نام لکھا:[۱]

"بانیِ ملکِ عاریہ عباس بداند کہ اگر ایں مرد اول ظالم بود، اکنوں مظلوم می نماید، چنانچہ از تقصیر او بگذری شاید حق سبحانہٗ و تعالیٰ از پارۂ تقصیرِ تو بگذرد۔"

اس کے جواب میں شاہ عباس نے لکھا:-

"بہ عرض می رساند عباس کہ خدماتے کہ فرمودہ بودند بجان منّت داشتہ بتقدیم رسانید کہ ایں محب را از دعائے خیر فراموش نہ کنند

"کتبہ کلبِ آستانِ علی، عباس"

ایک اور اردبیلی مجتہد نے، جنھیں "محقق" بھی کہتے تھے، بعض سادات کی سفارش میں ایک رقعہ شاہ طہماسپ کو لکھا تھا۔ شاہ طہماسپ کے پاس جب یہ رقعہ پہنچا تو وہ تعظیماً کھڑا ہوگیا، اسے آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا اور جو خواہش اس رقعہ میں ظاہر کی گئی تھی، اس کی تکمیل بوجہ احسن کردی۔ پھر چونکہ اس رقعہ میں اسے "ایہا الاخ" سے مخاطب کیا گیا تھا، اس لیے اس نے اسے اپنے کفن میں رکھوایا اور حکم دیا کہ یہ میرے ساتھ قبر میں رکھا جائے تاکہ "اس کی سند پر میں منکر نکیر سے کہہ سکوں کہ مجھے عذابِ قبر سے محفوظ رکھا جائے۔"

---

[۱] یہ اور اس کے بعد کا قصہ دونوں قصص العلما (طبع طہران ص ۲۶) طبع لکھنؤ ص ۱۳۲ سے ماخوذ ہیں۔ ۱۲ مصنف

ایک شہزادے نے اسی دنیا میں جنت کا محل خرید لیا

لیکن ان سب سے بھی زیادہ عجیب تر ایک قصہ قصص العلما[1] میں یہ لکھا ہے کہ شہزادے محمد علی مرزا نے دو مجتہدوں کو فی کس ایک ایک ہزار تومان دیے اور اس کے معاوضہ میں ان کی مہر اور دستخط سے ایک تحریر لکھوائی جس میں جنت میں ایک محل عطا کرنے کا وعدہ تھا۔ ان میں سے ایک مجتہد (سید رضا ابن سید مہدی) نے ایسی تحریر لکھنے میں کسی قدر تامل کیا تو شہزادے نے کہا کہ آپ صرف دستاویز لکھ دیجئے اور اس پر کربلا اور نجف کے علما کی تصدیق لے لیجئے پھر اللہ جلّ شانہٗ سے جنّت میں محل لینے کا ذمّہ میرا ہے“

غرض کہ مذکورہ بالا قصّوں کی طرح کئی قصّے ہیں، اسی طرح سے علماء دین کی کرامات کے کئی واقعات بھی بیان کیے جاسکتے ہیں لیکن اس موقع پر ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ جو کچھ اب تک بیان ہوا وہ یہ ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے کہ اس زمانے میں علما اور مجتہدین کا رسوخ کس قدر تھا، اور ان کی کتنی عزّت کی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثر کا رسوخ اور اقتدار تو وزرائے سلطنت سے بھی زیادہ ہوا کرتا تھا۔ وہ لوگ علانیہ شاہ وقت کی مخالفت کرتے اور اس پر غالب بھی آجاتے لیکن پھر بھی اس باز پرس سے محفوظ رہتے تھے، جو خطا کی وزیروں سے کی جاتی تھی۔ یاد رہے کہ یہ صرف گزشتہ زمانے ہی

---

[1] قصص العلما طبع لکھنؤ صفحہ ۱۳۶ - ۱۲ مصنف

زمانۂ حال میں علما کے اثر کی مثالیں ۔	کے قصّے نہیں ہیں، بلکہ آج تک یہی حالت ہی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء۔سنہ ۱۸۹۱ء کی

تمباکو کی مراعات کو جس طرح منسوخ کرایا گیا وہ علما کے اثر کی بیّن مثال ہی۔ یہ تنسیخ ناصرالدین شاہ اور اس کے پورے دربار نیز انگریزی سفارت خانہ کے علی الرغم کرائی گئی اور اس کے بانی مبانی مجتہدین ہی تھے جنھوں نے حاجی مرزا حسن شیرازی اور حاجی مرزا حسن اشتیانی کی قیادت میں اور اس عجیب و غریب شخص یعنی سیّد جمال الدین کے اشارے اور ایما سے جسے غلطی سے "الافغانی" کہا جاتا ہی[1] یہ کل کارروائی کی۔ ڈاکٹر فیوریر (Dr. Feuvrier) نے جو شاہ کا طبیب خاص اور فرانسیسی الاصل تھا اور اس زمانے میں طہران میں مقیم تھا اس یادگار واقعہ کا مفصل بیان اپنی تصنیف[2]

Trois Ans a la Cour de Perse

(دربار ایران میں تین سال) بیر کیا ہی، میں نے بھی اپنی کتاب انقلاب ایران[3] میں اس کی تفصیل دی ہی۔ اور موجودہ عیسوی صدی کے قرن اوّل میں ایران نے آزادی کے لیے جو کچھ کشمکش کی اور اس میں ملّا محمد کاظم خراسانی اور دوسرے وطن خواہ مجتہدین[4] نے جو عملی حصّہ لیا

---

[1] اس شخص کے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو میری تصنیف Persian Revolution (انقلاب ایران) باب اول ص ۱ - ص ۳۰ الخ ۱۲ مصنف

[2] طبع Paris 1906 D. Chapter V PP. 307-349 ۱۲ مصنف

[3] باب دوم ص ۳۱ - ص ۵۸ - ۱۲ مصنف

[4] ایضاً ص ۲۶۲ الخ - فتاوی اور خطوط کے عکس کے لیے ملاحظہ ہو ص ۲۴۴ تا ص ۲۴۲ - ۱۲ مصنف

اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ ملّا محمد کاظم وطن خواہ مجتہدین کی ایک نہایت قابل قدر مثال تھے۔ ان کے قلب پر اس زمانے کی روسی حکومت کے ناقابلِ برداشت مظالم اور دست درازیوں کا اتنا اثر پڑا تھا کہ انھوں نے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو روسیوں کے خلاف باضابطہ جہاد کا اعلان کردیا اور خود اس میں شرکت کی غرض سے کربلا سے ایران کی طرف روانہ ہوگئے، لیکن روانگی کے دوسرے ہی دن دفعتاً ان کا انتقال ہوگیا، جس کی وجہ عام طور پر زہرخورانی سمجھی جاتی ہے[1]۔ ملّا کاظم کے علاوہ کچھ اور علما بھی وطن کی راہ میں فدا ہوچکے ہیں، مثلاً ثقۃ الاسلام جنھیں روسیوں نے عین عاشورہ محرم ۱۳۳۰ھ کے دن (یکم جنوری ۱۹۱۲ء) کو تبریز کے شاہراہ عام میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا اور اس کے تین ماہ بعد مشہد میں روضہ حضرت امام رضا پر گولہ باری کرکے اس سے بھی زیادہ شقاوت اور سیہ قلبی کا ثبوت دیا تھا۔ اکثر ایرانیوں کا اعتقاد ہے کہ زار روس اور اس کے خاندان پر بالشویکوں کے ہاتھوں جو تباہی نازل ہوئی وہ اس روضہ کی بے حرمتی ہی کا مواخذہ تھا، جو منتقم حقیقی نے ان سے کیا۔

مختصر یہ کہ ایران میں ملّاؤں اور مجتہدین کا اقتدار پہلے بہت زیادہ تھا اور غالباً آج کل بتدریج کم ہو رہا ہے۔ یہ لوگ جزئیات فتاوی (مثلاً طہارتِ جسمانی سے لے کر اہم ترین سیاسی معاملات

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب Press and Poetry in Modern Persia صفحہ ۳۳۶۔ ۱۲ مصنف

ہیں اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں دخل دیتے ہیں۔ ہر شیعہ
مسلمان کو اس کا حق ہے کہ ہر ایسے مسئلے کو جس کا مذہب سے کچھ
بھی لگاؤ ہو اور تقریباً ہر مسئلے کا تعلق مذہب سے کچھ نہ کچھ ضرور
ہوتا ہے کسی مجتہد کے سامنے پیش کر کے شیعہ عقاید کے اُصولوں
کے مطابق اس سے استفتار کرے۔ اس قسم کے فتاویٰ کسی بے دین
یا ظالم بادشاہ یا وزیر کی تکفیر کے متعلق بھی لیے جاتے ہیں اور یہ
حکم لگایا جاتا ہے کہ جو شخص ان کی طرف سے لڑے، وہ گویا امام
غائب سے جنگ کرتا ہے۔ چونکہ مشہور ترین مجتہدوں کا مستقر نجف
یا کربلا یعنی سلطنتِ ایران کے حدود سے باہر ہوتا ہے، اس لیے
ان کی حیثیت اور زیادہ مستحکم ہوتی ہے اور وہ ہر طرح محفوظ و مامون
ہوتے ہیں۔ صفویہ کے زمانے سے پہلے، نیز اس کے بعد ایران کے
اکثر حکمرانوں نے کوشش کی کہ کسی طرح ان کی قوت کو توڑا جائے
یا کم کر دیا جائے، لیکن ان مساعی میں اگر انھیں کبھی کامیابی ہوئی
بھی تو صرف عارضی اور سطحی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملّاؤں کا طبقہ ایک

طبقۂ مجتہدین کی بعض قابلِ قدر خصوصیات

خاص قومی طبقہ ہے، وہ قومی مطمح نظر اور
قومی احساسات کے نمائندے ہوتے
ہیں اور تاریخ میں اکثر و بیشتر رعایا کو جابر حکمرانوں کے ظلم و تعدی
سے بچاتے رہے ہیں۔ ان کی علمیت کسی قدر تنگ نظرانہ ضرور
ہوتی ہے، لیکن اپنی جگہ پر ٹھوس اور صحیح بھی ہوتی ہے اور ان میں
سے اکثر میں تنقیدی نظر بھی پائی جاتی ہے، خوش قسمتی سے مجھے ایک
ایسے ہی بلند پایہ ایرانی کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ یعنی :-

مرزا محمد ابن عبدالوہاب قزوینی جنھوں نے صرف درسی مذہبی تعلیم ہی نہیں ختم کی ہے، بلکہ اس پر اس یورپی طرز تنقید کا بھی اضافہ کرلیا ہے جو انھوں نے انگلستان، فرانس اور جرمن میں سیکھا ہے۔

اس طبقے کی مذموم خصوصیات عیبوں پر نظر ڈالی جائے
رشک و حسد، سبّ و شتم تو معلوم ہوتا ہے کہ بد اخلاقی،

تعصّب اور دوسری مذموم خصوصیات کے علاوہ اکثر علما میں ادنیٰ ترین حسد اور ایک دوسرے کی تنقیص کا مرض بھی ہوتا ہے۔ ملکم نے ایک مشہور قصّہ نقل کیا ہے[1] - جو قصص العلما میں موجود ہے[2] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم بڑے بڑے علما مثلاً میر داماد اور شیخ بہاءالدین العاملی وغیرہ کی ذات اس قسم کی خفیف الحرکاتی سے ارفع تھی، لیکن صاحب قصص العلما کو شکایت ہے کہ ان بزرگوں سے قطع نظر کرکے ان کے دوسرے کم ظرف معاصرین ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو گدھا اور بے وقوف کہہ دیا کرتے تھے، جس سے ایک طرف اس طبقے کی وقعت کم ہوتی تھی اور دوسری طرف باہر والوں کو شماتت کا موقع ملتا تھا۔ اگرچہ یہ سبّ و شتم کبھی کبھی ضلع، جگت اور استعاروں میں کیا جاتا تھا، جیسا کہ ذیل کے شعر سے معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ پردے بھی ان کی سوقیت کو نہ چھپا سکتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے[3]-

---

[1] تاریخ ایران۔ جلد اول (طبع ۱۹۱۵ء) ص ۲۸۵ - ص ۲۸۹ - ۱۲ مصنف

[2] طبع لکھنؤ حصّہ دوم ص ۲۶ - ص ۲۰، طبع طہران ص ۱۸۱ ۱۲ مصنف

[3] قصص العلما طبع لکھنؤ جلد دوم ص ۱۶۵ طبع طہران ص ۲۸۱ ۱۲ مصنف

وَلَسْتُ جَدِیرًا اَنْ تَکُونَ مُقَدَّمًا
وَمَا اَنْتَ اِلَّا نِصْفُ ضِدِّ الْمُقَدَّمِ

(ترجمہ: تو مقدم بنائے جانے کے قابل نہیں ہی، نہیں، بلکہ تو مقدم کی ضد کے نصف سے بھی کچھ بہتر نہیں ہی)

"مقدم" کا ضد موخر ہی، جس کا نصف آخر "خر" ہوتا ہی۔ لیکن ملّاؤں کی ظرافت کا یہ نمونہ پھر بھی کسی قدر شائستہ ہی، اس سے بھی بدتر نمونے دیکھنا ہوں تو ناظرین قصص العلما میں[1] اس سبّ و شتم کا حال پڑھیں جس کا سلسلہ ملّا مرزا محمد شیروانی ترک اور آقا جمال اصفہانی کے درمیان ایک مدّت تک جاری رہا۔ لیکن اسی کتاب میں جمال الدین محمد ابن حسین خوانساری کا جو پُر لطف واقعہ درج ہی[2] اس سے معلوم ہوتا ہی کہ بعض ملّاؤں میں اپنے ہمسایوں کے عیوب کے مقابلے میں خود اپنی کوتاہیوں کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ یہ صاحب قاضی تھے۔ اور چار ہزار تومان سالانہ تنخواہ پاتے تھے، ایک دن چار آدمیوں نے یکے بعد دیگرے ان سے چار سوالات کیے اور ہر ایک کے جواب میں اُنھوں نے یہی کہا "میں نہیں جانتا" کوئی بڑا عہدے دار بھی اس موقع پر موجود تھا، وہ کہنے لگا کہ آپ کو بادشاہ کی طرف سے چار ہزار تومان جاننے کے لیے دیے جاتے ہیں لیکن یہاں جس شخص نے آپ سے سوال کیا، آپ نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا، اس پر ملّا جمال الدین نے جواب دیا کہ" یہ

---

[1] طبع لکھنؤ جلد دوم ص۵۰ طبع طہران ص۲۰۱، حلد ۳۰۱ ۔ ۱۲ مصنف

[2] طبع لکھنؤ حصہ دوم ص۵۰ طبع طہران ص۱۹۹ ۔ ۱۲ مصنف

چار ہزار تومان مجھے ان باتوں کے لیے ملتے ہیں جو میں جانتا ہوں، اگر مجھے ان چیزوں کی تنخواہ بھی ملا کرتی جنھیں میں نہیں جانتا تو شاید سارا شاہی خزانہ بھی اس کی ادائی کے لیے کافی نہ ہوتا۔"

اخباری اور اصولی فرقے فقہ، عقائد اور ان کے فرعی علوم، نیز عربی زبان کی گہری واقفیت جس کے بغیر ان علوم کی تحصیل نہیں ہوسکتی۔ یہ سب علما کے مطالعہ کے موضوع ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان میں سے کسی ایک شعبہ کا مطالعہ زیادہ تفصیل اور تدقیق کے ساتھ کیا جاتا ہے، مثلاً قاضی کو زیادہ تر فقہ سے اور عالمِ دین کو عقائد سے سروکار رہتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں اخباری اور اصولی فرقوں کا فرق بھی بتا دینا چاہیے۔ مذہب اصولی آج کل بھی رایج ہے، لیکن اخباری مذہب، اگرچہ کسی زمانہ میں بہت مشہور تھا، لیکن آج کل کچھ ایسا زیادہ قابلِ اعتنا نہیں رہا ہے ان دونوں مذاہب کے پیروؤں میں ہمیشہ سے شدید مخالفت رہی ہے، اصولی مذہب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ان عام اصولوں کی پیروی کرتا ہے، جو قرآن اور معتبر احادیث سے مستنبط ہوتے ہیں اور استخراج نتایج میں قیاس کو دخل دیتا ہے۔ برخلاف اس کے اخباری مذہب میں صرف "اخبار" کی پیروی کی جاتی ہے اور قیاس کو مطلق دخل نہیں دیا جاتا۔ عام طور پر ملّا محمد امین ابن محمد شریف استرآبادی (وفات ۱۰۳۳ھ مطابق ۱۶۲۳ء - ۱۶۲۴ء) کو اخباری مذہب کا بانی سمجھا جاتا ہے، بقول صاحب لؤلؤۃ البحرین کے[1]

[1] لیتھو بمبئی ص ۱۲۳ - ۱۲ مصنف

"یہی وہ سب سے پہلے بزرگ تھے جنھوں نے مجتہدین پر
لعنت ملامت کا دروازہ کھولا۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ فرقۂ
ناجیہ اخباریوں اور مجتہدین میں منقسم ہوگیا"

ان کی کتاب الفوائد المدنیۃ[1] تمام تر مجتہدین پر حملوں سے بھری ہوئی ہے، جنھیں وہ "مذہب حقہ کی بربادی" کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اسی مذہب کے ایک اور عالم، جو بعد کے زمانے میں ہوے، مرزا محمد اخباری ساکن بحرین کو مجتہدین سے اتنی عداوت تھی کہ انھوں نے فتح علی شاہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں چالیس روز کے اندر اس روسی جنرل کا سر جو ایران کے سرحدی صوبوں کو تاخت و تاراج کر رہا ہے، طہران میں شاہ کی خدمت میں حاضر کردوں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ اگر میں اپنا وعدہ پورا کردوں تو شاہ مجتہدین سے سروکار نہ رکھے، انھیں سرزمین ایران سے بیخ و بن سے خارج کر دے اور ساری مملکت میں اخباری مذہب رائج کردے۔ شاہ نے وعدہ کرلیا۔ تب ان اخباری عالم نے چالیس روز کا چلّہ کھینچا، ترک حیوانات کیا اور ایک موم کا پتلا بناکر اور تلوار سے اس کا سر کاٹ کر روسی جنرل کی ہلاکت کا عمل شروع کیا۔ روایت ہے کہ پورے چالیس دن کی موعودہ مہلت کے بعد روسی جنرل کا سر شاہ کے سامنے حاضر کردیا گیا۔ اب شاہ نے اپنے مشیروں سے رائے طلب کی، ان لوگوں نے عرض کی کہ طبقۂ مجتہدین ائمہ کے وقت سے

---

[1] ملاحظہ ہو کشف الحجب ص۴۰۶ نمبر ۲۲۴۳۔ یہ کتاب "الفوائد المدنیہ" مصنف نے اپنی وفات سے دو سال پیشتر مکہ معظمہ میں لکھی تھی۔" مصنف

اب تک برابر قایم ہی اور ان کا مذہب مبنی برحق و صداقت ہی، برخلاف اس کے، اخباری فرقہ تعداد میں کم اور کمزور ہی، علاوہ بریں ابھی قاچاریہ دور کی ابتدا ہی ہی، ممکن ہی کہ آپ اپنے حکم سے رعایا کے پرانے عقائد تبدیل کر سکیں لیکن اندیشہ ہی کہ مبادا ایسی کارروائی حضور کے عہدِ حکومت کے لیے مضر ثابت ہو اور رعایا بغاوت کردے، نیز یہ بھی ممکن ہی کہ مرزا محمد آپ سے بھی خفا ہو جائیں اور آپ کے دشمنوں سے ساز باز کر کے آپ کا بھی وہی حشر کریں جو انھوں نے روسی "اشپختر"[1] کا کیا، پس مناسب ترین صورت یہ ہی کہ آپ ان کی دل جوئی کریں، ان سے معذرت خواہ ہوں اور حکم دے دیں کہ وہ آستانہائے مقدسہ یعنی کربلا یا نجف دونوں میں سے کسی جگہ چلے جائیں اور وہیں سکونت اختیار

[1] قصص العلما طبع طہران ص۱۳۲، طبع لکھنؤ ص۱۸۸ - ص۱۹۹

روسی جنرل کو اس مقام پر "اشپختر" کہا گیا ہی، یہ لفظ جیسا کہ میرے دوست ایم - وی - منارسکی (M. V. Minorski) نے مجھے بتایا ہی "انسپکٹر" کا مخرب ہی، جس کا روسی تلفظ "اش پک تر" ہی - اس لفظ کی اصل غالباً "ایشی پوخ در" (ترکی: ایشی بوق در" ہی، جو ترکی بولنے والے آذربائیجانیوں کا محاورہ ہی اور جس کے معنے یہ ہیں کہ "اس کا کام مٹی کے برابر ہی" ایم - منارسکی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ اس جنرل کا اصل نام زیت سیانوف (Tsitsianoff) تھا اور وہ گرجی الاصل تھا، نیز یہ کہ یہ محاورہ "مگر سر اشپختر آوردی" آج بھی اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہی جو اتنا گھبرایا ہوا کہیں سے آئے گویا کوئی بہت اہم پیغام لایا ہی - ۱۲ مصنف

کرلیں کیوں کہ ایک ایسے "خطرناک شخص کا دارالخلافہ میں رہنا کسی طرح قرینِ مصلحت نہیں ہے" چنانچہ فتح علی شاہ نے اس مشورے پر عمل کرنے کا تصفیہ کرلیا۔

قشری علما | ایسے علما کو جو بہت خشک طبیعت، روکھے اور متشرع ہوں، ایرانی "قشری" کہتے ہیں، جس کے لغوی معنے بھوسہ پھٹکنے والے کے ہیں، یعنی محض ظاہری اور بے مغز اخباری علما کا تعلق خاص طور پر انھیں قشریئین سے ہے، لیکن بعض اصولی علما بھی قشری ہوتے ہیں، مثلاً مرزا ابراہیم، مشہور ملا صدرا کے فرزند اور سید نعمت اللہ جزائری کے اُستاد، جنھیں بہت فخر تھا کہ میرا مسلک وہی ہے جو جمہور کا یا ملاّ علی نوری جو ہر وقت یہی دعا کرتے رہتے تھے کہ میرا خاتمہ رائج الوقت دین پر ہو[1]۔

متکلمین | دوسری طرف ہمیں ایسے علما بھی نظر آتے ہیں جو ان قشریوں سے زیادہ وسیع النظر تھے اور جن کے عقائد میں فلسفہ یا تصوف کا شائبہ بھی پایا جاتا تھا: یعنی متکلمین، جنھوں نے فلسفہ اور مذہب کی تطبیق کی کوشش کی۔ یہ لوگ ازمنہ وسطے کے یورپی اصحاب مدرسہ (School men) سے بہت مشابہ تھے، آخر میں ہمیں خالص فلاسفہ مثلاً مشہور روزگار ملا صدرا شیرازی کا گروہ نظر آتا ہے اگرچہ مرور ایام سے ان کے معتقدات، مذہبی عقاید سے کسی قدر مستبعد ہوگئے تھے، لیکن ان کی تعلیم در اصل علما کی طرح ہوئی تھی اور انھیں کے طبقے سے ان کا تعلق تھا۔

---

[1] قصص العلما طبع طہران ص۲۴۴ طبع لکھنو حصہ دوم ص۱۰۰ ۔ ۱۲ مصنف

علما کی پُر نویسی ان کثیر التعداد اور محنتی حضرات نے جو ادب عربی اور فارسی زبانوں میں چھوڑا ہی، وہ قدرتاً بہت ضخیم ہی، لیکن اس کا بیشتر حصّہ اس قدر خشک یا اصطلاحی ہی کہ بجز ان مذہبی شیعہ علما کے جن کے پاس فرصت بہت ہو، دوسرا شخص اس کے مطالعہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مصنف قصص العلما لکھتا ہی[۵۱]:-

> "علما کی عمریں عموماً بڑی ہوتی ہیں اور چونکہ خانہ نشینی اور مطالعہ ان کی عادات میں داخل ہوتا ہی، اس لئے وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ لکھنے میں صرف کرتے ہیں، چنانچہ ایک ایک شخص کی تصنیفات کا سَو یا دو سَو ہو جانا تو ایک معمولی سی بات ہی"

چنانچہ خود مصنف قصص العلما نے شروح، رسائل اور دوسری متفرق تحریرات کے علاوہ اپنی ۱۶۹ مستقل تصانیف کے نام بتائے ہیں[۵۲]، ملّا محسن فیض کی ۶۹ کتابوں کے نام لکھے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہی کہ ان کی جملہ تعداد ۲۰۰ کے قریب ہی[۵۳]، محمد ابن علی ابن بابویہ الملقب بہ صادوق کی تصانیف کی تعداد ۱۸۹ بتائی ہی[۵۴] وعلیٰ ہذا۔ ان میں سے اکثر تصانیف بالکل ہیچ د پوچ ہیں اور زیادہ تر شرحیں یا نحوی، منطقی، یا فقہی متون کی تفاسیر کی شرح در شرح ہیں، غرض کہ اس گم کردہ راہ

[۵۱] قصص العلما طبع لکھنؤ ص۲۵ - ۱۲ مصنف

[۵۲] قصص العلما طبع لکھنؤ ص۲۰ - ص۲۵ ۔ ۱۲ مصنف

[۵۳] قصص العلما طبع لکھنؤ حصۂ دوم ص۱۱۳ ۔ ص۱۱۶ ۔ ۱۲ مصنف

[۵۴] قصص العلما طبع لکھنؤ حصۂ دوم ص۱۸۱ ۔ ص۱۸۶ ۔ ۱۲ مصنف

جدّت اور محنت کا حاصل اگر کچھ ہؤا ہی تو یہ کہ اصل متون، جن کی یہ شرحیں ہیں، ان کی وجہ سے اور زیادہ مہمل اور خبط ہوگئے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ، سابق مفتی اعظم مصر اور صدر الشیوخ جامعہ ازہر نے جو ہمارے زمانے کے ایک نہایت قابل اور روشن خیال عالم ہیں، اس قسم کی تصانیف کے متعلق کہا تھا کہ انھیں جلا دینا چاہیے، اس لیے کہ بجائے تحصیلِ علم میں معاون ہونے کے، یہ مخل ہوتی ہیں۔

فقہ | کتب فقہ کی بہترین کتب کا مطالعہ بھی عموماً غیر مسلموں کی قدرت سے باہر ہی۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں "اسلامی قانون" کے عنوان سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہی، وہ در اصل اس موضوع کا صرف ایک جزو ہی شریعت کی اصطلاح صرف ضابطہ مال و فوجداری ہی پر حاوی نہیں ہی بلکہ ذاتی ارکان مذہبی کی پابندی مثلاً نماز، طہارت، زکوٰۃ، روزہ، حج جہاد وغیرہ یہ سب بھی اس کے دائرے میں داخل ہیں، پھر ان سب کی لا تعداد فروع اور ان کے ضمنی مسائل کی مو شگافیاں۔ غرض کہ شریعت کا شاید نصف سے زیادہ حصہ انھی باتوں پر مشتمل ہوتا ہی۔ یہ ایک عجیب بات ہی کہ حالانکہ یورپی مستشرقین نے عقائد الشیعہ کی طرف سے بہت کچھ غفلت برتی ہی، لیکن پھر بھی یورپی زبانوں میں فقہ اسلامی کی بہترین کتاب فقہ شیعی ہی کے متعلق ہی، یعنی۔ ایم۔ ایمے دی کوئری (M Amedee Querry) کی تصنیف "Droit Mussulman: Recueil de lois Concernant Mussulmans Schyites"[1]

[1] یہ دو جلدوں میں ہی، جلد اول میں صفحہ ۴۲۴ اور جلد دوم میں صفحہ ۶۶۹ میں Paris Maisonneuve 1871 1872 ۱۲ مصنف

(فقہ اسلامی - مجموعہ مسائل الفقہ الشیعی) اگر کوئی یورپی ناظر اس موضوع اور اس کی پیچ در پیچ (اور غیر مسلموں کے نقطۂ نظر سے) ہیچ و پوچ جزئیات کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو اس یادگار تصنیف سے معتبر کوئی دوسری کتاب نہ ملے گی۔ اس کا ماخذ مشہور شیعہ عالم نجم الدین ابوالقاسم جعفر ابن الحسن الحلی الملقب بہ المحقق اول (وفات ۶۷۶ھ مطابق ۱۲۷۷ / ۱۲۷۸ء) کی تصنیف "شریعت الاسلام فی مسائل الحلال والحرام"[5] ہے۔ اس کے علاوہ ایم۔ کوئری نے جیسا کہ وہ خود اپنے دیباچہ میں (جلد اول ص۸) لکھتے ہیں دوسری کتابوں سے بھی استناد کیا ہے، نیز اپنے زمانے کے مشاہیر فقہا سے بھی مشورہ کیا ہے۔ وہ ۲۵ سال تک ترکی اور ایران میں رہے اور اہم سرکاری خدمات مثلاً مشیر سفارت خانہ فرانسہ طہران وغیرہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ غرض کہ ان چند در چند خصوصیات کی وجہ سے وہ اس محنت طلب کام کے لیے، جسے انھوں نے اتنی قابلیت کے ساتھ ختم کیا ہے، ہر طرح موزوں تھے۔ کتاب کے آخر میں انھوں نے ان عربی اصطلاحات کی فہرست بھی دے دی ہے جن کی تشریح متن کے صفحات میں کی گئی ہے، اس سے کتاب کی قدر و قیمت اور زیادہ ہو گئی ہے۔

سوال و جواب اس سلسلے میں فارسی کی بھی ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہیے جو فقہ پر سوال و جواب کی شکل میں لکھی گئی ہے، اس کا نام بھی سوال و جواب ہے، اس کے مصنف زبردست مجتہد سید محمد باقر ہیں جن کے

---

[5] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا ص ۵۱ حاشیہ ۱ ۱۲ مصنف

متعلق ہم کہیں پہلے کہہ چکے ہیں[1] کہ شرعی سزائے قتل دینے میں وہ بہت سخت تھے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۳۶ھ (سنہ ۱۸۲۰ء) کے بعد تصنیف ہوئی اور غالباً سنہ ۱۲۴۸ھ (سنہ ۱۸۳۲ء) میں اصفہان میں زیر نگرانی مرزا زین العابدین "بانی این فن در ایران" طبع ہوئی۔ اس کی طباعت نہایت دیدہ زیب ہے، ۲۹٫۶ × ۲۰٫۵ سنٹی میٹر کی تقطیع کے ۱۶۳ اوراق ہیں۔ سطر ۲۸ سطروں کا ہے۔ سوال و جواب کی سرخیاں س اور ج، ساری کتاب میں شنگرف سے قلم سے لکھی گئی ہیں۔ میرے پاس اس کی صرف ایک جلد ہے، جس میں مصنف نے دوسری جلد لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مکمل ہوئی یا نہیں[2]۔ کتاب کے مضامین کی ترتیب حسب معمول ہے، یعنی شروع میں فرائض طہارت نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا بیان ہے، خاتمہ پر کتاب الودیعت ہے، جس میں امانت رکھنے رکھوانے کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ شروع میں اصول پر ایک مقدمہ ہے اور ہر "کتاب" میں موضوع زیر بحث کے متعلقہ مسائل پر سوال و جواب کی صورت میں بحث اور ان پر خود مصنف کی رائے درج ہے۔ مقدمہ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے اس

---

[1] جلد ہذا کا صفحہ ۲۷۶

قصص العلما طبع لکھنو صفحہ ۱۲۹ - صفحہ ۱۲۸ پر ان کی مفصل سوانح عمری موجود ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] برٹش میوزیم کے کتب خانے میں صرف ایک ہی جلد ہے، ملاحظہ ہو ایڈورڈ کی فہرست (سنہ ۱۹۲۲ء) کالم صفحہ ۲۵۹

قصص العلما میں سن تصنیف سنہ ۱۲۲۷ھ (سنہ ۱۸۱۲ء) بتایا گیا ہے، لیکن اصل کتاب کے ورق ۲۹ ب سطر ۳ پر محرم سنہ ۱۲۳۶ھ (اکتوبر سنہ ۱۸۲۰ء) درج ہے۔ ۱۲ مصنف

طرح ہوتا ہے:-

س: "اگر کوئی شخص کسی مجتہد (زاد اللہ مثلہ) کی حینِ حیات میں اس کا متبع رہا ہو، تو کیا اس کی وفات کے بعد بھی اُس پر اس کا اتباع اور اس کے اقوال پر کاربند رہنا فرض ہے؟"

اس کا جواب جو تقریباً ایک صفحہ میں درج ہے، یہ ہے کہ یہ فرض نہیں ہے اور اس شخص کو کسی دوسرے مجتہد کے حلقے میں شریک ہونا چاہئے۔ اس رائے کی تائید میں بے شمار مشاہیر مثلاً محمد باقر (غالباً المجلسی)، سید محمد مہدی الشہیدۃ الثانی اور محقق ثانی وغیرہ کے مستند اقوال بیان کیے گئے ہیں۔ سب کتابوں کی ضخامت ایک سی نہیں ہے۔ کتاب الصلوٰۃ کا حجم تقریباً ۷۰ اوراق ہے اور کچھ کتابیں جن میں آخری کتاب یعنی کتاب الودیعت بھی داخل ہے صرف آدھے صفحے پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اس آخرالذکر کتاب میں صرف دو سوال اور ان کے جوابات ہیں، جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

س۔" زید نے کوئی چیز کسی امین کے پاس بمدِ امانت رکھوائی ہے اور تاکید ہے کہ فلاں شخص کو پہنچا دی جائے۔ چیز کے وصول ہونے کے بعد امین کو اس کا حتمی طور پر علم ہوتا ہے کہ ودیعت کا اصل مالک در اصل عمر ہے اور موتمن مقروض اور خاین ہے، علاوہ ازیں عمر اپنی چیز کا دعوے دار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ امانت جو تیرے پاس رکھوائی گئی ہے، میری ملک ہے، امین بھی اس کے حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے،

لیکن عذر کرتا ہے کہ موتمن نے یہ چیز فلاں شخص کو دینے
کے لیے میرے پاس رکھوائی ہے، میں تجھے نہیں دے سکتا
اب کیا عمر کو قانوناً اس کا حق ہے کہ وہ اس چیز پر قابض
ہوجائے اور امین سے اُسے لے لے، خود امین کو مزید
ذمّہ داری سے بچنے کے لیے وہ چیز کس کے حوالے کرنی
چاہیئے ۔"

جواب:۔" اگر واقعات بالکل یہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے یعنی
امین کو اس کا علم ہے کہ مِلک در اصل عمر کی ہے اور موتمن
خائن ہے، تو امین کا فرض ہے کہ چیز جائز مالک کے حوالے
کردے، خواہ موتمن اجازت دے یا نہ دے، امین کا یہ
جاننے کے باوجود کہ ملک در اصل عمر کی ہے پھر بھی اس
سے یہ عذر کرنا کہ امانت رکھوانے والے نے اسے فلاں
فلاں کو دینے کے لیے میرے پاس رکھوایا ہے، اس لیے
میں تجھے نہیں دے سکتا، فرائض ودیعت کے خلاف ہے
اور مطابق شرع نہیں ہے۔"

سوال:۔" اگر زید عمر کے پاس کوئی امانت رکھوائے اور اس
واقعہ کو ۱۷ سال ہوجائیں، لیکن عمر کے اصرار اور زید سے
بار بار درخواست کرنے کے باوجود کہ اپنی چیز واپس
لے جاؤ، وہ اسے واپس نہ لے اور یہ چیز بغیر عمر کی
زیادتی، یا نقص یا کوتاہی کے ضایع ہوجائے تو کیا عمر
کسی تاوان کا مستوجب ہے یا، نہیں ۔

جواب:- اگر جملہ واقعات یہی ہیں جو بیان ہوئے تو اس صورت
میں عمر پر کوئی تاوان عائد نہیں ہوتا۔"

میں فقہ شیعی کی صرف اسی ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں، لیکن اگر کوئی صاحب ان مسائل کی مزید مثالیں دیکھنا چاہیں، جن میں حضرات فقہا اور علما کا دماغ خوب لڑتا ہے۔ تو وہ اس مقدمہ کی کارروائی ضرور پڑھیں جو ۱۸۴۸ء میں تبریز میں باب پر بالزام کفر چلایا گیا تھا اس کارروائی کا مفصل بیان جو چیدہ چیدہ فارسی بیانات سے ماخوذ ہے ناظرین کو میری کتاب "Travellers' Narrative" کی جلد دوم ص۲۷۷ - ص۲۹۰ میں ملے گا۔

عام عقائد | اب ہم عقائد الشیعہ کی دلچسپ بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر اب تک یورپی مصنفین نے جتنی چاہئے اتنی توجہ نہیں کی ہے اور اس موقع پر بھی اس کے متعلق جو کچھ بحث کی جائے گی وہ لا محالہ مختصر اور تشنہ ہوگی۔ میں صرف رائج الوقت عقیدہ کا بیان مختصر طور پر کردوں گا اور عہد صفویہ میں یا اس کے بعد اس موضوع پر جو خاص خاص کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر کردوں گا، لیکن ابتدا سے اس کے ارتقار پر بحث نہ کروں گا۔ اس مجمل بحث کے لیے میں نے جس کتاب کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے وہ ملّا محمد باقر مجلسی کی حق الیقین یا ویسی ہی کوئی مستند اور ضخیم کتاب نہیں ہے، بلکہ ایک چھوٹا سا رسالہ عقائد الشیعہ ہے جو محمد شاہ قاچار کے زمانے میں، یعنی انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے پہلے ایک شخص مسمی علی اصغر ابن علی اکبر نے تصنیف کیا تھا اور جو بغیر صراحت

مقام یا سنہ طباعت ایران میں لیتھو میں چھپا ہی۔ اس کا حجم ص۴۳۴ ہی۔ صفحات پر نمبر درج نہیں ہیں، یہ ایک مقدمہ، پانچ مشکوٰۃ اور خاتمہ پر مشتمل ہی۔ اس کے مضامین کی تلخیص درج ذیل ہی[1]

تلخیص عقائد الشیعہ

مقدمہ

اس میں یہ بیان کیا گیا ہی کہ خالق عالم نے انسان کو بے کار نہیں پیدا کیا ہی بلکہ اس کی تخلیق کی غایت یہ ہی کہ وہ عبادت کرے، اس کے احکام پر چلے اور دوسری دنیا میں اپنے اعمال کا ثمرہ پائے۔ انسانوں تک اپنے احکام اور قوانین کی ترسیل کے لیے اس نے لاتعداد انبیاء بھیجے، جن میں حضرت محمد خاتم الانبیا اور سب سے بڑے نبی ہیں انھوں نے بنی نوع انسان کی رہ نمائی اور ہدایت کے لیے قرآن اور اہلِ بیت اطہار اور اپنے جانشینوں کو چھوڑا۔ غیبت کبریٰ[2] کے جس زمانے میں ہم لوگ آج کل ہیں،

---

[1] اس ترجمے کے ناظرین چونکہ عقائد الشیعہ کی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ نیز اصل کتاب بھی آسانی سے مل سکتی ہی، اس لیے اس حصہ کو ترجمے سے حذف کر دینا غالباً بے جا نہ ہوتا، لیکن مزید غور کے بعد ہم نے یہی مناسب خیال کیا کہ پروفیسر براؤن مرحوم کی تلخیص کا ترجمہ ضرور دینا چاہیے۔ کیونکہ عقائد الشیعہ کے متعلق ان کی رائے، نیز ان کے محققانہ حواشی سے ناظرین ترجمہ کو محروم کرنا ایک طرح کی بے انصافی ہوتی۔ ۱۲ مترجم

[2] غیبت کبریٰ ۲۶۰ھ (۸۷۳ء یا ۸۷۴ء) سے شروع ہوتی ہی یعنی بارھویں اور آخری امام کے غائب ہونے کے وقت سے، جو قیامت میں نبی آخر الزمان بن کر ظاہر ہوں گے۔ ۱۲ مصنف

اس میں صحیح اور سچّا مذہب قرآن اور ائمّہ علیہم السلام کے اقوال اور احادیث سے مستنبط ہوتا ہے۔ ان کے بموجب ہم پر تین چیزیں فرض ہیں (۱) اقرار بالقلب (۲) اقرار باللسان (۳) بعض مقررہ ارکان کی پیروی ان ارکان کی تحقیق یا تو ذاتی تلاش اور تفحص یعنی اجتہاد سے ہوسکتی ہے یا پھر کسی مجتہد کے تبتّع سے۔ خاتمے پر مصنف نے مختلف الحاوی مسائل بتائے ہیں اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے، مثلاً مسئلہ وحدت الوجود، مسئلہ اتحاد وصول، مسئلہ جبر، سقوط عبادات، جو ریاضت سے پیدا ہو، مسئلہ اِباحت[1]، الوہیت و پرستش ائمّہ، حشر یا حیات اخروی سے انکار، مزامیر یا مُغنّیات کے استعمال کو مباح قرار دینا، تناسخ تشبیہ وغیرہ۔

مشکوٰۃ اوّل (صک صـ۲۸)

(اس میں چار مصباح ہیں)

ذات و صفات آلہی کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

ذات و صفات آلہی | مصباح اول: توحید ذاتی

خدا واحد ہے، اس کا کوئی شریک، ہمسر یا ثانی نہیں، پاک ہے، بے عیب ہے، وہ مرکب نہیں اور مرکب سمجھا یا خیال نہیں کیا جا سکتا، وہ نہ جسم ہے، نہ نور ہے، نہ شے ہے، نہ حادث ہے، وہ بے نشان ہے، نہ اس سے

---

[1] اباحت (Communism) کی تلقین ایران میں ساسانیوں کے زمانے یعنی چھٹی صدی عیسوی میں مزدک نے کی تھی۔ اس وقت سے لے کر بابیوں کے زمانے تک اکثر ملاحدہ پر اباحت کا الزام لگایا گیا۔ ۱۲ مصنف

کوئی پیدا ہوا، نہ اس کو کسی نے پیدا کیا، وہ اس دنیا نیز دوسری دنیا دونوں میں غیر مرئی ہے[1] انبیا، ائمہ اور اولیا بھی اسے نہیں دیکھ سکتے ہم صرف اس کے کاموں اور قدرتوں کی وجہ سے اس کا درک کر سکتے ہیں، وہ نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ لباس استعمال کرتا ہے، اس کی ذات غصہ، رنجش، الم، لذت، بلندی، پستی، تغیر، ترقی، تنزل سب سے بری ہے، وہ ابدی ہے، ہر چیز سے بالکل بے نیاز ہے، اس کی صفات اور ذات ایک ہی ہیں، یہ نہیں ہے کہ صفات ذات میں اضافہ کر دی گئی ہوں، یہ صفات زیادہ تر صفات سلبیہ ہیں۔

رد صوفیا اس مقام پر پھر مصنف نے اصل موضوع سے ہٹ کر صوفیاء کی مختلف بے دینیوں کو مردود اور مطعون قرار دیا ہے، خصوصاً اس خیال کو کہ حسین لوگ ہی خاص طور پر جمالِ الٰہی کے آئینہ ہوتے ہیں، نیز عقیدۂ وحدت الوجود کی تردید کی ہے، جس کی رد سے مظاہرات اور ہستی مطلق کا تعلق بالکل وہی فرض کیا جاتا ہے جیسا کہ امواج اور بحر کا تعلق، یا سورج کی روشنی کی مختلف رنگ کے شیشوں سے گزرنے کی کیفیت۔

مصباح دوم۔ توحید صفاتی

یہ صفات کئی قسم کے ہوتے ہیں (۱) صفات ذاتی[2] یعنی حیات، قدرت

---

[1] اس عقیدہ کی رو سے معترضین نے حافظ کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے ؎

ایں جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست
روزے رخش بہ بینم و تسلیم می کنم ۱۲ مصنف

[2] اسی کو صفاتِ ثبوتیہ یا صفاتِ کمال بھی کہتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

اور اس کی فرع قوت نطق، علم اور اس کے فروع ارادہ اور ادراک
انھیں میں بعض علمائے عقائد نے ابدیت اور حقیقت کی صفات کا
بھی اضافہ کیا ہی، لیکن یہ صفات مثلاً نطق، ارادہ اور ادراک وغیرہ
ثانوی صفات ہیں اور حیات، قدرت اور علم، صفات اوّلیہ ہیں ۔
۲۔ صفاتِ سلبیہ یا صفاتِ جلال (بالمقابل صفات کمال و جمال) جن
میں وہ سات صفات داخل ہیں جن سے ذاتِ باری منزّہ ہی، یعنی
ترکیب، جسمیت، مرئیت، قیدِ مکانی، شرکت، غیر حقیقت اور
احتیاج ۳۔ صفاتِ فعلی یا صفات جمال، ان میں وہ افعال داخل
ہیں، جو مختلف اوقات اور حالات میں ذاتِ باری سے منسوب کیے
جاتے ہیں اور نہیں بھی کیے جاسکتے: مثلاً رازق، خالق، رحمٰن و رحیم
جواد وغیرہ، اس مصباح میں مصنف نے اشاعرہ، معتزلہ، کرامیہ، البلخی
النجار، حسن بصری وغیرہ کے عقائد کا ذکر کیا ہی۔

مصباح سوم

توحید خلقی | صفتِ خالقیت صرف ذاتِ باری ہی کو سزا وار ہی،
مجوسیوں کی طرح سے یہ عقیدہ رکھنا کہ خدا صرف خالق خیر ہی، اور
شر کا خالق شیطان ہی، شرک ہی۔ یہ ضرور ہی کہ خداوند تعالیٰ دوسرے
وسائل سے کام لے سکتا اور لیتا بھی ہی اور وہ اپنے خلق کرنے کے اختیارات
فرشتوں یا دوسرے وسیلوں کو بخش سکتا ہی:۔

"واما خیر و شر از بندگان مختار ظاہر می شود، کارِ خدا نیست،
بلکہ کار بندۂ است، لہذا موردِ ثواب و عقاب می شوند،
باختیارے کہ داد ند و بخواہش خود بخود می کنند، آنہارا

کہ خداوند امر و نہی نمودہ است اگرچہ ایشاں ہم بقدرت
و قوتے کہ ندارند بایشاں عطا فرمودہ است می کنند، لکن
چوں اختیار را ہم بایشاں داد پس ثواب و عقاب را ہم
قرار داد واما خدا خالق خیر و شر است و بندہ فاعل و
کنندہ اوست، بارے چوں (ایں) رسالہ بجہۃ عوام است
محل کلام با (ما؟) ایں جا نیست۔"

رد غلات اس کے بعد مصنف نے غلات کے بعض عقائد کی تردید کی ہے، مثلاً یہ کہ حضرت علی حکم خداوندی سے، نیز اس کے بغیر بھی خلق کرسکتے ہیں" وہ "قاسم الارزاق" ہیں" خدا نے ان کی مرضی سے کائنات پیدا کی ہے" "انھوں نے جا نماز کے نیچے ہاتھ ڈال کر نکالا تو زمین و آسمان ان کی مٹھی میں تھے" وغیرہ وغیرہ، تاہم جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے۔ یہ عقیدہ رکھا جا سکتا ہے کہ قیامت کے روز خداوند تعالیٰ پرسش اعمال کا کام حضرت علی یا دوسرے ائمہ کے سپرد کرے گا اور ان کی شفاعت بھی قبول فرمائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اسی وجہ سے حضرت علی کو "وجہ اللہ" "ید اللہ" اور "باب اللہ" وغیرہ کہتے ہیں۔

"البداء" یعنی خداوند تعالیٰ کی مشیت کاملہ پر عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے یعنی یہ سمجھنا کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور بلا "مادہ و مدت" چشم زدن میں "نیست" سے جو چاہے معرض وجود میں لا سکتا ہے۔

مصباح چہارم

توحید عبادتی | عبادت صرف ذاتِ باری ہی کی کی جا سکتی ہے صفات کی نہیں۔ ذات سے الگ ہو کر کسی صفت یا نام (جیسے کلام اللہ) کی عبادت کرنا الحاد ہے۔ اور ذات کے ساتھ شریک کر کے کسی صفت کی عبادت کرنا شرک ہے۔ شرک دو قسم کا ہو سکتا ہے، شرک جلی و شرک خفی، شرک جلی میں اصنام، اشجار، نجوم، چاند، سورج، آگ، انسانوں وغیرہ کی پرستش داخل ہے، نیز اعلام، مثلاً صلیب، یا مقدس آدمیوں کی تصاویر کی پرستش۔ شرک خفی میں بیوی بچوں کی محبت میں غلو، طلب جاہِ دنیوی میں اشتغال و انہماک، حرص و ریاکاری وغیرہ داخل ہیں۔ تاہم مکہ میں خانہ کعبہ کی زیارت اور ائمہ اطہار کے مزارات پر حاضری کی اجازت ہے، اسی طرح سے بادشاہوں یا مقدس اور عالم انسانوں کی تعظیم کے لیے خم ہونا بھی جائز ہے، بشرطیکہ سجدہ نہ ہونے پائے اور عبادت کی نیت نہ ہو۔

مشکوٰۃ دوم۔ صفحہ ۲۸ صفحہ ۳۱

قدر و جبر | " یہ عقیدہ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ خدا عادل ہے، جابر نہیں ہے، نہ اس نے کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی کی، نہ کرتا ہے اور نہ کرے گا۔ یہ ہمارے عقیدہ کا سب سے پہلا جزو ہے اور جو اس کے خلاف ایمان رکھے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردود ہے"

مشکوٰۃ دوم مذکورہ بالا الفاظ سے شروع ہوئی ہے اور اس کا سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ وہ ہے، جس میں جبر و قدر کی بحث پھر

اٹھائی گئی ہے۔

" یہ عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ خدا نہ تو اپنے بندوں کو کسی خاص فعل پر مجبور کرتا ہے اور نہ اس نے انھیں مطلق "تفویض" دے رکھی ہے، بلکہ ان کے بین بین راہ اختیار کی ہے، یعنی اس نے بندوں کو خیر اور شر دونوں کے لیے یکساں طور پر مختار اور مجاز بنایا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بندے نہ تو اپنے افعال میں اتنے مجبور محض ہیں کہ ان کے افعال خدا کے افعال سمجھے جائیں اور نہ اتنے مختار کہ محض اپنی قدرت اور قوت سے بغیر توفیق ایزدی کے سب کچھ کر سکیں۔ پہلے عقیدہ کو "جبر" اور دوسرے کو "تفویض" کہتے ہیں۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ بندے جو کچھ کرتے ہیں، ارادتاً کرتے ہیں، کسی جبر و مجبوری سے نہیں کرتے۔ خدا نے انھیں وسائل و ذرایع دے رکھے ہیں۔ اور خیر و شر کے راستے انھیں بتا دیے ہیں پس جو خیر کرے اُسے ثواب ملے گا اور جو شر کرے مستوجب عتاب ہوگا۔"

مصنّف نے اپنے مطلب کی توضیح کے لیے ایک نجّار کے شاگرد کی مثال لی ہے، جسے نجّاری کی تعلیم دی جا چکی ہے اور ضروری آلات و اوزار بھی اس کے حوالے کیے جا چکے ہیں، اب اس کا استاد اسے حکم دیتا ہے کہ اس ناپ اور اس طرح کی ایک کھڑکی تیار کرو۔ اگر شاگرد بجائے کھڑکی کے دروازہ تیار کر دے، تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی بریت میں یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ پیشہ سکھانے والا اُستاد ہے اور جن اوزاروں سے دروازہ تیار کیا گیا ہے وہ بھی استاد ہی کے دیے ہوئے ہیں، یعنی وہ اگر اوزار نہ دیتا تو دروازہ نہ بنتا۔ بالکل یہی مثال اس

بندے کی ہو جو ان قوا اور اعضا سے جو خداوند تعالےٰ نے اُسے
دیے ہیں، غلط کام لیتا ہو، اس کے بعد اس مشکک کا قصہ[1] درج کیا
گیا ہو جس نے کسی درویش سے تین سوال کیے تھے، جن کے جواب میں
درویش نے اس کے سر پر مٹی کا ایک ڈھیلا کھینچ مارا تھا، لیکن
مصنف نے اپنی ایراد کی ہو کہ مشکک کی جگہ ابوحنیفہ اور درویش کی
جگہ بہلول لکھا ہو۔

مصنف نے ایک نظریہ یہ پیش کیا ہو کہ خدا نے مومن، کافر اور
مشکک ہر ایک کا قلب الگ الگ مٹی سے بنایا ہو" وہ ان کے پیدا
کرنے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ مومن اپنے ایمان کی وجہ سے نیک ہوگا
کافر اپنے کفر کی وجہ سے شر کرے گا۔ اور اس نے ہر ضروری چیز
اسی طرح پیدا کی کہ جبر کا کوئی سوال ہی نہ رہ جائے"۔ لیکن ہماری
رائے میں یہ نظریہ کچھ زیادہ مدلّل نہیں معلوم ہوتا۔

مشکوٰۃ سوم ص۳۳ ص۴۵

دربارہ منشار عمومی و خصوصی نبوت

مقصد رسالت | نبوت عامہ:- ان انبیاء برحق کی تعداد جو
جناب خاتم المرسلین و آخرالانبیا سے پہلے ہوئے ہیں بروایات مختلف
ایک سو چالیس سے لے کر ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بتائی جاتی ہو
یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ خواہ صحیح تعداد کچھ ہی ہو، لیکن یہ سب

---

[1] یہی قصہ فوربس (Forbes) کی قواعد فارسی کے ختم پر بضمن اقتباسات
درج ہو۔ ص۲۶ ۔ ص۲۷ ، ص۲۸ ۱۲ مصنف

سب برحق اور معصوم تھے، یعنی اپنی زندگی بھر کوئی گناہ صغیرہ یا کبیرہ ان سے سرزد نہیں ہوا۔ ان سب نے ایک ہی سے حقایق حقّہ کی تعلیم دی۔ جو الہامات ربّانی ان سب کو ہوئے، وہ بھی ایک ہی طرح کے تھے، اگرچہ جزئیات کے اعتبار سے بعد کی صحف سے صحف سابقہ کی تنسیخ ہوجاتی ہے، یعنی قرآن، انجیل کو اور انجیل توراۃ کو منسوخ کردیتی ہے۔ یہی تینوں، نیز زبور اور صحوف خاص طور پر "کتب اللہ" کہی جاتی ہیں۔ اگرچہ الہامی کتابوں کی تعداد کوئی ۱۰۴ بتاتا ہے اور کوئی ۱۲۴۔ انبیاء مرسلین میں سے چار یعنی آدمؑ، شیثؑ ادریس اور نوح علیہم السلام شامی تھے۔ پانچ یعنی ہود، صالح شعیب، اسمٰعیل اور محمد صلعم عربی تھے اور بقیہ بنی اسرائیل تھے پانچ بڑے بڑے انبیاء کرام جنھیں "اولوالعزم" کہا جاتا ہے یہ تھے، نوح ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمدؐ۔

مصباح دوم

رسالتِ محمدی

نبوت خاصّہ | یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ محمدؐ خاتم المرسلین ہیں اور ان کے بعد جو کوئی نبوت کا مدعی ہو وہ کافر ہے۔ اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے قتل کردیں، نیز یہ کہ حضور کی ذات ستودہ صفات محاسنِ سیرت اور حسنِ اخلاق کے اعتبار سے جملہ بنی آدم سے اعلیٰ دارفع ہے۔ نور محمدیؐ جملہ مخلوقات سے ایک ہزار سال پہلے خلق فرمایا گیا تھا۔ وہ جن و انس دونوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور ان کی

شریعت اور احکام سے پچھلی سب شریعتیں منسوخ ہو جاتی ہیں۔

مصباح سوم

قرآن کے متعلّق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے

قرآن | جملہ کتب اللہ میں قرآن سب سے آخری اور سب سے زیادہ مکمّل ہے اور اگرچہ یہ آں حضرت کے فکر کا نتیجہ نہیں ہے، لیکن ان کا معجزہ ضرور ہے۔ یہ حادث ہے، قدیم نہیں ہے۔ یہ خالص عربی زبان میں نازل فرمایا گیا ہے (علیٰ ہذا جملہ الہامی کتابیں بھی اسی زبان میں نازل ہوئیں، اگرچہ ہر نبی کو اس کی امت کی زبان میں الہام ہوا) قرآن اپنی مکمل صورت میں شب قدر میں لوح محفوظ سے اتارا گیا لیکن جبرئیل علیہ السلام نے اسے حسب موقع اور بالاقساط ۲۳ سال کی مدّت میں آں حضرتؐ تک پہنچایا۔ جن و انس اگر سب مل کر بھی کوشش کریں تو بھی قرآن کا جواب تو کیا، اس کے ایک پارہ، بلکہ ایک سورۃ کا جواب بھی نہیں پیدا کر سکتے۔ وہ جملہ حقایق اور علوم پر حاوی ہے اور اس کے پورے معانی صرف، خدا، رسول، ائمّہ، نیز ان اصحابِ معرفت ہی کو معلوم ہیں جنھیں ان سب کی طرف سے اس کا علم بخشا گیا۔ اصلی قرآن امام غائب کی حفاظت میں ہے اور اس میں کسی قسم کی تحریف، یا تصرف نہیں ہوا ہے۔

مصباح چہارم

صفاتِ محمدؐی

سیرتِ نبوی | وہ اُمّی تھے، اُنھوں نے نہ کبھی کچھ پڑھا اور نہ کسی

جن و انس نے انھیں تعلیم دی۔ ان کا جسمِ اطہر سایہ سے منزّہ تھا ایک بادل کا ٹکڑا آپ کے سر پر سایہ فگن رہتا تھا۔ آپ اپنے سامنے کی، نیز پیچھے کی چیزیں بھی دیکھ سکتے تھے، روئے انور اس قدر روشن تھا کہ اس کی ضیا میں ازواجِ مطہرات تاریک ترین راتوں میں بغیر شمع یا چراغ جلائے ہوئے سوئی ڈھونڈھ لیتی تھیں۔ آپ کی ولادت باسعادت سے قبل، نیز اس کے وقت کئی معجزات ظاہر ہوئے، جن کی تفصیل دی گئی ہے۔ آپ معصوم تھے اور افضل الموجودات۔ جبرئیل امین آپ کی بارگاہ کے خادم تھے۔ اور عزرائیل کی تاب نہ تھی کہ بغیر مرضی مبارک روح مبارک کو قبض کرنے کی نیت سے آپ کے پاس جاتے۔ آپ نعوذ باللہ شاعر نہ تھے، نہ ساحر نہ کذّاب، نہ مجنوں اور ذاتِ مبارک سے ان چیزوں کا منسوب کرنا بہتانِ عظیم ہے۔ آپ کی پانچ روحیں تھیں، جن میں سے تین روحِ مدرج، روحِ قوت اور روحِ شہوت بقیہ بنی نوع انسان میں بھی عموماً ہوتی ہیں، چوتھی یعنی روحِ ایمان صرف مومنین کا حصّہ ہے اور پانچویں یعنی روح القدس صرف ذاتِ مبارک اور آپ کے جانشین ائمۃ علیہم السّلام کا خاص حصّہ ہے۔

مصباح پنجم۔ معجزاتِ نبوی

ان میں حسب ذیل معجزات بتائے گئے ہیں۔ شق القمر؛ ماضی مستقبل اور غیب کا علم؛ مُردوں کو زندہ کرنا؛ ۷۳، اسماے حسنےٰ میں سے ۷۲، کا علم؛ حالانکہ انبیائے سابقین میں سے کسی کو بھی بیس سے

زیادہ اسمائے حسنہ کا علم نہ تھا، وغیرہ۔ آپ دوزخ اور جنت کو بچشمِ خود ملاحظہ فرما چکے تھے اور جسم مبارک کے ساتھ، لباس زیب تن کیے، نعلینِ مبارک پہنے معراج حاصل فرما چکے تھے، تختِ خداوندی کے پاس پہنچ کر آپ نے ارادہ فرمایا تھا کہ نعلین اُتار دیں، لیکن حکم ہُوا کہ پہنے رہو۔

مصباح ششم۔ معراج نبوی

آپ نے جسمِ اطہر کے ساتھ "مقام قاب قوسین او ادنیٰ" تک رسائی حاصل فرمائی۔ اس قدر تقرب ادریس، عیسےٰ، اسرافیل یا کسی فرشتہ کو بھی نصیب نہیں ہُوا۔ یہ دعویٰ کرنا کہ یہ معراج تمثیلی یا روحانی یا باطنی تھی کُفر ہی۔

مصباح ہفتم۔ دیگر عقاید دربارہ رسالت

آپ بشر تھے جن پر مختلف بدیہی اور درمیانی ذرائع سے وحی نازل ہوتی تھی۔ آپ کی ذات مبارک میں رسول، نبی، امام اور محدث کی شخصیتیں داخل تھیں۔ محدث سے یہاں مطلب یہ ہی کہ آپ فرشتوں کو دیکھ سکتے اور ان سے ہم کلام ہو سکتے تھے۔ حشر کے دن گنہگاروں کے حق میں آپ شفیع بنیں گے۔ خداوند کریم نے بعض قیود کے ماتحت اوامر و منہیات نیز فرائض صوم و صلوٰۃ میں اضافہ کا اختیار آپ کو دیا ہی۔ آپ نے صریحی طور پر اپنے برادرِ عم زاد اور داماد علی ابن ابی طالب کو اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا، یہ دعویٰ

کرنا کہ حضرت جبرئیل وحی کو کنوئے سے میدان میں لائے اور حکم
خداوندی پاکر کہ تحقیق کرو کہ اس کا مصنف کون ہے، کنوئیں میں
جھانک کر دیکھا اور وہاں حضرت علیؑ کو موجود پایا۔ یا یہ کہ جبرئیل کو
علیؑ پر آنحضرت کا دھوکا ہوگیا۔ افترا اور کفر ہے۔

مشکوٰۃ چہارم۔ صفحہ ۱۴۵

مصباح اول۔ امامت

دوازدہ اماموں کے نام بتائے گئے ہیں۔ احناف کی، جو ابوبکرؓ، عمرؓ
اور عثمانؓ کو خلفائے رسول مانتے ہیں تردید کی گئی ہے۔ کیسانیہ کی بھی
تردید کی گئی ہے، جو محمد ابن الحنفیہ کو جو حضرت علیؑ کے صاحبزادے تھے،
لیکن حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہیں تھے، امام تسلیم کرتے ہیں۔ زیدیہ
کی تردید کی گئی ہے جو زید ابن حسن کو امام مانتے ہیں۔ اسمٰعیلیہ کی تردید
کی گئی ہے جو موسیٰ الکاظم کی بجائے ان کے بھائی اسمٰعیل کو امام مانتے
ہیں۔ افتحیہ کی تردید کی گئی ہے جو عبداللہ الافتاح، فرزند دومین امام
ششم جعفر صادق کو امام مانتے ہیں، وغیرہ وغیرہ کیسانی، زیدی،
اسمٰعیلی، طاعوسی، افتحی اور واقفی۔ یہ سب شیعہ فرقے ہیں، لیکن
اثنا عشریوں سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سب، علیٰ ہذا
احناف بھی مسلمان ہیں اور بحیثیت مومن کے پاک ہیں اور رائج
الوقت عقیدہ کے بموجب ان کی جان، مال، ازواج وغیرہ کو تکلیف
دینا جائز نہیں، حالانکہ بعض علما اسے جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن قیامت
کے روز اپنی ضلالت اور گمراہی کی پاداش میں یہ سب ایذائے جہنم

برداشت کریں گے۔

مصباح دوم - احوال نبی و ائمہ

یہ مصباح تاریخی، یا نیم تاریخی ہے، اس میں آں حضرت صلعم اور دوازدہ ائمہ کی تاریخِ ولادت و وفات اور ان کے خاص خاص حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت نبی کریم محمد صلعم | آپ کی ولادت با سعادت جمعہ ۱۷ ربیع الاول (یا ۱۲) ربیع الاول عام الفیل، ۱۰۲۱ اسکندری، ۴۰ جلوس نوشیروانِ عادل میں واقع ہوئی۔ آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی، جس میں سے ۵۳ سال مکہ معظمہ میں اور دس مدینہ منورہ میں بسر ہوئے۔ آپ کی رسالت کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب سن شریف چالیس سال تھا، آپ کی ۹۔ (یا بروایاتِ مختلفہ ۱۲، یا ۱۵) ازواج مطہرات تھیں اور دو حرمیں اولادیں یہ تھیں۔ چار فرزند، جن میں سے تین قاسمؓ، طاہرؓ اور طیبؓ، حضرت خدیجہؓ کے بطن مبارک سے، اور چوتھے ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ بیٹیاں تین تھیں:۔ فاطمہؓ (جو حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں)، زینبؓ اور رقیہؓ حضرت عثمانؓ کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ آپ کی وفات دوشنبہ ۲۷ یا ۲۸ صفر کو ہوئی، اور جسم اطہر مدینہ منورہ میں سپرد خاک کیا گیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خیبر کی ایک یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا۔

علی ابن ابی طالبؓ | آپ حضرت رسالت مآب کے خلیفہ جائز اور امام اول تھے۔ آپ کی خلافت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی وفات کے بعد

تسلیم کی گئی، جنھیں شیعہ غاصب قرار دیتے ہیں۔ آپ نے تین بڑی جنگیں لڑیں، ایک قاسطین یعنی معاویہ اموی اور ان کے شرکا سے، دوسری جنگ ناکثین عائشہ، طلحہ اور زبیر سے، تیسری جنگ مارقین خوارج سے، آپ ۶۳ سال کی عمر میں ۲۱ رمضان کو ابن ملجم کے ہاتھ شہید ہوئے، حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد آپ نے بارہ شادیاں کیں اور ۱۷ فرزند اور ۱۹ لڑکیاں آپ کے ہوئیں۔ آپ کے والد ابوطالب اگرچہ بظاہر اسلام نہ لائے تھے، لیکن دل سے مؤمن تھے، حضرت علیؑ کو اوصیاے عیسےٰ میں سے بارھواں وصی خیال کیا جاتا ہے۔

فاطمہ | آپ حضرت رسول مقبولؐ کی صاحبزادی اور حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں، آپ حضرت علیؑ کے عقد میں آئیں جن سے تین فرزند حسن، حسین اور محسن اور دو صاحبزادیاں، زینب اور ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ آپ کی وفات بعمر ۱۸ سال ۳ جمادی الثانی ۱۱ھ (۲۶-اگست ۶۳۲ء) کو واقع ہوئی۔

حسن ابن علی امام دوم | آپ شعبان (یا رمضان) ۳ھ میں تولّد ہوئے۔ (یعنی جنوری یا مارچ ۶۲۵ء) آپ ½ ۱۰ سال تک خلیفہ رہے، اس کے بعد اپنی اور اپنی جماعت کی حفاظت کے خیال سے معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے، اس کے ½ ۹ سال بعد معاویہ کے اشارے سے جعدہ بنت الاشعث ابن نفیس المعروف بہ اسما نے آپ کو زہر دیدیا، کہتے ہیں کہ حرموں کے علاوہ آپ کی ۶۰ ازواج مطہرات تھیں اور بعضوں نے تو ان کی تعداد ۳۰۰ یا ۶۰۰ تک بتائی ہے آپ نے اتنی کثرت سے طلاقیں دیں کہ آپ کا نام ہی "المطلاق" پڑگیا۔

اولادوں میں ۱۵ بیٹے اور ۲ بیٹیاں بتائی جاتی ہیں، لیکن اس بارے میں بھی کچھ اختلاف ہے، آپ کے مختلف القاب میں سے، مشہور ترین لقب المجتبیٰ ہے۔

حسین ابن علی امام سوم | آپ کی ولادت اپنے بھائی حسن کی ولادت کے چھ ماہ (؟) بعد واقع ہوئی، حرموں کے علاوہ آپ کی پانچ ازواج مطہرات تھیں، فرزند چھ تھے (۱) علی اکبر جو آپ کے بعد امام ہوئے؛ علی اوسط؛ علی اصغر؛ محمد؛ جعفر اور عبداللہ؛ صاحبزادیاں تین تھیں فاطمۃ الکبریٰ، سکینہ اور فاطمۃ الصغریٰ، اس کے بعد آپ کی نیز آپ کے ۷۲ رفقا کی شہادت واقع روز عاشورہ محرم ۶۱ھ (۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء) بمقام کربلا کا حال درج ہے، شہادت کے وقت آپ کا سن شریف ۵۶، ۵۷، یا ۵۸ سال بتایا جاتا ہے، آپ کے القاب میں سے مشہور ترین لقب سید الشہدا ہے۔

علی زین العابدین امام چہارم | علی ابن حسین امام چہارم، عموماً زین العابدین یا سید سجاد کے ناموں سے مشہور ہیں، آپ کی والدہ یزدگرد کی جو آخری ساسانی تاجدار ایران تھا، صاحبزادی تھیں، جن کا نام شہر بانو، یا دوسری روایات کے مطابق غزالہ، یا سلامہ تھا، آپ کی ولادت ۳۶ھ (۶۵۶ء-۶۵۷ء) یا ۳۸ھ (۶۵۸ء-۶۵۹ء) میں ہوئی۔ آپ کی ایک بیوی تھیں جو آپ کی چچا زاد بہن تھیں یعنی حسن رض کی صاحبزادی ام عبداللہ۔ ان کے علاوہ حرمین بھی تھیں، آپ کی ۱۶ اولادیں ہوئیں یعنی ۷ یا ۱۲ صاحبزادے، اور ۹ یا ۴ صاحبزادیاں آپ کے ایک فرزند زید کو اموی خلیفہ ہاشم ابن عبدالملک نے

مروا ڈالا تھا، روایت ہے کہ اسی خلیفہ نے خود آپ کو بھی سنہ ۹۴ھ (سنہ ۷۱۲ھ) میں زہر دے دیا۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر ۵۰ سال تھی۔

محمد باقر امام پنجم | آپ سنہ ۵۷ھ یا سنہ ۵۸ھ میں پیدا ہوئے (سنہ ۶۷۶ء۔ سنہ ۶۷۸ء) کہتے ہیں کہ بنو امیّہ نے آپ کو سنہ ۱۱۴ھ مطابق سنہ ۷۳۲ء یا سنہ ۱۱۷ھ مطابق سنہ ۷۳۶ء۔ سنہ ۷۳۵ء میں زہر دے دیا (اس سے آگے کتاب میں اتنی غلطیاں ہیں کہ بہت زیادہ احتیاط سے تلخیص کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انھی امام کی عمر ۵۷ یا ۵۸، یا ۸۰ برس کی لکھی ہے، جو سب کی سب، خصوصاً آخری (یعنی ۸۰ برس) ان تاریخوں سے جو آپ کی ولادت اور وفات کی دی ہوئی ہیں، مطلق مطابق نہیں ہیں)

جعفر الصّادق امام ششم | آپ سنہ ۸۰ھ مطابق سنہ ۶۹۹ء۔ سنہ ۷۰۰ء میں پیدا ہوئے، عباسی خلیفہ المنصور نے آپ کو سنہ ۱۴۸ھ مطابق سنہ ۷۶۵ء۔ سنہ ۷۶۶ء میں زہر دیا۔ چوں کہ آپ کے زمانے میں بنو امیّہ اور بنو عباس میں خاندانی جھگڑے پیدا ہو گئے تھے، اس لیے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ نے شیعیت کی بہت پُر زور تبلیغ و اشاعت کی۔ چنانچہ آپ کے نام کی مناسبت سے شیعیت کو مذہب جعفری بھی کہتے ہیں۔

موسیٰ الکاظم امام ہفتم | سنہ ۱۲۹ھ مطابق سنہ ۷۴۶ء۔ سنہ ۷۴۷ء میں پیدا ہوئے ہارون رشید نے آپ کو ۱۸۳ھ (سنہ ۷۹۶ء۔ سنہ ۷۹۷ء) میں زہر دے دیا۔

علی رضا، امام ہشتم | آپ کو المامون نے ۲۰۳ھ مطابق ۸۱۸ء۔ ۸۱۹ء میں زہر دے دیا، آپ کا مزار مبارک مشہد میں ہے۔

محمد تقی، امام نہم | ۱۹۵ھ مطابق ۸۱۰ء۔ ۸۱۱ء میں پیدا ہوئے، خلیفہ المعتصم کے اشارے سے آپ کی اہلیہ نے ۲۲۰ھ (۸۴۶ء۔ ۸۴۷ء) میں آپ کو زہر دیا۔

علی نقی۔ امام دہم | ۲۱۲ھ مطابق ۸۲۷ء۔ ۸۲۸ء میں پیدا ہوئے خلیفہ المعتز کے اشارے سے انھیں ۲۴۵ھ مطابق ۸۶۸ء میں زہر دیا گیا۔

حسن العسکری امام یازدہم | ۲۳۲ھ مطابق ۸۴۶ء۔ ۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ خلیفہ المعتمد کے اشارے سے ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء۔ ۸۷۴ء میں زہر دے کر ہلاک کئے گئے۔

امام مہدی الموسوم بہ قائم علی محمد حجۃ اللہ و باقیات اللہ امام دوازدہم | آپ آخری امام ہیں، حسن العسکری کے فرزند ہیں اور نرجس خانم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ سال ولادت ۲۵۵ھ مطابق ۸۶۹ء ہے۔ ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء۔ ۸۷۴ء میں غائب ہوئے، اب تک زندہ ہیں، قریب قیامت رجعت فرمائیں گے، شیعہ مذہب قایم کریں گے۔ اور دنیا کو جو ہنوز ظلم کدہ ہے عدل و انصاف سے مملو کریں گے۔

مصباح سوم۔ صفات ائمہ

یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ جملہ ائمہ ایک نور سابق الوجود سے پیدا

کیے گئے ہیں برکات الٰہی کے نزول اور معرفت الٰہی کے حصول کا ذریعہ صرف انھی کی ذات ہے، کائنات کی زندگی، حرکت اور وجود انھی کی بدولت ہے، رسولِ مقبولؐ کی ذات بابرکات کے بعد یہی حضرات ہر حیثیت سے جملہ موجودات سے اعلیٰ و افضل ہیں، اگرچہ حوائج انسانیہ سے مبرّی نہیں ہیں، لیکن اور سب انبیا اور فرشتوں سے اعلیٰ و افضل ہیں معصوم ہیں، کوئی گناہ کبیرہ یا صغیرہ ان سے سرزد نہیں ہوسکتا، باہم ہم رتبہ ہیں، ہر صفت، علم اور قدرت سے متصف ہیں ان کی ولادت عام انسانوں کی طرح نہیں ہوئی، بلکہ رسول مقبول کی طرح، یہ سب بھی بطنِ مادر سے مختون تولّد ہوئے، ائمہؑ کے کمالات کی مزید صراحت کے بعد مصنف نے ناظرین کو متنبہ کیا ہے کہ غلّات کے عقائد سے اجتناب کریں جو ائمہ کا درجہ رسول سے بھی بڑھا دیتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔

مشکوٰۃ پنجم ص۱۷۱ ص۲۵۰[1]

عقائد متعلقہ موت، یوم الحساب و معاد

مصباح اوّل - درباره ممات

موت کے وقت، خواہ مرنے والا مومن ہو یا کافر، فرشتہ رسولِ کریم

[1] اکثر فارسی کتابوں کی طرح عقائد الشیعہ کی ترتیب بھی فہرست مباحث کے مطابق نہیں ہے - فہرست میں پانچ حصّے جنھیں مصباح کہا گیا ہے، قایم کیے گئے ہیں، لیکن کتاب میں صرف چار مشکوٰۃ ہی ہیں اور اس حصّے کو مشکوٰۃ چہارم کا مصباح پنجم

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اور ائمہ موجود رہتے ہیں، جب روح کالبد خاکی سے جدا ہوتی ہے تو یہ کسی " قالب مثالی لطیف" کے ساتھ وابستہ ہوجاتی ہے، جو عالمِ برزخ میں مادّی جسم کا ہیولیٰ ہے۔ یہ عقیدہ رکھنا جیسا کہ اکثر لوگ رکھتے ہیں، یہ منزّہ عن الاجسام ارواح سبز طیور کے حواصل، یا قنادیلِ عرش میں داخل ہوجاتی ہیں، گمراہی ہے۔ یہ منزّہ روح اس جسم کو جس کو اس نے چھوڑا ہے، نیز اس کے دفن کی تیاریوں کو دیکھتی رہتی ہے اور اگر مرنے والا مومن ہے، تو دفن میں عجلت کی اور اگر کافر ہے، تو تاخیر کی تاکید کرتی رہتی ہے، اگرچہ کوئی اس کی آواز کو نہیں سنتا، نہ اُس سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ جہنم یا جنت میں (جیسی بھی صورت ہو) اپنے مقام کو بھی دیکھتی ہے، مومن کی موت ہمیشہ آسان نہیں ہوتی اور نہ کافر کی ہمیشہ سخت ہوتی ہے۔ اس کے بعد عزرائیل کا جو بیان آن حضرت صلعم نے شبِ معراج میں انھیں دیکھ کر کیا تھا وہ درج کیا گیا ہے۔

مصباح دوم۔ پرستشِ قبر

جب جسم دفن کردیا جاتا ہے اور عزا دار رخصت ہوجاتے ہیں تو روح منکر نکیر کے سوال قبر کا جواب دینے کے لیے جسم میں واپس آتی ہے، اس کے بعد نکیرین کی دہشت ناک شکلوں کا بیان کیا گیا ہے اگر مرنے والا مومن ہے اور اپنی قوت ایمانی سے ان کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیتا ہے تو نکیرین اس سے تعارض نہیں کرتے، بلکہ کہتے ہیں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کہا گیا ہے، لیکن چونکہ اس کا موضوع بحث نیا ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ اسے مشکوٰۃ پنجم ہی کہنا چاہیے، جیسا کہ میں نے کیا ہے ۱۲ مصنف

کہ "جس طرح عروس حجلۂ عروسی میں آرام سے سوتی ہے، اسی طرح تو قبر میں سو" اور وہ اس کی قبر کو حدِّ نظر تک وسیع کر دیتے ہیں اور اس سے ایک دروازہ بہشت کی طرف نکالتے ہیں، جس سے نسیم خلد قبر میں آتی اور سونے والے کو فرحت بخشتی ہے، لیکن اگر مرنے والا کافر ہو تو منکر نکیر اس کو لعنت ملامت کرتے ہیں۔ اپنے گرزوں سے اس کو مارتے ہیں، اس کی قبر میں آگ بھر دیتے ہیں اور وہ شخص اس کرب اور تکلیف کی وجہ سے ایسی جگر خراش چیخیں مارتا ہے کہ اگر جن وانس انھیں سن لیں تو فرط دہشت سے ان کا دم خفا ہو جائے، لیکن جانور انھیں سنتے ہیں اور یہی وجہ ہے بھیڑیں چرتے چرتے اور چڑیاں دانہ چگتے چگتے ٹھٹک جاتی ہیں اور ان چیخوں کو غور سے سنتی اور لرزتی ہیں جو شیعہ کربلائے معلّٰی میں دفن ہیں، ان کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سوال قبر سے محفوظ ہیں اور بعضوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ پورا میدان کربلا جو ہر طرح کی آلائشوں سے پاک ہے، کافروں اور منافقوں کی لاشوں کے ساتھ سارے کا سارا جنت کو منتقل کر دیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مردوں کے نیک اعمال اور اپنی زندگی میں جو شفقتیں انھوں نے دوسروں پر کی ہیں وہ کسی حسین رفیق کی شکل اختیار کر لیں، جو ان کی تنہائی میں ان کا دل بہلائے گا۔[۱]

---

[۱] اس عقیدے میں اور زرتشتیوں کے اُس عقیدے میں جو ارداویراف نامہ میں بیان کیا گیا ہے بہت دلچسپ مشابہت پائی جاتی ہے۔

۱۲ مصنف

مصباح سوم۔ دربارہ فشارِ قبر

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر مرنے والے کو فشارِ قبر کی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔ یا صرف کافروں کو۔ یہ فشار صرف انھیں لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے، جو زمین میں دفن ہیں بلکہ جن کو پھانسیاں دی گئی ہیں یا جو ڈوب کر مرے ہیں یا جنھیں خوں خوار درندوں نے پھاڑا ہے، ان کو بھی یہ تکلیف ہوگی۔ سوالِ قبر اور فشارِ قبر کے بعد روح پھر مادی جسم سے الگ ہوجاتی ہے اور قالب مثالی لطیف سے وابستہ ہوجاتی ہے، یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا یہ قالب مثالی لطیف مادی جسم کے اندر ہمیشہ سے موجود ہے یا اس سے الگ عالمِ مثال میں ہے۔ یا فراقِ جسم و روح کے وقت ہر روح کے لیے علیحدہ طور پہ بنایا جاتا ہے۔

مصباح چہارم[1]۔ دربیان عالمِ برزخ

برزخ کے معنے ایسے حجاب کے ہیں جو دو اشیاء کے درمیان ہو یہاں اس سے مراد وہ حالت، یا وہ عالم ہے جو اس زندگی اور دوسری زندگی کے درمیان اور اول الذکر سے لطیف تر اور ثانی الذکر سے کثیف تر ہوتا ہے، بعض لوگ اسی کو عالمِ مثال بھی کہتے ہیں، بعضوں

---

[1] اصل کتاب میں اسے مشکوٰۃ چہارم کا مصباح پنجم کہا گیا ہے اور فصلوں کا شمار یہاں سے پھر شروع ہوتا ہے، لیکن میری رائے میں در اصل مشکوٰۃ پنجم کا مصباح چہارم ہے۔ ۱۲ مصنف

کی رائے میں یہ اسی دنیا میں واقع ہی، لیکن سات طبقوں سے الگ ایک آٹھویں طبقے میں ہی جسے ارضِ ہورقلیا[1] کہتے ہیں۔ "بہشتِ ارضی" اس ارض کے مغربی حصّے میں وادی دارالسلام میں واقع ہی اور "جہنم ارضی" اس کے مشرقی حصّے میں وادی برہوت میں ہی[2]۔ "بہشت ارضی" میں نیکوں کی اور "جہنم ارضی" میں بدوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں اور اُن کو راحت اور ان کو اذیت ملتی ہی اور جب کوئی نئی روح داخل ہوتی ہی تو پُرانی روحیں کچھ دیر کے لیے اسے سکون سے رہنے دیتی ہیں تاکہ سوالِ قبر اور فشار کی جو ایذائیں اسے ہوئی ہیں، ان کی تکلیف کم ہوجائے۔ اس کے بعد وہ اُس سے ان دوستوں، عزیزوں وغیرہ کے حالات دریافت کرتی ہیں جنھیں وہ اس دنیا میں چھوڑ گئی تھیں اور پوچھتی ہیں کہ وہ زندہ ہیں یا مرگئے۔

مصباح پنجم[3] ۔ حشر سے پہلے مُردوں کی حالت

مُردوں کی روحیں اپنے خاندان والوں اور دوستوں کو دیکھنے

---

[1] دیکھو شیخیوں کا عقیدہ در بارہ جسم ہُورقلیا جس کا بیان میں نے اپنی کتاب Travellers' Narrative جلد دوم ص۲۳۶ میں کیا ہی۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو قزوینی کی آثار البلاد، نیز ہالوے (Halevy) کا مضمون مطبوعہ Journal Asiatique بابتہ اکتوبر۔دسمبر ۱۸۸۳ء ص۴۴۲ ص۵۴۴ ۔ ۱۲ مصنف

نیز یاقوت کی معجم البلدان جلد اول ص۵۹۵ ۱۲ مصنف

[3] اسے اصل کتاب میں مصباح پنجم (مشکوٰۃ چہارم) کی فصل دوم قرار دیا گیا ہی ۱۲ مصنف

کے یے کبھی روزانہ، کبھی ہفتہ وار، کبھی ماہانہ، کبھی سالانہ اور کبھی کئی کئی سالوں میں ایک مرتبہ اس دنیا میں اپنے پُرانے گھروں کو واپس آتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے وہ سبز پرندوں کی شکلوں میں آتی ہیں اور مکان کی چھت یا دیواروں پر بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں، لیکن دنیا والے اپنی دنیوی مکروہات کی وجہ سے انھیں نہیں دیکھ سکتے یا ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، نیکوں کی روحیں صرف ان نیک اور اچھی باتوں کو دیکھتی ہیں جو ان کے اعزا اور اقربا کرتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان روحوں کے آنے کا کوئی خاص دن مقرر ہے، مثلاً دوشنبہ کے دن دوپہر کے وقت، یا جمعرات یا جمعہ۔ اگر ان کے اعزّا اور اقربا انھیں یاد رکھتے ہیں، ان کی طرف سے کوئی کارِ خیر کرتے، یا نماز اور روزہ انھیں بخشتے ہیں تو یہ روحیں خوش ہوتی ہیں، اگر نیک ہیں تو ان کی خوشی اور زیادہ ہوجاتی ہے۔ اگر راندۂ درگاہ ہیں تو ان کے عذاب میں کمی ہوجاتی ہے، اس موقع پر مصنف لکھتا ہے:-

"پس اے میرے دوستو! تم کو اس دنیا میں رہ کر مرنے والوں کو فراموش نہ کرنا چاہیے، بلکہ جہاں تک تمھارے امکان میں ہو، ان کے نام پر کچھ نہ کچھ کار خیر کرتے اور بخشتے رہو۔" بہشت ارضی کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ امن و سکون کی جگہ ہے، جہاں نہ غم ہے، نہ گریہ وزاری اور نہ نماز روزہ کے فرایض ادا کرنے پڑتے ہیں۔

مصباح ششم[1] - در بیان ارواح اشرار

مرنے کے بعد اشرار کی حالت | ان کی روحوں کو بھی کبھی کبھی اپنے دنیاوی گھروں کو آنے کی اجازت دی جاتی ہے، لیکن انھیں صرف اپنے اعزّا اور اقربا کے اعمال بد ہی نظر آتے ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ انھیں متنبّہ کریں، لیکن نہیں کرسکتیں اور پہلے سے بھی زیادہ زار و ملول ہوکر جہنم ارضی کو واپس چلی جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ بحث کی گئی ہے کہ مومنوں اور کافروں کے بچوں، جاہلوں، فاترالعقل لوگوں اور مجنونوں کی حالت مرنے کے بعد کیا ہوگی۔ پھر کراماً کاتبین کی بحث ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مومنین کے بچّے مرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی نگرانی میں دے دیے جاتے ہیں اور لڑکیاں حضرت مریمؑ کے سپرد کردی جاتی ہیں۔

خاتمہ[2] (ص۵ - ص۱۳۲)

عقیدہ در بارہ ظہور امام دوازدہم

فصل اوّل در بیان غیبت امام موعود | تین قسم کی "غیبت" بتائی گئی ہے: غیبتِ صغرے، غیبتِ کبرے اور غیبتِ اصغر۔ غیبتِ صغرے ۸- ربیع الاول ۲۶۰ھ (یکم جنوری ۸۷۴ء) کو شروع

---

[1] جیسا کہ حاشیہ ص۵۳۶ ۱ میں بتایا جاچکا ہے اس مصباح کو فصل سوم لکھا گیا ہے ۱۲ مصنف

[2] اس حصّے کا عنوان خاتمہ ہونا چاہیے، لیکن اصل کتاب میں اسے مشکوٰۃ چہارم کی مصباح پنجم کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۔ حاشیہ ۔ ۱۲ مصنف

ہوئی، ۶۹ سال رہی اور اس وقت ختم ہوئی جب ان چار وکلا[1]
میں سے جو امام غائب اور ان کی امت کے درمیان واسطہ تھے،
آخری وکیل کا انتقال ہوگیا، یعنی ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء-۹۴۱ء
میں۔ اس کے بعد غیبتِ کبریٰ کا آغاز ہوا۔ جس میں کسی کی رسائی
براہِ راست امام غائب[2] تک نہیں ہوسکتی۔ آج کل اسی غیبت کبریٰ
کا زمانہ ہے۔ غیبتِ اصغر کا زمانہ امام غائب کی رجعت کے بعد جمعہ کے
دن دوپہر سے شروع ہوگا۔ وہ خطیب مکہ کو قتل کریں گے اور فوراً
غائب ہوجائیں گے۔ یہ غیبت دوسرے دن، یعنی ہفتہ کی صبح تک
رہے گی۔ رجعت کا زمانہ صرف خدا ہی کو معلوم ہے، لیکن اس سے
پہلے بہت سی نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ جن میں سے مصنف نے ۴۸
یا اس سے کچھ زیادہ نشانیاں بیان کی ہیں۔ ان میں سے سب سے

---

[1] ان کو ابواب بھی کہتے ہیں غالباً مصنف عقائد الشیعہ نے انھیں قصداً ابواب نہیں کہا ہے، اس لیے کہ اس کتاب کا سنِ تصنیف (۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء) ہی وہ زمانہ تھا جب مرزا علی محمد نے باب ہونے کا دعویٰ کرکے سارے ایران میں تہلکہ ڈال دیا تھا، ملاحظہ ہو میری کتاب Travellers' Narrative جلد دوم صفحہ ۲۲۶، صفحہ ۲۳۴ نیز صفحہ ۲۹۶، صفحہ ۲۹۵ ۱۲ مصنف

[2] میری کتاب ''Travellers' Narrative'' کی جلد دوم کے آخر میں جو حواشی دیے ہوتے ہیں، خصوصاً D، E اور O ان میں "غیبت" "ابواب" اور "امام غائب" سے گفت و شنید کرنے سے متعلق جو دعوے شیخیوں اور بہائیوں نے کیا تھا، ان سب کی تفصیل موجود ہے، ناظرین کو چاہیے کہ انھیں ملاحظہ کریں۔ ۱۲ مصنف

زیادہ مشہور نشانی ایک شریر النفس اور دہشت ناک شخص یعنی سفیانی کا ظہور ہے، بالآخر زمین اس کی فوجوں کو کھائے گی۔ دوسری علامتیں یہ ہیں:- سورج میں کسی شکل کا نظر آنا، علمائے سوء، فقہا اور شعراء کی افراط، ظلم و طغیان کی کثرت، دجّال کی آمد جو اپنے گدھے پر سوار ہوگا۔ امام کے ۳۱۳ برگزیدہ امتّیوں کا بمقام طالقان (خراسان) جمع ہونا۔ بادشاہت اور دنیا کا زمانہ ۷۰ سال رہے گا۔ اس کے بعد

قیامت صغرے | ایک مسیحی عورت ملیحہ امام کو زہر دے دے گی اور وہ مر جائیں گے۔ اب امام حسین دنیا میں واپس آئیں گے اور ان کی نماز جنازہ کی امامت کریں گے۔ یہیں سے قیامت صغرے شروع ہوگی، آن حضرت صلعم جملہ ائمہ اور ان کے خاص خاص دشمن سب تھوڑے دنوں کے لیے دنیا میں واپس آجائیں گے اور ازسرنو پُرانی جنگیں لڑی جائیں گی، لیکن اس مرتبہ ان کا نتیجہ پہلے سے مختلف ہوگا۔ یعنی کافروں کو متواتر شکستیں ہوں گی۔ اس عارضی اور پہلی قیامت میں صرف مومن خالص یا کافر خالص ہی محشور ہوں گے، اس کے بعد پھر وہ سب روئے زمین سے غائب ہو جائیں گے اور اور چالیس دن کے فتنہ و فساد اور انتشار کے بعد یاجوج اور ماجوج کے قبیلے جن کو سدّ روکے ہوئے ہے۔ اسے توڑ کر دنیا میں پھیل جائیں گے ساری گھاس، پتیاں وغیرہ کھالیں گے۔ اور سب دریاؤں کا پانی پی جائیں گے۔

قیامت کبرے | قیامت کبرے میں تمام مُردے اپنے اپنے قالبوں کے ساتھ محشور ہوں گے، خداوند کریم اپنی قدرت سے ان کے مُردہ

قالبوں کو پہلے کی طرح بنا دے گا، جیسے ٹوٹی ہوئی اینٹ اپنے اجزاے پھر پہلے کی طرح تیار کی جاسکتی ہے، اس قیامت کا آغاز اس طرح ہوگا کہ حضرت اسرافیل اپنا صور پھونکیں گے، جس میں تمام زندوں اور مُردوں کی روحیں آکر جمع ہو جائیں گی اور سوائے "چہاردہ معصومین"[1] کے روئے زمین پر کوئی باقی نہ رہے گا۔ اس کے بعد جب سب قالب از سرِ نو تیار ہو جائیں گے، تو اسرافیل پھر صور پھونکیں گے اور تمام روحیں شہد کی مکھیوں کے جھرمٹ کی طرح اس میں سے نکلیں گی اور ہر روح اپنے مخصوص قالب میں داخل ہو جائے گی اسی طرح سے جملہ حیوانات بھی "حساب" کے لیے اور زندگی میں دوسروں پر جو تشدّد انھوں نے کیا تھا، اس کی پاداش بھگتنے کے لیے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ پھر میزان کھڑی کی جائے گی جس میں ہر روح کے نیک و بد اعمال تولے جائیں گے اور کراماً کاتبین یعنی سائق اور شاہد کا لکھا ہُوا نامۂ اعمال ہر شخص کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

سبعہ جہنم | اس کے بعد سات جہنموں کے تام بتائے گئے ہیں یعنی جہنم، سعیر، سقر، جحیم، لظیٰ، حطمہ اور حاویہ، ان میں سے پہلی جہنم ان مسلمانوں کے لیے ہے جو بغیر توبہ استغفار کیے ہوئے، گنہ گار مرے ہیں۔ جب ان کی کافی سزا ہو چکے گی تو انھیں اس جہنم سے نجات مل جائے گی۔ دوسری جہنم یہودیوں کی ہے، تیسری عیسائیوں کی، چوتھی سبائیوں کی، پانچویں مجوسیوں کی، چھٹی عرب بت پرستوں کی

[1] یعنی رسول کریم، ان کی صاحبزادی فاطمہ اور بارہ امام۔ ۱۲ مصنف

اور ساتویں منافقین کی۔ کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ لیکن ان میں سے بعض اپنی نیک اعمالیوں کے صلہ میں وہاں کسی قسم کا عذاب نہ پائیں گے، مثلاً خسرو انوشیرواں اپنے عدل کی وجہ سے، اور حاتم طائی اپنی سخاوت کی وجہ سے جہنم کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے بعد پل صراط کا حال ہے، جو بال سے زیادہ باریک

پل صراط

تلوار سے زیادہ تیز اور آگ سے زیادہ گرم ہوگی۔ یہ پل جہنم کے اوپر ہوگا اور ہر شخص حتیٰ کہ انبیا، ائمہ اور اولیا سب کو بہشت میں داخل ہونے کے لیے اس کے اوپر سے ہوکر گزرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ایک بہت زیادہ مادّی لذّات کی بہشت کا ذکر ہے، پھر اعراف کا بیان ہے۔ اعراف کو ایک خواب صورت مزار بتایا گیا ہے جو پل صراط پر واقع ہے اور جس میں کم عقلوں ناجائز اولادوں اور ان لوگوں کی آبادی ہے، جو نہ اتنے نیک تھے کہ جنت کے مستحق ہوں اور نہ اتنے بد تھے کہ جہنم کے سزاوار نہیں۔ رسول کریم یا ائمہ کی شفاعت سے ان میں سے بعض

بہشت

بعد میں بہشت میں داخل کرلیے جائیں گے، اس کے بعد جنت کی نعمتوں کا بیان ہے، مثلاً آب کوثر، سدرۃ المنتہیٰ، شجر طوبیٰ، جب ہر روح کو اس کے اعمال کے مطابق جنت، جہنم یا اعراف میں جگہ مل چکے گی تو موت ایک سیاہ بھیڑ کی شکل میں لاکر ذبح کردی جائے گی۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب موت کا کوئی ڈر، یا اس کی امید کسی کو نہ رکھنی چاہیے۔

خاتمہ[۱] ص ۱۳۲ تا ص ۱۳۵

فصل دوم، در معنی کفر و ایمان | قرآن میں کفر کی پانچ قسمیں ایک دوسرے سے الگ بیان کی گئی ہیں، زندگی میں عموماً کفر تین طرح کا ہوتا ہے، یعنی قلبی، قولی اور فعلی، اسی طرح سے ایمان کی بھی تین قسمیں ہیں۔ اور ایمان اور اسلام کا فرق بیان کیا گیا ہے سنّی اور وہ شیعہ جو اثنا عشری نہیں ہیں، مومن ہیں، مگر مسلم نہیں ہیں۔ لیکن ہمیشہ نارِ جہنم میں رہیں گے، مرتد کی سزا موت بتائی گئی ہے۔ اس کی توبہ اس دنیا میں قبول نہ کی جائے گی، اگرچہ بعض علما کے قول کے مطابق، دوسری دنیا میں قبول کرلی جائے گی۔ لیکن اگر ایک شخص اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرے اور پھر اپنے اصلی مذہب پر آجائے تو اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ مرتدہ کو سزائے موت نہ دینی چاہیے، بلکہ اس کو قید کرلینا چاہیے اور اس وقت تک سزاے تازیانہ دینی چاہیے جب تک وہ تائب نہ ہو یا مرنہ جائے۔ پانچ قسم کے عقائد اور چھٹی قسم کی توبہ کے بیان پر یہ رسالہ ختم ہوجاتا ہے۔

یہ ہے ایران کے آج کل کے شیعہ مذہب کا خاکہ، جس کے موٹے موٹے اور عامیانہ عقائد صفحات بالا میں بیان کیے گئے ہیں۔

[۱] کتاب میں اس کا عنوان خاتمہ رکھا گیا ہے۔ لیکن ملاحظہ ہو ص۲۹۵ حاشیہ نمبر ا۔ اس فصل کو ایک طرح کا خلاصۃ الکتاب سمجھنا چاہیے۔ ۱۲ مصنف

اسلام کے ابتدائی زمانے سے شروع کر کے موجودہ شیعہ مذہب کے ارتقار پر نظر ڈالنا اور جس حد تک کہ موجود مواد ساتھ دے شیعہ اور سنّی عقائد اور اعمال کی جزئی بحث اور تاریخی اور ذہنی ائمہ کا امتیاز — یہ سب کچھ اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن بدقسمتی سے اول تو اس قسم کی بحثوں کے لیے جو تحقیق اور تدقیق ناگزیر ہے وہ ہنوز مکمل نہیں ہوئی ہے اور بفرضِ محال اگر ہوتی بھی تو بھی یہ بحث موجودہ کتاب کی حدِّ نظر سے باہر ہے۔ قشری مجتہدین اور ملاؤں کے ذاتی عقائد اتنے توہمانہ اور طفلانہ نہیں ہیں، جتنے کہ مذکورہ بالا عامیانہ عقائد، لیکن ان حضرات نے کمال دور اندیشی سے کام لے کر عقائدِ عامّہ میں خلل نہ ڈالنا ہی مناسب سمجھا اور قیاسات اور عقلی موشگافیوں کا دروازہ بند ہی رکھا، ورنہ ایرانیوں کی جیسی متشکک اور مائل بہ الحاد قوم کے لیے یہ چیزیں بہت خطرناک ہو جاتیں!

ایرانی معتقداتِ مذہبی کے بڑے بڑے اقسام اگر ہم صرف ایران کے مذہبی اور فلسفیانہ افکار و معتقدات کی بڑی بڑی قسموں ہی پر غور کی نظر ڈالیں تو ہمیں ان میں سے ہر ایک میں تین بڑے بڑے گروہ ایک دوسرے سے الگ نظر آئیں گے: یعنی علمائے مذہب میں اخباریوں، اصولیوں اور شیخیوں کی جماعتیں اور فلاسفہ میں متکلمین، فلاسفہ یا حکما اور صوفیا کے

گوبی نو کی تقسیم فرقے۔ ان سب کا جو بیان گوبی نو (Gobineau)[1]

---

[1] ملاحظہ ہو "Les Religions et les Philosophies daus l' Asie Centrale"

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

نے کیا ہی اس سے زیادہ واضح، دل چسپ اور جامع بیان مجھے کسی اور یورپی تصنیف میں اب تک نہیں نظر آیا - تاہم یہ دعویٰ کرنا مشکل ہی کہ وہ جس قدر واضح ہی اسی قدر صحیح بھی ہی! مثلاً اخباریوں سے زیادہ خشک اور غالی فرقہ ایران میں کوئی اور نہ ہوگا، لیکن گوبی نو نے انھیں کسی قدر وسیع المشرب بتایا ہی، جس کا یہ فرقہ کسی طرح مستحق نہیں ہوسکتا - اسی طرح سے شیخیوں کے متعلق اس نے لکھا ہی کہ وہ "حشر جسمانی کے عقیدہ کے مخالف نہ تھے" حالانکہ دراصل جس چیز کی وجہ سے ان پر تہمت الحاد لگائی گئی وہ ان کا مسئلہ "جسم ہورقلیا"[1] ہی تھا - علاوہ بریں شیخیوں ہی کے عقائد آگے چل کر بابیوں کے زیادہ الحادی مسائل کے لیے دلیل راہ بنے. بابی دائرہ اسلام سے خارج سمجھے جاتے تھے، لیکن شیخی مسلمان سمجھے جاتے تھے اور ان کے اکثر ہم عقیدہ اعلیٰ عہدوں پر سرفراز کیے جاتے تھے - فلاسفہ اور صوفیا کی بحث آئندہ کسی باب میں ہوگی، لیکن علمائے مذہب کے متعلق ہمیں گوبی نو کا یہ فیصلہ ذہن میں رکھنا چاہیے[2] -

" یہ امر ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ اگر ان تینوں راویوں کی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) (مذاہب و فلسفہ ایشیائے وسطی) تینوں مذہبی جماعتوں کا بیان صفحہ ۲۸ - ۳۳ پر اور صوفیا اور فلاسفہ کا بیان صفحہ ۶۳ - ۱۱۱ پر ہی - ۱۲ مصنف

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب Travellers' Narrative جلد دوم صفحہ ۲۳۶ - ۱۲ مصنف

[2] گوبی نو کی کتاب مذاہب و فلسفہ ایشیائے وسطی - صفحہ ۳۲ - ۳۳ - ۱۲ مصنف

جو تقسیم میں نے کی ہے وہ ممکن بھی ہو، تب بھی ایسا
شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ایک ایرانی اپنی عمر کے
دوران میں کبھی بھی ایک رائے کو چھوڑ کر دوسری
اختیار نہ کرے اور کبھی ان سب رایوں کو بھی اختیار
نہ کرے[1]"

علماے مجلسی | خود ملاّ محمد باقر مجلسی نے جو عہد صفویہ کے سب سے زیادہ مشہور بلند پایہ متعصب مجتہدین میں سے تھے، مصلحت اسی میں دیکھی تھی کہ ان کے والد ملاّ محمد تقی مجلسی نے (جو بحیثیت عالم کے ان سے کم پایہ نہ تھے) صوفیا کے ساتھ جو رواداری اور ہمدردی کا سلوک کیا تھا، اس کے متعلق معذرت کریں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں[2]:-

"کوئی شخص ہرگز ہرگز میرے والد مرحوم کے متعلق یہ
نہ سمجھے کہ وہ صوفی تھے، نہیں، ایسا ہرگز نہیں تھا،
کیوں کہ میں ان کی خانگی اور پبلک زندگی سے بہت
گہری واقفیت رکھتا ہوں اور مجھے ان کے معتقدات
کا حال خوب معلوم ہے۔ صوفیا کے متعلق میرے والد
مرحوم کی رائے اچھی نہ تھی، اگرچہ اپنی زندگی کے
ابتدائی زمانہ میں جب کہ صوفیا کا زور بہت زیادہ

---

[1] پروفیسر براؤن نے اصل فرانسیسی عبارت نقل کی ہے، اس کا ترجمہ، نیز دوسری فرانسیسی عبارتوں کا ترجمہ، میرے مکرم دوست خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی نے کیا ہے۔ ۱۲ مترجم

[2] قصص العلما طبع لکھنو حصہ دوم ص۱۹۱ ۱۲ مصنف

تھا اور وہ خوب جدّ و جہد کر رہے تھے، میرے والد
مرحوم ان کے سلسلہ میں داخل ہوئے، لیکن اس سے
ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس "شجرۂ خبیثہ زقومیہ"
کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں، چنانچہ جب وہ ان کی
گمراہیوں کی آگ کو فرو کر چکے تو انھوں نے اپنے اصلی
جذبات و خیالات کا برملا اظہار کر دیا، اس لیے کہ وہ
ایک نہایت نیک اور مقدس بزرگ تھے اور عبادت
اور ریاضت میں ان کی عمر بسر ہوتی تھی۔"

اگرچہ عام طور پر ملّا محمد باقر کی شہرت، ان کی قشریت کے باعث ہی، نیز اس وجہ سے کہ شیعہ عقائد کی ترویج کے لیے انھوں نے محنتِ شاقہ اٹھا کر آسان اور سلیس فارسی زبان میں رسالے لکھے اور صوفیا کو بے دردی کے ساتھ ایذائیں دیں، تاہم ان کی موت کے بعد کے بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہمدردی اور انسانیت کی کرنوں سے بھی منور تھی[1]۔ چنانچہ ان کی وفات کے بہت دن بعد ایک شخص نے انھیں خواب میں دیکھا اور پوچھا "کہ آپ پر عقبیٰ میں کیا گزر رہی ہے، دوسری دنیا والوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا" اس پر انھوں نے کہا کہ میرا کوئی کام، ریاضت، تقدس وغیرہ یہاں میرے کام

---

[1] قصص العلما جلد اول ص ۲۱۶ مصنف نے اس قصّے کو جو عام طور پر مشہور ہے ناقابلِ یقین قرار دیا ہے، اس عالم کے ادبی مشاغل کے متعلق اسی صفحے پر درج ہے کہ وہ ہزار ابیات روزانہ یعنی تقریباً پچاس ہزار الفاظ روزانہ لکھ لیا کرتے تھے۔ مصنف۔

نہ آیا، البتہ ایک دن میں نے ایک یہودی کو ایک سیب دیا تھا، اور اسی فعل سے میری نجات ہوئی۔

قصص العلما میں ۱۵۳ مشہور عالمانِ دین کی سوانح عمریاں دی ہوئی ہیں، مجھے ان میں سے حسب ذیل ۲۵ خاص طور پر اہم اور دلچسپ معلوم ہوئیں، جنھیں صفحات ذیل میں حتی الامکان تاریخ وار مرتب کیا گیا ہے۔ اصل کتاب میں ہر سوانح عمری کا جو سلسلہ واری نمبر ہے، وہ میں نے ہر نام کے آگے قوسین میں لکھ دیا ہے[1]۔

عُلمائے قبل عہدِ صفویہ

زمانۂ قبل عہد صفویہ کے مشہور علما

۱۔ محمد ابن یعقوب الکلینی (نمبر ۹۶)

الملقب بہ ثقۃ الاسلام، مصنف کافی، وفات سنہ ۳۲۹ھ مطابق سنہ ۹۴۱ء۔

۲۔ محمد ابن علی ابن حسین ابن موسیٰ ابن بابویہ (نمبر ۹۵)

قم کے رہنے والے تھے، صدوق کے لقب سے مشہور تھے۔ سنہ ۳۸۱ھ مطابق سنہ ۹۹۱ء۔ سنہ ۹۹۲ء میں وفات پائی۔ قصص العلما میں ان کی ۱۸۹ تصانیف کا ذکر ہے جن میں سے مشہور ترین من لایحضرہ الفقیہ

[1] دونوں اڈیشنوں میں (طہران اور لکھنؤ) سلسلہ واری نمبر از روے جدول دیے ہوئے ہیں۔ مثلاً کلینی کا نمبر صفحہ ۹۶ ہے۔ نجاشی کا نمبر تسلسل ۱۳۳ وعلیٰ ہذا ۱۲ مصنف

ہی، جو کافی کی طرح جس کا ذکر اوپر ہوا ہی، الکتب الاربعہ میں سے
تھی۔

۳۔ محمد ابن محمد ابن نعمان ابن عبد السّلام الحارثی الملقب به شیخ مفید (نمبر ۹۷)

وفات ۴۱۳ھ مطابق ۱۰۲۲ء، قصص العلما میں ان کی ۱۷۱ تصانیف کا ذکر ہی۔

۴۔ سید مرتضیٰ الملقب به عَلَم الہُدا (نمبر ۹۸)

وفات ۴۳۶ھ مطابق ۱۰۴۴ء۔ ساتویں امام موسی الکاظم کے پرپوتے کے پوتے تھے۔

۵۔ احمد ابن علی النجاشی (نمبر ۱۳۲)

وفات ۴۵۵ھ مطابق ۱۰۶۳ء، تلامذۂ شیخ مفید میں سے تھے مشہور کتاب الرجال انھی کی تصنیف ہی۔

۶۔ محمد ابن حسن ابن علی الطوسی الملقب به شیخ الطائفہ (نمبر ۱۰۰)

وفات ۴۶۰ھ مطابق ۱۰۶۷ء۔ وہ پُرانے زمانے کے تین مشہور محمدوں میں سے (المحامدة الثلاثه) تیسرے ہیں۔ بقیہ دو کا ذکر اوپر ہوچکا ہی (۱ و ۲)۔ الکتب الاربعہ میں سے دو یعنی تہذیب الاحکام اور استبصار انھی کی تصنیف ہیں۔ مشہور کتاب "فہرست" بھی جو شیعوں کے فن اسامی کتب پر ہی انھی کی تصنیف ہی۔

۷۔ نصیر الدین طوسی الملقب به محقق (نمبر ۹)

ان کی شہرت بحیثیت عالم دین کے اتنی نہیں ہی جتنی کہ فلسفی اور حکیم کی حیثیت سے۔ وفات ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۴ء۔ ان کی مشہور

ترین تصانیف یہ ہیں۔ اخلاق ناصری جو علم الاخلاق پر ہی، زیچ الخانی نجوم پر ہی اور ہلاکو خان مغل کے لیے لکھی گئی تھی اور تجرید جو فلسفہ پر ہی اور جس پر بے شمار شارحین اور حاشیہ نویسوں نے خوب زورِ قلم صرف کیا ہی۔

۸۔ نجم الدین جعفر ابن یحیٰی المعروف بہ محقق اول (نمبر ۸۹)

شرایع الاسلام کے مصنف ہیں۔ ولادت ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء ۱۲۴۱ء۔ وفات محرم ۷۲۶ھ (دسمبر ۱۳۲۵ء) جوانی میں ذوقِ شعر بھی رکھتے تھے، لیکن ان کے والد نے اس شغل سے انھیں روک دیا اور کہا کہ شاعر مردود ہیں اور شاعری تقدس کی زندگی کے لیے ناموزوں ہی۔

۹۔ حسن ابن یوسف ابن علی ابن المطہر الحلّی المعروف بہ علامہ حلّی (نمبر ۸۸)

ان کی وفات کا مہینہ اور سن وہی ہی جو محقق اول کا (۸) عمر میں محقق اول سے دس سال بڑے تھے۔ قصص العلما میں ان کی ۷۵ تصانیف کا ذکر ہی، علامہ حلّی عالموں کے ایک مشہور خاندان سے تھے، جس نے تھوڑی ہی مدت میں دس اعلیٰ پایہ کے مجتہد پیدا کیے، ان میں سے ایک تو خود ان کے والد تھے اور دوسرے ان کے فرزند جو فخر المحققین کہلاتے تھے (۸۶)

۱۰۔ شیخ شمس الدین محمد ابن مکی العاملی المعروف بہ شہید اول (نمبر ۸۲)

انھیں ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء[۱] کے موسم بہار میں دو قاضیوں

(حاشیہ نمبرا بر صفحہ آئندہ)

برہان الدین مالکی اور جماعۃ شافعی کے حکم سے دمشق میں قتل کر دیا گیا تھا۔

علمائے عہد صفویہ و بعد صفویہ

۱۱- نور الدین علی ابن عبد العلی المعروف بہ محقق ثانی (نمبر ۸۴)

یہ کرک چھوڑ کر جو ان کا آبائی وطن تھا، ایران میں آ بسے تھے، شاہ طہماسپ اول ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ سنہ ۹۴۰ھ مطابق سنہ ۱۵۳۳ سنہ ۱۵۳۴ء میں وفات پائی۔

۱۲- احمد ابن محمد المعروف بہ مقدس اردبیلی (نمبر ۸۳)

شاہ عباس کبیر ان کی بڑی عزت کرتا تھا، سنہ ۹۹۳ھ مطابق سنہ ۱۵۸۵ء میں وفات پائی۔

۱۳- میر محمد باقر داماد (نمبر ۷۷)

یہ محقق الثانی (ملا مذکورۃ الصدر) کے پوتے تھے، ان کی بھی شاہ عباس کبیر بہت تعظیم کرتا تھا، سنہ ۱۰۴۰ھ مطابق سنہ ۱۶۳۱ء-سنہ ۱۶۳۲ء میں وفات پائی ان کی تصنیف صراط المستقیم ہی کے لیے کسی فارسی شاعر نے ذیل کا شعر کہا تھا

صراط المستقیم میر داماد

مسلماں نشنود، کافر مبیناد

وہ خود بھی اشراق تخلص کرتے اور شعر کہتے تھے۔

---

[1] یہ تاریخ قصص العلما میں دی ہوئی ہے، لیکن لؤلؤۃ البحرین نے سنہ ۷۸۱ھ (سنہ ۱۳۷۸ء و سنہ ۱۳۷۹ء) دیا ہے۔ ۱۲ مصنف

۱۴- شیخ محمد بہاء الدین العاملی المعروف بہ شیخ بہائی (نمبر ۳۷)

شہرت، رسوخ اور عزت میں میر داماد کے ہمسر تھے، جن علما کی بدولت شاہ عباس کبیر کے دربار کو چار چاند لگے، ان میں یہ دونوں بھی تھے۔ شیخ بہائی بعلبک کے پاس ۹۵۳ھ مطابق ۱۵۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۲ء میں وفات پائی۔ ان کے ادبی مشاغل صرف علم دین ہی تک محدود نہ تھے، دینیات پر ان کی مشہور ترین تصنیف جامع عباسی ہے۔ یہ فقہ شیعی پر ایک عام فہم رسالہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی میں ختم نہ کر سکے۔ انھوں نے عربی زبان میں قصص کا ایک بہت بڑا مجموعہ کشکول کے نام سے مرتب کیا تھا، جو ان کی اس سے پہلے کی لیکن اس سے کم تر مشہور کتاب مخلات کا تتمہ ہے۔ انھوں نے حساب اور نجوم پر بھی کئی رسالے لکھے اور ایک فارسی مثنوی نان و حلوا بھی کہی۔

۱۵- محمد ابن مرتضیٰ کاشی المعروف بہ ملّا محسن فیض (نمبر ۷۶)

اگرچہ انھیں "اخباری صرف" کہا جاتا ہے اور شیخ احمد الاحسائی بانی فرقہ شیخی ان سے بہت متنفر تھا، اور محسن کو بگاڑ کر "مُسیئ" کہا کرتا تھا، لیکن عالم دین کی بجائے ان کی حیثیت زیادہ تر صوفی اور فلسفی کی تھی۔ دینیات پر ان کی مشہور ترین کتاب ابواب الجنان ہے، جس کا سن تصنیف ۱۰۵۵ھ مطابق ۱۶۴۵ء تھا۔ اس کے دس سال بعد ملّا صدرا سے فلسفہ پڑھنے کی غرض سے کاشان سے شیراز آئے اور یہیں اُن کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی۔ وہ شاعر بھی تھے اور مجمع الفصحا[۱] میں ان کے اشعار کی تعداد چھ سات

---

[۱] لیتھو طہران ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) جلد دوم ص ۲۵، ص ۲۶ ۱۲ مصنف

ہزار بتائی گئی ہے۔

۱۶۔ میر ابوالقاسم خندرسکی

"اگرچہ قصص العلما میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن وہ اپنے زمانے کے جید فلسفی اور صوفی تھے، شاہ عباس اول ان کی بڑی قدر کرتا تھا، لیکن کہتے ہیں کہ وہ ادنی صحبتوں اور مرغوں کی لڑائی میں شوق سے شریک ہوتے تھے۔ جس کو شاہ عباس اپنی سُبکی سمجھتا تھا[۱]" انھوں نے شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان میں بھی کچھ زمانہ بسر کیا تھا، ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء۔۱۶۴۱ء میں اصفہان کے قریب وفات پائی۔

۱۷۔ ملّا صدر الدین محمد ابن ابراہیم شیرازی المعروف بہ ملّا صدرا

انھیں باتفاق رائے ایران کے دور جدید کا مشہور ترین فلسفی تسلیم کیا جاتا ہے، قصص العلما میں ان کا بیان علیحدہ نہیں لکھا گیا اور چنداں تعجب خیز نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی زندگی ہمیشہ علمائے دین اور مجتہدین سے الجھنے میں گزری اور ان کے اساتذہ میرداماد اور شیخ بہائی کی بہ نسبت ان کا جامہ دین و تقوےٰ کچھ زیادہ ہی باریک تھا، جس کے اندر سے ان کا اصلی رنگ صاف جھلکتا تھا لیکن خود قصص العلما نیز اس قسم کے دوسرے تذکروں مثلاً لؤلؤۃ البحرین وغیرہ میں ان کا تذکرہ ضمناً جا بجا آیا ہے، ان کی

---

[۱] ریو کی فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ص۸۱۵ نیز جلد ہذا کا ص۲۱۱ ۱۲ مصنف

تعلیم کا اثر دینیات پر، خصوصاً فرقۂ شیخیؒ[1] کے عقائد پر بہت گہرا پڑا۔ روضات الجنات میں ان کا سن وفات اندازاً ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء بتایا گیا ہے[2] لیکن لورۃ البحرین میں اس سے بیس سال قبل کی تاریخ ہے

۱۸۔ عبدالرزاق لاہجی

ملا محسن فیض کی طرح انھیں بھی ملا صدرا کے تلمذ کا شرف حاصل تھا ان کی دو مشہور ترین تصانیف جو دونوں فارسی زبان میں ہیں سرمایۂ ایمان اور گوہر مراد ہیں۔ مصنف مجمع البنیان کی طرح یہ بھی الفاظ کے معانی لازم کے قائل تھے۔ یعنی یہ کہ ہر لفظ کی آواز اور اس کے معنوں میں ایک حقیقی تعلق ہوتا ہے، پس اگر کوئی غیر مانوس لفظ کان میں پڑے تو صرف آواز پر غور کر کے اس کا مفہوم قیاس کیا جا سکتا ہے[3]۔

آخر الذکر چھ حضرات جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے صرف علمائے دین ہی نہ تھے، بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بحیثیت فلاسفہ کے مشہور رہیں حسب ذیل حضرات، باستثنائے حاجی ملا ہادی جن کا ذکر سب سے آخر میں کیا گیا ہے۔ خالص شیعہ علما میں سے ہیں۔

---

[1] شیخ احمد الاحسای نے ان کی مشاعر اور دوسری تصنیفات پر حاشیہ لکھا ہے (روضات الجنات صفحہ ۳۳۱) لیکن صاحب قصص العلما کا بیان ہے (طبع لکھنؤ صفحہ ۴۸) کہ وہ انھیں کافر سمجھتا تھا۔ ۱۲ مصنف

[2] قصص العلما میں اس سن کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ان کے فرزند مرزا ابراہیم کا سال وفات ہے، پس اس سے قبل کی تاریخ یعنی ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء ۱۶۴۱ء کا باپ کی تاریخ وفات ہونا زیادہ اغلب ہے۔ ۱۲ مصنف

[3] قصص العلما طبع لکھنو حصہ دوم صفحہ ۱۲۳۔ ۱۲ مصنف

۱۹- ملّا محمد تقی مجلسی (نمبر ۳۶)

کہا جاتا ہے کہ یہی سب سے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے شیعہ احادیث کی، جو انھیں محقق ثانی سے حاصل ہوئی تھیں، صفویہ کے زمانہ میں تدوین و اشاعت کی، ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ان پر لوگ صوفیانہ عقائد رکھنے کا الزام لگاتے تھے ان کی وفات ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۶۰-۱۶۵۹ء میں ہوئی۔ ذیل کے مصرع سے مادہ تاریخی حاصل ہوتا ہے:-

افسر شرع اوفتاد، بے سروپا گشت فضل[1]

"شرع" کا پہلا حرف ش اور "فضل" کے پہلے اور آخری حروف گرانے سے ض، ز، ع، حاصل ہوتے ہیں، جن سے ۸۰۰+۲۰۰+۷۰ (۱۰۷۰ھ) برآمد ہوتا ہے۔

۲۰- ملّا محمد باقر مجلسی (نمبر ۳۷)

یہ مذکورۃ الصدر ملّا محمد تقی مجلسی کے فرزند تھے، ان کا ذکر اس کتاب میں پہلے بھی جابجا ہو چکا ہے، یہ اپنے والد سے بھی زیادہ مشہور ہیں ان کی مشہور ترین تصنیف بحار الانوار ہے جو شیعہ احادیث کا ایک زبردست مجموعہ ہے، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ان کی تصنیف ہیں جن میں سے حسب ذیل فارسی زبان میں ہیں: عین الحیات، مشکوٰۃ الانوار، حلیۃ المتقین، حیات القلوب (جو مکمل نہ ہوسکی) تحفۃ الزائرین، جلاء العیون وغیرہ[2] جیسا کہ بیان

---

[1] یہ حالات روضات الجنات ص ۱۲۹، ص ۱۳۱ سے لئے گئے ہیں، قصص العلما میں ان کا حال بہت تشنہ ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] روضات الجنات ص ۱۱۸، ص ۱۲۴ - ۱۲ مصنف

ہو چکا ہے، ان کی وفات ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء یا ۱۷۰۰ء میں ہوئی۔

۲۱- سیّد محمد مہدی بروجردی الملقب بہ بحر العلوم (نمبر ۲۷)

ولادت ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ - ۱۷۴۳ء، وفات تقریباً ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء یا ۱۸۲۵ء۔

۲۲- سیّد محمد باقر ابن سیّد محمد تقی رشتی الملقب بہ حجت الاسلام (نمبر ۲۶)

ان کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جو لوگ شریعت کی خلاف ورزی کرتے تھے، ان کو یہ بہت سخت سزائیں دیا کرتے تھے۔ وہ صاحب ثروت بھی تھے اور صاحب اقتدار بھی۔ صاحب روضات الجنات (صفحہ ۱۲۵) کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک لاکھ دینار قانونی[1] کے صرف سے اصفہان کے محلہ بید آباد میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ ان کی ولادت تقریباً ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء یا ۱۷۶۷ء میں ہوئی، ۱۶ یا ۱۷ سال کی عمر میں انھوں نے تحصیل علم کے لیے عراق کا سفر کیا تھا، ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۱ء یا ۱۸۰۳ء) میں اصفہان واپس آئے اور وہیں یک شنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (۲۳ مارچ ۱۸۴۴ء) کو وفات پائی۔ ان کے ہم نام مصنف روضات الجنات کا قول ہے کہ لوگوں نے (جن سے غالباً

---

[1] آج کل ایران میں دینار کی قیمت صرف برائے نام ہے اور ایک لاکھ دینار (۱۰ تومان) صرف دو پونڈ سے چار پونڈ تک قیمت رکھتے ہیں، لیکن پہلے دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا جس کی قیمت ۱۰ فرانک کے برابر ہوتی تھی، یہاں بھی پہلے کا دینار مراد ہے۔ ۱۲ مصنف

صرف پابند مذہب لوگ مراد ہیں) کامل ایک سال تک ان کا ماتم کیا، اس لیے ان کے بعد اب کوئی ایسا باہمت یا قابل عالم نہ تھا جو احکامِ شرع کی پابندی اتنی سختی کے ساتھ کرا سکے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مرزا علی باب کا ظہور اور اس کا نتیجہ یعنی وہ فتنۂ الحاد جس نے قدیم شیعہ عقائد کی بنیادیں ہلا دیں تھیں ان کی وفات کے ٹھیک ۲ ماہ بعد رونما ہوا۔

۲۳۔ شیخ احمد ابن زین الدین ابن ابراہیم الاحسائی

یہ فرقہ شیخی کے بانی تھے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یزد میں بسر ہوا۔ وہاں سے وہ براہ اصفہان کرمان شاہ گئے اور گورنر شہر شہزادہ محمد علی مرزا خلف فتح علی شاہ کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ اس شہزادے کی ان پر بہت نظرِ عنایت تھی اور اسی نے انھیں کرمان شاہ میں سکونت پذیر ہونے کے لیے طلب کیا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد انھوں نے عراق کے مقاماتِ مقدسہ میں خلوت گزینی اختیار کرلی اور ان کی متعدد تصانیف میں سے بیشتر یہیں لکھی گئیں، ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔ شرح الزیارۃ الکبیرۃ اور شرح الفوائد۔ وہ ملا صدرا، ملا محسن فیض اور صوفیا کے سخت مخالف تھے، حاجی ملا محمد تقی قزوینی نے جو تقریباً ۱۸۴۷ء میں کسی بابی کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کی تکفیر کی تھی، شیخ احمد نے تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۷ء-۱۸۲۶ء میں انتقال کیا۔[1]

[1] یہ حالات زیادہ تر روضات الجنات ص۲۵-ص۲۶ سے ماخوذ ہیں۔ ۱۲ مصنف

۲۴۔ ملّا احمد نراقی

ان کا انتقال ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء۔۱۸۲۹ء میں بعارضہ ہیضہ ہوا۔ یہ عالم دین بھی تھے اور شاعر بھی۔ جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے جواب میں ایک مثنوی طاقدیس لکھی ہے۔ تخلص صفائی تھا۔ مجمع الفصحا جلد دوم صفحہ ۳۳ پر ان کے حالاتِ زندگی ملتے ہیں۔

۲۵۔ حاجی ملّا ہادی سبزواری[1]

یہ ایران کے آخری جید فلسفی تھے، اسرار تخلص کے ساتھ شعر بھی کہتے تھے۔ ولادت ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء۔۱۷۹۸ء وفات ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء۔

---

[1] ان کے ایک شاگرد نے بھی ان کی سوانح لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو میری کتاب Year among the Persians صفحہ ۱۳۱۔ صفحہ ۱۴۳۔ ۱۲ مصنف

باب نہم

۱۸۵۷ء تک کے نثر نگار

اقسام نثر — فن انشا پر جن مصنفین نے قلم اٹھایا ہے انھوں نے نثر کی تین قسمیں بلحاظ اس کی ظاہری اشکال کے کی ہیں۔ یعنی عاری، مقفیٰ اور مسجع۔ ہم آسانی کے ساتھ اس کی تقسیم فطری اور مصنوعی نثر میں کر سکتے ہیں۔ مصنوعی نثر ہم مغربیوں کے ذوق کو بہت گراں گزرتی ہے اگرچہ ہمارے اسلاف کو کسی زمانے میں یہی مرغوب تھی (مثلاً ملاحظہ ہوں ملکہ الزبتھ کے عہد کے لفاظوں[1] Euphuists کی تحریریں)۔ اگر ہم عربی کی مقامات الحریری یا فارسی کی انوار سہیلی کی طرح کی کتابوں میں جو صرف سامعہ کو خوش آنے یا مصنف کی قدرت الفاظ ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں، اس قسم کی تحریروں کو گوارا بھی کرلیں، تاہم جب ایسی سنجیدہ کتابوں میں جن میں ہمارے مفید مطلب مواد موجود ہے، اس قسم کی نثر لکھی جاتی ہے تو لامحالہ ہمیں بہت

---

[1] Euphuists اس نام سے ملکہ الزبتھ کے زمانے میں انشا پردازی کا ایک مذہب پیدا ہوا تھا، جس کی تحریروں کی بڑی خصوصیت تصنع تھی۔ یہ لوگ اپنے استعارات زیادہ تر مناظر قدرت اور تاریخ طبعی سے لیتے تھے اور ان میں بہت کچھ خیال آفرینیاں کرتے تھے ۱۲ مترجم

زیادہ ناگوار ہوتا ہے۔ یہ تو ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ کسی اسلوبِ بیان کو قطعی طور پر کس حد تک اچھا یا بُرا کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ نہ صرف مختلف ممالک میں، بلکہ ایک ہی ملک میں بھی باختلافِ زمانہ مذاق بدل جاتا ہے اور بمصداق عربی مثل "الناس اشبہ بزمانہم منہم بآبائہم" ایک مصنف کو ایک نسل قابل تعریف سمجھتی ہے تو دوسری اسے صرف معمولی درجہ کا خیال کرتی ہے۔ لیکن جب کوئی سنجیدہ مزاج اور متین مورخ اس بات کے کہنے میں جو آسانی

تاریخی کتابوں میں رنگین عبارت آرائی بہت مذموم ہے

کے ساتھ ایک یا دو سطروں میں کہی جا سکتی ہے، پورا ایک صفحہ سیاہ کر دیتا ہے تو ہمیں حق ہے کہ اس بے راہ جدّت پسندی سے ہمارے وقت کی جو خواہ مخواہ تضیع کی گئی ہے اس کے خلاف ناراضی کا اظہار کریں۔ تیرھویں عیسوی میں مغلوں کے حملۂ ایران سے پہلے

ابتدائی نثر سلیس ہوتی تھی

فارسی نثر عام طور پر سلیس اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی، چنانچہ بلعمی کا ترجمہ تاریخ طبری، سیاست نامہ نظام الملک، سفرنامہ ناصر خسرو، قابوس نامہ یا چہار مقالہ کی نثر ایسی جامع اور ٹھوس ہے کہ اس کا جواب مشکل سے ملے گا، لیکن

مغول اور دوسری غیر ملکی حکومتوں کے مضر اثرات

مغلوں، تاتاریوں اور ترکوں کے اثرات یکساں طور پر بُرے پڑے اس لیے کہ یہ سب کے سب خوشامد اور مبالغہ کو پسند کرتے تھے۔ مشہور مورخ وصّاف جن کی تاریخ ۱۳۱۲ء میں الجائتو کی خدمت میں گزرانی گئی، اس بارے میں مجرم اوّل تھا اور بدقسمتی سے

متاخرین میں سے اکثر نے اسی کو نمونہ قرار دیا اور اس کی تقلید کی۔ زمانۂ جدید میں ہمیں اس بارے میں بہت کچھ اصلاح نظر آتی ہے جس کی ایک وجہ، جو پہلے بھی شاعری کی بحث میں بیان ہو چکی ہے، یہ ہے۔ اب نئے نثر نگار ان متقدمین کو دلیلِ راہ بناتے ہیں جن کا مذاق انشاء عہد مغول کے بعد کے مصنفوں کی بہ نسبت صحیح تر اور سلیس تر تھا اور دوسری وجہ اس اصلاح مذاق کی یہ ہے کہ زمانہ حال میں فن صحافت میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے جس سے اگرچہ لازمی طور پر اچھا طرزِ تحریر نہیں پیدا ہوتا، تاہم جامع اور بر محل تحریروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ناظم الاسلام کرمانی کی تاریخ بیداریٔ ایرانیاں جو بد قسمتی سے مکمل نہ ہو سکی، کیا بہ لحاظ ترتیب مضامین اور کیا بہ لحاظ استفادۂ ماخذ رضا قلی خاں کے ضمیمۂ روضۃ الصفا میرخواند اور لسان الملک کی ناسخ التواریخ سے جو دونوں پچاس برس پہلے کی تصنیفیں ہیں، بمراتب بہتر ہے۔

زمانۂ جدید کی اصلاح

رطب و یابس کی ایک مثال

میں اپنی اس تاریخ میں ایسی نثر کی کتابوں کا تذکرہ کرنا اور اس طرح گویا ان کی زندگی کی ضمانت کرنا نہیں چاہتا جو صرف قدرتِ زبان اور علم البیان کی جدّتیں دکھانے کے لیے لکھی گئی ہیں، تاہم اس سلسلے میں میں اتنا البتہ عرض کروں گا کہ اگر ان میں تاریخی یا کسی اور نوع کا اہم علمی مواد موجود ہو جس کی وجہ سے وہ قابل ترجمہ ہوں تو میری رائے میں پہلے ان کی رنگین عبارتوں کے گل بوٹے ضرور کاٹ چھانٹ

دیے جائیں، ورنہ یورپی ناظرین کا مذاق انھیں سندِ قبولیت نہ دیگا۔ مثال کے طور پر میں ابتدائی دورِ صفویہ کے متعلق ایک نہایت اہم کتاب احسن التواریخ (۹۸۵ھ مطابق ۱۵۷۷ء-۱۵۷۸ء) کو لوں گا جو کچھ ایسی زیادہ رنگین عبارت میں بھی نہیں ہے اور جس سے میں نے اپنی اس جلد کے ابتدائی حصّے کی تالیف میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں اس جنگ کا تذکرہ ہے جو ۹۱۴ھ مطابق ۱۵۰۸ء-۱۵۰۹ء کے موسمِ بہار میں محمد خان استاجلو اور نابینا تاجدار ایران شاہ رُرخ میں ہوئی تھی۔ یہ تذکرہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

"در بہار[1] کہ سلطانِ گُل با حشمت و تجمل روئے بتاخت الوس ریاحین آورد و بزخم پیکان خار جنودِ شتوی را از گلزار منہزم گردانید:-

برآمد زکوسِ سحابی خروش — در آمد سپاہِ ریاحیں بجوش

رُخِ خویش را ابر درہم کشید — بدعویٰ کمانہاتے رستم کشید

برآورد شاخِ شگوفہ علم — ریاحیں بیار است خیل و حشم

زژالہ پیٔے فرقِ افراسیاب[2] — بداماں کشاں سنگ ہر سو سحاب

خان محمد استاجلو بہ ییلاق ماردین نزول فرمود"

اس پوری عبارت کا مطلب صرف ایک سطر میں بیان ہوسکتا تھا

[1] مسٹر الیس کے نسخہ کا ص ۵۷۔ ۱۲ مصنف

[2] نسخے میں افسر سحاب ہے، جو یقیناً غلط ہے، اس لیے کہ نہ اس سے کوئی مطلب نکلتا ہے اور نہ مصرع موزوں رہتا ہے۔ ۱۲ مصنف

" در بہار خان محمد استاجلو بہ ییلاق ماروین نزول فرمود "

دل کش شاعرانہ تخیلات اپنے اپنے موقع اور محل پر اچھے ہوتے ہیں، لیکن سنجیدہ تاریخوں میں وہ بالکل غیر موزوں اور ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہی، ایک بڑی مشکل یہ ہی کہ تقریباً تمام ذی علم ایرانی، چنانچہ مورخین بھی شاعر یا کم از کم متشاعر ضرور ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ان کو شاعری کے ساتھ تاریخی عنصر کے ادغام کرنے کی نسبت تاریخ کے ساتھ شاعرانہ عنصر کو ملانا زیادہ آسان اور پُر لطف معلوم ہوتا ہی اور خود ایسی نظموں میں بھی جن کو وہ "تاریخی شاعری" کے زمرے میں داخل سمجھتے ہیں وہ شاعری کے ساتھ بہت کم تاریخ کو ملاتے ہیں[1]۔ نظر بایں حالات میں ایران کے دورِ آخر کے ادبیات نثر کی بحث میں صرف انھیں نمونوں سے بحث کروں گا جن میں دور از کار صنایع و بدایع کی بجائے کام کی باتیں زیادہ ہوں۔ میں نے نثر کو باعتبار موضوع حسب ذیل پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہی اور ہر ایک سے فرداً فرداً بحث کی جائے گی۔

ادبیات نثر کی قسمیں (۱) دینیات یا مذہب

(۲) فلسفہ

---

[1] مصنف کا مطلب یہ ہی کہ ایرانیوں کی تاریخی نظمیں بھی بہت کم تاریخی مواد رکھتی ہیں اور شاعرانہ عنصر غالب ہوتا ہی۔ ۱۲ مترجم

(۳) علوم : ریاضی، علوم طبعی اور علوم بیتریہ[1]
(۴) تاریخ : عام، مخصوص اور مقامی تاریخ
(۵) سوانح و خود نوشتہ سوانح عمریاں، مع سیاحت نامہ

۱- دینیات یا مذہبی ادبیات

زمانۂ زیر بحث میں، یعنی قیام خاندانِ صفویہ سے لے کر آج تک ایران میں مذہب سے مراد شیعہ مذہب رہا ہے اگرچہ کبھی کبھی اس کے دائرے میں شیخیوں کے نیم ملحدانہ اور بابیوں اور بہائیوں کے سراسر ملحدانہ معتقدات کو بھی داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس مذہبی ادبیات کا بیشتر حصّہ یعنی زمانۂ قدیم میں سارے کا سارا اور آج کل بھی اچھا خاصہ، عربی زبان میں ہے جو اسلام اور قرآن کی مقدس زبان ہے۔ گنتی کے چند علمائے دین کی تصانیف کو چھوڑ کر جملہ ممالکِ اسلامی میں ادبیاتِ مذہبی کا بیشتر حصّہ نہ صرف نا قابل مطالعہ ہے بلکہ اس کا مطالعہ بے سود بھی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عالم کسی مذہبی، فضول اور بے مصرف کتابیں منطقی، یا لغوی موضوع پر ایک رسالہ لکھتا ہے جو مکتبوں اور مدرسوں میں جہاں علما کو پرانے طرز کی تعلیم دی جاتی ہے، مشہور ہو جاتا ہے۔ کوئی اور شخص اس پر ایک تفسیر لکھ دیتا ہے، تیسرا اس تفسیر کی تفسیر لکھتا ہے، چوتھا اس تفسیر التفسیر پر حاشیہ چڑھا دیتا ہے اور پانچواں شرح حاشیہ

---

[1] اس میں کیمیا، لیمیا، ہیمیا، سیمیا اور ریمیا داخل ہیں، یہ اسما "کُلّہٗ سِرًّا" کے حروف سے بنائے گئے ہیں ۱۲ مصنف

تفسیر التفسیر لکھ مارتا ہی، نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ آخر میں ہمارے سامنے وہ
چیز رہ جاتی ہی جسے زندۂ جاوید ترکی ظریف خوجہ نصرالدین آفندی
نے "شوربۂ، شوربۂ، شوربۂ، شوربۂ خرگوش" کہا تھا۔ یعنی ایک
ایسی چیز جس میں نہ ذائقہ ہوتا ہی اور نہ غذائیت اور جس سے
حل مواد بجائے اس کے کہ واضح اور روشن ہو اور زیادہ مبہم
اور گنجلک ہو جاتا ہی۔ شیخ محمد عبدہٗ سابق مفتی اعظم مصر اور شیخ
الجامعہ ازہر، جن سے زیادہ روشن خیال مفکّر اور عربی زبان
اور ادب کا شیدائی اسلام کے عہدِ حاضر میں شاید ہی پیدا ہوا ہو،
کہا کرتے تھے کہ یہ سارا طومار اس قابل ہی کہ نذرِ آتش کر دیا جائے
اس لیے کہ اس سے صرف الماریوں پر انبار ہوتا ہی، دیمکیں پیدا
ہوتی ہیں اور حقیقی علم پر پردہ پڑ جاتا ہی۔ چونکہ یہ رائے ہماری
نہیں، بلکہ ایک مسلمان عالم دین کی ہی، اس لیے اس کے قبول
کرنے میں کسی کو تامّل نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہی کہ جتنی زیادہ ہمارے
دلوں میں اسلام کے ضخیم اور بلند پایہ ادبیات کی وقعت موجود
ہی، اُتنا ہی زیادہ ہمیں اس خرافات کی افراط پر افسوس ہوتا
ہی اور غصّہ آتا ہی۔ جب ہم روضات الجنات یا قصص العلما کی طرح
کی کتابوں میں علما کے حالات پڑھتے ہیں تو ہم کو اکثر ایک ایک
عالم کی تصانیف کی فہرست میں اس قسم کی چالیس، پچاس یا
ساٹھ کتابوں کے نام نظر آتے ہیں، جنھیں آج کوئی پڑھتا تک
نہیں اور نہ پہلے سوائے ان مصنفین کے شاگردوں کے اور وہ
بھی بدرجۂ مجبوری اور کسی نے انھیں پڑھا ہوگا۔ ایسے رسالوں

کی فہرست پیش کرنا اول تو ممکن نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی، تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔

فارسی زبان کی عام فہم کتب مذہبی

صفویہ کے آخری دور کے جیّد علما مثلاً علمائے مجلسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شیعہ عقائد اور شیعیت کے تاریخی تصور کو ملکی زبان میں عوام کے سامنے پیش کیا۔ ان حضرات نے یہ سمجھ لیا تھا کہ عوام کے کانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی بہترین صورت یہی ہے کہ سادگی اور سلاست کے ساتھ انھیں کی زبان استعمال کی جائے چنانچہ ان کی سعی مشکور ہوئی اور ملک میں ہر طرف شیعیت کا شدید اور عالمگیر جوش ان کی تحریروں کی بدولت پھیل گیا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں[1] کہ جب شروع میں شاہ اسمٰعیل کو شیعیت کو ایران کا قومی مذہب بنانے کی فکر ہوئی تو شیعہ عقائد کی کتابیں کس قدر کمیاب تھیں اور بقول صاحب روضات الجنات کے[2] "ملا

مجلسیوں کا کارنامہ

محمد تقی مجلسی ہی وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے آغاز دور صفویہ کے بعد سب سے پہلے شیعہ احادیث کو مدون کیا" ان کے فرزند ملا محمد باقر مجلسی نے جو ان سے بھی زیادہ مشہور ہیں، اسی موضوع پر ایک ضخیم کتاب عربی میں تصنیف کی یعنی بحار الانوار اور فارسی میں حسب ذیل کتابیں لکھیں[3]: عین الحیاۃ

---

[1] جلد ہذا ص۵ ۱۲ مصنف

[2] طہران لیتھو اڈیشن ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء ص۱۲۹ ۱۲ مصنف

[3] روضات الجنات طبع طہران لیتھو ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء ص۱۱۹۔ ۱۲ مصنف

جس میں ترکِ دنیا کی نصیحت کی گئی ہے، مشکوٰۃ الانوار اور حلیۃ المتقین جو مثال اور طرزِ عمل کے متعلق ہیں؛ حیات القلوب، یہ تین حصّوں میں ہے، حصّۂ اوّل میں آں حضرت صلعم سے پہلے کے انبیا کا، حصّۂ دوم میں خود آں حضرت صلعم کا اور حصّۂ سوم میں دوازدہ ائمہ کا تذکرہ ہے لیکن یہ حصّہ مکمّل نہیں ہے، اس کا صرف ایک جُز لکھا گیا ہے؛ تحفۃ الزائرین؛ جلاء العیون؛ مقباس المصابیح، جو پنج وقتہ نماز کے متعلق ہے؛ ربیع الاسابیع؛ زاد المعاد اور بے شمار مختصر رسالے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دینیات پر ان کی مشہور ترین فارسی تصنیف حق الیقین کا اس فہرست میں کہیں نام نہیں ہے۔ یہ کتاب ۱۱۰۹ھ مطابق ۱۶۹۸ء میں تصنیف ہوئی اور اب سے بہت پہلے یعنی ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں طہران سے نہایت دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شایع ہوئی۔

ایم۔ اے، ڈی، بی، برسٹائن کازمی رسکی

(M. A. de Biberstenі Kazimirski)

نے اس کا فرانسیسی ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن پھر یہ خیال چھوڑ دیا اور اپنے ترجمے کا مسودہ میرے پاس بھیج دیا اور اصرار کیا کہ میں اس کی تکمیل کردوں۔ بدقسمتی سے مجھے اس کام کی انجام دہی کی فرصت آج تک نہیں نصیب ہوئی۔ حالانکہ یہ کام اس قابل ہے کہ ضرور کیا جائے، اس لیے کہ شیعہ عقائد پر کوئی جامع اور مستند کتاب آج تک کسی یورپی زبان میں موجود نہیں ہے۔

فارسی مذہبی کتب کی تبویب وتقسیم | شیعہ عقائد کی اساسی

کتابیں قرآن اور احادیث یعنی رسول مقبول اور ائمہ کے اقوال قدرتاً عربی زبان میں ہیں۔ فارسی زبان میں بے شمار رسالے مذہب پر تحریر کیے گئے ہیں، ان کی تقسیم تین گروہوں میں ہوسکتی ہے، عقائد، تاریخ اور فقہ۔ عملاً عقائد اور تاریخ کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں، خصوصاً ان حصّوں میں یہ تعلق اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے جہاں امامت کی بحث ہوتی ہے، یا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پیغمبر علیہ السّلام کا منشا یہ تھا کہ حضرت علیؓ خلیفہ ہوں لیکن ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ نے ان کا حق چھین لیا، یا یہ کہ ائمہ کی تعداد ۱۲ تھی نہ اس سے کم تھی، نہ زیادہ اور یہ بارہ ائمہ وہی تھے جنھیں اثنا عشری مانتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ حاصل کلام یہ کہ کتب عقائد کے ابتدائی حصّے جن میں خدا اور اس کی صفات سے بحث کی جاتی ہے، علم ما بعد الطبیعات کی ضمن میں آتے ہیں۔ بعد کے حصّوں میں بیشتر تاریخی یا تاریخ نما بحثیں ہوتی ہیں اور آخری حصّے جن میں جنّت، دوزخ، یوم حساب وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے زیادہ تر علم المعاد یا معادیات (Eschatology) کے دائرے میں آتے ہیں۔

ان کتابوں کی سادگی اور سلاست ان کتابوں کی زبان بہت عام فہم اور سادہ ہوتی ہے، ان میں کسی قسم کی انشا پردازانہ عبارت آرائی نہیں ہوتی۔ عربی محاورے اور عربی اسلوب بیان کی تقلید زیادہ کی جاتی ہے اور یہ صرف ان عبارتوں ہی میں نہیں ہوتا جو عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں، بلکہ پوری کتاب کا رنگ یہی

ہوتا ہی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ علمائے دین کے
ذہن قرآن اور احادیث میں اتنے ڈوبے ہوتے تھے کہ فارسی
لکھتے وقت بھی ان کا طرز خیال لازمًا عربی ہی رہتا تھا۔ ذیل
کی مثال سے جو حق الیقین[1] جلد دوم کے ابتدائی حصّے سے نقل
کی جاتی ہی، اس خصوصیت کا اندازہ ہوگا:۔

"مقصد نہم در اثبات رجعت است۔ بداں کہ از جملۂ
اجماعیاتِ شیعہ بلکہ ضروریاتِ مذہبِ حق فرقۂ محقۂ
حقیت رجعت است، یعنی پیش از قیامت در زماں
حضرت قایم ع جمعے از نیکانِ بسیار نیک و بدانِ
بسیار بد بدنیا بر می گردند۔ نیکاں برائے آں کہ
بہ دیدنِ دولتِ ائمہ خود دیدہائے ایشاں روشن گردد
و بعضے از جزائے نیکی ہائے ایشاں در دنیا بایشاں برسد
و بداں از برائے عقوبت و عذاب دنیا و مشاہدہ اضعافِ
آں دولتے کہ نمی خواستند باہلِ بیت رسالت ع برسد
و انتقام کشیدن شیعیاں از ایشاں و سایر مردم در
قبرہا می مانند تا در قیامت محشور شوند، چنانچہ در احادیث
بسیار وارد شدہ است کہ رجوع نمی کند در رجعت
مگر کسے کہ محض ایمان داشتہ باشد، یا محض کفر اما سایرِ
مردم پس ایشاں را بحال خود می گزارند"

یہ صحیح ہی کہ منقولہ بالا عبارت میں جو جملہ اور سب جملوں

---

[1] طبع طہران ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء ورق ۱۴۲ اب ۱۲ مصنف

سے زیادہ عربی ترکیب رکھتا ہے وہ شاید کسی حدیث کا لغوی ترجمہ ہو، جس کی عربی اصل اگرچہ نقل نہیں کی گئی ہے، لیکن غالبًا یہ ہو گی:۔

"ولا یرجع فی الرجعۃ الا من لہ محض الایمان او محض الکفر"

لیکن اس کے علاوہ بھی عربی نحو کا اثر ساری عبارت میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔

کتبِ مناظرہ

(۱) سنّیوں کے خلاف شیعہ مذہب کی کتابوں کی ایک اور قسم کتبِ مناظرہ ہیں جن میں صوفیوں سُنّیوں، شیخیوں، بابیوں، بہائیوں اور عیسائیوں کی تردید ہے۔ سُنّیوں پر تو قدرتًا عقائد کی تمام کتابوں میں کم و بیش شدید حملے کیے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نادر شاہ سے لے کر ابوالحسن مرزا (حاجی شیخ الرئیس) تک جو آج کل اتحادِ اسلامی کے پُرجوش حامی ہیں[1]، کوئی شخص اسلام کے ان دو بڑے بڑے فرقوں میں مصالحت نہیں کرا سکا اور اگر آج کل کے ایرانی نوجوانوں میں پہلے کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ مذہبی روا داری نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ سُنّیوں کے ساتھ مصالحت کر چکے ہیں، بلکہ صرف یہ کہ خود مذہبِ اسلام سے ان کی بیگانگت روز بروز زیادہ بڑھتی جا رہی ہے۔

(۲) صوفیوں کے خلاف صوفیوں پر خصوصًا ان کے عقیدے

---

[1] اتحاد اسلام پر ان کا رسالہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء - ۱۸۹۵ء میں بمبئی سے لیتھو میں شایع ہو چکا ہے۔ ۱۲ مصنف

وحدت الوجود پر حملے اور اعتراضات شیعہ عقائد کی عام کتابوں میں اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں اور ردّ صوفیا پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، مثلاً آقا محمد بہبہانی کا رسالہ خیراتیہ[1] جس کی وجہ سے ایسی آتشِ انتقام بھڑکی کہ صوفیا کو شدید ترین ایذائیں دی گئیں اور ان کے کئی سربرآوردہ لوگ مثلاً میر معصوم، مشتاق علی اور نور علی شاہ[2] قتل کر دیے گئے، یا محمد رفیع ابن محمد شفیع تبریزی کی مطاعن الصوفیہ، جو ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں تصنیف ہوئی[3]۔ اس میں مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں انجیل سے بھی استناد کیا ہے اور حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:-

"خبردار رہو ان سے جو بھیڑ کے لباس میں (صوف یعنے اون) تمھارے پاس آتے ہیں لیکن باطن میں خونخوار بھیڑیے ہیں۔"

(۳) **عیسائیوں کے خلاف** | اسلام اور عیسائیت کے مناظروں پر بھی فارسی زبان میں ادبیات کا اچھا خاصہ ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے جس سے پروفیسر سیموئل لی Samuel Lee نے اپنی تصنیف

---

[1] سن تصنیف ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء، ۱۷۹۷ء۔ ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص ۳۳، ۳۴ پر اس پر دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] ان کے واقعات کے لیے ملاحظہ ہو ملکم کی تاریخ ایران (۱۸۱۵ء) جلد دوم ص ۴۱۶، ۴۲۳۔ ۱۲ مصنف

[3] میرے پاس اس کا ایک اعلیٰ درجہ کا قلمی نسخہ (تاریخ ختم کتابت ۲۲ر جمادی الثانی ۱۲۲۱ھ مطابق ۲۷ر اگست ۱۸۰۶ء) موجود ہے۔ ۱۲ مصنف

(Controversial Tracts on Christianity and Mohammadanism (Cambridge, 1824)

(رسائل مناظرہ مابین مسیحیان و مسلمانان) میں بحث کی ہے۔ اس قسم کی اکثر کتابیں سترھویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں ایک صاحب سیّد احمد ابن زین العابدین العلوی نے تصنیف کی تھیں، جن میں سے ایک میں زیویر (Xavier) کے "آئینۂ حق نما" پر اعتراضات کیے گئے ہیں اور دوسری میں یہودیوں پر حملے ہیں۔ اس زمانے کے بعد بھی عیسائی مشنری ہنری مارٹن (Henry Martin) کی تبلیغی جد و جہد کے خلاف اور ان کے دلائل کی تردید میں مرزا ابراہیم[1] نیز دیگر حضرات نے کتابیں لکھی ہیں۔

(۴) شیخیوں کے خلاف: شیخی مذہب یا فرقے کی ابتدا شیخ احمد ابن زین العابدین الاحسائی سے ہوتی ہے اور انھیں کے نام پر یہ فرقہ "شیخی" کہلاتا ہے۔ شیخ احمد ایرانی نہ تھے، بلکہ بحرین کے باشندے تھے۔ صاحب روضات الجنات کے بیان کے مطابق[2] ان کا انتقال ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء - ۱۸۲۸ء میں بعمر نوّد[90] سال ہوا۔ ان کے بعد سید کاظم رشتی ان کے خلیفہ ہوئے۔ سیّد علی محمد باب بانی فرقۂ بابیہ نیز ان کے اکثر مرید اور حاجی محمد کریم خاں کرمانی جنھوں نے بعد میں شیخی عقیدہ کی ترویج و اشاعت کی یہ دونوں انھیں سیّد کاظم رشتی

---

[1] ملاحظہ ہو میری فہرست مخطوطات فارسی کیمبرج یونیورسٹی (۱۸۹۶ء) ص ۸، ۱۳۔ ۱۲ مصنف

[2] طہران لیتھو اڈیشن ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء ص ۲۵، ۲۶۔ ۱۲ مصنف

کے شاگرد تھے۔ شیخی عقیدے کو جو در اصل شیعیت ہی کی انتہائی شکل ہی، اکثر مشہور مجتہدین نے ملحدانہ قرار دیا ہی، مثلاً حاجی ملّا محمد تقی قزوینی جو مشہور بابی مجاہدہ قرۃ العین کے چچا اور خسر بھی تھے، محض اسی وجہ سے قتل کیے گئے کہ وہ شیخیوں اور بابیوں کے مخالف تھے اور خوش عقیدہ شیعہ لوگوں نے انھیں شہید ثالثؒ کا لقب دیا۔ شیخیوں کا نیز ان کے عقائد کا کچھ تذکرہ جو ہر ایسے شخص کے لیے جسے ایرانی افکار و خیالات کا سرسری مطالعہ منظور ہو کافی ہوگا میری کتاب Travellers' Narrative کی جلد دوم کے خاتمے پر حاشیہ میں ناظرین کو ملے گا[۲]۔ شیخ احمد کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو میرے علم کی حد تک سب عربی زبان میں ہیں۔ روضات الجنات (ص۲۵) میں ان کی فہرست دی ہوئی ہی اور من جملہ دیگر امور کے یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہی کہ اگرچہ حشر کے متعلق خود ان کے عقائد صحیح نہ تھے، لیکن صوفیوں سے وہ بہت متنفر تھے اور واقعہ بھی یہ ہی کہ صوفیا کا عقیدہ وحدت الوجود نیز ان کی وسیع المشربی قدرتی طور پر ہر فرقہ کے اصولی علما کو ناگوار ہوتی ہی، خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنّی، شیخی ہوں یا بابی،

---

[۱] ملاحظہ ہو میری کتاب Travellers' Narrative جلد دوم ص۱۹۶ ص۱۹۸ نیز ص۳۱۰ ۔ ص۳۱۲ ۔ ۱۲ مصنف

[۲] نیز ملاحظہ ہو اے۔ ال۔ ایم نکولاس (A. L. M. Nicolas) کی تصنیف Essai sur le Cheikhisme (مقالہ بر عقیدہ شیخیت ص۷ ۔ اس کتاب میں شیخ احمد کی تصانیف کی فہرست بھی ملے گی۔ ۱۲ مصنف

بہائی ہوں یا مسیحی۔ خود ہنری مارٹن عیسائی مشنری بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے عقائد ان مختلف مذاہب سے خوشہ چینی کرنے والے اور عقلی نکتہ آفرینیاں کرنے والے صوفیا کی بہ نسبت شیراز کے غالی ملّاؤں کے عقائد سے زیادہ میل کھاتے تھے۔ دور آخر کے شیخی اور بابی اگرچہ ایک ہی اصل کے دو فروع تھے، لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے بہت بیزار اور متنفر تھے اور جن علما نے اخیر ۱۸۴۸ء میں تبریز میں باب کے مقدمے کی سماعت کی اور ان کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا، ان میں سے کم از کم ایک یعنی ملّا محمد مقامی کے متعلق یہ وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ ان کا تعلق فرقہ شیخی سے تھا[1]۔

۵۔ بابیوں اور بہائیہ کے خلاف بابی اور بہائی تحریکات کی بدولت، جن کے اثرات آج کل حدودِ ایران سے متجاوز ہو کر امریکہ تک پہنچ چکے ہیں، قدرتی طور پر مذہبی ادبیات کا ایک زبردست ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے جو بجائے خود اس قابل ہے کہ مستقل طور پر اس کی تحقیق و تدقیق کی جائے۔ میں اپنی دوسری تصانیف میں اس سے بحث کر چکا ہوں[2]۔ خود باب کی تصانیف میں سے بیان اور دلائل سبعہ جو دونوں فارسی زبان میں ہیں،

---

[1] ملاحظہ ہو Travellers Narrative جلد دوم ص ۲۷۸ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو

(1) Travellers' Narrative Vol. ii. P. 173-211

(2) Materials for the Study of the Babi Religion PP. 175-243

۱۲ مصنف

مشہور ترین ہیں[1]۔ بہاء اللہ کی ایقان جو ان کے مدعی "ظہور اللہ" ہونے سے پہلے لکھی گئی، بہائی مذہب کی اوّلین مدلّل توجیہ ہے۔ ان کے زمانۂ آخر کی تصنیف الواح ہے جن میں سے اکثر لوحیں فارسی زبان میں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم الواح سلاطین ہیں۔ اسی طرح سے فرقۂ ازلیہ کے متعلق بھی وافر ادبی سرمایہ فراہم ہوچکا ہے اور ہر شاخ سے جو دو علیحدہ علیحدہ اور فرید فرقے پیدا ہوئے، ان کی وجہ سے کتب و رسائلِ مناظرہ بھی بکثرت لکھے گئے۔ بابی اور بہائی مذہب کی مدلّل اور باقاعدہ تردید میں جو جو فارسی کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں مشہور ترین یہ ہیں[2]:

آقا محمد تقی ہمدانی[3] کی احقاق الحق سنہ تصنیف تقریباً ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء۔

منہاج الطالبین[4] مصنف حاجی حسین قلی جو پہلے ارمنی عیسائی تھے اور پھر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ کتاب بمبئی میں ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں لیتھو میں شایع ہوچکی ہے۔

بابیوں اور بہائیوں نے فارسی نویسی کا ایک مخصوص طرز پیدا کیا ہے جو کئی حیثیتوں سے قابلِ تعریف ہے۔ بہاء اللہ کے بعض الواح

---

[1] اے۔ ال۔ ایم۔ نکولاس (A. L. M. Nicolas) نے جو ایک فاضل اور بے لاگ مصنف ہیں ان دونوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا ہے ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو میری تصنیف Materials for the Study of the Babi Religion PP. 189-90 ۱۲ مصنف

[3] ،، ،، صفحہ ۱۹۶ - صفحہ ۱۹۵ ۱۲ مصنف

جو زرتشتیوں کے استفسارات کے جواب میں ان کو مخاطب کر کے لکھے گئے تھے، خالص فارسی زبان میں ہیں اور عربی کی آمیزش سے بالکل پاک ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی مشہور ترین تصانیف مثلاً کتاب اقدس عربی ہی میں ہیں۔ طرزِ انشا کے اعتبار سے بہاء اللہ کی عربی اور فارسی دونوں کی تحریروں میں بہت کچھ ترقی نظر آتی ہے۔ مرزا علی محمد باب کا اسلوبِ بیان بقول گوبی نو (Gobineau) کے "بے مزہ، دقیق اور بے رنگ ہے"۔

۳ فلسفہ

فلسفہ یا حکمت کی تعریف مسلمانوں میں یہ ہے "تا حدِ امکان اشیا کی کُنہ تک پہنچنا اور ان کی ماہیت معلوم کرنا"۔ فلسفہ کی تقسیم دو شاخوں میں کی جاتی ہے، نظری اور عملی۔ فلسفۂ نظری میں ریاضیات علم الطبیعت یا طبیعات اور ماوراء الطبیعات (جسے ما بعد الطبیعات اور فوق الطبیعات بھی کہتے ہیں) داخل ہیں۔ فلسفۂ عملی میں تہذیب الاخلاق یا اخلاقیات، تدبیر المنزل (معاشیات) اور سیاست المدن (سیاسیات) داخل ہیں۔ عملی فلسفہ پر فارسی کی تین مشہور ترین کتابیں اخلاق ناصری، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی ہیں[1] جو سب کی سب دورِ زیرِ بحث سے پہلے کی ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اُس زمانے سے لے کر آج تک اس

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد سوم ص۲۲۱۔ ص۲۴۴ ۱۲ مصنف

موضوع پر کوئی اہم کتاب نہیں لکھی گئی ہے، پس اس موقع پر ہم اپنی بحث صرف شق اوّل یعنی نظری فلسفہ ہی تک محدود رکھتے ہیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ مابعد الطبیعات کی بحث ہوگی جس کے ڈانڈے ایک طرف مذہب اور دوسری طرف علم (سائنس) سے ملے ہوئے ہیں۔

شیعہ اور معتزلہ | یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ابتدائی دورِ عباسیہ میں شیعہ اور معتزلہ[1] کے اصول میں بہت قریبی تعلق تھا۔ نیز اس حقیقت سے بھی عموماً سب واقف ہیں کہ اسلام میں جتنے مذہبی فرقے پیدا ہوئے، ان میں سب سے زیادہ روشن خیال اور فلسفی مزاج معتزلہ ہی تھے۔ یہ لوگ عقیدہ جبر کے جو ان کے بعد عام طور پر تسلیم کیا گیا اور جس سے دنیائے اسلام کے ذہنی ارتقا کو بہت کچھ صدمہ پہنچا، شدید مخالف اور قدر کے قایل تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو DeBoer's History of Philosophy in Islam translated by E. R. Jones (London, 1803) PP. 33, 43, 72, and 84, نیز Goldziher's Vorlesungen uber der Islam (طبع ہائی ڈل برگ ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۰۳ الخ) ۱۲ مصنف

(دبوئیر کی مذکورہ بالا کتاب کا ترجمہ اردو اصل جرمن سے ہمارے محترم دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی، استاذ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی نے "تاریخ فلسفۂ اسلام" کے عنوان سے کیا ہے جو جامعہ کے سلسلۂ مطبوعات میں شایع ہوا ہے) ۱۲ ۔ مترجم

معتزلہ کے ساتھ شیعوں کے اس ذہنی ربط و تعلق کا اثر یہ ہوا کہ ان کی کتب مذہبی کے وہ حصّے جن میں ماہیت و صفات الٰہی سے بحث کی جاتی ہو، سنّیوں کی مذہبی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

مسلمان فلاسفہ اور یونان کی خوشہ چینی

اسلامی علم (سائنس) کی طرح سے اسلامی فلسفہ بھی مسلّمہ طور پر اور خود مسلمانوں کا اپنے اعتراف کے مطابق، تقریبًا کل یونانیوں سے لیا گیا ہو۔ آٹھویں صدی کے نصف سے لے کر جب کہ ابتدائی خلفائے عبّاسیہ کے عہدوں میں مشہور اور سربرآوردہ مفکرین یونان کی تصانیف کے عربی ترجمے ہونے لگے تیرھویں صدی عیسوی کے وسط تک جب مغلوں کے حملے نے اسلامی تہذیب کی جڑیں کاٹ ڈالیں اور بغداد اور خلافتِ عبّاسیہ کا قلع قمع کردیا مسلمانوں کے فلسفہ نے جو تدریجی ترقیاں کی ان کا مفصّل بیان یورپی محققین بار بار کرچکے ہیں۔ جن ناظرین کو فلسفۂ اسلامی پر ایک عام تبصرہ اور مختلف مذاہب فلسفہ کے خاص خاص بانیوں کی خصوصیات کا مطالعہ مقصود ہو ان کے لیے ڈاکٹر جے۔ ڈی بئویر (Doctor T. J. de Boer) کی تاریخ فلسفۂ اسلام کا مطالعہ بہت مفید ہوگا جس کا ترجمہ مسٹر ای۔ آر۔ جونس (E. R. Jones) نے انگریزی میں کیا ہو۔ ناظرین دیکھیں کہ اس کتاب میں جن مسلمان مفکرین کا ذکر کیا گیا ہو ان میں سے صرف ایک یعنی ابن خلدون (ولادت بمقام تونس ۱۳۳۲ء؛ وفات بمقام قاہرہ ۱۴۰۶ء) ہی

زوالِ خلافتِ عباسیہ کے بعد گزرا ہی، مگر بقول بوَیر "اس کی بات ہی دوسری ہی اس لیے کہ نہ اس کا کوئی پیش رو تھا اور نہ کوئی جانشین ہوا[1]"

قریبی زمانے کے ایرانی نظامات فلسفہ کی اہمیّت کا اندازہ دشوار ہی

اس موقع پر جو سوال ہمارے زیرِ بحث ہی وہ یہ ہی کہ ایران میں جہاں پہلے "عرب فلاسفہ"[2] کی اتنی بڑی تعداد پیدا ہو چکی ہی، سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے آج تک بھی کوئی بلند پایہ "فوق الطبیعی" یا "مابعد الطبیعی" پیدا ہوا ہی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب وہی دے سکتا ہی جو عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ نہ صرف عربی فلسفہ، بلکہ یونانی یا یوں کہیے کہ عام فلسفہ کی تاریخ اور خود موضوعِ فلسفہ میں بھی کافی دستگاہ رکھتا ہو اور بدقسمتی سے مجھے اس کا دعویٰ نہیں ہی۔ دراصل یہی سب سے بڑی دقّت ہی جس کی وجہ سے اسلام کی علمی ادبیات (Scientific Literature) کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہی۔ مثلاً میں پوچھتا ہوں کہ ان لوگوں میں جو

---

[1] ڈی بوئر صفحہ ۱۲ مصنف

[2] انھیں "عرب فلاسفہ" صرف اس لیے کہا جاتا ہی کہ ان کی تصنیف و تالیف کی زبان تمام تر عربی تھی جو اس زمانے میں اور آج بھی دنیائے اسلامی کی مہذّب ترین زبان سمجھی جاتی ہی، جس طرح کسی زمانے میں لاطینی دنیائے مسیحی کی شائستہ زبان خیال کی جاتی تھی۔ ۱۲ مصنف

عمر خیام کی فارسی رباعیات پر سر دُھنتے ہیں ایسے کتنے ہوں گے جو ایم۔ وپکے (M. Woepcke) کے اس فاضلانہ مقالے کو سمجھ سکیں جو انھوں نے خیام کے رسائل جبر و مقابلہ کی تعریف میں لکھا ہے؛ علیٰ ہذا محض عربی زبان کی واقفیت سے ہمیں اس تصفیہ میں کوئی مدد نہیں مل سکتی کہ الرازی اور ابن سینا دونوں میں سے کون بڑا طبیب تھا؟ اس قسم کے مخصوص اور فنی مسائل پر بہت کچھ قابلِ قدر کام کیا جا چکا ہے اور ڈاکٹر ای وی ڈے مان (Doctor E. Wiedemann) ساکن ارلانگن (Erlangen) نے مسلمانوں کے علم المناظر اور طبیعیات پر، ڈاکٹر جولیس ہرش برگ (Julius Hirschberg) نے علم البصر پر اور ڈاکٹر ماکس سائمن (Max Simon) نے علم الابدان پر بہت کچھ قابلیت کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے، لیکن ہنوز بہت کچھ کام باقی ہے اور ایسے محققین جو اس کے اہل ہوں، بہت ہی کم ہیں۔ جہاں تک ایران

زمانۂ حال کے چھ مشہور ایرانی فلاسفہ

کی گزشتہ تین یا چار صدیوں کے فلسفہ کا تعلق ہے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس پوری مدت میں صرف چھ مفکرین ایسے گزرے ہیں جنھیں اپنے ابنائے وطن میں شہرت حاصل ہے، لیکن یہ سوال کہ یہ شہرت کس حد تک واقعی اور سچی ہے ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہو سکا ہے۔ ان چھ مفکرین کے نام بہ ترتیب سن حسب ذیل ہیں:-

۱- شیخ بہاء الدین العاملی (وفات ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۲ء)

۲- میر داماد (وفات ۱۰۴۱ھ مطابق ۱۶۳۱ء - ۱۶۳۲ء)

۳- ملّا صدرا (وفات ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء۔ ۱۶۴۱ء)
۴- ملّا محسن فیض (وفات ۱۰۹۱ھ مطابق ۱۶۸۰ء)
۵- ملّا عبدالرزاق لاہجی اور نسبتہً قریب تر زمانے میں
۶- حاجی ملّا ہادی سبزواری (وفات ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء)

حکمت و کلام | مسلمان فلاسفہ دو قسم کے ہوتے ہیں؛ ایک وہ جن کا فلسفہ مشروط بہ مذہب اور مذہب کے ماتحت ہوتا ہے، دوسرے وہ جن کے افکار اس طرح محدود اور مشروط نہیں ہوتے۔ اول الذکر متکلمین یا اہل الکلام کہلاتے ہیں اور ثانی الذکر کو حکما (واحد حکیم) یا فلاسفہ (واحد فیلسوف) کہا جاتا ہے اور یہی اصل معنوں میں فلسفی ہوتے ہیں۔ جن چھ اشخاص کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے ان میں سے ملّا صدرا تو یقینی طور پر اور ملّا ہادی غالبًا زمرۂ فلاسفہ میں داخل ہیں، بقیہ چار کا تعلق متکلمین کے گروہ سے ہے، لیکن چاہے فلسفہ میں ان کی شہرت زیادہ نہ ہو، مگر دوسری حیثیتوں سے وہ سب جیّد عالم تھے۔ سوائے ملّا ہادی کے جو بہت قریبی زمانے کے ہیں، اور سب کے سوانح زندگی روضات الجنات یا قصص العلما میں ملتے ہیں اور میں نے ذیل کے حالات میں بجز ان صورتوں کے جہاں خاص طور پر صراحت کر دی گئی ہے، انھیں دونوں کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

پہلے پانچ حضرات کا زمانہ کم و بیش ایک ہی تھا اور ان میں باہم دگر کسی قدر تعلقات بھی تھے، شیخ بہاء الدین اور میر داماد دونوں بہت ذی اثر اور شاہ عباس کے دربار میں بہت قدر و منزلت

سے دیکھے جاتے تھے اور اگر وہ دلچسپ قصّہ جو ان دونوں اور شاہ عباس کے متعلق سرجان ملکم نے لکھا ہے[1] صحیح ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کسی قسم کی معاصرانہ رقابت نہ تھی۔

ملّا صدرا ان دونوں کے شاگرد تھے[2] اور ملّا محسن فیض اور ملّا عبدالرزاق لاہجی دونوں ملا صدرا کے تلامذہ اور داماد تھے۔

ا۔ شیخ بہاء الدین العاملی

ولادت ۹۵۳ھ مطابق ۱۵۴۶ء؛ وفات ۱۰۳۱ء مطابق ۱۶۲۲ء

شیخ بہاء الدین محمد، ابن حسین، ابن عبدالصمد الحارثی الہمدانی الجبع کا شمار ان کثیر التعداد شیعہ علما میں ہے جو جبل عامل واقع شام سے ایران آئے تھے۔ ان کا نسبہ جس سے وہ عام طور پر معروف ہیں یعنی عاملی اسی جبلِ عامل کی مناسبت سے ہے، حالانکہ ایرانی انھیں زیادہ تر شیخ بہائی کہتے ہیں۔ ان کے والد شیخ حسین جو شیخ زین الدین "شہید ثانی" کے شاگرد تھے، اپنے اُستاد کی وفات کے بعد جنھیں شیعیت کی پاداش میں ترکوں نے قتل کر دیا تھا، اپنے صغیر سن فرزند شیخ بہاء الدین کو ہمراہ لے کر ایران چلے آئے۔ یہاں آکر شیخ بہاء الدین نے کمال ریاضت اور مشقت سے دینیات کے جملہ شعبے نیز ریاضی،

---

[1] تاریخ ایران (۱۸۱۵ء) جلد اول ۵۵۵-۵۵۹۔ یہ واقعہ قصص العلما اور روضات الجنات (ص۱۱۵) میں بھی موجود ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] روضات الجنات ص۳۳۱ ۱۲ مصنف

طب وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا۔ جن اساتذہ کے سامنے انھوں نے زانوئے شاگردی تہ کیا، ان میں خود ان کے والد کے علاوہ ملّا عبداللہ یزدی تلمیذ جلال الدین دوّانی مصنف اخلاقِ جلالی بھی تھے، ریاضی میں انھوں نے ملّا علی مذہّب اور ملّا افضل قائنی سے تحصیل کی اور طب علاء الدین محمود[1] سے حاصل کی۔ رفتہ رفتہ وہ فقہ اور علم دین میں بہت مشہور ہوگئے اور اصفہان میں شیخ الاسلام یا صدر الاسلام کے عہدہ پر سرفراز کیے گئے، چند دنوں کے بعد ان کے دل میں حج کرنے کی لگن پیدا ہوئی اور وہاں سے واپسی میں درویشانہ لباس میں عراق، مصر، حجاز اور فلسطین کی سیاحت کی اور کئی مشہور علما مجتہدین اور صوفیا سے ملاقاتیں کیں۔

ان کے اساتذہ

شیخ بہائی بعلبک (ولایت شام) میں ۱۷ محرم ۹۵۳ھ (۲۰ مارچ ۱۵۴۶ء) کو پیدا ہوئے اور ۱۲ شوال ۱۰۳۱ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۶۲۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی خاص خاص تصانیف حسب ذیل ہیں: جامع عباسی جو فتاوے کا مجموعہ ہے؛ زبدہ؛ مفتاح الفلاح؛ تشریح الافلاک ہیئت میں؛ خلاصۃ الحساب علم الحساب میں؛ کشکول جو قصّوں اور نظموں کا ایک

ان کی خاص خاص تصانیف

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی جلد اول میں شاہ عباس کبیر کے عہد کے مشاہیر کے سلسلے میں ان کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ شیخ بہائی اور میر داماد کے بعض حالاتِ زندگی جو یہاں بیان کیے گئے ہیں، اسی تاریخ سے ماخوذ ہیں ۱۲ مصنف

ضخیم مجموعہ ہے اور جس میں نظموں کا ایک جزء فارسی میں بھی ہے[1]، ہملات جو کشکول ہی کے طرز کی کتاب ہے؛ ایک فارسی مثنوی نان و حلوا جس میں سفر مکہ کے واقعات اور واردات کا بیان ہے اور ایک اور مثنوی شیر و شکر۔ ان نظموں، نیز ان کی غزلیات کے انتخابات مجمع الفصحا (جلد دوم ص۸-۱۰) میں موجود ہیں۔

۳۔ میر داماد

پورا نام میر محمد باقر استر آبادی تھا، اشراق تخلص کرتے تھے عام طور پر داماد کے عرف سے مشہور ہیں جو فی الحقیقت ان کے والد سید محمد کا عرف تھا، کیونکہ وہ مشہور عالم شیخ علی ابن عبد العلی کے داماد تھے۔ میر محمد باقر داماد نے اپنی ابتدائی تعلیم مشہد میں حاصل کی، لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ اصفہان میں گزرا جہاں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، وہ شاہ عباس کے خاص منظور نظر تھے۔ تاریخ عالم آرائے عباسی کی تصنیف کے ختم کے وقت ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں یہ اصفہان ہی میں تھے۔ ان کی زیادہ تر تصانیف عربی میں ہیں، لیکن شعر فارسی میں کہتے تھے اور اشراق تخلص تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ طبعی، نیز فلسفے سے شہد کی مکھیوں کی عادات کا مشاہدہ انھیں خاص شغف تھا۔

---

[1] قاہرہ اڈیشن ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء-۱۸۸۹ء) میں یہ نظمیں نہیں ہیں، لیکن طہران کے لیتھو اڈیشن میں (طبع ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء) میں موجود ہیں۔ ۱۲ مصنف

چنانچہ صاحب قصص العلما نے لکھا ہو کہ انھوں نے مشاہدہ و معائنہ کی غرض سے ایک شیشہ کے ظرف میں شہد کا چھتّا لگایا تھا اور شہد کی مکھیوں کے عادات و خواص کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اسی مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہو کہ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد اور داماد ملّا صدرا نے انھیں خواب میں دیکھا اور ان سے کہا کہ "حضرت میرے اور آپ کے عقاید ایک ہی ہیں، لیکن میری تکفیر کی جاتی ہو اور آپ صاف بچ گئے، آخر اس کی وجہ کیا ہو؟" اس پر میر داماد کی روح نے جواب دیا کہ میں نے بے شک فلسفے پر قلم اٹھایا لیکن میری تحریر کو صرف فلاسفہ ہی سمجھ سکتے ہیں، عالمانِ دین کی فہم سے وہ باہر ہو، لیکن تم فلسفیانہ مسائل پر ایسی تحریریں لکھتے ہو جنھیں ہر مکتب کا ملّا یا مسجد کا امام جو تمھاری کتابوں کو پڑھتا ہو، سمجھتا ہو اور تمھاری تکفیر کرتا ہو۔

ملّا صدرا شیرازی وفات ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء یا ۱۶۴۱ء

صدرالدین محمد ابن ابراہیم شیرازی نام تھا۔ عام طور پر ملّا صدرا کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد ایک ضعیف العمر شخص تھے، یہ اکلوتے بیٹے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد شیراز چھوڑ کر اصفہان چلے گئے جہاں جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہو، انھوں نے شیخ بہائی اور میر داماد سے تحصیل علم کی اور دونوں سے ان کی تصانیف پر شرح لکھنے کی اجازت حاصل کی۔ آخر میں سب کچھ چھوڑ کر قم کے پاس ایک قصبہ میں گوشہ نشینی اختیار کرلی اور تنہائی اور

ریاضت کی زندگی بسر کرنے اور فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے سات مرتبہ پا پیادہ حج کیا اور ساتویں سفر سے واپس ہوتے وقت بصرہ میں ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء ۱۶۴۱ء میں انتقال کیا۔ انھوں نے صرف ایک لڑکا چھوڑا جس کا نام ابراہیم تھا، مگر وہ اپنے والد کے مسلک سے منحرف ہوگیا، ان کے عقائد کی تردید کی اور فخریہ کہتا تھا کہ میرا مسلک وہی ہے جو جمہور کا۔ ملّا صدرا کی زندگی کے یہ مختصر حالات میں نے روضات الجنات (ص ۳۳۱) اور قصص العلما سے لیے ہیں۔ میں ان میں اتنا اضافہ اور کرتا ہوں کہ ملّا صدرا کو جیسا کہ ان کی تصنیف اسفار کے دیباچے کے بعض جملوں سے ترشح ہوتا ہے غالی اور قدامت پسند ملاؤں کے ہاتھوں بہت ایذائیں اٹھانی پڑیں، نیز یہ کہ شیخ احمد احسائی بانی فرقۂ شیخی نے ان کی دو تصنیفوں حکمت العرشیہ اور مشاعر پر تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ شیخی اور بہائی عقائد کا اثر ملّا صدرا پر نظر بایں حالات غالباً شیخ محمد اقبال[1] کا یہ قول صحیح ہے کہ:۔

"صدرا کا فلسفہ ہی ابتدائی بابی مابعد الطبیعات کا ماخذ ہے[2]" یا آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] یعنی ہمارے ملک کے مایۂ ناز فلسفی اور شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۲ مترجم

[2] Development of Metaphysics in Persia (Luzac, London, 1908) (ارتقاء مابعد الطبیعات در ایران) ص ۱۷۵ ۔ ۱۲ مصنف

"اس عجیب وغریب فرقہ کے فلسفہ کا نقطۂ آغاز تلاش کرنا ہو تو شیخیوں کے شیعہ فرقے پر نظر کرنی چاہیے جس کا بانی شیخ احمد، ملّا صدرا کے فلسفہ کا پُر جوش طالبِ علم تھا اور جس پر اس نے کئی تفسیریں بھی لکھی ہیں"۔ [۱]

ان کی خاص خاص تصانیف | صدرا کی جملہ تصانیف عربی میں ہیں۔ ان میں سے دو اسفار اربعہ [۲] اور شواہد الربوبیہ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ دونوں طہران میں لیتھو میں طبع ہو چکی ہیں، اول الذکر بڑی تقطیع کی ۲ جلدوں میں ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں اور ثانی الذکر حاجی ملّا ہادی سبزواری کے حاشیہ کے ساتھ بغیر صراحتِ سال یا مقامِ طباعت چھپی ہے۔ صاحب روضات الجنات نے ان کے علاوہ حسب ذیل دوسری تصانیف بھی بتائی ہیں جو میری نظر سے نہیں گزری ہیں: حاشیہ اصول الکافی؛ کتاب الہدایہ؛

---

[۱] Development of Metaphysics in Persia (Luzac, London, 1908) (ارتقاء مابعد الطبیعات در ایران) ص ۱۲۵ - ۱۲ مصنف

[۲] گوبی نو (Gobineau) سے اسفار کے معنے سمجھنے میں سہو ہوا ہے: لفظ سِفر (بکسرۂ س وسکون ف) یعنی کتاب کی جمع ہے، نہ کہ سَفر کی۔ اسی سہو کی وجہ سے وہ لکھتا ہے (Religion et Philos. 1866, P. 81) "اس نے زیادہ سے زیادہ چار کتابیں اپنے حالاتِ سفر میں لکھی ہیں"! اس طرح سے گوبی نو نے باب کی ایک ابتدائی تصنیف زیارت نامہ کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے یعنی "اپنی زیارات کا سفر نامہ" ۱۲ مصنف

بوعلی سینا کی شفاء کے مابعد الطبیعاتی حصّے پر حاشیہ؛ حاشیہ حکمت الاشراق (حکمت الاشراق غالبًا ان مشہور اور بدقسمت عالم یعنی شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہی جو الحاد کے الزام میں قتل کردیے گئے اور اسی لیے المقتول کہے جاتے ہیں)؛ کتاب الواردات القلبیہ؛ کسر اصنام الجاہلیتہ؛ قرآن کی مختلف آیات کی تفسیریں وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ ملّا صدرا کے فلسفیانہ مسائل ایران میں بہت کچھ مشہور اور مقبول ہیں، لیکن یورپی زبانوں میں کم از کم میرے علم میں ان کی مجمل اور سرسری بحث صرف دو کتابوں میں لکھی گئی ہی۔

گوبی نو کا بیان ملّا صدرا کے متعلق

کامتے دی گوبی نو[1] نے ان کے فلسفہ پر متعدد صفحات لکھے ہیں، لیکن غالبًا اس کی معلومات کا مآخذ زیادہ تر اس کے ایرانی اساتذہ کے زبانی بیان کیے ہوئے حالات ہیں جو خود بھی شاید کچھ زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے۔ مثلاً اپنے بیان کے خاتمے پر وہ لکھتا ہی کہ ملّا صدرا کے عقائد وہی تھے جو ابوسینا کے تھے، حالانکہ صاحب روضات الجنات نے صاف صاف لکھ دیا ہی کہ وہ اشراقی تھے اور مشائین کے، جن کا سب سے بڑا نمائندہ ابوسینا تھا، سخت مخالف تھے:۔

---

[1] Les Religions et les Philosophies etc. (1866) PP. 80-92 ۱۲ مصنف

"کان ..... منفحاً اساس الاشراق بما لا مزید علیہ ومنفحاً ابواب الفضیحۃ علی طریقۃ المشاء والرواق"

شیخ محمد اقبال کا بیان | اس سے کسی قدر مختصر، لیکن نسبۃً زیادہ سنجیدہ بیان وہ ہی جو شیخ محمد اقبال نے جو پہلے اسی کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹر میک ٹگارٹ (Mctaggart) کے شاگرد تھے اور اب خود ہندوستان میں ایک مشہور اور جدت طراز مفکر کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنی کتاب

Development of Metaphysics in Persia : a Contribution to the History of Muslims Philosophy [1]

کے ص۱۵۰ پر کیا ہی، لیکن انھوں نے زمانۂ حال کے فلسفی حاجی

---

[1] مطبوعہ لوزک اینڈ کو (Luzac & Co.,) لندن ۱۹۰۸ء محمد اقبال نے اپنے ذاتی خیالات بھی ایک مختصر فارسی مثنوی "اسرار خودی" میں ظاہر کیے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں، انھوں نے نٹشے (Nietzsche) کے خیالات کو مشرقی جامہ پہنایا ہی۔ یہ مثنوی یونیورسٹی پریس لاہور سے لیتھو میں چھپی ہی اور میرے دوست اور شریک کار ڈاکٹر ر۔ا۔ نکلسن (R. A. Nicholson) نے اس کا انگریزی ترجمہ مع مقدمہ و حواشی شایع کیا ہی۔

The Secrets of Self, London Mcmillan & Co., 1920) ۱۲ مصنف

ملّا ہادی سبزواری پر ملّا صدرا کی بہ نسبت زیادہ مفصّل بحث کی ہے یعنی ۲۰ صفحات میں (ص۱۷۵ - ص۱۹۵)۔ ملّا ہادی کو وہ ملّا صدرا کا معنوی جانشین سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اُستاد (ملّا صدرا) کی روش کے خلاف عربی کی بجائے فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

شیخ محی الدّین ابن العربی کا اثر اس موقع پر یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ملّا صدرا جب کبھی مشہور روزگار مغربی شیخ محی الدّین ابن العربی کا ذکر کرتے ہیں تو بہت عزّت و احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اگرچہ ابن العربی ایرانی الاصل نہ تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایران کے فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار سے جتنے زیادہ وہ متاثر ہوئے ہیں، کوئی اور مفکر نہ ہوا ہوگا۔

۵ - ملّا محسن فیض کاشی - وفات تقریبًا ۱۰۹۱ھ ہجری مطابق ۱۶۸۰ء

پورا نام محمد ابن مرتضےٰ کاشی تھا، عام طور پر محسن کہلاتے ہیں فیض تخلص کرتے تھے۔ کاشان کے رہنے والے تھے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ملّا صدرا کے خاص شاگرد اور داماد بھی تھے۔ روضات الجنات (ص۵۴۲ - ص۵۴۹) اور قصص العلما میں ان کا حال ان کے اُستاد کے حال سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے اور چونکہ وہ عالمِ دین اور فلسفی ہونے کے علاوہ کسی قدر مشہور شاعر بھی تھے اس لیے ریاض العارفین (ص۲۲۵ - ص۲۲۶) اور مجمع الفصحا (ص۲۵ - ص۲۶) میں

بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

ان کی غیر معمولی علمی مصروفیت ان کی علمی مصروفیت محیر العقول تھی۔ دو سو[عہ] کتابیں اور رسالے تصنیف کیے ہیں اور تصانیف کی کثرت کے اعتبار سے سوائے ملّا محمد باقر مجلسی کے ان کے معاصرین اور پیش روؤں میں سے اور کوئی ان کی ہمسری نہیں کرسکا ہے۔ قصص نے ان کی ۶۹ تصانیف کے نام دیے ہیں جن میں سب سے اخیر کتاب شرح الصدر[۱] ان کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے، لیکن روضات الجنات میں ان کی تصانیف کا بیان زیادہ تفصیل سے موجود ہے۔ (ص۵۴۵۔ ص۵۴۶) اور ان کے سنین تصنیف بھی جو اکثر ۱۰۲۹ھ (۱۶۲۰ء) اور ۱۰۹۰ھ (۱۶۸۰ء) کے درمیان ہیں، درج کیے گئے ہیں۔ ۱۰۹۰ھ (۱۶۸۰ء) میں جو ان کی وفات کا سال بھی بتایا جاتا ہے، ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی[۲] اس حساب سے ان کا سالِ ولادت ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء۔ ۱۵۹۸ء) قرار پاتا ہے، ان کی تصنیف مفاتیح الشرائع کا ایک قلمی نسخہ جو غالبًا خود ان کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور ۱۰۴۲ ہجری مطابق ۱۶۳۲ء۔ ۱۶۳۳ء میں تیار ہوا میرے کتب خانے میں زیر نشان C. 18 موجود ہے۔

---

[۱] سن تصنیف ۱۰۶۵ھ مطابق ۱۶۵۴ء۔ ۱۶۵۵ء۔ ملاحظہ ہو روضات الجنات ص۵۴۶۔ قصص العلما کا جو اڈیشن ہندوستان سے لکھنؤ میں طبع ہوا ہے اس میں غلطی سے اس کتاب کا نام شرح الصدور لکھ دیا گیا ہے۔ ۱۲ مصنف

[۲] روضات الجنات ص۵۴۲ و ص۵۴۹۔ ۱۲ مصنف

[عہ] بقول صاحب قصص علماء

تحصیل علم کے لیے سفر جب ملّا محسن نے اپنے وطن کاشان کو چھوڑ کر شیراز جانے اور مشہور عالم دین سیّد ماجد بحرینی کی شاگردی اختیار کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا تو شروع میں ان کے والد نے مخالفت کی تھی، لیکن بعد کو یہ رائے قرار پائی کہ پہلے قرآن نیز ان نظموں سے جو حضرت علی ابن ابی طالب سے منسوب کی جاتی ہیں، تفاول کرلیا جائے چنانچہ قرآن سے تو حسب ذیل آیت نکلی وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ۝ (۹- ۱۲۳)

اور حضرت علی کی نظموں کے حسب ذیل اشعار نکلے۔ ان میں یہ الفاظ "صُحْبَةُ مَاجِدٍ" خاص طور پر برمحل اور مناسب حال تھے، کیونکہ ان میں مذکورہ بالا سید ماجد کی طرف صاف اشارہ موجود ہے۔

تغرب عن الاوطان فی طلب العلیٰ
وسافر ففی الاسفار خمس فوائد
تفرّج ھمٍّ واکتساب معیشۃ
وعلم وآدابٌ وصحبۃ ماجد
فان قیل فی الاسفار ذل ومحنۃ
وقطع الفیافی وارتکاب الشدائد
فموت الفتیٰ خیرٌ لہٗ من قیامہ
بدار ھوانٍ بین ذلٍّ وحاسد

ترجمہ:- بزرگی کی تلاش میں وطن سے باہر جا، سفر کر، اس لیے

کہ سفر میں پانچ فوائد ہیں - انبساط قلب، اکتساب معیشت، علم، آداب اور بزرگ (ماجد) کی صحبت اور اگر یہ کہا جائے کہ سفر میں ذلتیں اور محنتیں ہوتی ہیں، ریگستانوں کو عبور کرنا اور شدائد برداشت کرنے پڑتے ہیں (توبھی) بہادری کی موت اس کے لیے اس سے اچھی ہے کہ ذلت کی منزل میں ذلتوں اور حاسدوں کے درمیان رہے)

ان صریحی اشارات کے بعد ملّا محسن کے والد نے ان کے شیراز جانے کی مخالفت نہیں کی، چنانچہ وہ وہاں گئے اور مذکورہ بالا سید ماجد، نیز ملّا صدرا کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ قصص العلما نے ان کے سفر کا سال ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء۔۱۶۵۵ء) قرار دیا ہے، جسے قبول کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ اس لحاظ سے تو ملّا صدرا کی شاگردی اختیار کرنے اور ان کی صاحبزادی سے شادی کرتے وقت ان کی عمر ۶۰ سال ہوتی ہے؟

شیخ احمد احسائی اور ملّا محسن فیض کی باہمی مخالفت

قصص میں ملّا محسن کو "اخباری صرف" صوفی اور مداح شیخ محی الدین ابن العربی کہا گیا ہے۔ شیخ احمد احسائی، جنھوں نے، جیسا کہ ہم اوپر کہ آئے ہیں[1] ملّا محسن کے استاد ملّا صدرا کی دو تصانیف پر حاشیہ چڑھایا ہے، خود محسن سے بہت متنفر تھے اور ان کے نام کو بگاڑ کر محسن کی بجائے "مُسِیء" کہتے تھے اور شیخ العربی کو محی الدین کی بجائے "ممیت الدین" کہا کرتے تھے۔ قصص العلما میں

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ہذا ص ۳۲۶ ۔۱۲ مصنف

ملّا محسن نے ایک عیسائی مبلّغ کو شکست دی

ایک لغو سا قصّہ یہ بھی درج ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عباس نے ملا محسن سے خواہش کی کہ ایک عیسائی مبلغ سے جو "شاہ فرنگستان" کی طرف سے ایرانیوں میں مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بھیجا گیا تھا، مناظرہ کریں اور اس کے دلائل کا رد کریں۔ اس مبلغ کی ایک کرامت یہ تھی کہ وہ اپنے مخالف کی بند مٹھی کے اندر کی چیز بتادیا کرتا تھا۔ ملا محسن نے روضہ حضرت امام حسین کی خاک کی بنی ہوئی تسبیح اپنی مٹھی میں رکھ لی۔ عیسائی نے بتانے میں تامّل کیا، لیکن جب مجبور کیا گیا تو کہا "یہ نہ سمجھنا کہ میں تیری مٹھی کی چیز بتا نہیں سکتا، لیکن اپنے علم سے مجھے اس وقت یہ معلوم ہوا ہے کہ تیرے ہاتھ میں بہشت کی مٹی ہے اور میں حیران ہوں کہ یہ تجھے کہاں سے مل گئی"۔ ملا محسن نے کہا کہ تو ٹھیک کہتا ہے اور پھر اس کو بتایا کہ میں فلاں چیز مٹھی میں لیے ہوئے تھا اور اس کو نصیحت کی کہ اپنا مذہب چھوڑ دے اور مشرف باسلام ہو جائے۔ چنانچہ راوی کے بیان کے بموجب اسے مجبوراً یہی کرنا پڑا۔ اگرچہ ملا محسن بہت زیادہ پابندِ شرع تھے لیکن انھوں نے غنا کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا جس سے پُرانے طرز کے علما میں ہلچل پڑ گئی تھی۔ ان کی مشہور ترین فارسی تصنیف (غالباً) ابواب الجنان ہے جو ۱۰۵۵ھ مطابق ۱۶۴۵ع میں ختم ہوئی اور نماز اور ضرورتِ نماز پر ہے[1]۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے

---

[1] اسی نام کی ایک اور کتاب جو علم الاخلاق میں ہے کسی اور شخص کی تصنیف بھی ہے، ان دونوں میں التباس نہ کرنا چاہیے ۱۲ مصنف

بہت کم طبع ہوئی ہیں، یا آج کل پڑھی جاتی ہیں اور ان تصانیف کی بہ نسبت لوگ ان کے نام سے زیادہ واقف ہیں۔

۵۔ ملّا عبدالرزاق لاہجی

ان میں اور ملّا محسن فیض میں کئی حیثیتوں سے مشابہت پائی جاتی ہے، یہ بھی ملّا صدرا کے شاگرد اور داماد تھے، شاعر بھی تھے، فیاض تخلص تھا۔ اگرچہ ان کی تصانیف اتنی زیادہ نہیں ہیں جتنی ملّا محسن کی، لیکن آج کل زیادہ وہی پڑھی جاتی ہیں۔

گوہر مراد ان کی مشہور ترین تصانیف یہ ہیں: گوہر مراد، فارسی زبان میں ایک فلسفیانہ رسالہ ہے اور سرمایۂ ایمان۔ یہ بھی فارسی میں ہے۔ یہ دونوں کتابیں لیتھو میں چھپ چکی ہیں روضات الجنات (ص۳۵۲ تا ۳۵۳) اور قصص العلما میں ان کے جو حالات دیے ہوئے ہیں وہ بہت مجمل اور تشنہ ہیں۔ صاحب قصص العلما کو اگرچہ دبی زبان سے اس کا اعتراف ہے کہ ان کی تصانیف پکّے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، لیکن اس میں تامّل ہے کہ آیا وہ خود ان کے ذاتی معتقدات کی مظہر ہیں، یا مصلحت اندیشی سے کام لے کر انھوں نے ان کو اپنے اصلی خیالات کے لیے پردہ بنایا ہے۔ گوبی نو کی راے بھی کم و بیش یہی ہے۔[1]

میر ابوالقاسم فندرسکی گوبی نو نے[2] میر ابوالقاسم فندرسکی کی

[1] Les Religion et les Philosophies P. 91-2 ۱۲ مصنف

[2] Les Religion et les Philosophies ۱۲ مصنف

عجیب وغریب شخصیت کا بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملّا صدرا کے تین استادوں میں سے ایک وہ بھی تھے۔ میں نے بھی صفحات گزشتہ میں کسی جگہ[1] ان کا حال نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان مختصر حالات کے علاوہ جو ریاض العارفین[2] اور مجمع الفصحا میں دیے ہوئے ہیں، (دونوں نے ان کی ایک ہی نظم نقل کی ہے) اور دبستان[3] نے ان کے کیوان کے معتقدین سے راہ و رسم رکھنے اور سورج کی پرستش کرنے کے متعلق جو اشارے کیے ہیں، ان کے علاوہ کہیں اور سے مجھے ان کی زندگی یا عقائد وغیرہ کے تفصیلی حالات نہیں مل سکے۔ بظاہر آثار یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت فلسفی کی بہ نسبت زیادہ تر قلندرانہ تھی۔ اصفہان میں جو متعصبانہ شیعیت کی فضا پیدا ہوگئی تھی، وہ انھیں راس نہ آتی تھی، چنانچہ اس سے بچنے کے لیے انھوں نے ہندوستان کا سفر کیا۔ اگر صاحب ریاض العارفین کا یہ بیان صحیح ہے کہ ان کی قبر اصفہان میں ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف ہیں تو ماننا پڑے گا کہ وہ ہندوستان سے ایران واپس آگئے تھے۔

گوبی نو (کتاب محولہ بالا ص۹۱۔ ص۱۱۱) نے ایسے کئی فلاسفہ کے نام لکھے ہیں جو ملّا صدرا کے بعد سے اس کے (گوبی نو) قیام

---

[1] ملاحظہ ہو ص۱۲۱ نیز ص۳۰۶۔ ۱۲ مصنف

[2] ص۱۶۵ ص۱۶۶ ۱۲ مصنف

[3] ترجمہ Shea and Troyer (London, 1843) جلد اول ص۱۴۰۔ ص۱۴۱ ۱۲ مصنف

ایران کے زمانے تک گزرے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر بالکل غیر معروف ہیں اور ان میں کسی قسم کی جدّت نہیں پائی جاتی۔ اب میں صرف ایک اور فلسفی کا ذکر کرنا ہی جو گوبی نو کی تصنیف کے وقت زندہ تھا اور جسے اس نے "عجیب و غریب اور بے نظیر شخصیت" کہا ہی۔

۶۔ حاجی ملّا ہادی سبزواری

ولادت ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء یا ۱۷۹۸ء۔ وفات ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء

چونکہ شیخ محمد اقبال[1] نے اپنی تصنیف Development of Metaphysics in Persia (ارتقاے مابعد الطبیعات در ایران) کے خاتمے پر اس مشہور مفکر کے فلسفیانہ مسائل پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہی، اس کے لیے ان کے متعلق مجھے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہی۔ طہران میں ۱۸۸۷ء یا ۱۸۸۸ء کے جاڑوں میں مجھے ان کے ایک شاگرد سے تلمذ حاصل ہؤا تھا اور انھیں سے میں نے اِن کی زندگی کے متعلق مستند واقعات و حالات معلوم کر لیے تھے جن کا انگریزی ترجمہ میں اپنی کتاب[2] Year among Persians میں کر چکا ہوں کہ اس بیان کے مطابق جس کا ایک حصّہ ان کے بیٹے سے

---

[1] ص ۱۷۵ - ص ۱۹۵ ۱۲ مصنف

[2] ص ۱۳۱ - ص ۱۳۶ ۱۲ مصنف

حاصل ہوا ہے۔ حاجی ملا ہادی ولد حاجی مہدی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے وطن سبزوار میں تعلیم پاتے رہے، پھر وہاں سے اصفہان گئے اور ملا علی نوری کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور وہاں سے واپسی میں کرمان کی سیاحت کی۔ یہیں انھوں نے شادی کر لی۔ اور پھر سبزوار واپس چلے گئے اور وفات تک (۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء) بقیہ زندگی وہیں بسر کی۔

ان کی تصانیف ان کی مشہور ترین فارسی تصانیف یہ ہیں:۔ اسرار الحکم؛ مثنوی رومی کی مشکل ابیات اور الفاظ کی شرح؛ عربی میں منطق پر ایک منظوم رسالہ لکھا اور ایک فلسفہ پر تفسیر والفجر وجوشن کبیر اور ملا صدرا کی شواہد الربوبیہ نیز دوسری کتابوں پر حاشیے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، اسرار تخلص تھا، چنانچہ ریاض العارفین (ص ۲۴۱، ص ۲۴۲) میں ان کا تذکرہ موجود ہے اور لکھا ہے کہ تصنیف کے وقت یعنی ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء-۱۸۶۲ء میں وہ زندہ ہیں اور ان کی عمر ۶۳ سال ہے۔ ان کی اکثر تصانیف ایران میں لیتھو میں چھپ چکی ہیں۔

۳۔ علوم۔ ریاضیات، علوم طبعی، علوم سریہ

عربی علوم کا ارتقا اور فلسفہ سے ان کا تعلق جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے[1] ریاضیات، طبیعات اور مابعد الطبیعات

[1] ص ۱۳۲۔ مصنف

یہ سب کے سب نظری فلسفے کے موضوعات ہیں اور اس لیے وہ فلسفہ ہی کا جز ہوتے ہیں۔ غالبًا انھیں فلسفہ سمجھنے ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے مسلمان مفکرین میں بجائے اس کے کہ مظاہرِ قدرت کا تنقیدی مشاہدہ کیا جائے، ان پر استخراجی نظر ڈالنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ جس چیز کو عربی یعنی اسلامی علم (سائنس) کہا جاتا ہے وہ خاص طور پر یونانیوں سے ماخوذ ہے اور خلافتِ عباسیہ کی پہلی صدی یعنی سنہ ۷۵۰ء - سنہ ۸۵۰ء کا زمانہ اس کا عہدِ زرّیں تھا جب خلفائے عباسیہ خصوصًا المنصور، ہارون الرشید، المامون وغیرہ نے خاص کوشش اور صرف سے اس کا اہتمام کیا تھا کہ مشہور فلاسفہ، طبیعین اور اطبائے یونان کی کتابوں کے اچھے اور صحیح ترجمے عربی زبان میں ہو جائیں۔ یونانی سرمایہ کے عربی زبان میں منتقل ہو جانے سے سب سے بڑا فائدہ بنی نوع انسان کو یہ پہنچا کہ یورپ کے ازمنہ مظلمہ سے لے کر احیا (Renaissance) تک یونانی علم و فن کی روایات انھیں ترجموں کی بدولت باقی رہیں۔

عربوں نے یونانیوں سے جو کچھ لیا اس میں انھوں نے کس چیز کا اضافہ کیا

مذکورہ بالا خیال کی صداقت تو ہر شخص کو مسلّم ہے، لیکن اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عرب صرف یونانی علم کے حامل اور مُرسِل ہی تھے، یا انھوں نے بطورِ خود بھی ان میں کچھ ترمیم یا اضافہ کیا ہے اور اگر کیا تو ان اضافوں اور ترمیموں کی حیثیت اصلی یونانی علوم میں اصلاح و ترقی کی تھی یا نہیں؟ جہاں تک علم طب کا تعلق ہے میں نے اپنی کتاب (طب عربی)

Arabian Medicine[1] میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن چونکہ مجھے اصلی یونانی آخذ سے بہت کم واقفیت تھی، اس لیے مجھے بہت دقتوں کا سامنا ہوا۔ مذکورہ بالا سوال کی تحقیق کے لیے خواہ وہ مسلمانوں کی طب کے متعلق ہو، یا ریاضیات، طبیعیات، نجوم، کیمیا، غرض کہ کسی علم کے بھی متعلق ہو، محقق میں تین صفات کا موجود ہونا ضروری ہے جو بدقسمتی سے شاذ و نادر ہی ایک ذات میں جمع ہوتے ہیں یعنی علم یا فن زیرِ بحث کی واقفیت؛ عربی اور متاخر مصنفین کی تحقیق کے لیے کسی قدر ترکی اور فارسی کی واقفیت اور یونانی زبان کی واقفیت۔

قوتِ مشاہدہ کے اعتبار سے رازی (الرازی) کی فوقیت

عربی، یعنی مسلمان اطبّا کے متعلق میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں — اور مجھ سے پہلے ڈاکٹر میکس نیوبرگر (Max Neuberger) بھی اپنی یادگار تصنیف[2] Geschichte der Medizin (تاریخ طب) میں اسی نتیجہ پر پہنچے تھے — وہ یہ ہے کہ ابوبکر محمد ذکریا الرازی بحیثیت طبیب کے مشہورتر اور مقبول انام ابن سینا سے بمراتب زیادہ تھے اور غالباً اسلام میں ان سے بڑا طبی مشاہدہ کرنے والا کوئی اب تک نہیں گزرا ہے۔ جو اصلی امراض ان کے مشاہدے میں آئے اور ان کے متعلق اپنی زبردست تصنیف الحاوی میں جو اشارے

---

[1] PP. VIII+138, Cambridge University Press, 1921 ۱۲ مصنف

[2] جلد دوم، حصہ اول ص ۱۶۸ - الخ ۱۲ مصنف

اور خلاصے انھوں نے چھوڑے ہیں، ان کی اہمیت صرف تاریخی یا ادبی ہی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی بھی ہے۔ اپنے معالجہ کے جو طریقے انھوں نے لکھے ہیں، ان سے بھی کہیں کہیں کوئی نئی اور مفید مطلب بات حاصل ہو جاتی ہے۔ ابن سینا اس میں شک نہیں کہ الرازی کے مقابلے میں زیادہ منطقی، اصول پسند اور فلسفی مزاج تھے، لیکن ان میں اس بقراطی بصیرت کی بہت کمی تھی جو ان کے زبردست پیش رو (الرازی) کو حاصل تھی۔

مغلوں کے حملے کے بعد اسلامی علوم کا زوال اپنی کتاب Arabian Medicine (طب عربی) میں، میں نے آٹھویں صدی عیسوی سے شروع کر کے بارھویں صدی تک اسلامی فنِ طب کی تاریخ لکھی ہے، لیکن اس کو بڑھا کر موجودہ زمانے تک لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ جیسا کہ میں بار بار اور بہ تاکید کہہ چکا ہوں، تیرھویں صدی میں مغلوں کے حملۂ ایران نے اسلامی علوم و فنون پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ اس کے صدمے سے وہ ہنوز پنپنے نہیں پائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے بعد بھی طبّی یا دوسری نیم علمی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا وہ اس اعلیٰ معیار پر پہنچی ہیں یا نہیں جس پر وہ ابتدائی خلفائے عباسیہ کے زمانے تک پہنچ چکی تھیں اور جو گیارھویں صدی اور کسی قدر تیرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ اگرچہ مجھے اس مسئلہ کی کما حقہٗ تحقیق کا دعویٰ نہیں ہے لیکن کم از کم میری رائے میں یہ خیال بہت بعید از قیاس ہے کہ ان متاخر تصانیف سے متقدم سرمایہ میں کسی جدّت یا نئی

حقیقت کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر اڈلف فوناں (Adolph Fonahn) نے اپنی نہایت کارآمد کتاب Fur Quellenkunde der Persischen Medizin[1] (طب ایرانی کے مآخذ پر ایک نظر) میں ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو آئندہ محققین کے لیے دلیلِ راہ کا کام دے گی۔ ان متاخر تصانیف میں سے غالباً مشہور ترین تحفۃ المومنین ہے جو ۱۶۶۹ء میں محمد مومن حسینی نے شاہ سلیمان صفوی کے لیے لکھی تھی۔ اس کی حیثیت زیادہ تر مخزن الادویہ کی سی ہے اور ترکی اور عربی تراجم[2] کے علاوہ، اس کے متعدد اڈیشن اور قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

سطورِ بالا میں طب کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم الحیوانات علم نباتات، کیمیا وغیرہ، نیز ایک حد تک ریاضیات، فلکیات اور علم المعادن کے لیے بھی صحیح ہے۔ ان میں سے بعض علوم کے متعلق چند ماہرینِ فن نے جو عربی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں، اعلیٰ درجہ کا تحقیقی کام کیا ہے۔ مثال کے طور پر میں صرف حسب ذیل حضرات کے نام لوں گا: ووپکے (Woepcke) نے علم جبر و مقابلہ پر، وی ڈی مان (Wiedemaun) نے علم الحیل (میکانیات) پر، ہرش برگ (Hirschberg) نے علم البصر پر،

مسلمان ماہرینِ علوم کس حد تک ذاتی مشاہدہ سے کام لیتے تھے

---

[1] Leipzig, 1910 PP. V+152 ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو فوناں (Fohnan) کی کتاب متذکرہ صدر صفحہ ۸۹ حاشیہ ۹ نیز فہرست کتب فارسی برٹش میوزیم صفحہ ۴۷۵۔ ۴۷۶ ۔ ۱۲ مصنف

اور نوجوان محققین میں سے ہولم یارڈ (Holmyard) نے کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مشہور ترین اسلامی محققین نے جو درجۂ کمال حاصل کیا تھا وہ اس سے کچھ زیادہ ہی تھا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کم ہرگز نہ تھا، تاہم یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان مسلمان ماہرین علوم نے جن مظاہرات کا بیان کیا ہے اس کی تحقیق میں جیسا کہ چاہیے انھوں نے براہِ راست ذاتی مشاہدہ سے بھی کام لیا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر بذل الرحمٰن نے جو آج کل اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہیں[1] اس یونیورسٹی (Cambridge) میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں الجاحظ کی تصانیف کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تھا جو حیوانات کے متعلق اپنی معرکۃ الآرا تصنیف کتاب الحیوان کی وجہ سے عرب کا بہترین طبیعی سمجھا جاتا ہے[2]۔ اس قابل اور محنتی نوجوان طالب علم نے میری درخواست

---

[1] اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبہ السنہ مشرقیہ بھی رہ چکے ہیں اور آج کل اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی) میں پرنسپل ہیں ۱۲ مترجم

[2] مثلاً ملاحظہ ہو Fr. Wustenfield's Geschichte der Arabischen Aertze und Naturforscher (عرب اطبا و طبیعین) (Gottingen 1840) PP. 25-26 (No. 56) کارل بروکل مان (Carl Brocklemann) کی رائے صحیح ہے Gesch. d. Arab. Litt. (تاریخ ادبیات عرب) Vol. I, P. 152. لیکن ڈاکٹر ل۔ لیک لرک (L. Leclerc) نے اس موضوع پر جو خیال ظاہر کیا ہے (تاریخ طب عربی) (His. de la Med. Arabi) اور اس پر جو تنقید کارل بروکل مان نے کی ہے بے لاگ اور منصفانہ نہیں ہے۔ ۱۲ مصنف

اس مسئلہ پر خاص طور پر غور کیا کہ کیا الجاحظ کی تصانیف سے اس بات کا کوئی پتہ مل سکتا ہی کہ جن حیوانات کے متعلق اس نے لکھا ہی ان میں سے کسی کی عادات و خصائل کا اس نے بطورِ خود مشاہدہ کیا تھا یا نہیں؛ بالآخر انھیں ایک عبارت ایسی مل گئی جس سے اس سوال کا قطعی جواب حاصل ہوتا تھا۔ جبلت کی بحث میں الجاحظ نے لکھا ہی کہ جب چیونٹیاں غلّے کے دانے جمع کرتی ہیں تو وہ ہر دانے کو اس طرح خراب کردیتی ہیں کہ وہ پھوٹنے اور نمو کرنے نہ پائے۔ میں نے اس بیان کی تصدیق کے لیے بہت کچھ تحقیق استفارات وغیرہ کیے، لیکن کام نہ چلا، بالآخر مجھے مسٹر ہورسیس وِن تھروپ (Horace Winthrope) سے جو چیونٹیوں کے انگریزی ماہرین میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، یہ معلوم ہوا کہ یہ بیان صحیح ہی۔ اور مجھے یہ امید بندھی کہ اب کم از کم ایک قطعی ثبوت تو اس امر کا ملا کہ اس پُرانے مسلمان عالم نے اپنے ذاتی مشاہدے سے تاریخ طبعی کے ایک ایسے واقعہ کو دریافت کرلیا تھا جو آج کل کے اکثر ماہرینِ حیاتیات کو بھی معلوم نہیں ہی، لیکن بدقسمتی سے بعد کو مجھے بالکل یہی بیان Pliny[1] کے یہاں نظر آیا اور میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ قرینِ قیاس یہی ہی کہ الجاحظ نے اسے ذاتی مشاہدہ

[1] یعنی پلی نی کبیر ولادت ۲۳ء۔ وفات ۷۹ء مشہور رومی مورخ ہی، اس کی مشہور ترین تصنیف تاریخ طبعی پر ۳۷ جلدوں میں ہی اور ان میں جغرافیہ نجوم، نباتات، حیاتیات وغیرہ پر مستقل کتابیں ہیں۔

۱۲ مترجم

کی بنا پر نہیں بلکہ روایتہً سُن کر اپنی کتاب میں لکھا تھا۔

ایران میں یورپی علوم جدیدہ کی حالت

بعینہٖ یہی سوال ہر "عربی" علم کے متعلق پیدا ہوتا ہے اور اس کے جواب کا اہل صرف کوئی ایسا شخص ہی ہوسکتا ہے جو قدما کے علوم سے بخوبی واقف ہو، مثلاً ابن البیطار نے جو معرکتہ الآرا کتاب عربی میں دوائیوں کے درختوں پر لکھی ہے، کیا اس میں کوئی ایسی نئی بات ہے جو دسقوریدس[1] Dios Corides کے یہاں نہ پائی جاتی ہو؟ اس سوال کا جواب جو کچھ بھی ہو، لیکن یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ ان مختلف موضوعات پر متاخرین مسلمان مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ متقدمین اسلامی مصنفین سے افضل یا ان کے پاسنگ بھی ہے یا نہیں؟ زمانۂ حال میں خصوصاً جب سے طہران میں ناصرالدین شاہ کے عہد حکومت کے شروع میں دارالفنون کالج کا قیام ہوا، یورپی علوم کی کتابوں کے متعدد ترجمے یا ان کی بنیاد پر تالیفیں فارسی زبان میں ہوچکی ہیں، لیکن یہ سب کی سب خارج الاصل ہیں اور کسی ایسی تاریخ میں جو ایران کے ادبیات پر ہو، ان کے لیے گنجایش نہیں نکل سکتی۔ میں نے اپنی کتاب Press and Poetry in Modern Persia (صفحہ ۱۵۴ - صفحہ ۱۶۶) میں زیرِ عنوان "Modernizing Influences in the Persian Press

[1] پہلی صدی عیسوی کا بہت مشہور یونانی طبیب گذرا ہے اس نے مخزن الادویات پر ایک زبردست کتاب لکھی ہے جو پانچ جلدوں میں ہے اور خصوصیت کے ساتھ نباتات اور پودوں کے خواص سے بحث کی گئی ہے۔ ۱۲ مترجم

ایسی کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے، لیکن جو ایرانی حضرات انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے اب تک یورپی مدارس سائنس سے فارغ التحصیل ہوکر نکلے ہیں، ان میں کم از کم میرے علم میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے تلاش یا تحقیق کے اعتبار سے کچھ بھی شہرت حاصل کی ہو۔

نیرنجات، علوم سرّیہ آخر میں مجھے نجوم اور کیمیا گری چھوڑ کر علوم سرّیہ کا ذکر کرنا چاہیے۔ ان دونوں علوم کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ممالک مشرقی میں نجوم اور فلکیات اور کیمیا گری اور علم الکیمیا میں بمشکل کوئی فرق کیا جاتا ہے۔ کیمیا گری کے فن کو عربی اور فارسی میں کیمیا کہتے ہیں اور بقیہ چار علوم سرّیہ کے نام بھی جن میں تعویذ، سحر وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے، کیمیا ہی کے وزن پر، لیمیا، ہیمیا، سیمیا اور ریمیا ہیں جو "کُلُّہٗ سِرٌّ" کے حروف سے بنائے گئے ہیں، جس کے معنے ہیں کہ "یہ سب بھید ہے"۔ فارسی میں اس قسم کے ادبیات کا اچھا نمونہ اسرار قاسمی[1] اور عربی میں مشہور شیخ البونی کی شمس المعارف[2] ہے۔ لیکن ناواقف لوگوں کے لیے ان کا مطالعہ بالکل خشک اور بے سود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مصنفین میں صرف ابن خلدون ہی ایسا مصنف ہے جس نے ان نام نہاد علوم کی

---

[1] لیتھو بمبئی ۱۸۸۵ء ر ۱۸۹۴ء ۱۲ مصنف

اس کتاب کا پورا نام "کشف الاسرار قاسمی" ہے ۱۲ مترجم

[2] میرے پاس اس کا ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) کا لیتھو کا نسخہ ۔۔۔ ہے۔ لیکن ہندوستان اور مصر میں اس کے اور اڈیشن بھی نکل چکے ہیں۔ ۱۲ مصنف

فلسفیانہ اور عقلی بنیاد دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر ڈنکن بلیک میک ڈونالڈ (Duncan Black Macdonald) نے اپنی دلچسپ اور بصیرت افروز تصنیف "Religious Attitude and Life in Islam" [۱] (اسلام میں مذہبی زندگی اور اس کا نقطۂ نظر) میں نہایت کمال کے ساتھ ابن خلدون کے خیالات کا انطباق جدید "تحقیق نفسی" (Psychical Research) کے نظریوں پر کیا ہے۔ ماہرین علوم سرّیہ جن روحانی قوتوں کا دعویٰ کرتے ہیں اس کے متعلق میں نے اپنی رائے کو ہمیشہ بے لاگ اور غیر متعصبانہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور جب کبھی موقع ملا ہے میں نے اور کام چھوڑکر ان مظاہرات کی تحقیق کی ہے، لیکن سوائے دو موقعوں کے اور ہمیشہ مجھے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یعنی ایک تو ۱۸۸۸ء کے موسم بہار میں مجھے ایک "ساحر" اصفہان میں ملا جس نے بہت کچھ فخر و تعلّی کے بعد ایک کرشمہ ایسا دکھلایا کہ میری عقل دنگ ہوگئی [۲] اور دوسرے شیخ حبیب احمد مرحوم جنھوں نے انگریزی زبان میں ایک حیرت انگیز کتاب [۳] 'Mysteries of Sound and Number" (اسرار اصوات و اعداد) لکھی ہے۔ یہ صاحب اور کچھ نہیں تو ایک اعلیٰ درجے کے "خیال خواں" (Thought reader) یعنی دل کی بات

---

[۱] University of Chicago Press, 1909 ۱۲ مصنف

[۲] ملاحظہ ہو میری کتاب Year among the Persians ص ۴۵۳ - ۴۵۵ ۱۲ مصنف

[۳] London, Michols and Co., 1903. PP. XIV+211 ۱۲ مصنف

بتا دینے والے ضرور تھے!

۴۔ تاریخ ـ عام، مخصوص اور مقامی

فنِ تاریخ میں عربوں کی ایرانیوں پر افضلیت

ہمیں چار و ناچار اور بہت کچھ تاسف کے ساتھ اس امر کو تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ فنِ تاریخ میں ایرانی عربوں سے، جنھوں نے اس فن میں واقعی درجۂ کمال حاصل کیا ہی، بہت پیچھے ہیں۔ طبری کی طرح کے قدیم وقایع نگار جنھوں نے عینی شاہدوں کے دیکھے ہوئے واقعات یا راویوں کے پرکھے، پرتالے، زبانی سُنے ہوئے حالات درج کیے ہیں نہ صرف واقعہ نگاری کے اعتبار سے بے نظیر ہیں، بلکہ ان کی تصانیف میں ہمیں آج بھی ایسا تاریخی مواد مل جاتا ہی جس کی صحت اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی، مختلف اسناد کی وجہ سے جانچی جاسکتی ہی۔ خواہ سلسلہ روایات کی مختلف کڑیوں کی مضبوطی کے متعلق ہم ہمیشہ مسلمان نقّادوں کے ہم خیال ہوں یا نہ ہوں۔ متاخر عرب مورخین نے ان خشک لیکن قابلِ قدر اسناد میں بہت کچھ انتخاب و حذف و ترمیم سے کام لیا ہی، لیکن پھر بھی ان کے تاریخی بیانات حسبِ دستور سیدھے سچّے، جامع، قطعی اور مدلّل ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے سے تیرھویں صدی عیسوی تک کے اعلیٰ پایہ کے ایرانی مورخین بھی، چاہے عرب وقایع نگاروں کی سی دل کشی ان میں نہ ہو، لیکن پھر بھی بہت کچھ لایقِ تعریف اور معتبر تھے۔ لیکن تاتاری اور ترکی حکمرانوں اور سرپرستوں کی بدمذاقی کی وجہ

تاریخِ وصّاف کا افسوس ناک اثر (ایرانی تاریخوں پر)

سے رفتہ رفتہ ان کی تاریخیں، طرزِ تحریر نیز تاریخی مواد دونوں حیثیتوں سے زوال پذیر ہوتی گئیں۔ چنانچہ ہمیں جوینی کی تاریخ جہاں کشا (سن تکمیل تقریباً ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء) اور اس کے تتمے یعنی تاریخ وصّاف میں جو ۷۱۲ھ مطابق ۱۳۱۲ء میں مکمل ہوئی، صاف طور پر فرق نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، متاخر ایرانی مورخین پر تاریخ وصّاف کا اثر نہایت مضر ہوا اور بہت دیر پا ثابت ہوا[1] بعد کی فارسی تاریخوں میں مجھے بہت کم ایسی نظر پڑتی ہیں جو ہندو شاہ

کتاب الفخری فارسی جامہ میں

ابن سنجر ابن عبداللہ الصحابی الکیرانی کی تجارب السلف کی ٹکر کی ہوں جو ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں نصرت الدین احمد اتابک لرستان کے لیے لکھی گئی تھی اور تاریخ خلافت کے متعلق ہے۔ لیکن یہ کتاب بھی جیسا کہ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے، تمام و کمال صفی الدین محمد ابن علی العلوی الطقطقی کی دلکش عربی تاریخ کتاب الفخری[2] سے ماخوذ ہے جو ۷۰۱ھ مطابق ۱۳۰۲ء میں تصنیف ہوئی تھی اور جس کا نام مصنف تجارب السلف نے منیات الفضلاء فی تواریخ الخلفاء والوزراء لکھا ہے۔ جس بد مذاقی کا ہم یہاں ماتم کر رہے ہیں بھلا وہ اس کتاب کو کیونکر خلعتِ قبولیت بخشتی! چنانچہ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ یہ (تجارب السلف) ہنوز غیر مطبوعہ پڑی ہوئی ہے، بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا ص ۴۱۳ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو حاشیہ بر تاریخ الفخری ص ۶۱۳ آئندہ۔ ۱۲ مترجم

صرف دو نسخے ہی دنیا میں باقی ہیں، ایک تو میرا نسخہ G. 3 تو ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں نقل کیا گیا اور دوسرا پیرس کے "کتب خانہ قومی" (Biblistheque Nationale) کا نسخہ[1] جس پر ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء-۱۸۸۵ء درج ہے۔

بعد کی بعض قابلِ ذکر فارسی تواریخ | گزشتہ چار صدیوں میں جو متعدد کتب تواریخ فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں ان سب کے نام گِنانا ایک خشک اور بے مزہ چیز ہے خاص خاص عہدوں پر جو تاریخیں ہیں ان میں سے مشہور ترین کتابوں کا صرف گزشتہ صفحات میں ذکر ہی نہیں ہوا ہے، بلکہ اس جلد کے پہلے حصے میں جا بجا ان کے اقتباسات بھی دیے جا چکے ہیں، مثلاً صفوۃ الصفا جس سے شیخ صفی الدین مورثِ اعلیٰ شاہانِ صفویہ کے حالات لیے

حاشیہ بر تاریخ الفخری:- ابتدا میں اسے اہلِ وارڈٹ (Ahlwardt) نے پیرس کے قلمی نسخے ۸۹۵ سے (حالیہ ۲۴۴۲) مرتب کرکے ۱۸۶۰ء میں گوتھا (Gotha) سے شایع کیا تھا۔ اسی کا ایک نسخہ بعد نظرِ ثانی ۱۸۹۵ء میں ایچ۔ ڈرن بورگ (H. Deren bourg) نے پیرس سے شایع کیا تھا، ان کے علاوہ کم از کم دو سستے اور اچھے مصری اڈیشن بھی نکل چکے ہیں۔ (Societe des Etudes Marocaines) کے اہتمام میں ۱۹۱۰ء میں پیرس سے ایمل آمر (Emil Amar) نے اس کا ایک فارسی ترجمہ بھی شایع کیا تھا۔ ۱۲ مصنف

[1] بلوشے کی فہرست مخطوطات فارسی وغیرہ (پیرس ۱۹۰۵ء) جلد اول صفحہ ۲۵۱ (شیفر ۲۳۲) (Pers. Supp. 1552) ۱۲ مصنف

گئے ہیں؛ شاہ اسمٰعیل کے عہد پر ایک تاریخ جس کا ذکر سر ای۔ ڈے نی سن راس (Sir E. Denison Ross) نے جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی بابت ۱۸۹۶ء صفحہ ۲۶۴ - صفحہ ۲۹۳ پر کیا ہے۔ حسن روملو کی احسن التواریخ جس کا سن تصنیف ۹۸۵ھ مطابق ۱۵۷۷ء-۱۵۷۸ء ہے، اسکندر منشی کی تاریخ عالم آرائے عباسی جو ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں لکھی گئی۔ ان کے علاوہ آخری دور صفویہ کے متعلق اور بھی تاریخیں موجود ہیں مثلاً فوائد الصفویہ (۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء-۱۷۹۷ء) اور تذکرۂ آل داؤد (۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء-۱۸۰۴ء)۔ بدقسمتی سے یہ دونوں مجھے دستیاب نہ ہو سکیں ورنہ میں ان سے ضرور استفادہ کرتا۔ زمانہ بعد صفویہ کے متعلق کئی اعلیٰ درجہ کے یورپی مصنفین کی تواریخ موجود ہیں جنھوں نے ہمیں ملکی مورخین سے کسی قدر بے نیاز کر دیا ہے، علاوہ بریں خود ایرانی مورخین میں سے بھی بعض کی تصانیف مثلاً تاریخ زندیہ[۱] اور مجمل التاریخ بعد نادریہ[۲] یورپ میں طبع ہو چکی ہیں اور بقیہ جیسے مرزا مہدی خان استرآبادی کی درۂ نادری کے لیتھو کے نسخے مشرقی ممالک میں بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کتابوں میں ہمیں قابل قدر تاریخی مواد مل جاتا ہے اور اس دور کے حالات کے مطالعہ کے لیے وہ ناگزیر ہیں، لیکن بدقسمتی سے ان کی عبارت مجموعی حیثیت سے خشک اور ترتیب ناقص ہے اور جن رنگین بیانیوں اور صنعت طرازیوں

۱۔ طبع Ernst Beer, Leyden. 1881. ۱۲ مصنف

۲۔ طبع Oskar Mann, Leyden. 1891. ۱۲ مصنف

کا ہم ابھی شکوہ کر رہے تھے، انھوں نے ان کی قدر و قیمت کو اور بھی کم کر دیا ہے۔

عام فارسی تاریخیں اکثر ادنیٰ معیار کی ہوتی ہیں | دور زیر بحث پر جو عام ایرانی تاریخیں لکھی گئی ہیں مثلاً خواندمیر کی حبیب السیر (۹۲۹ھ مطابق ۱۵۲۳ء) سے شروع کرکے رضاقلی خان کے ضمیمہ روضۃ الصفا اور لسان الملک کی ناسخ التواریخ تک اور خلدِ برین جو ان دونوں کے درمیانی زمانہ میں تصنیف ہوئی یعنی ۱۰۷۱ھ مطابق ۱۶۶۰ء-۱۶۶۱ء میں اور بہت کم یاب ہے۔ ان سب کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ اگرچہ ان واقعات کے اعتبار سے جو خود ان مصنفین کے زمانے میں گزرے ہیں، ان کی اہمیت مذکورہ بالا تواریخ سے کسی طرح کم نہیں ہے، لیکن سابقہ دوروں کے متعلق انھوں نے اتنا بھی نہیں کیا کہ جن مآخذ سے انھوں نے کام لیا ہے کم از کم ان کا انتخاب اور استعمال خوش سلیقگی سے کرتے اور ان کے اقتباسات اچھی طرح اور احتیاط سے نقل کرتے۔ علاوہ بریں، مذکورہ بالا جملہ تواریخ جمہور ایران کی تاریخیں نہیں ہیں، بلکہ ان بادشاہوں شاہزادوں اور امرا کی تاریخیں ہیں جو رعایا پر ظلم توڑتے اور مالِ غنیمت کے لیے آپس میں دست و گریباں رہا کرتے تھے۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ خوں ریزی، تشدد اور غارت گری کی بے مزہ داستانوں کی سی ہے جن سے اس زمانے کے اخلاقی اور معاشری معیار اخلاق کا کوئی اندازہ

نہیں ہوسکتا[۱]۔ اور وہ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل جن پر ابن خلدون کا جیسا کوئی مورخ نہایت کمال کے ساتھ قلم اُٹھاتا، افسوس ہے کہ ان کتابوں سے بہت کچھ محنت اور صبر آزما تلاش کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتے۔

زمانۂ جدید میں ترقی کے آثار تاہم زمانۂ حال میں اس فن میں ترقی کے کچھ امید افزا آثار نظر آتے ہیں۔ مرزا جانی کاشی اگرچہ بے چارہ تاجر پیشہ شخص تھا اور کچھ زیادہ ادبی قابلیت بھی نہیں رکھتا تھا، لیکن اس نے بابی فرقے کی تاریخ پر نقطاۃ الکاف[۲] لکھی ہے اور ۱۸۵۲ء میں اسی فرقے پر اس نے اپنی جان نثار کر دی۔ اگرچہ اُس کی کتاب میں ضرورت سے زیادہ جوش و خروش نظر آتا ہے تاہم وہ بہت کچھ عالمانہ اور سادہ اور سلیس زبان میں ہے اور اس میں وہ رنگین نگاری مطلق نہیں ہے جو ہم لوگوں کے ذوق پر اتنی گراں گزرتی ہے۔ اسی طرح سے ناظم الاسلام کرمانی کی غیر مکمل تاریخ بیداری ایرانیاں[۳]

---

[۱] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو مسٹر ونسنٹ اسمتھ (Vincent Smith) کی وہ نادر رائے جو انھوں نے اسی موضوع پر اپنی تاریخ اکبر بادشاہ میں لکھی ہے۔ ص ۳۸۶ تا ص ۳۸۷ ۱۲ مصنف

[۲] یہ کتاب ۱۹۱۰ء میں گب میموریل سیریز کی جلد ۱۵ کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ ۱۲ مصنف

[۳] یہ کتاب کئی حصوں میں لیتھو میں شایع ہو چکی ہے اور مجھے اس کے جو اجزا وصول ہوئے وہ حسب ذیل مواد پر مشتمل ہیں: ص ۲۷۳ صفحات کا ایک مقدمہ حصہ اول جو ۲۰ ذی قعدہ ۱۳۲۸ھ (۲۳ نومبر ۱۹۱۰ء) کو ختم ہوا اور جس میں ہجرت صفر ۱۳۲۷ تک کے واقعات کا بیان ہے۔ حجم ص ۲۵۶، اور حصہ دوم جو اواخر صفر ۱۳۳۰ھ (۱۸ فروری ۱۹۱۲ء) کو مکمل ہوا، حجم ص ۲۴۰ میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کی تکمیل کی امید کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ۱۲ مصنف

جس میں کثرت سے مستند حوالے موجود ہیں اور سیاسی حالات پر شخصی خصوصیات کے اثرات دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، میری رائے میں گزشتہ چھ یا سات صدیوں کی ہر ایرانی تاریخ سے بمراتب افضل و اعلیٰ ہے۔

۵۔ سِیَر۔ خود نوشتہ سوانح عمریاں اور سیاحت نامے

فن سِیَر مسلمانوں میں بہت عام ہے۔

مسلمان مصنفین ہمیشہ سے فن سِیَر کے زیادہ دلدادہ رہے ہیں۔ خواہ وہ ہر فن کے مشاہیر کی عام سوانح عمری ہو، جیسے ابن خلکان کی وفیات الاعیان یا روضات الجنات (جس سے میں نے اس جلد کے آخری حصّہ میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور جو دونوں عربی زبان میں اور علی الترتیب تیرھویں صدی اور انیسویں صدی عیسوی کے آخری حصّے میں تصنیف ہوئی تھیں) یا ان سے زیادہ بلند نظر، لیکن غیر مکمل نامۂ دانش وراں جسے تقریبًا چھ عالموں کی ایک انجمن نے تالیف کیا ہے اور جس کا پہلا حصّہ طہران میں ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں اور دوسرا ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء۔ ۱۹۰۵ء[1] میں لیتھو ہو چکا ہے۔ لیکن عمومًا اس قسم کی کتابوں میں کسی خاص طبقے کے افراد مثلاً وزرا، اطبا، علما یا شعرا کے حالات بیان کیے جاتے ہیں، یا پھر ان کی ترتیب جغرافی اور تاریخی ہوتی ہے، لیعنی ان کے

کتب سِیَر کے مختلف اقسام

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب Press and Poetry in Modern Persia PP. 163—166 ۱۲ مصنفنا

ڈانڈے ایک طرف علم جغرافیہ اور دوسری طرف تاریخ سے ملے ہوتے ہیں۔ خواندمیر کی کتاب جس کا تاریخی نام دستور الوزرا[1] ہر جس سے ۹۱۵ھ (مطابق ۱۵۰۹ء۔ ۱۹۱۰ء) برآمد ہوتا ہی، کتب سیر کی پہلی قسم میں داخل ہر اور جس دور کا حال ہم نے اپنی اس جلد میں لکھا ہی، اس کے ابتدای حصّے سے بحث کرتی ہی۔ جہاں تک اطبا اور فلاسفہ کی سوانح کا تعلق ہی، اب تک کوئی کتاب القفطی کی تاریخ الحکما[2] یا ابن ابی اصیبعہ کی عیون الانبا فی طبقات الاطبا[3] کے پلّے کی نہیں لکھی گئی ہی۔ یہ دونوں کتابیں تیرھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہیں جو عربی کتب سیر کی کثرت کے اعتبار سے اور سب صدیوں سے بڑھی ہوئی ہی۔ لیکن ان کے برخلاف، فارسی زبان میں شعرا کے تذکرے، خصوصاً آخری زمانہ میں جب سے شاہ اسمٰعیل کے لڑکے سام مرزا نے تحفۂ سامی لکھ کر (جو دولت شاہ کے تذکرۂ شعرا کا تتمہ ہی) اس کا فیشن قایم کیا، بکثرت تصنیف ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے فن سیر پر ایک اور نہایت مفید کتاب مجالس المومنین

---

[1] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم (ص ۳۳۵)۔ میرے پاس اس کا حال کا لکھا ہوا ایک اعلیٰ درجہ کا قلمی نسخہ موجود ہی جس کے متعلق کاتب کا دعویٰ ہی کہ اس کا مقابلہ اصل کتاب سے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء ۱۸۵۲ء) میں ہوچکا ہی۔ یہ میرے کتب خانے میں زیر نشان J.1.1 محفوظ ہی۔ مصنف

[2] مرتبہ پروفیسر جولیس لپّرٹ (Julius Lippert) (Leipzig, 1903) ۱۲ مصنف

[3] مطبوعہ قاہرہ دو جلد ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء۔ ۱۲ مصنف

ہے جس میں بادشاہوں سے لے کر شاعروں تک، غرض کہ ہر طبقے کے عرب اور ایرانی شیعہ مشاہیر کے حالات درج ہیں۔ اس کے مصنف سید نوراللہ شوستری تھے جنھیں بعض سُنّیوں کی سازش سے ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء۔ ۱۶۱۱ء) میں جہانگیر نے سزائے تازیانہ دے کر مروا ڈالا تھا اور جنھیں ان کے ہم مذہب شہید ثالث کہتے ہیں[۱]۔ قدیم طرز کی جغرافی اور سوانحی تصانیف کے دو اعلیٰ درجے کے نمونے زکریا ابن محمد، ابن محمود القزوینی کی آثار البلاد[۲] اور امین احمد رازی کی فارسی کتاب ہفت اقلیم[۳] (۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۹ء) ہیں۔ ایران کے مختلف شہروں اور صوبوں کے متعلق بھی بکثرت تصانیف موجود ہیں جن میں عام طور پر ان کے مشہور باشندوں کے حالات بھی درج ہیں۔ جو

روضات الجنات | کتب سوانح حال میں ایران میں تصنیف ہوئی ہیں اُن میں سے میں نے سب سے زیادہ استفادہ خصوصًا اس باب میں جو علمائے دین کے حالات میں ہے، عربی کتاب روضات الجنات

---

[۱] ریو (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم) ص ۳۳۷، ص ۳۳۵۔ ۱۲ مصنف

[۲] ف۔ وسٹن فیلڈ (F. Wustenfield) نے اسے مع اصل عربی کتاب کے ۱۸۴۸ء میں گوٹنگن سے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ اسی کے ایک سال بعد اسی مصنف کی عجائب المخلوقات بھی اڈٹ کی گئی۔

[۳] ہفت اقلیم میں سوانحی حصہ بہت غالب ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک تنقیدی اڈیشن مولوی عبدالمقتدر نے لکھنا شروع کیا تھا جس کے کم از کم میرے علم میں صرف ابتدائی اجزا (116 + PP. x) ۱۹۱۸ء میں کلکتہ میں چھپے ہیں۔ ۱۲ مصنف

فی احوال العلما والسادات سے کیا ہے۔ اس جامع تصنیف میں جو یقیناً
اس سے زیادہ شہرت اور تعارف کی مستحق ہے جو آج کل اسے حاصل
ہے، تقریباً ۷۴۲، متقدم و متاخر مسلمان علما اولیا اور شعرا کے حالات
درج ہیں۔ اس کے مرتب محمد باقر ابن حاجی امیر زین العابدین خوانساری
ہیں۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں تصنیف ہوئی
تھی۔ اس کا ایک اچھا لیتھو کا نسخہ جس میں حسب دستور فہرست
عنوانات کی کسر ہے، ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں طہران سے شائع ہو چکا
ہے۔ اس کتاب میں سوانح کی ترتیب ردیف وار ہے لیکن ردیف کی بہت
زیادہ پابندی ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے اور زیادہ تر حالات اصل اسما کے
ذیل میں لکھے گئے ہیں جیسے احمد، علی، محمد، وغیرہ۔ لیکن عموماً یہ لوگ ان
اسما کے علاوہ دوسرے ناموں سے زیادہ معروف ہیں، مثلاً محمد کے
ذیل میں جو چوتھی یعنی آخری جلد کے بیش تر حصہ پر حاوی ہے ۱۴۳
مشاہیر کے حالات لکھے گئے ہیں جن میں علما کے ذیل میں جید علمائے
دین جو عموماً الکلینی، ابن بابویہ، شیخ بہند وغیرہ کے ناموں سے معروف
ہیں؛ مورخین میں طبری اور شہرستانی؛ ماہرین علوم میں رازی اور بیرونی
مفکرین میں فارابی، غزالی اور محی الدین ابن العربی اور فارسی شعرا میں
سنائی، فریدالدین عطار اور جلال الدین رومی وغیرہم کے حالات دیے
ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے خود ان حصّوں کی مزید تقسیم میں تاریخی یکلوئی
اور ترتیب مدِنظر نہیں رہی ہے، غرض کہ اگر کوئی شخص اس کا باضابطہ
مطالعہ کرنا چاہے تو وہ اس پر مجبور ہوگا کہ پہلے اپنے طور پر اس کی
فہرست مضامین مرتب کرے۔

قصص العلما ایک اور کتاب جس سے میں نے علمائے دین کے حالات کے متعلق بہت کچھ استفادہ کیا ہے محمد ابن سلیمان تنکابونی کی فارسی تصنیف قصص العلما ہے جو ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں تصنیف ہوئی[1] اس میں تقریباً ۱۵۰ شیعہ علمائے دین کے سوانح ہیں۔ اور اگرچہ باعتبار صحت یہ روضات الجنات سے ادنیٰ درجے کی ہے لیکن دلچسپی میں اس سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور مفید فارسی کتاب نجوم السماء ہے جسے مرزا محمد علی نے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء۔ ۱۸۷۰ء میں تصنیف کیا[2]۔

نجوم السماء اور سوانح علما پر دوسری کتب

اس میں گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری (سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی) کے شیعہ علما کے حالات درج ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بحرین اور جبل عامل کے شیعہ علما کے حالات میں بھی دو مخصوص کتابیں موجود ہیں، یعنی لؤلؤۃ البحرین مصنفہ شیخ یوسف ابن احمد البحرانی جو اٹھارھویں صدی میں گزرا ہے اور دوسری محمد ابن حسن ابن علی ..... الحر العاملی کی امل الآمل فی علماء جبل عامل۔ یہ مصنف، مصنف لؤلؤۃ البحرین سے ایک صدی قبل ہوا ہے۔

اسی سلسلہ میں زمانۂ حال کی ایک اور مخصوص سوانح عمری کا بھی ذکر کرنا چاہیے جو اگرچہ ایک ایرانی کی تصنیف ہے، لیکن ترکی زبان میں ہے

---

[1] میرے پاس اس کے دو لیتھو کے نسخے موجود ہیں ایک تو طہران اڈیشن اشاعت دوم ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء اور دوسرا بظاہر آثار لکھنؤ سے ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۸۹ء میں شایع ہوا تھا ۱۲ مصنف

[2] یہ لکھنؤ میں ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء۔ ۱۸۸۶ء میں لیتھو ہو چکی ہے۔ ۱۲ مصنف

یعنی خط و خطاطان[1] جس میں فن خطاطی اور اس کے ماہرین کی تاریخ
خطاطان | دی ہوئی ہے۔ اس کے مصنف ایک لایق شخص مرزا حبیب
اصفہانی ہیں جن کی عمر کا آخری حصہ قسطنطنیہ میں جہاں وہ انجمن معارف
ترکی کے رکن تھے، بسر ہوا۔

خودنوشتہ سوانح | ان کی حیثیت صرف ان کتب سیر کے انتخابات
کی سی ہے جو ان سے زیادہ مفید یا کم معروف ہیں اور جن کی مذکورہ
بالا کتابوں کے علاوہ مزید فہرستیں ریو، ایتھے (Ethe) اور فارسی
مخطوطات کی دوسری فہرستوں میں نظر آتی ہیں۔ خود نوشتہ سوانح عمریوں
میں مشہور ترین شیخ علی حزیں کی کتاب ہے جس میں ۱۷۲۲ء کے حملہ
افغانان اور تسخیر اصفہان کے ایسے چشم دید حالات فراہم کیے گئے
ہیں جو دوسری کتابوں میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ یہ فارسی میں
ہے۔ سیاحت ناموں کی حیثیت بھی ایک قسم کی خود نوشتہ سوانح
سیاحت نامے | عمری کی سی ہوتی ہے۔ اعلیٰ حضرت ناصرالدین شاہ
مرحوم کو اس کا بہت شوق تھا۔ شاہ مرحوم کے اسٹاف کے ایک
صاحب مرزا حسین ابن عبداللہ نے اس وفد کے حالات لکھے ہیں
جو جنگ ایران و انگلستان کے خاتمہ پر (۱۸۵۷ء۔ ۱۸۵۹ء) بہ سرکردگی
فرخ خان امین الملک لندن و پیرس روانہ کیا گیا تھا۔ لیکن یہ
حالات ہنوز شایع نہیں ہوئے ہیں[2]۔ اس کے خاتمے پر فرانس کے

---

[1] اس کا ایک نہایت دیدہ زیب اڈیشن ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء۔۱۸۸۹ء
میں قسطنطنیہ سے شایع ہوا تھا۔ ۱۲ مصنف

[2] میرے پاس اس کا جو نسخہ K 7 ہے وہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

محکموں اور پبلک اداروں کا بھی کچھ حال لکھا گیا ہے۔ مذکورۂ بالا بستان السیاحات کتاب سے زیادہ اہم اور تنوع مضامین میں اس سے بڑھی ہوئی ایک اور تصنیف حاجی زین العابدین شیروانی کی بستان السیاحات[1] ہے جو ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء۔ ۱۸۳۲ء میں لکھی گئی۔ اسی مصنف نے سناخی کے عنوان سے جو مختصر سی آپ بیتی لکھی ہے، اس میں وہ اپنے متعلق لکھتا ہے کہ میں وسط شعبان ۱۱۹۴ھ (اگست ۱۷۸۰ء) میں پیدا ہوا اور پانچ سال کی عمر میں لوگ مجھے کربلا لے گئے جو اس وقت سے میرا وطن قرار پایا۔ اس نے عراق، گیلان، قفقاز، آذربائجان، خراسان، افغانستان، ہندوستان، کشمیر، بدخشان، ترکستان، ماوراء النہر، خلیج فارس، یمن، حجاز، مصر، شام، ایشیائے روم اور آرمینیا کی سیاحت کی اور خود ایران میں طہران، ہمدان، اصفہان، شیراز اور کرمان کی سیر کی۔ وہ شیعہ تھا اور شاہ نعمت اللہ کے سلسلے کا درویش بھی تھا، چنانچہ ان دونوں حیثیات کی وجہ سے

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) شہزادہ جہان مرزا بہاء الدولہ کے لیے نقل کیا گیا تھا اور سنتدڈ لرگ مخطوطات کے ساتھ میرے پاس پہنچا تھا۔ فرخ خان کے وفد کے متعلق ملاحظہ ہو ر۔ ج۔ واٹسن کی تاریخ ایران من ابتدا ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۵۸ء، ص ۴۲ الخ ۱۲ مصنف

[1] طبع طہران ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء۔ ۱۸۹۳ء ملاحظہ ہو ریو کی ضمیمہ فہرست ص ۹۹۔ ۱۰۱، ۱۳۶۔ ۱۲۰۔

اور ب۔ ڈارن (B Dorn) کا مضمون مندرجہ رسالہ Melanges et Extraits جلد سوم ص ۵۸۔ ۵۹۔ ۱۲ مصنف

اس کی دوستی اکثر مشاہیر علما اور عرفا سے ہوئی۔ وہ ایک ذہین اور زیرک مشاہدہ کرنے والا تھا، اپنی کتاب میں اس نے اپنی سیاحات کو سلسلہ وار بیان نہیں کیا ہے، بلکہ حسب ذیل عنوانات قایم کیے ہیں:۔

باب اول:۔ رسول کریم، ان کی صاحبزادی فاطمہ اور دوازدہ ائمہ کے حالات۔

باب دوم:۔ بعض علما، صلحا، فلاسفہ، شعرا اور اہلِ علم کے حالات ہیں۔

باب سوم:۔ مختلف فرقوں اور عقائد کے بیان ہیں۔

باب چہارم:۔ ایران، ترکستان، افغانستان، ہندوستان، اقصائے یورپ و چین، ترکی، شام اور مصر کے جن شہروں اور قصبوں کی سیاحت کی گئی ان کا جغرافی بیان۔ ان ناموں کی ترتیب ردیف وار ہے۔

سیر:۔ یعنی ترتیب بستان اور بعض متعلقہ امور کی تمہیدی بحث۔

گلشن:۔ جن ممالک و اشخاص کا بیان کتاب کا مقصد اصلی ہے ان کی ردیف وار فہرست عربی تہجی کے اعتبار سے ۲۸ حصوں میں۔

بہار:۔ جو چہار گلزار پر مشتمل ہے:۔

ا۔ دربارہ تعبیر خواب۔

ب۔ بعض مقامات کے نام جہاں مصنف نے دورانِ سیاحت میں قیام کیا۔

ج۔ مختلف قصص و حکایات۔

د۔ خاتمہ۔

اس کتاب میں متفرق سوانحی اور جغرافی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے اور چونکہ ترتیب عموماً ردیف وار ہے اور کتاب کے شروع میں ایک مبسوط فہرست مباحث بھی شریک کردی گئی ہے، اس لیے اس کے مواد تک ناظرین کی دسترس آسانی سے ہوسکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف میں شوق تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اگرچہ وہ یورپ نہیں جاسکا لیکن جہاں کہیں موقع ملا اس نے یورپی سیاحوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کی زبان سے ان کے ملکوں کے حالات وخصائص سنے۔ "فرہنگ" کے عنوان کے ماتحت (صفحہ ۳۸۵ - صفحہ ۳۸۶) اس نے خاص خاص یورپی اقوام کے خصائص سے بحث کی ہے اور فرانسیسیوں کو پہلے، آسٹرویوں کو دوسرے اور انگریزوں کو تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ اس نے مسٹر وکلیس[1] نامی ایک انگریز سے عظیم آباد میں ملاقات کی تھی اور ان سے جو مکالمہ ہوا اس کا طویل بیان لکھا ہے۔ وہ آسٹروی سفیر متعینہ قسطنطنیہ سے بھی ملا تھا جس نے اسے آسٹریا آنے کی دعوت بھی دی تھی، لیکن وہ لکھتا ہے:-

> "چونکہ اس ملک کے سفر سے کسی بڑے روحانی فائدہ کی امید نہ تھی اس لیے میں نے معذرت چاہی"

لیکن اس کا سب سے زیادہ قابلِ قدر اور مفید بیان وہ ہے جو اس نے ایشیا کے مختلف مذاہب اور فرقوں کا کیا ہے اور جس کے ضمن میں اس نے دوسرے مباحث کے علاوہ زرتشتیوں، مزدکیوں

---

[1] غالباً یہ ولکنس (Wilkins) کا مخرب ہے۔ ۱۲ مصنف

یہودیوں، عیسائیوں، ہنود، صوفیا اور غلات کا تذکرہ کیا ہے۔
جو لاجواب اور بے شمار کتب حوالہ، نیز تاریخی، سوانحی اور جغرافی تصانیف انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر اب تک ایران میں ہوئی ہیں، ان سب کا بیان کرنا اس موقع پر ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو قدیم عربی و فارسی تصانیف کی بنیاد پر تالیف کی گئی ہیں، یا ان کی تلخیص ہیں لیکن بعض میں ایسا قابلِ قدر جدید مواد بھی مل جاتا ہے جو کہیں اور میسر نہیں آتا۔ پس اس بعد کے زمانے کی ادبیات نیز ایران کی عصر جدید کی دنیائے کتب کی خصوصیات کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہیے۔

فارسی زبان کے یورپی محققین تاوقتیکہ وہ خود ایران میں نہ رہے ہوں، عموماً اپنی تمام تر توجہ فارسی مخطوطات ہی تک محدود رکھتے ہیں اور جب انھیں تاریخ ادبیات ایران پر کوئی معلومات مطلوب ہوتی ہے تو وہ ڈاکٹر ریو کی مرتبہ لاجواب فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سے ایران میں مطابع قایم ہوئے اور پتھر کی چھپائی کا کام شروع ہوا خصوصاً ۱۸۸۰ء کے بعد سے، مطبوعات کے مقابلے میں مخطوطات کی اہمیت بتدریج کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اہم ترین تصانیف یا تو اصل نسخہ سے لیتھو کرلی جاتی ہیں یا پھر ٹائپ پر چھالی جاتی ہیں۔ اس مطبوعہ اور لیتھو ادبیات پر اب تک اتنی توجہ نہیں کی گئی ہے جتنی کہ قلمی ادبیات پر اور زمانۂ حال کی ان تصانیف

اور مصنفین کے متعلق کوئی فوری یا صحیح معلومات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ مسٹر اڈورڈ (Edward) کی "فہرست مطبوعات فارسی برٹش میوزیم"[1] کی وجہ سے اس میں شک نہیں کہ سابقہ کام میں بہت کچھ اضافہ اور ترقی ہوئی ہے، لیکن اس میں جو حالات درج ہیں وہ لامحالہ بہت مختصر ہیں، مصنفین کے حالات عموماً نہیں ملتے اور ان کی نوعیت کے متعلق جو اشارات نظر آتے ہیں وہ قدرتی طور پر بہت مجمل اور تشنہ ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس چیز کی ہے کہ گزشتہ صدی میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں، یا خاص ایران میں لیتھو یا طبع ہوئی ہیں ان کی ایک ترتیب وار اور مفصل فہرست مرتب کی جائے۔ ایرانی مطبوعات کی تخصیص اس وجہ سے کی گئی کہ (حسب ذیل وجوہات کی بنا پر) ترکی، مصری اور ہندوستانی مطبوعات سے واقف ہونا نسبتہً زیادہ آسان ہے:-

واقعہ یہ ہے کہ فارسی کتب کی تجارت بہت کچھ انتشار اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ ایران میں نہ تو دقیع ناشرین ہی ہیں اور نہ اچھے کتب فروش۔ کتابوں کی فہرستیں تو شایع ہی نہیں ہوتیں۔ اکثر کتابوں کی نہ تو قیمت مقرر ہوتی ہے اور نہ اُن کی جائے فروخت کا کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔ بہت سی کتابوں میں صفحات کے نمبر تک درج نہیں ہوتے اور فہرست مباحث یا اشاریہ (Index)

[1] لندن ۱۹۲۲ء مشتمل ۹۶۸ کالم۔ اس میں تصنیفات کی ترتیب مصنفین کے ناموں کے تحت کی گئی ہے لیکن اسما اور مباحث کی فہرستیں بھی شریک کر دی گئی ہیں۔ ۱۲ مصنف

تو شاذ و نادر ہی کسی کتاب میں ہوتے ہیں۔ ایسا اوقات یہ ہوتا ہی کہ ایسی کتابیں جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوتی ہیں، جیسے جیسے لکھی جاتی ہیں، ویسے ویسے ان کی تقطیع، شکل و صورت، ترتیب، حتیٰ کہ موضوع بھی بدلتا رہتا ہی اور اکثر تو مصنف کا لقب بھی بدل جاتا ہی۔ مثال کے طور پر ہم ان متعدد کتب حوالہ میں سے جو مرزا محمد حسن خان کے نام سے چھپی ہیں صرف ایک کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ صاحب یکے بعد دیگرے صنیع الدولہ، مؤتمن السلطان اور اعتماد الدولہ کے القاب سے مشہور رہ چکے ہیں اور حاجی علی خان مراغی کے صاحبزادے تھے، جن کا لقب پہلے حاجب الدولہ تھا اور بعد کو اعتماد السلطنۃ ہوا۔ سب سے پہلے تو یہی امر مشتبہ ہی کہ صنیع الدولہ ان کتابوں کے مصنف تھے بھی یا نہیں۔ عام طور پر تو یہی کہا جاتا ہی کہ وہ چند غریب عالموں سے بجبر کتابیں لکھواتے اور ان کے مصنف بن جاتے تھے[1] یہ دونوں حرکتیں جتنی نازیبا ہیں، محتاج بیان نہیں۔ پہلی خطا کے لیے تو خیر کچھ عذر بھی ہوسکتا ہی، لیکن دوسری حرکت تو سراسر واجب التعزیر ہی۔ ہاں تو ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں انھوں نے فارسی میں مراۃ البلدان کے نام سے ایرانی شہروں اور قصبوں کی ایک جغرافی فرہنگ مرتب کی جو اکثر و بیشتر یاقوت کی مشہور عربی تصنیف معجم البلدان سے ماخوذ تھی۔ اس میں آ سے ت تک ردیفیں تھیں۔ بظاہر آثار یہ معلوم

[1] ملاحظہ ہو میری تصنیف Press and Poetry in Modern Persia P 164—166 ۱۲ مصنف

ہوتا ہی کہ اس جلد کے دو اڈیشن نکلے ہیں ایک تو وہ جو تبریز کے حال پر ختم ہوتا ہی اور اس کا حجم ۳۸۸ صفحات ہی، دوسرا اڈیشن اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں نکلا، اس میں طہران تک کے حالات ہیں اور حجم ۶۰۶ صفحات ہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ط کی ردیف میں طہران تک پہنچنے کے بعد مصنف جغرافیہ سے اُکتا گیا اور اب اس کے بعد اس نے بادشاہ وقت یعنی ناصرالدین شاہ کی تاریخ شروع کردی ہی اور بقیہ جلدوں میں سے ہر ایک کے خاتمے پر سال رواں کی جنتری اور دربار نامہ (Court Directory) شامل کردیا ہی۔ پس جلد دوم کے ۲۹۵ صفحات شاہ کے ابتدائی پندرہ سالہ عہدِ حکومت کے حالات میں ہیں اور ۵۴ صفحوں میں سن طباعت یعنی ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء کی جنتری دی ہوئی ہی۔ جلد سوم بھی اسی نہج پر مرتب کی گئی ہی، یعنی اس کے ۲۶۴ صفحات میں شاہ کے عہدِ حکومت کے سولھویں سال سے لے کر بتیسویں سال تک کے حالات ہیں اور پچاس صفحات میں جنتری یا سال نامہ ہی۔ لیکن یہاں تک پہنچنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مصنف کو اپنے ابتدائی خاکے کا پھر خیال آگیا ہی۔ چنانچہ جلد چہارم میں اس نے پھر جغرافیہ شروع کردی ہی اور ت اور ج کی ردیفیں ختم کی ہیں، لیکن یہاں سے وہ پھر تاریخ کی طرف متوجہ ہوگیا ہی اور سن تصنیف (۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء) کے حالات بیان کرکے پھر جنتری لکھ دی ہی اور گویا تاریخ اور جغرافیہ کے اس قران السعدین کی تقریب میں چوتھی جلد میں

تقطیع ۱/۲ ۱۰ × ۳/۴ ۶ کی بجائے ۱/۲ ۱۳ × ۱/۴ ۸ کردی گئی ہے۔

چوتھی جلد ختم کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف مراۃ البلدان سے اکتا گیا ہے، اس لیے کہ ایک سال کے وقفہ کے بعد اس نے ایک دوسری ہی کتاب منتظم ناصری شروع کردی اور ۱۲۹۸ھ سے ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۱ء تا ۱۸۸۳ء) تک اس کی بھی تین جلدیں شائع ہوئیں۔ میرے پاس ان میں سے صرف پہلی اور تیسری جلد ہے۔ پہلی جلد میں ۱ھ سے ۶۵۶ھ (۶۲۲ء۔ ۱۲۵۸ء) تک کی اسلامی تاریخ یعنی تاریخ خلافت (ص ۳۔ ص ۲۳۹) لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد ان خاص خاص واقعات کا بیان ہے جو اس سال شمسی میں یا من ابتداء مارچ ۱۸۸۰ء ایران اور یورپ میں پیش آئے (ص ۲۳۹۔ ص ۲۵۶) اور آخر میں حسب دستور، جنتری اور دربار نامہ شریک کردیا ہے (۵۴ صفحات)۔ تیسری جلد میں ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) سے ۱۳۰۰ھ ہجری (۱۸۸۲ء) تک حکمران خاندان یعنی قاچاریہ کے حالات ہیں (ص ۳۲۔ ص ۳۳۵) اور ۱۳۰۰ھ کی جنتری ہے۔

مطلع الشمس | اس کے دوسرے سال مصنف نے تین جلدوں کی ایک اور تصنیف مطلع الشمس شروع کی جس کے شروع میں مراۃ البلدان کو غیر مکمل چھوڑ دینے کی معذرت بھی کی ہے۔ لیکن وہ لکھتا ہے کہ چونکہ خراسان جو ایک نہایت اہم صوبہ ہے، خ سے شروع ہوتا ہے اور اعلیٰ حضرت ناصرالدین شاہ جن کا میں جاں نثار خادم ہوں اور جن کے نام پر یہ اور دوسری کتابیں معنون ہیں، حال میں روضۂ مبارک امام علی رضا واقع مشہد کی زیارت کے سلسلے میں اس صوبہ کا

سفر کر چکے ہیں، اس لیے میں نے نیت کرلی ہے کہ یہ کتاب اسی صوبہ (خراسان) کے حالات کے لیے وقف کردی جائے اور چونکہ وہ شرق میں واقع ہے اس لیے کتاب کا نام مطلع الشمس رکھا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی جلد میں جو سنہ ۱۳۰۱ھ مطابق سنہ ۱۸۸۴ء میں شایع ہوئی، مصنف نے براہ دماوند، فیروز کوہ، بسطام، بجنورد اور قوچان مشہد تک کے راستہ کا حال لکھا ہے اور ان میں سے ہر مقام، نیز درمیانی منزلوں کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ دوسری جلد میں جو سنہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں شایع ہوئی، مشہد اس کے آثارِ قدیمہ سنہ ۴۲۶ھ سے سنہ ۱۳۰۲ھ (سنہ ۱۰۳۶ء۔ سنہ ۱۸۸۵ء) تک اس کی تاریخ اور وہاں کی خاک سے پیدا ہونے والے مشاہیر کے حالات لکھے ہیں اور ایک پورا رسالہ امام ہشتم علی رضا رہ کے حالات میں لکھا ہے، خاتمے پر مشہد کی مسجد کے کتب خانے کی ایک فہرست بھی شریک کردی ہے جو نہایت ضروری اور قابل قدر ہے۔ ان جغرافی حالات کے بیچ بیچ میں مصنف نے شاہ طہماسپ کا خود نوشتہ روزنامچہ بھی نقل کردیا ہے (ص۱۶۵ - ص۲۱۶) جس سے ہم نے کسی گزشتہ باب میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے[1]۔ تیسری جلد میں جو سنہ ۱۳۰۳ھ مطابق سنہ ۱۸۸۶ء میں چھپی ہے، زائرین کے مقررہ راستہ یعنی نیشاپور، سبزوار، شاہ رود دامغان اور سمنان ہوتے ہوئے شاہ کی مراجعت کا ذکر کیا گیا ہے اور ان سب مقامات نیز درمیانی منازل کے تفصیلی بیانات اور ہر مقام کے ضمن میں وہاں کے مشاہیر کے حالات درج کیے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو ص۸۷ - ۱۲ مصنف

ہر جلد کے خاتمے پر سال رواں کی جنتری اور دربارنامہ شریک کردیا ہے، بے انصافی ہوگی اگر اس موقع پر یہ نہ بتادیا جائے کہ ہر جلد کے آخری صفحے پر اس کی قیمت : ۱۲ قران : لکھی گئی ہے جو تقریباً آج کل کے سات شلنگ کے مساوی ہے۔

اسی مصنف کی دوسری کتابیں اس کے بعد ہمیں محمد حسن خان کی متعدد تصانیف میں سے ہر ایک کے خاتمہ پر سال رواں کی جنتری ضرور شریک نظر آتی ہے جس کے صفحات کا سلسلہ اصل کتاب سے الگ ہے۔ مشہور مسلمان خواتین کی سوانح میں اس نے جو کتاب "خیرات حسانؑ"، ۱۳۰۴ھ-۱۳۰۷ھ (۱۸۸۶ء-۱۸۸۹ء) تک تین جلدوں میں لکھی ہے، اس میں سالنامہ شریک نہیں ہے۔ لیکن کتاب المآثر والآثار میں جو ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء-۱۸۸۹ء میں شایع ہوئی، ہمیں پھر جنتری شریک نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ناصرالدین شاہ کے چہل سالہ عہدِ حکومت کی یادگار واقعات کا دفتر ہے اور جو حضرات سن تصنیف یعنی ۱۸۸۸ء-۱۸۸۹ء تک ایران کی تاریخ علم الرجال اور ایران جدید کے ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کے لیے بہت مفید اور قابلِ قدر ہے۔

حکیم کی گنج دانش مصنف مذکور کی طرح ایک اور مصنف محمد تقی خان المعروف بہ حکیم کو بھی ایک جغرافی فرہنگ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا، چنانچہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء-۱۸۸۸ء میں اس نے گنج دانش کے نام سے بڑی تقطیع کے ۷۴۵ صفحات پر ایرانی مقامات کے اسما کی ایک مکمل قاموس مرتب کی۔ اس کتاب کی ایک قابلِ قدر

خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے شروع میں ان اسناد اور کتب کی ایک طویل فہرست بھی شریک کر دی ہے جن سے اس نے اپنی اس تالیف میں مدد لی ہے۔ اس فہرست میں کئی یورپی تصانیف، نیز چند قدیم یونانی کتابیں بھی ہیں۔

فارسی کی یہ لیتھو کی کتابیں اپنی خامیوں کے باوجود عام طور پر پڑھنے میں دلچسپ، اچھی لکھی ہوتی، عمدہ جلد کی اور اعلیٰ درجے کے کاغذ پر چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مثلاً مرزائے سنگلاخ کی خط و خطاطان اور مثنوی کا وہ اعلیٰ درجے کا اڈیشن جس میں کشف الابیات بھی شریک ہے جو علاء الدولہ سے منسوب کی جاتی ہے، حقیقتاً بہت دیدہ زیب کتابیں اور تقریباً سب کی سب ہندوستانی لیتھو کی کتابوں سے عموماً کہیں زیادہ اچھی ہوئی ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یورپ میں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ طہران، تبریز اور شاید اصفہان کے باہر یہ کتابیں بہت مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ خود برٹش میوزیم کا ذخیرہ ابھی بہت کچھ تکمیل طلب ہے اور میرا فراہم کردہ ذخیرہ بھی جس کی ابتدا ایران میں کتابوں کی خرید سے ہوئی[1] اگر کسی قابل ہے تو محض اس وجہ سے کہ مجھے فارسی کے دو مشہور کتب خانوں سے اس میں کئی نسخوں کے اضافے کا موقع ملا ہے یعنی ایک تو مرحوم ایم۔ چارلس شےفر (M. Charles Schefer)

---

[1] میں نے ۱۸۸۸ء کے موسم خزاں میں جو کتابیں ایران میں خریدی تھیں ان کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب Year among the Persians صفحہ ۵۵۴۔ ۵۵۵ ۔ ۱۲ مصنف

کا کتب خانہ اور دوسرا مرحوم سر ا۔ ہوتم شنڈلا (Sir A Houtam Schindler) کا ذخیرہ۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، ایرانی علم و ادب کی بہترین خدمت یہی ہوسکتی ہے کہ ان لیتھو شدہ نسخوں کی ترتیب وار فہرست تیار کی جائے، ان کا پورا پورا بیان کیا جائے اور ایسی تدبیریں کی جائیں کہ وہ یورپ کے کتاب فروشوں کے یہاں مل سکیں۔ چونکہ لیتھو کی طباعت بہت کم سازوسامان کے ساتھ ہوسکتی ہے اور اس میں اعلیٰ درجے کی صنعتی مہارت یا صرف کثیر کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے غیر مستطیع عالم اور کتابوں کے شوقین لوگ اکثر اسی سے کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ بہت کم نسخے چھپواتے ہیں، جو بہت جلد ختم ہوجاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمیابی اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے ان کی کتابیں بجائے مطبوعات کے قلمی نسخوں کا حکم رکھتی ہیں[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو میری تصنیف Year among the Persians

صفحہ ۱۵۵۔ ۱۲ مصنف

باب دہم

جدید ترین حالات

(۱۸۵۰ء سے اب تک)

عوامل و موثرات تجدّد صفحاتِ گزشتہ میں میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاچاریہ کے زمانے میں اور خصوصًا انیسویں صدی عیسوی کے نصف سے، ادبیات نظم و نثر دونوں میں ایک طرح کی نشاۃ ثانیہ نظر آتی ہے اور ان کا زوال پذیر ہونا تو درکنار امر واقعہ یہ ہے کہ جو بلند معیار ہمیں آج نظر آتا ہے وہ گزشتہ چار صدیوں میں جن سے ہم نے اس جلد میں بحث کی ہے، انھیں ہرگز نصیب نہ ہوا تھا۔ اب ہمیں زمانۂ حال کی ان تین چار تازہ تبدیلیوں پر غور کرنا چاہیے جو بقول مرزا محمد علی خان تربیت کے (جو میری کتاب Press and Poetry in Modern Persia کے اصلی مصنف ہیں) زیادہ تر "موثرات تجدد در اخبارات ایران غیر از رسائل و جرائد" کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ ان موثرات میں انھوں نے سب سے زیادہ اہم

دارالفنون ان مختلف درسی علمی کتابوں کو قرار دیا ہے جو ۱۸۵۱ء کے بعد سے طہران کے دارالفنون، دارالحرب اور دارالسیاسیات کے متعدد یورپی اساتذہ نے تالیف کیں یا اپنی نگرانی میں تیار

کرائی ہیں۔ علیٰ ہٰذا اُنھوں نے ان عام دلچسپی کی یورپی خصوصاً فرانسیسی کتب کے فارسی تراجم کا بھی ذکر کیا ہے جو ایرانیوں کی یورپ اور وہاں کی زبانوں کے ساتھ گہری دلچسپی کی وجہ سے کیے گئے ہیں، مثلاً مولیر (Moliere) کے بعض ڈراموں یا جولس ورن (Jules Verne) کی ناولوں کے ترجمے۔ انھوں نے ان تراجم نیز ایسی تمام فارسی تصانیف کی جو اس نئی فضا میں ہوئیں، ایک فہرست بھی دی ہے جس میں ۱۶۲ نام ہیں۔ اور ہر اس شخص کے لیے جسے ان باتوں سے دلچسپی ہو، اس فہرست کا مطالعہ ضروری ہے۔ ۱۹۰۶ء کے انقلاب کی وجہ سے صحافت میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے اور اس سے فنِ طباعت میں جو سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں، انھوں نے اس تحریک کو اور پُر زور بنا دیا تھا۔ اگرچہ ان مصائب اور مشکلات کی وجہ سے، جن کا سامنا ایران کو جنگِ عظیم کے دوران میں کرنا پڑا، اس کا اثر کم زور پڑ گیا تھا لیکن آج کل اس میں پھر روز افزوں قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ حسبِ ذیل تین عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ڈراما (تمثیل) افسانہ یا ناول (رومانؔ[1]) اور پریس۔ ان میں سے پہلے دو عنوانات پر ہمیں کچھ زیادہ نہ کہنا پڑے گا۔

ڈراما یا تمثیل

ڈراما | خالص ایرانی الاصل تمثیل صرف ایک ہی قسم کی ہے، یعنی

[1] یہ انگریزی لفظ Romance کی تفرلیس ہے ۱۲ مترجم

عزائے محرم کی تمثیلیں، یا شبیہیں، جنھیں انگریزی میں Passion Plays (جذباتی کھیل) کہتے ہیں اور جن کا ذکر ہم کسی گزشتہ باب میں کر چکے ہیں[1]۔ لیکن ان کے متعلق بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ یورپی اثرات سے بالکل بے نیاز ہیں۔ مولیر کے کم از کم تین ڈراموں کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہے۔ یعنی

مولیر کے ترجمے

Le Medicin Malgre Lui [2]

اور[3] Le Misanthrope اور تیسرا جس کا فارسی عنوان "خر" ہے اور جو شاید L' Etourdi کا ترجمہ ہے۔ لیکن یہ تراجم بہت کم یاب ہیں اور غالباً کچھ زیادہ مقبول بھی نہیں ہوتے۔ میرے پاس صرف Le Misanthrope کا ترجمہ ہے جو قسطنطنیہ کے مطبع تصویر الافکار میں چھپا تھا (۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء۔۱۸۷۰ء) اس کا ترجمہ گزارش مردم گریز کے نام سے کیا گیا ہے۔ افراد قصہ کو ایرانی لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ منظوم ہے اور اصل کی بہت کچھ پابندی ملحوظ رکھی گئی ہے، صرف کہیں کہیں فرانسیسی محاوروں اور ضرب الامثال کی بجائے ہم معنی ایرانی محاورے اور ضرب الامثال رکھے گئے ہیں مثلاً اصل کتاب سے

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ہذا کا صفحہ ۱۶۹ تا صفحہ ۱۷۵ ۔ ۱۲ مصنف

[2] اس کا فارسی ترجمہ طبیب اجباری کے عنوان سے ہوا ہے۔ ۱۲ مترجم

[3] اس کا اردو ترجمہ محمد عمر اور نور الٰہی صاحبان (لاہور) نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ "بگڑے دل" کے عنوان سے کیا ہے، فارسی میں اس کا ترجمہ گزارش مردم گریز کے عنوان سے ہوا ہے۔ ۱۲ مترجم

«Ville chanson» Act i, Scene 2 کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے جو لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ مطلب اپنے لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔

اصل فرانسیسی کا لفظی ترجمہ[1]

اگر بادشاہ نے مجھے دیا ہوتا اپنا بڑا شہر پیرس اور اس کے معاوضہ میں میرے لیے ضروری ہوتا کہ اپنے معشوق کی محبت سے دست بردار ہو جاؤں تو میں شاہ ہنری سے کہتا "اپنا پیرس اپنے پاس رکھو" مجھے اپنے معشوق سے اس سے زیادہ الفت ہے، مجھے اپنے معشوق سے اس سے زیادہ الفت ہے"

فارسی ترجمہ

گر بیک موئے ترکِ شیرازی بدہد پادشہ یمن شیراز
گویم اے پادشاہ گرچہ بود شہر شیراز شہرِ بے انباز
ترکِ شیراز کافی است مرا شہرِ شیراز خویش بستاں باز

ذیل میں دوسرے ایکٹ کے ساتویں سین کا فارسی ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔ ناظرین اگر اس کا مقابلہ اصل سے کریں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ مترجم نے کیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ افراد قصہ یہ ہیں:۔
مونس (Alceste)؛ فاطمہ (Celimene)

---

[1] اس فرانسیسی ٹکڑے کا ترجمہ اردو میں ہمارے محترم دوست خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج نے کیا ہے ۱۲- مترجم

لیلیٰ (Eliante) ؛ ناصح (Acaste) ؛ نعیم بیگ (Philinte)
اور فراش (un garde de la Marechaussee)
سوار پولیس کا ایک سپاہی)

مونس (بہ پیش فراش می رود) . . . . . چہ ہست فرمایش ؟
بیا بہ بینیم۔

فراش۔ . . . . دارم دو حرف یا سرکار۔

مونس۔ تواں دو حرف خودت را کنی بلند اظہار۔

فراش رئیس دیوان آں راکہ بندہ ام فراش
مرا بدست بد اودست حکم حاضر باش
بتو. . . . .

مونس۔ بکہ ؟ بمن ؟

فراش . . . . آرے بتو۔

مونس . . . . براے چہ کار۔

فراش۔ بحرف مفت (امیدی) و حضرتِ سرکار۔

فتینہ بہ ناصح۔ . . . چساں ؟

ناصح۔ . . . . اسیدی و او گزشتہ اند دست وبغل
بچند شعر کہ نگذاشتہ است وقع ومحل
کنوں زپیش بخواہند بست دارہ کار۔

مونس: من ومداہنہ ، ہرگز نمی کنسم اقسرار۔

ناصح: ولیک حکم چنیں رفتہ ہیں بجنب از جا

مونس: میان ما چہ بخواہند داد صلح وصفا

بحکم ہائے بزرگاں مگر بود تنسیق
کہ شعر ہائے بدِ مردماں کنی تصدیق
از آنچہ گفتہ ام انکار نیست زاں مرجو
بداست ہر چہ بخواہی

ناصح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ولیک مضمون نو
مونس :۔ نمی تواں گزرم شعرہا پرو پوچ است
ناصح :۔ قبول رائے تو خواہند وجائے خواہش است
پرودہ!

مونس: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میروم اما نمی تواں ابدا
زرائے خویش بگردم

ناصح :۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برو تو خود بما
مونس :۔ مگر بحکم شہے خاص گردد و منسوب
کہ شعر ہائے ستیزیدہ یافت باید خوب
وگرنہ فاش بگویم کہ شعر ہاش بدند
ببایدہ ایں کہ چنیں شاعراں بدارکشند
(بہ لقمان بگ و نعیم بگ ہمی کہ دیدہ می خندند)
حقیقتاً کہ چنیں سخرہ ہم نبود گماں
کہ بودہ باشم وہستم یکان!

ناصح : ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رواں شوہاں!
فتینہ: کجا شمارا باید۔
مونس: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روم ولے دردم
بیایم ایں جا تاکش مکش برم ازہم

میرے پاس جو نسخہ ہے اس کے سر ورق سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مترجم کون شخص اور نہ اس میں کسی قسم کا مقدمہ، تمہید وغیرہ ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولیر کے ڈرامے کا یہ فارسی ترجمہ شایع ہوا (۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء - ۱۸۷۰ء) اسی سال احمد وفیق پاشا نے اس فرانسیسی مصنف کے تین ڈراموں George Dandin;

Le Medicin Malgre Lui

اور Le Mariage Force کے ترکی ترجمے شایع کیے[۲]۔ اسی مصنف کے ایک اور ڈرامے Tartufe کا ترجمہ بھی کچھ زمانہ بعد ہوا[۳]۔

مرزا جعفر قراجہ داغی کے ڈرامے ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں طہران سے فارسی کے سات ڈراموں کا ایک مجموعہ شایع ہوا تھا جس کے شروع میں مرزا جعفر قراجہ داغی نے ایک مقدمہ ڈراموں کی تعلیمی اہمیت پر لکھا تھا۔ یہ ڈرامے اصل میں مرزا فتح علی دربندی نے آذر بائیجانی ترکی میں لکھے تھے اور طفلس سے ۱۸۶۱ء میں شایع کیے تھے۔ ان میں سے حسب ذیل پانچ شرح، حواشی اور اکثر صورتوں میں ترجمے کے ساتھ یورپ میں دوبارہ چھپ چکے ہیں:-

---

[۱] میں نے بعض ترمیمات کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ نکاح بالجبر (۱۹۲۶ء) کے نام سے کیا ہے جو انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شایع ہوا ہے۔ ۱۲ مترجم

[۲] ملاحظہ ہو گِب (Gibb) کی تاریخ ادبیات عثمانی جلد پنجم صفحہ ۱۲۔ ۱۲ مصنف

[۳] ملاحظہ ہو گِب (Gibb) کی تاریخ ادبیات عثمانی جلد پنجم صفحہ ۹ حاشیہ ۱۔ ۱۲ مصنف

(۱) وزیر لنکران مع اصل، ترجمہ، فرہنگ الفاظ و حواشی از و۔ ہ۔ ڈ ہے گارڈ (W. H. D. Haggard) و ج۔ لی۔ اسٹرینج (G. Le Strange)(طبع لندن ۱۸۸۲ء)

۲) تین بزمیہ ڈرامے مترجمہ از آذربائجانی ترکی در فارسی مع فرہنگ و حواشی از س۔ باربیرے نارڈ (C. Barbiere Maynard) و س گویارڈ (S. Guyard) طبع پیرس ۱۸۸۶ء (فرانسیسی زبان میں) (۳) موسیوژوردان (Mousieur Jourdan) مع ترجمہ حواشی وغیرہ مرتبہ ا۔ واہرمنڈ (A. Wahrmund) (طبع وائنا ولائی پزگ ۱۸۹۹ء)

نمبر(۲) میں جو تین بزمیہ ڈرامے ہیں ان کے اصل عنوانات یہ ہیں "خرس قلدور باسان" (چور پکڑنے والا ریچھ)، "وکلاء مرافعہ" اور "ملّا ابراہیم خلیل کیمیا گر"۔ بقیہ دو ڈرامے جو اب تک یورپ میں نہیں چھپے ہیں یہ ہیں:۔ مرد خسیس و یوسف شاہ سراج[۱]۔

---

[۱] ملّا ابراہیم خلیل کیمیاگر کا ترجمہ G. Le Strange نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل بابت ۱۸۸۶ء (ص ۱۰۳۔ ص ۱۲۶) میں اور یوسف شاہ سراج کا انگریزی ترجمہ کرنل۔ ای۔ راس (E. Ross) نے اس رسالے کے ص ۵۳۷۔ ص ۵۶۹ پر کیا تھا۔ یہ اصل فارسی ڈرامہ ای۔ سل (E. Sell) نے ۱۸۸۹ء میں مدراس سے شایع کیا تھا۔ ملاحظہ ہو اڈورڈ کی فہرست مطبوعات فارسی برٹش میوزیم (۱۹۲۲ء) کالم ۲۰۷، ۲۰۸۔ ۱۲ مصنف

پرنس ملکم خان کے تین ڈرامے | پرنس ملکم خان مرحوم سابق سفیر ایران متعینہ لندن نے بھی تین ڈرامے لکھے ہیں جن کا سن تصنیف مجھے معلوم نہیں، لیکن ان کے کچھ اجزا تبریز کے اخبار اتحاد میں ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں "پاورق" کے طور پر چھپے تھے۔ مشہور زمانہ جرمن مدبر اور عالم ڈاکٹر ف۔ روزن (F. Rosen) کے کتب خانے کے نسخوں سے مدد لے کر چاپ خانہ شرکت کاویانی برلن نے ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء ۱۹۲۲ء میں ان کا ایک مکمل اڈیشن شایع کیا ہے۔ ان کے عنوانات یہ ہیں "گزارش اشرف خان حاکم عربستان در زمانہ قیام طہران (سن تصنیف ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء)؛ "طریق حکومت زمان خان بروجردی (۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء۔ ۱۸۲۱ء)؛ "شاہ قلی مرزا بکربلا می رود و روزے چند در کرمان شاہ با حاکم شاہ مراد مرزا بسر می کند۔"

اخبار تیاتر | ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں طہران سے ایک اخبار تیاتر (تھیٹر) نکلا تھا جو ہفتہ میں دو مرتبہ شایع ہوتا تھا اور جس میں ایسے ڈرامے نکلتے تھے جن میں دورۂ استبداد پر حملے کیے جاتے۔ میرے پاس اس کے صرف چند نمبر ہیں جن میں ایک ڈرامے کے بعض حصے چھپے تھے۔ اس ڈرامے کا عنوان "شیخ علی مرزا حاکم ملائیر و ترکستان وکتخدائی او با دختر شاہ پرستان" تھا

فارسی ڈراموں میں میری نظر سے اب تک صرف یہی گزرے ہیں[۱]

---

[۱] اس حصہ کے لکھنے کے بعد مجھے ایک اور مختصر سا ناٹک "جعفر خان از فرنگ آمدہ" دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کے مصنف حسن مقدم ہیں یہ طہران میں چھپا ہے اور اب سے دو سال پہلے وہاں کھیلا بھی جا چکا ہے۔ ۱۲ مصنف

یہ سب کے سب بزمیہ ڈرامے (کومیڈی) ہیں اور سب میں ایران کے انتظامی اور معاشرتی حالات پر چوٹیں کی گئی ہیں۔" وزیر لنکران" میں ایک بے کیف اور معمولی عشقیہ قصّے کو طنز اور ہجو کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے، لیکن عشق و محبت کا عنصر اس میں بہت کم ہے اور مصنف کا مقصد اس کے لکھنے سے یہ تھا کہ ایران کے پُرانے حکومت کے طریقوں کے خلاف عوام میں عام طور پر نفرت اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ بالفاظ دیگر "سیاحت نامہ ابراہیم بیگ" کی طرح جس کا ذکر ہم ابھی کریں گے، یہ سب ڈرامے نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیاسی رسالے ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی اسٹیج پر کھیلا گیا ہو اور تاثیر کے اعتبار سے ان میں سے ایک بھی اس اعلیٰ درجے کے ترکی ڈرامے "وطن یا خود سلسترا"[1] کی ٹکّر کا نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ ایران میں ابھی ڈرامے کو اتنی مقبولیت بھی حاصل نہیں ہوئی ہے جتنی ترکی میں۔

ناول یا افسانے

ناول | الف لیلہ، یا مقبول عام اور خالص ملکی مذاق کے افسانوں اور حصّوں کی، جیسے "حسین کرد" ایران میں کمی نہیں ہے، لیکن جس چیز کو عرف عام میں ناول کہہ سکتے ہیں اس کے متعلق تو ہمیں اتنا لکھنے

[1] گبب نے بہت مختصر طور پر اس جوش و خروش کو بیان کیا ہے جو اس ڈرامے کے پہلی مرتبہ گدبک پاشا تھیٹر میں دکھانے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ سلطان عبدالعزیز اس پر سخت سراسیمہ اور برہم ہوا اور اس نے اس کے مصنف (کمال بے) کو جزیرہ قبرس میں بمقام فماگستا نظر بند کر دیا تھا۔ ۱۲ مصنف

کی بھی ضرورت نہیں ہو جتنی ڈرامے کے لیے تھی۔ حال میں ناول لکھنے کی دو اولوالعزمانہ کوششیں میرے علم میں آئی ہیں اور آج کل زرتشتی زمانہ کے ایران کو بڑھا چڑھا کر دکھانے کا جو عام رجحان پیدا ہوگیا ہو اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہو کہ یہ دونوں زمانۂ قبل اسلام کے متعلق ہیں: یعنی ایک سیروس (Cyrus) پر اور دوسری قباد اور اس کے بیٹے اور جانشین انوشیروان اور علم بردارِ الحاد مزدک پر۔

عہد سیروس کے متعلق ایک تاریخی ناول: عشق و سلطنت

اول الذکر ناول یا یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کی پہلی جلد اس لیے کہ تمہید میں مصنف نے دو اور جلدیں لکھنے کا خیال ظاہر کیا ہو، ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوئی اور ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں ہمدان میں طبع ہوئی۔ اس کا نام عشق و سلطنت ہو اور اس کے مصنف ایک صاحب مسمی شیخ موسیٰ صدر مدرسۂ نصرتیہ ہمدان ہیں۔ انھوں نے اپنی عنایت سے اس کا ایک نسخہ جنوری ۱۹۲۰ء میں مجھے بھی بھیجا تھا۔ تمہید میں اس ناول کے متعلق لکھا ہو۔

"دومی تواں گفت اول رومانے است کہ در ایران باسلوب مغرب زمین تالیف شدہ"

یہ ایک تاریخی ناول ہو، لیکن جو نام اس میں نظر آتے ہیں وہ قدیم ایرانی شکل میں نہیں بلکہ فرانسیسی بنا کے لکھے گئے ہیں مثلاً مترادات (جو اصل میں مہرداد ہو) اکباتان (یہ ہمدان کا نام ہو۔ قدیم ایرانی نام ہگمتانہ کی بجائے مصنف نے یہ نام اکبتانہ سے بنایا ہو)؛ اگرادات اسپاکو (اسپے کو) اور سیاکزر، جو ہوک نشترا کی بجائے سیاکزرس

سے ماخوذ ہے، کیمیاہی سس کو کمبوجیا کی بجائے ایک درمیانی شکل کمبوزیا" میں رکھا گیا ہے۔ قصہ کے مناظر اور افراد کے متعلق جو طویل الذیل بیانات اس ناول میں کیے گئے ہیں وہ یورپی نمونوں کی نقل ہیں۔ قصہ میں عشق اور رزم دونوں عنصر موجود ہیں اور اگرچہ وہ بہت زیادہ سنسنی خیز نہیں تاہم پڑھنے کے لائق ہیں۔ اس میں سنین، اثری اور ضمیاتی حواشی اور تاریخی تحقیق کی افراط ہے، جس کی بنیاد ہیرودوتوس (Herodotus) کے بیانات اور اوستا سے اخذ کی ہوئی معلومات پر ہے۔ اگرچہ قدیم متروک الفاظ کے استعمال اور عربی سے پہلو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، تاہم مصنف نے اپنا دامن فاش تاریخی اغلاط سے پاک رکھا ہے۔ ذیل کے مختصر اقتباس سے جو ص۲۲ سے نقل کیا گیا ہے اور جس میں سیروس کی شادی کی تیاریوں کا ذکر ہے، ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ایران میں اب تک جس قسم کی قصہ نویسی کا چلن تھا اس سے اس کتاب کا رنگ کتنا دور ہے:-

"بلے این تہیہ، تہیۂ عروسی است و گمان ندارم کہ عروسی جز برائے کورس پادشاہِ با اقتدار پارس و مدی[1] باشد، چہ کہ امروز کسے جز او این قدر نزد اہالی اکباتان محبوبیت ندارد کہ مردم عروسی اورا چوں عید بزرگے دانستہ و بازارہا را زینت کردہ و از صمیم قلب اظہار سرور و شادمانی نمایند۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس "تاریخی ناول" کو ایران میں کس حد تک کامیابی ہوئی اور نہ اس کا کوئی نسخہ بجز اس نسخے کے جو مصنف نے اپنے

---

[1] میڈیا۔ ۱۲ مصنف

ایک مکتوب مورخہ ۴ صفر ۱۳۳۸ھ (۳۰۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء) کے ساتھ میرے پاس بھیجا تھا، اب تک کہیں میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس خط میں مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں اخبار ٹائمز میں اس ناول پر تبصرہ لکھوں جس سے میں معذور رہا، لیکن مجھے امید ہے کہ فاضل مصنف اس مختصر تذکرے کو جس کے ذریعے میں یورپ کو ان کی تصنیف سے روشناس کرا رہا ہوں، قبول فرمائیں گے۔ اپنے ابنائے وطن کی تعلیم و تفریح، نیز ایران میں ایک نئے قسم کی ادبیات کو رائج کرنے کی جو کوشش انھوں نے اس کتاب کے ذریعے کی ہے وہ ہر طرح مستحق ستایش ہے۔

دام گستران یا انتقام خواہان مزدک

جن دو تاریخی ناولوں کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، ان میں سے دوسری "دام گستران یا انتقام خواہانِ مزدک" ہے، جو صنعتی زادہ کرمانی کی تصنیف ہے اور ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں چھپی ہے۔ مذکورۂ بالا ناول کی طرح یہ بھی غیر مکمل ہے، اس لیے کہ ص۱۱ پر اس کے خاتمے پر یہ الفاظ ہیں: "تمام شد جلد اول" لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ مصنف کا اور کتنی جلدیں لکھنے کا ارادہ تھا اور میرے علم کی حد تک، اب تک اس کی کوئی مزید قسط شایع نہیں ہوئی ہے۔ اس کا طرزِ تحریر عام طور پر وہی ہے جو "عشق و سلطنت" کا۔ لیکن اس میں اثری غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً ص۱ پر ساسانی بادشاہ بہرام گور کی ایک تصویر کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس پر ایک چھٹی لگی ہوئی ہے جس میں "خط میخی" میں کچھ لکھا ہوا ہے

شرلاک ہومز، ترکی اور ایران میں

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مجھے اس زندۂ جاوید شخص شرلاک

ہومز[۵۱] کے بین قصّوں کے فارسی تراجم کا ذکر بھی کرنا چاہیے - یہ ترجمے میر اسمٰعیل زادہ نے روسی سے کیے ہیں اور ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء - ۱۹۰۶ء میں مطبع خورشید طہران سے شایع کیے ہیں - ان قصّوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں؛ عینک طلائی؛ احوال چارلس آگس ٹس مل ورٹن[۵۲]؛ اور دہ خدایاں - روسی زبان کے درمیانی واسطے سے گزرنے کی وجہ سے ہومز خمس یا خومس بن گیا ہے - ڈاکٹر واٹسن البتہ اس بارے میں خوش نصیب رہے ہیں - واقعات کو نہایت سادہ عبارت میں بیان کیا گیا ہے اور اگر یہ کتاب زیادہ تعداد میں میسّر آسکتی جس میں شک ہے، تو فارسی کے مبتدیوں کے لیے بہت مفید ہوتی - ترکی میں بھی شرلاک ہومز کے قصّے بہت مقبول ہوئے ہیں - مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں باسفورس میں جہاز پر تھا تو ایک اخبار فروش نے مجھ سے باصرار Engineer's Thumb کے ترکی ترجمے کے خریدنے کی درخواست کی تھی - سلطان عبدالحمید مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سر آرتھر کے نن ڈایل کے نہایت مداح تھے اور ان کی آرزو تھی کہ وہ انھیں اپنے محکمہ خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ بنائیں -

---

۵۱ زمانہ حال کے مشہور انگریز مصنف سر آرتھر کے نن ڈایل نے سراغ رسانی کے متعلق جو افسانے لکھے ہیں ان سب کا ہیرو شرلاک ہومز ہے جو تفتیش و سراغ رسانی کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے - ڈاکٹر واٹسن شرلاک ہومز کے دوست ہیں اور اکثر یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں ۱۲ مترجم

۵۲ اصل قصہ کا نام جس کا یہ ترجمہ ہے The Adventure of Appledore Towers ہے - ۱۲ مصنف

سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اور ابراہیم بیگ کے جوش کا سبب

اس کا تصفیہ کسی قدر دشوار ہی کہ حاجی زین العابدین مراغی کا سیاحت نامہ ابراہیم بیگ (ابراہیم بیگ فرضی نام ہی) جو بقول مرزا محمد علی خان تربیت[1] کے ۱۹۰۵ء۔۱۹۰۶ء کے انقلاب ایران کا محرک ہوا، ناول کہا جاسکتا ہی یا نہیں۔ اگرچہ قصہ کا ہیرو اور اس کی سرگزشت دونوں فرضی ہیں، لیکن اس میں مبالغہ بہت کم ہی اور اسے اصلی اور سچی سرگزشت بھی سمجھا جاسکتا ہی۔ اس کتاب میں ایران کے طریق حکومت اور معاشرتی حالت پر بہت سخت چوٹیں کی گئی ہیں اور ان کا بیان بہت پُر اثر انداز سے کیا گیا ہی۔ مصنف کا منشاء یہ تھا کہ عوام میں بے چینی اور بددلی پیدا کرکے انھیں ان حالات کی اصلاح پر

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب Press and Poetry in Modern Persia PP. 22—164

سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اصل فارسی زبان میں تین جلدوں میں چھپا تھا ایک قاہرہ میں جس پر سن تصنیف درج نہیں ہی، دوسری کلکتہ میں جس پر ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء درج ہی، اگرچہ طباعت ۱۹۰۵ء سے پہلے ختم نہ ہوئی اور تیسری قسطنطنیہ میں ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء۔ مصنف کا نام صرف تیسری جلد کے سرورق پر درج ہی۔ ڈاکٹر والٹر شلز (Walter Schulz) جلد اول کا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں لائپزگ سے اس عنوان سے کیا ہی۔

"Zustande im heutigen Persien wie sie das Reisebuch Ibrahim Beg's enthullt"

(آج کل کے ایران کے حالات جس طرح کہ وہ ابراہیم بیگ کے سفرنامہ میں بیان کیے گئے ہیں) "مصنف"

اُبھارا جائے۔ ایرانی "من حیث القوم" طنز اور ہجو کے معاملے میں بہت زود حس واقع ہوئے ہیں اور اکثر یورپی قوموں کی بہ نسبت وہ اسے ٹھنڈے دل سے سہتے اور برداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایرانی مصلحانِ قوم اپنے مقصد اصلاح کو حاصل کرنے کے لیے طنز اور ہجو کا استعمال بہت زیادہ کیا کرتے ہیں۔ یہ سیاحت نامہ بہت خوبی کے ساتھ اور نہایت جوش سے لکھا گیا ہے۔ اس کا طرز تحریر سادہ اور پُر زور ہے اور اگر فارسی زبان کا کوئی متعلم روز مرّہ کے محاورات پر عبور اور ایران کے متعلق ایک عام لیکن کسی قدر رنگ آمیز واقفیت پیدا کرنا چاہے تو میری رائے میں اس سے بہتر کوئی اور کتاب اس کے مطالعہ کے لیے نہیں ہوسکتی۔

حاجی بابا کا فارسی ترجمہ | اس سلسلہ میں موریر (Morier) کی حاجی بابا کے اس فارسی ترجمے کا ذکر بھی کر دینا چاہیے جو ایک لائق لیکن بدنصیب شخص حاجی شیخ احمد روحی کرمانی کا کیا ہوا ہے اور جسے کرنل ڈی. سی. فل لاٹ نے ۱۹۰۵ء میں کلکتہ سے شایع کیا ہے[1]۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کی طرح اس کتاب میں بھی ایرانیوں پر بہت چبھتی ہوئی چوٹیں کی گئی ہیں اور چونکہ اس کا مصنف ایک غیر ملکی شخص ہے (یعنی موریر) اس لیے اس کی حیثیت اور زیادہ عجیب و غریب اور پُر معنی ہوگئی ہے۔ مگر اصل میں یہ کتاب بجائے فارسی کے انگریزی تصانیف کے ضمن میں آتی ہے۔ اس کے متعلق میں اپنی ذاتی رائے اس انگریزی اڈیشن کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں جو مسرز میتھوئن نے ۱۸۹۵ء میں شایع کیا تھا۔ علی ہذا اس کتاب کے

[1] ملاحظہ ہو فارسی ترجمے کے انگریزی مقدمہ کا ص ۵ اور ص ۶، نیز میری تصنیف Persian Revolution کے ص ۹۳، ص ۹۶ - ۱۲ مصنف

فارسی مترجم اور اس کی قابل ستایش محنت کے متعلق کرنل فل لاٹ اپنے اس مقدمے میں جو انھوں نے فارسی ترجمے پر لکھا ہی اس قدر تفصیل سے بحث کی ہی کہ اب اس میں کسی اضافے کی گنجایش نہیں ہی۔

پریس

ایران میں پریس کا ارتقا ایرانی فن صحافت کے متعلق جس نے تجدد ایران میں اور سب عوامل سے زیادہ حصّہ لیا ہی میں اپنی ایک اور تصنیف میں[1] جو مستقل طور پر اسی موضوع پر ہی اس قدر مفصل بحث کر چکا ہوں کہ اس موقع پر بجز اس کے کہ اسی کی تلخیص کردی جائے اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہی۔ ایران میں فن طباعت کو تقریبًا ایک صدی قبل عباس مرزا نے شروع کیا تھا اور سب سے پہلا فارسی اخبار تقریبًا ۱۸۵۱ء میں یعنی ناصر الدین شاہ کی حکومت کے تیسرے سال نکلا تھا۔ اس کے بعد بہت جلد جلد دوسرے اخبارات بھی نکلے، لیکن یہ محض خبروں کے پرچے تھے جو ابتدا میں حکومت کی طرف سے شایع کیے جاتے تھے اور بالکل بے رنگ اور خشک ہوا کرتے تھے۔ میرے قیام ایران کے زمانے میں بھی صرف ایک

ابتدائی دور کے پانچ اہم جرائد اخبار ایسا تھا جو پڑھنے کے قابل کہا جاسکتا تھا: یعنی اختر جو قسطنطنیہ سے ہفتہ میں ایک مرتبہ شایع ہوتا تھا۔ اس کا اجرا ۱۸۷۵ء میں ہوا تھا اور یہ تقریبًا بیس برس جاری رہا۔

---

[1] یعنی Press and Poetry in Modern Persia, Cambridge, 1914 ۱۲ مصنف

(یہ کتاب اس قابل ہی کہ جلد از جلد اس کا اردو ترجمہ کردیا جائے) ۱۲ مترجم

پرنس ملکم خان کا اخبار قانون ۱۸۹۰ء میں نکلا اور لندن میں طبع ہوتا اور وہیں سے شایع ہوتا تھا، لیکن چونکہ اس میں ایرانی حکومت، شاہ اور وزرا پر سخت حملے ہوتے تھے، اس لیے ایران میں اس کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ کلکتہ کا حبل المتین سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں نکلا، اس کے بعد ۱۸۹۸ء میں قاہرہ سے ثریا جاری ہوا اور ۱۹۰۰ء میں اس کا جانشین پرورش نکلا۔ ایران کے باہر چھپنے والے اخبارات میں

دورہ بعد انقلاب کے بہترین جرائد | صرف مذکورہ بالا اخبارات ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خود ایران میں با اثر اور آزاد جرائد اس وقت تک جاری نہیں ہوئے جب تک کہ ۱۹۰۶ء میں انقلاب کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ جم نہ گئیں اور شاہ اور مجلس وکلا کی آپس کی مخالفتیں پورے زور پر نہ آلیں۔ ان میں سے ادبی حیثیت سے سب سے زیادہ دلچسپ یہ ہیں:۔ صور اسرافیل، نسیم شمال، مساوات اور نوبہار۔ ان میں سے پہلے، دوسرے اور چوتھے اخبارات

صور اسرافیل اور اس کا ضمیمہ چرند پرند | سے میں نے اپنی کتاب Press and Poetry in Modern Persia میں دخو، سید اشرف گیلانی اور بہار مشہدی کی کئی بلند پایہ نظمیں نقل کی ہیں۔ لیکن نظم کے علاوہ صور اسرافیل میں چرند و پرند کے عنوان سے جو کالم ہوتا تھا اس میں بعض اعلیٰ درجہ کی اور جدت آمیز نثر کی تحریریں بھی ہوتی تھیں اور چونکہ ان کی مثل کوئی اور فارسی تحریر اب تک میری نظر سے نہیں گزری ہے اس لیے میں ان میں سے دو بطور نمونے کے یہاں نقل کرتا ہوں۔ یہ دونوں دخو کے قلم سے ہیں، پہلی

صور اسرافیل شمارہ ۱ بابت ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء میں اور دوسری اسی کے شمارہ ۲ بابت ۶ جون ۱۹۰۸ء میں شایع ہوئی تھی۔

چرند پرند

"بعد از چندیں سال مسافرت ہندوستان و دیدن ابدال[1] و اوتاد و مہارت در کیمیا ولیمیا و سیمیا[2] الحمدللہ بہ تجربۂ بزرگے نائل شدم و آں دوائے ترک تریاک است۔ اگر ایں دوا را ہریک از ممالک خارجہ کسے کشف مے کرد ناچار صاحب امتیاز می شد، انعامات می گرفت۔ در ہمۂ روز نامہ ہا نامش بہ بزرگی درج می شد، اما چہ کنم کہ در ایران قدر دان نیست!"

"عادت طبیعت ثانوی است، ہمیں کہ کسے بکارے عادت کرد دیگر باین آسانی ہا نمی تواند ترک کند، علاج منحصر باین است کہ بہ ترتیب مخصوص بمرور زمان کم کند، تا وقتے کہ بکلی از سرش بیفتد۔"

"حالا من بہ تمام برادران مسلمان غیور تریاکی خود اعلان می کنم کہ ترک تریاک ممکن است، بایں کہ اولاً در امر ترک جازم و مصمم باشند، ثانیاً، مثلاً یک نفر کہ روزے

---

[1] ابدال اور اوتاد "رجال الغیب" کی دو قسمیں ہیں جو صوفیا کے عالم ناسوت میں بہت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] ان علوم سریہ کی بحث میں ص ۲۳۶ پر کر چکا ہوں۔ ۱۲ مصنف

دو مثقال[1] تریاک می خورد، روزے یک گندم از تریاک کم کردہ دو گندم مرفین[2] بجائے آں زیاد کند و کسے کہ دہ مثقال تریاک می کشد روزے یک نخود کم کردہ، دو نخود حشیش اضافہ نماید و ہمیں طور مداومت کند تا وقتے کہ دو مثقال تریاک خوردنی بہ چہار مثقال مرفین و دہ مثقال تریاک کشیدنی بہ بیست مثقال حشیش برسد بعد ازاں تبدیلِ خوردنِ مرفین بہ آب ونذدک مرفین[3] و تبدیل حشیش بخوردنِ دوغ وحدت[4] بسیار آسان است برادرانِ غیور تریاکی من در صورتیکہ خدا کارہا ایں طور آسان کردہ چرا خودتاں را از زحمت حرف ہائے ہفت مردم و تلف کردن این ہمہ مال و وقت نمی رہانید۔ترک عادت در صورتے کہ بایں قسم بشود، موجب مرض نیست و کار خیلے آسان است"۔

"وہمیشہ بزرگاں و متخصصین ہم کہ می خواہند عادت زشتے از سر مردم بیندازند ہمیں طور می کنند، مثلاً ببینید واقعاً شاعر خوب گفتہ است کہ ع عقل و دولت قریں یکدگر ہست

---

[1] ایک مثقال میں ۲۴ نخود اور ہر نخود میں ۴ گندم ہوتے ہیں۔ ۱۲ مصنف

[2] یعنی مارفیا (Morphia) ۱۲مترجم

[3] یعنی پچکاری کے ذریعہ جلد میں مرفین داخل کرنا۔ ۱۲ مترجم

[4] دوغ وحدت، یا سنجاب حشیش اور دہی سے بنتا ہے اور اسرار حب نشاط وغیرہ کی طرح ہوتا ہے۔ بوق وحدت حشیش کشوں کی اصطلاح میں اس کاغذ کی نیف کو کہتے ہیں جس کے اندر سے دھوآں کھینچا جاتا ہے۔ ۱۲مصنف

مثلاً وقتے کہ بزرگان ما فکر می کنند کہ مردم فقیرند و استطاعت نان گندم خوردن ندارند، و رعیت ہمہ عمرش را باید بزرعت گندم صرف کند و خودش ہمیشہ گرسنہ باشد بہ ببینید چہ می کنند۔"

"روز اول سال نان را با گندم خالص می پزند، روز دوم در ہر خروار یک من تلخہ[51] جو، سیاہ دانہ، خاک ارّہ[52]، یونجہ[53]، شن[54]۔ مثلاً مختصر عرض می کنم کلوخ، چارکہ[55] گلولہ[56] ہشت مثقالے بزنند۔ معلوم است کہ در یک خروار گندم چہ صد من است، یک من ازیں چیز ہا ہیچ معلوم نمی شود۔ روز دوم دو من می زنند، روز سوم سہ من و بعد از صد روز کہ سہ ماہ و دہ روز بشو، صد من گندم صد من تلخہ، جو، سیاہ دانہ، خاکِ ارّہ، کاہ، یونجہ، شن . . . شدہ است درصورتیکہ ہیچ کس ملتفت نہ شدہ و عادت نان گندم خوردن ہم از سر مردم اُفتادہ است"

---

[51] خوبانی کی گٹھلی ۱۲ مترجم

[52] لکڑی کا برادہ ۱۲ مترجم

[53] بھوسی، کٹی ہوئی گھاس ۱۲ مترجم

[54] شن ۔ مٹی، ریت ۔ ۱۲ مترجم

[55] گما اینٹ ۔ ۱۲ مترجم

[56] گولیاں ۔ ۱۲ مترجم

"واقعاً کہ "عقل و دولت قرین یکدیگر است"

"برادران غیور تریاکی من البتہ می دانید کہ انسان عالم صغیر است و شباہت تمام بہ عالم کبیر دارد یعنی مثلاً ہر چیز کہ برائے انسان دست من دہد، ممکن است برائے حیوان، درخت، سنگ، کلوخ، در، دیوار، کوہ، دریا ہم اتفاق بیفتد و ہر چیز ہم برائے ایں ہا دست می دہد، برائے انسان ہم دست می دہد کہ چرا کہ انسان عالم صغیر است و آں ہا جزو عالم کبیر، مثلاً ایں را می خواستم بگویم ہماں طور کہ ممکن است عادتے را از سر مردم انداختن، ہماں طور ہم ممکن است عادتے را از سر سنگ و کلوخ و آجر انداختن چرا کہ میان عالم صغیر و عالم کبیر مشابہت تمام است، پس چہ انسانے باشد کہ از سنگ و کلوخ ہم کم باشد"۔

"مثلاً یک مریض خانہ حاجی شیخ ہادی[1] مجتہد مرحوم ساخت موقوفاتے[2] ہم برائے آں معین کرد کہ ہمیشہ یازدہ نفر مریض در آں جا باشند۔ تا حاجی شیخ ہادی حیات داشت مریض خانہ بیازدہ نفر مریض عادت کرد، ہمیں کہ حاجی شیخ ہادی مرحوم شد طلاب مدرسہ بہ پسر ارشدش گفتند ما وقتے تو را آقا می دانیم کہ موقوفات مریض خانہ را خرج ما بکنی۔ حالا بہ بنید ایں پسر خلف ارشد با قوت علم چہ کرد۔

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب Persian Revolution صفحہ ۴۰۶ تا ۴۰۷، ۱۲ مصنف

[2] اوقاف۔ ۱۲ مترجم

ماه اول یک نفر از مریض ہا را کم کرد، ماه دوم دو تا
ماه سوم سہ تا، ماه چہارم چہار تا و ہمیں طور تا حالا کہ
عدّۂ مریض ہا بہ پنج نفر رسیده و کم کم بحسن تدبیر آں چند
نفر ہم تا پنج ماه دیگر از میان خواہد رفت۔ پس بہ بیند کہ
چہ طور می شود عادت را از سر ہمہ کس و ہمہ چیز انداخت۔
حالا مریض خانہ کہ بہ یازده مریض عادت داشت، بدون
ایں کہ ناخوش بشود، عادت از سرش افتاد، چرا؟ برائے
آں کہ ہم جزوِ عالم کبیر است و مثلِ انسان کہ عالم صغیر
است می شود عادت را از سرش انداخت (دخو)۔"

چرند پرند، مکتوب شہری

"کبلائی[1] دخو، تو قدیم ہا گاہے بدردِ مردم می خوردی،
مشکلے بدوستانت روئے می داد حل می کردی، ایں آخر ہا
کہ سرو صدائے از تو نبود می گفتم بلکہ تو ہم تریاکی شده
در گوشہ اطاق پائے منقل لم داده[2] اما نگو کہ تو ناقلائے حقہ[3]
ہماں طور کہ توئے صور اسرافیل نوشتہ بودی پواشگی[4] بے خبر

---

[1] کربلای کا مخرب اور عامیانہ اصطلاح ہے، ملاحظہ ہو میری کتاب
Press and Poetry in Modern Persia P. 179—82 ۱۲ مصنف

[2] یعنی اونگھتے ہوئے۔ ۱۲ مصنف

[3] ناقلائے حقہ یعنی عجیب الخلقت۔ ۱۲ مصنف

[4] چپ چپاتے۔ ۱۲ مصنف

نمی دانم برائے تحصیلِ علم کیمیا ولیمیا وسیمیا گزاشتی ، در رفتی بہ ہند۔ حکماً گنج نامۂ ہم پیدا کردہٗ ، در ہر حال اگر سورظنّ در حق تو بردہ ام باید خیلے خیلے بہ بخشی عذر می خواہم باز الحمد للہ بسلامت آمدی جائے شکرش باقی است چرا کہ خوب سر وقتش رسیدی برائے ایں کہ کارہا خیلے شلوق پلوق[۱] است۔"

"خدا رفتگاں ہمہ را بیامرزد[۲] خاک براش خبر نہ بُرد۔ در قاقازان ما یک مُلّا اینک علی[۳] داشتیم۔ روضہ خواں خیلے شوخ بود۔ حالا نداشتہ باشد بامن ہم خیلے میانہ داشت وقتے کہ می رفت روضہ بخواند، اول یک مقدمہ دور و دراز سے می چید ہرچند بے ادبی است ، می گفت مطلب ایں طور خر فہم تر[۴] مے شود (در مثل مناقشہ نیست)۔ بنظرم می آید برائے شما ہم محض ایں کہ درست بہ مطلب پے ببرید یک مقدمہ بہ چینم بد نیست۔"

---

[۱] گڑبڑ۔ درہم برہم۔ ۱۲ مترجم

[۲] یہ زرتشتیوں کی عام دعا ہے۔ ملاحظہ ہو میری کتاب

Year among the Persians P. 375

یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ "ملا اینک علی" گزر چکے ہیں ۱۲ مصنف

[۳] ترکی لفظ بمعنی گائے۔ یہ نام مزاحًا رکھا گیا ہے۔ قاقازان شاید سہو کتابت ہے، اصل لفظ قازان ہے۔ ۱۲ مصنف

[۴] یعنی گدھوں کے بھی سمجھنے کے قابل۔ ۱۲ مترجم

"در قدیم الایام در دنیا یک دولت ایران بود۔ در ہمسائگی
ایران ہم دولت یونان بود۔ دولت ایران آں وقت دماغش
پُر باد بود، از خودش خیلے راضی بود، یعنی بے ادبی می شود
لوہنگش خیلے آب می گرفت[1]۔ کیّادہ ملک الملوکی دنیا را
می کشید، بلے آں وقت در ایران، معشوق السلطنہ، محبوب
الدولہ، عزیز الایالہ، خوش گل خلوت، قشنگ حضور، ملوس
الملک نہ بود، در قصرہا ہم سرسرہا[2] نہ ساختہ بودند۔ مُلّا ہائے
آں وقت ہم چماق الشریعۃ، حاجب الشریعۃ، پارک الشریعہ
نہ داشتند، خلاصہ آں وقت کالسکۃ الاسلام، میز صندلی
المذہب، اسپ دوسی الدین وجود نہ داشت، خوش آں
روزہا، واقعاً کہ درست عہد پادشاہ وزوزک بود[3]۔ مخلص
کلام یک روز دولت ایران لشکرہائے خودش را جمع کرد
یواش یواش[4] رفت تا پشت دیوار یونان۔ برائے داخل
شدن یونان یک راہ بیشتر نبود کہ لشکر ایران حکماً باید ازاں
راہ عبور کنند، بلے پشت ایں را ہم یک کوچہ

---

[1] لوہنگ بمعنی لوٹا، اس محاورے کے معنے یہ ہیں کہ اس میں خودستائی کا
مادّہ بہت تھا۔ ۱۲ مصنف

[2] یہ اشارہ ہے قصر نگارستان، طہران کے سرسرہ کی طرف سرسرہ پھسلنے کے
تختے کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو میری کتاب
Year among the Persians P-96 ۱۲ مصنف

[3] یعنی بہترین زمانہ، یہ ایک فرضی زمانہ ہے۔ ۱۲ مصنف
[4] چپ چپاتے۔ ۱۲ مترجم

آشتی کناں[1] مسجد آقا سید عزیز اللہ یعنی یک راہ باریک دیگر بود، وے لشکر ایران آں راہ را بلد نبود۔ ہمیں کہ لشکر ایران پشت دیوار یونان رسید دید ایں یونانی ہائے بدذات ہفت خط باقشون حلو راہ را گرفتہ اند۔ خوب، حالا ایران چہ خاک بسرش کند! برود چہ طور برود؟ برگرد چہ طور برگردد؟ ماندہ سفیل و سرگردان، خدا رحمت کند شاعر را خوب گفتہ است ؎

"نہ در غربت دلم شاد و نہ روئے در وطن دارم الخ"

"از آں جاکہ باید کارہا راست بیاید، یک دفعہ لشکر ایران دیدند، یواشکی یک نفر ازاں جعفر قلی آقا ہا[2] پسر بگلر بیگ آقاہائے قزاق، یعنی یک نفر غریب نواز، یک نفر نوع پرست یک نفر مہمان دولت از لشکر یونان جدا شدہ ہمہ پا ورچین پاورچین[3] آمد تا اردوے ایرانی ہا و گفت سلام علیکم، خیر مقدم خوش آمدید، صفا آوردید، سفر بےخطر، ضمناً آہستہ آہستہ با انگشت شہادت آں کوچہ آشتی کناں را بایرانی ہا نشان داد، گفت ما یونانی ہا آنجی لشکر نداریم اگر شما ازاں راہ بروید می توانید مملکت مارا بگیرید۔ ایرانی ہا ہم قبول کردہ وازاں راہ رفتہ داخل خاک یونان شدند

---

[1] مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ طہران کی ایک تنگ گلی کا نام ہے۔ ۱۲ مصنف

[2] یہ کاسک بلیٹن کے ایک ایرانی افسر کا نام ہے۔ ۱۲ مصنف

[3] پاورچین۔ دبے پاؤں۔ ۱۲ مترجم

"حالا مطلب این جا نیست، راستی تا یادم نرفته اسم آن غریب نواز را هم عرض کنم، هرچند قدرے بزبان ما سنگین است، اما چہ می شود کرد، اسمش افیالتس بود، خدا لعنت کند شیطان را نمی دانم چرا ہر وقت من این اسم را می شنوم، بعضے سفرائے ایران یادم می افتد بارے برویم سرِ مطلب در آن وقت کہ جناب چکیدۂ غیرت نتیجۂ علم و سیاست معلم مدرسہ قزاق خانہ جناب مرزا عبدالرزاق خان مہندس بعد از سہ ماہ پیادہ روی نقشہ جنگی راہ مازندران را برائے روسہا کشیدند ما دوستان گفتیم چنیں آدم باوجود حیف است کہ لقب نداشتہ باشد بیست نفر سہ شبانہ روز ہم نشستیم فکر کردیم کہ چہ لقبے برائے ایشان بگیریم چیزے بعقل ما نرسید، حالا از ہمہ بدتر، خوش سلیقہ ہم ہستند، می گویند لقبے کہ برائے من می گیرید، باید بکر باشد، یعنی پیش از من کس دیگر نہ گرفتہ باشد، از مستوفی ہا پرسیدم، گفتند دیگر لقب بکر نیست کتاب ہائے لغت را باز کردیم۔ در زبان فارسی، عربی، ترکی، فرنگی از الف یاے کلمہ نیست کہ اقلاً دہ دفعہ لقب نشدہ باشد، خوب، حالا چہ کنیم، یعنی خدا را خوش می آید کہ این آدم ہمیں طور بے لقب بماند"

"از آں جا کہ کارہا باید راست بیاید یک روز من در کمال اوقات تلخی کتاب تاریخی کہ جلد دستم بود برداشتم

که خودم را مشغول کنم۔ ہمیں که کتاب را باز کردم در صفحه
دست راست سطر اول دیدم نوشته است (انان روز
به بعد یونانی ہا افیالتس را خائن گفتند و خونش را ہدر
کردند) ای لعنت به شما یونانی ہا، مگر افیالتس به شما
چه کرده بود که شما اورا خائن بگوئید؟ مگر مہمان نوازی در
مذہب شما کفر بود؟ مگر بغریب پرستی شما اعتقاد نداشتید۔
خلاصه ہمیں که ایں اسم را دیدم گفتم ہیچ بہتر ازیں نیست
که ایں اسم را برائے جناب مرزا عبدالرزاق خان لقب بگیریم
چرا که ہم یکر بود، ہم ایں دو نفر شباہت کامل بہم داشتند
ایں غریب نواز او ہم بود، ایں مہمان پرست بود او ہم بود
ایں می گفت اگر من ایں کار را نمی کردم دیگرے می کرد
او ہم میگفت۔ تنہا یک فرق درمیانہ بود که تکمه ہائے سرداری
افیالتس از چوب جنگل وطن نبوده خوب نباشد، ایں
جزئیات قابل ملاحظه نیست۔ مخلص کلام ما دوستاں جمع
شدیم یک مہمانی دادیم شادی ہا کردیم فوراً یک تلگراف
ہم به کاشان زدیم که پنج شیشه گلاب قمصر و دو جعبه
جوز قند زود بفرستند که یدہیم لقب را بگیریم۔ درہمیں
حیص و بیص جناب حاجی ملک التجار[1] راه آستارا را
بروسہا واگذار کردند نمی دانم کدام نامرد حکایت ایں

---

[1] اس وقت یہ خطاب حاجی محمد کاظم کا تھا جن کے کمالات کا پلہ گراں لیکن دیانت کا پلہ ہلکا تھا ۱۲ مصنف

لقب را ہم بہ او گفت - دو پاش را توی یک کفش کرد[1]
کہ از آسمان افتادہ ام، این لقب حق و مال من است
حالا چند ماہ است، نمی دانی چہ الم سراتی[2] راہ افتادہ
از یک طرف میرزا عبدالرزاق خان بقوۂ علم ہندسہ از
یک طرف حاجی ملک التجار بزور فصاحت و بلاغت و
شعرہائے امرء القیس و ناصر خسرو علوی کیلانی و خود نمی
دانی درچہ النشر و منشری گیر کردہ ایم .... اگر بتوانی مارا
ازیں بلیہ خلاص کنی مثل این است کہ یک بندۂ در راہِ
خدا آزاد کردۂ خدا انشا، اللہ پسرہا ات را بہ بخشد، خدا
یک روز عمرت را صد سال کند امروز روز غیرت است
دیگر خود می دانی زیادہ عرضے ندارم ''
''خادم باوفائے شما خرمگس ''

نظم و نثر دونوں میں دخو کی جدّت آفرینی

مذکورہ بالا مضامین نے فارسی میں طنز اور ہجو کے ایک نئے طرز کی داغ بیل ڈالی ہے، افسوس ہے کہ اس با محاورہ و پُر زور عبارت کا پورا پورا حق ترجمہ میں ادا نہیں کیا جاسکا[3]۔ اگرچہ اس قسم کے مضامین مختلف فرضی ناموں سے شایع ہوتے رہے، لیکن میرا خیال ہے کہ

---

[1] یہ محاورہ ہے بمعنے ضد آگئی رگ چڑھ گئی - ۱۲ مترجم

[2] داویلا - توبہ تِلّا - ۱۲ مترجم

[3] پروفیسر مرحوم نے کتاب میں ان دونوں مضامین کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے - ۱۲ مترجم

وہ سب کے سب دخو ہی کے قلم سے نکلے ہیں۔ اگرچہ دخو نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ باعتبار حجم بہت کم ہے، لیکن اپنے مضامین نیز اپنی بعض نظموں[۱] کی بدولت وہ کم از کم میری رائے میں آج کل کے ایرانی اہلِ قلم کی صفِ اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

گزشتہ بارہ سال کے حالات ۱۹۱۲ء-۱۹۲۳ء

پچھلے بارہ سال کی ادبیات پر مجھے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱۹۱۲ء کے آغاز میں ایران میں روسی مظالم اور تشدّد انتہا کو پہنچ چکے تھے اور کم از کم اس وقت کے آثار بتا رہے تھے کہ اب ایران میں قومی حریت اور ادبی جد و جہد دونوں کا خاتمہ ہی ہونے والا ہے۔ اس کے بعد جنگ عظیم شروع ہوگئی جس میں غریب ایران مفت میں ان غیر ملکوں کی رزم آرائیوں کی جولاں گاہ بنا جن میں سے کسی کی فتح سے بھی اسے کسی قسم کے فائدہ کی امید نہ ہوسکتی تھی اور اس کے مغربی صوبوں میں ہر طرف قلتِ خوراک، قحط سالی اور تباہی کا دَوْر دَوْرہ ہوگیا۔ بہرحال روس کا انقلاب کم از کم ایرانیوں کے حق میں رحمت الٰہی ثابت ہؤا اور فسخِ معاہدۂ انگلستان و ایران کے بعد جب دولت برطانیہ ایران سے دست کش ہوگئی تو وہ اپنے گھر کا آپ مالک بنا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو مہلت اسے نصیب ہوئی ہے

---

[۱] مثلاً ان کی نظم "کبلائی" یا مرزا جہانگیر خان کا مرثیہ، یہ مرثیہ اپنے سوز و گداز و حسن کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ ملاحظہ ہو میری کتاب

Press and Poetry in Modern Persia

ص ۱۷۹۔ ص ۱۸۲ نیز ص ۲۰۰۔ ص ۲۰۴ ۱۲ مصنف

اس سے وہ کس حد تک فائدہ اُٹھاتا ہے۔

ایران اور جرمنی اکثر حضرات کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ گزشتہ جنگ میں ایران کی ایک اچھی خاصی جماعت، جس میں زیادہ تر سربرآوردہ جمہوریت پسند اور مصلحان ملک داخل تھے، جرمنوں کے موافق کیوں تھی؟ اس کی وجہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ایرانی قوم کو شہنشاہی یا امپراطوری روس سے نفرت تھی اور وہ اس کی طرف سے خائف رہا کرتی تھی اور اس کی یہ نفرت اور خوف بے وجہ بھی نہ تھے۔ پس جو سلطنت بھی روس کی توجہ اس کے شکار (یعنی ایران) کی طرف سے ہٹا لیتی اور اس کو زیر کرنے کی کوشش کرتی وہ لامحالہ ایرانیوں میں مقبول اور ہر دل عزیز ہوجاتی۔ علاوہ بریں ایران کو جرمنی کی طرف سے جو اس کے حدود سے بہت دور ہے، کسی قسم کا خدشہ نہ تھا اور نہ جرمن قوم نے کبھی پہلے ایرانی آزادی پر دندانِ آز تیز کیے تھے۔ پس ایران کے جذبات

جریدۂ کاوہ قدیم ۱۹۱۶ء-۱۹۱۹ء جرمنی کی طرف سے ہمدردانہ تھے اور اُس نے ان سے فائدہ اُٹھاکر بہت کچھ شد و مد کے ساتھ حدود ایران میں اپنا پروپاگنڈا کیا جس کی حیرت انگیز تاریخ ہنوز لکھنا باقی ہے۔ اس جرمن پروپاگنڈا کا ایک زبردست آلہ جریدہ کاوہ تھا جو ۲۴۔ جنوری ۱۹۱۶ء سے ۱۵۔ اگست ۱۹۱۹ء تک مہینے میں دو مرتبہ (برائے نام) شایع ہوتا رہا۔ اس کا شمارہ ۲۹ اور ۳۰ جو دونوں ایک ساتھ شایع ہوئے اور متحدہ نمبروں یعنی شمارہ ۳۱ و ۳۲ میں جو ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو نکلے ناغہ کا بہت بڑا وقفہ گزرا۔ اسی طرح

سے شمارہ ۳۳ مورخہ ۱۵۔ نومبر ۱۹۱۸ء اور شمارہ ۳۴ مورخہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء بھی بہت وقفہ سے شایع ہوئے اور اس آخرالذکر شمارہ (۲) "کاوہ دورِ قدیم" کے آخری نمبر میں ½ ۵ ماہ کا وقفہ گزرا۔

کاوہ دورِ جدید ۲۰۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو کاوۂ دورِ جدید کا پہلا نمبر شایع ہؤا جو اگرچہ ظاہری ترتیب، رنگِ تحریر اور اعلی معیارِ طباعت میں کاوۂ دورِ قدیم سے بہت زیادہ مختلف نہ تھا، لیکن اس میں سیاسیات سے قطعًا کنارہ کشی اختیار کی گئی تھی اور ادب اور علم کو موضوعِ بحث قرار دیا گیا تھا۔ اس نئی شکل میں یہ پرچہ جواب صرف ماہوار شایع ہوتا تھا، دو سال تک نکلتا رہا اور آخری پرچہ No. 12, Jahrg. 2, Neue Folge = شمارہ ۱۲ سال دوم دورِ جدید) جس کا حجم بڑی تقطیع کے کم از کم ۳۲ صفحے ہی اور جو گنجان ٹائپ میں اور فی صفحہ ۲ کالم میں چھپا ہے، یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو نکلا تھا۔

کاوہ دورِ قدیم کے بعض دلچسپ مضامین جس زمانے میں کاوہ کا مقصد پروپیگنڈا تھا، اس وقت قدرتی طور پر اس کے مضامین پر سیاسی رنگ غالب ہوتا تھا اور اگرچہ ان میں کبھی کبھی ایرانی حوادث و افکار، خصوصًا "مجلس مدافعت" کے کارناموں پر کافی روشنی ڈالی جاتی تھی، لیکن التوائے جنگ کے زمانے تک بجز چند مستثنیات کے اس میں ادبیات کا دخل بہت کم ہوتا تھا مثلاً شمارہ ۷ (مورخہ ۱۴ ایریل ۱۹۱۶ء) میں ایک کُردی زبان کی نظم ہے[۱]

---

[۱] یہ فارسی اخبار رستخیز سے نقل کی گئی تھی۔ ۱۲ مصنف

شمارہ ۲۰ میں سید محمد صادق قایم مقام[1] المعروف بہ "ادیب الممالک"
کی وفات پر ایک مضمون۔ یہ ایک مشہور اہلِ قلم تھے اور ان کا انتقال
۲۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۲۱ فروری ۱۹۱۷ء) کو ہوا تھا۔ شمارہ ۲۱
میں ان اکتشافات علمیہ کا ذکر جو کپتان نی ڈر مایر (Niedermayer)
کے وفد نے افغانستان میں کیے[2]۔ شمارہ ۲۳ میں پروفیسر مٹ ووخ
(Mittwoch) کا مضمون مشہور مصور رضائے عباسی پر[3]۔ شمارہ ۲۶
میں ایرانی طلبا مقیم جرمنی کے حالات؛ شمارہ ۳۳ مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۱۸ء
میں ایک نئی تصنیف کے سلسلے میں جس کا عنوان اگرچہ فارسی تھا یعنی
"راہِ نو" لیکن جو جرمانی زبان میں تھی - ان مختلف مساعی کا ذکر
جو وقتاً فوقتاً اصلاح رسم الخط کے متعلق ایران میں کی گئیں؛ شمارہ ۳۴
(مورخہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء) میں برلن میں ایک ایرانی مجلس ادبی کے
قیام کا ذکر ہے اور مرزا محمد قزوینی کا ایک خط چھاپا گیا ہے جس میں
انھوں نے فارسی رسمِ کتابت پر بحث کی ہے؛ شمارہ ۳۵ (مورخہ ۱۵ر
اگست ۱۹۱۹ء) میں انھیں مرزا محمد قزوینی کا ایک دلچسپ اور طویل
مضمون جس میں ساتویں صدی عیسوی یعنی عربوں کی فتح ایران کے بعد

---

(۱) انھیں قایم مقام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مشہور مرزا ابوالقاسم قایم مقام کی اولاد میں سے ہیں ملاحظہ ہوں جلد ہذا کے ص ۲۳۸ تا ص ۲۴۰ ۱۲ مصنف

(۲) یہ مضمون ایک جرمن اخبار Neue Orient (مشرق جدید) کے شمارہ ۴ ، ۵ بابت مئی ۱۹۱۷ء سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ۱۲ مصنف

(۳) یہ مضمون Die Islamische Welt (دنیائے اسلام) کے شمارہ ۵ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ ۱۲ مصنف

کے قدیم ترین فارسی اشعار سے بحث کی گئی ہے۔[1]

کاوہ دورِ جدید کی اعلیٰ ادبی اور تنقیدی خصوصیات

کاوہ دورِ جدید جس کا اجرا ۲۲ر جنوری ۱۹۲۰ء کو ہوا اپنے پیش رَو کاوہ دورِ قدیم کے برخلاف، صرف ادبی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں اعلیٰ درجے کے مفید اور دلچسپ مضامین ملتے ہیں۔ برلن میں ایرانیوں کی جماعت اگرچہ قلیل ہے، لیکن اس میں کئی بلند پایہ اور ذہین افراد ہیں جو جذبۂ وطن پرستی کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی کوتاہیوں کی طرف سے بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور یورپی علم و فن کی بہترین خصوصیات کو اخذ و جذب کرنے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ جرمن علمیت کی خصوصیت خاصہ اس کی سنجیدگی، دقّتِ نظر، صحت علمی کی لَو میں سخت سے سخت محنت اور جملہ ممکنہ مآخذ علمی سے متعلقہ مواد جمع کرکے اس پر تنقیدی نظر ڈالنا ہے اور چونکہ ایرانی بالطبع نکتہ آفرینیوں، جلد بازی کے قیاسات اور قبل از وقت نظریے قایم کرنے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے انھیں صحیح نہج پر چلانے کے لیے جرمن علمیت کی مذکورہ بالا خصوصیت ہی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ کاوہ دورِ جدید کے افتتاح کے موقع پر اس کے

---

[1] صاحب مضمون نے فارسی شعر گوئی کی دو اوّلین کوششوں کا ذکر کیا ہے یہ دونوں مثالیں مستند عربی کتب مثلاً ابن قتیبہ کی کتاب الشعر والشعرا اور کتاب الاغانی، نیز تاریخ طبری سے لی گئی ہیں۔ شعر گوئی کی سب سے پہلی مثال یزید ابن معاویہ کے عہدِ حکومت (۶۰ھ تا ۶۴ھ مطابق ۶۸۰ء۔ ۶۸۴ء) میں بتائی جاتی ہے۔ ۱۲ مصنف

مدیر سید حسن تقی زادہ نے ان الفاظ میں اپنے اخبار کے مقاصد بیان کیے تھے:-

"کاوۂ دور جدید کے اغراض و مقاصد[1]"

"چونکہ اخبار کاوۂ زمانہ جنگ کی پیدا وار تھا اس لیے اس کا طریق کار بھی حالات و واقعات آفریدۂ جنگ سے بہت متعلق تھا، لیکن چونکہ اب جنگ ختم ہوگئی اور بین الاقوامی صلح کی جاچکی ہے اس لیے کاوہ بھی اپنے دورۂ حربی کو ختم کرتا اور دورۂ صلح میں قدم رکھتا ہے۔ پس آغاز ۱۹۲۰ء (۹۔ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ) سے اس نے ایک نئی بنیاد ڈالی ہے اور ایک نیا طریقِ کار اختیار کیا ہے کاوۂ دور قدیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ اسے ایک نیا اخبار سمجھنا چاہیے جس کے مضامین کی نوعیت زیادہ تر علمی، ادبی اور تاریخی ہوگی۔ اس کا مقصد اولیٰ یہ ہوگا کہ ایران میں یورپی تہذیب کو فروغ دیا جائے۔ مذہبی تعصب کی روک تھام کی جائے، ایران کے جذبۂ قومی و اتحادِ ملی کی حفاظت کی جائے، فارسی زبان اور ادب کو جن بے ترتیبیوں اور خطرات کا سامنا ہے ان سے اسے محفوظ رکھ کر اس کی صفائی اور پاکی کی کوشش کی جائے اور تاحد امکان داخلی اور خارجی حریت

---

[1] افسوس ہے کہ باوجود کوشش و تلاش کے ہمیں کاوۂ دور جدید کا پہلا نمبر کہیں سے نہ مل سکا ورنہ اس سے اصل مضمون نقل کر دیتے۔ ۱۲ مترجم

کی تائید کی جائے۔ راقم سطور ہذا کی رائے میں جو چیز آج ایران کے لیے بدرجہ اتم ضروری ہے اور جسے اپنی پوری قوت کے ساتھ ترقی دینا اور ہر دوسری چیز کے مقابلے میں پیش پیش رکھنا آج ہر وطن خواہ ایرانی کا فرض ہے، وہ یہ تین باتیں ہیں:-

"سب سے پہلی بات یہ کہ یورپی تہذیب کو بغیر کسی شرط اور قید کے قبول کیا جائے اور اسے فروغ دیا جائے۔ یورپ کی پوری پوری متابعت کی جائے اور سوائے زبان کے اور ہر چیز میں مثلاً تہذیب، رسم و رواج، دستور تنظیم، علوم و فنون، طرزِ رہائش غرضکہ سرتا سر یورپ کی ذہنیت کو اپنے اندر جذب کر لیا جائے اور ہر قسم کی خود پسندی، نیز ان تمام جاہلانہ اعتراضات کو جو غلط کردۂ راہ یا ہماری رائے میں مصنوعی وطن خواہی سے پیدا ہوتے ہیں، پس پشت ڈال دیا جائے۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ فارسی زبان اور ادب کی حفاظت اور اس کی ترقی، توسیع اور اشاعت کی عاشقانہ خدمت کی جائے۔

"تیسری بات یہ ہے کہ علوم یورپی کی اشاعت کی جائے اور کالجوں کے قیام اور ملکی تعلیمات کی ترقی کے لیے ہر ممکنہ مادّی اور اخلاقی ذریعہ سے کام لیا جائے۔"

"راقم سطور ہذا کا ایمان ہے کہ ایران کی خدمت کے

اگر کچھ طریقے ہوسکتے ہیں تو وہ یہی ہیں اور جن لوگوں کو
تہذیب و سیاسیات حاضر کے بہت کچھ تجربے ہوچکے ہیں
وہ بھی اس بارے میں ہمارے ہم خیال ہیں "

" خارجی اور داخلی، جسمانی اور روحانی، غرض کہ ہر حیثیت
سے ایران کو یورپی بنا دینا چاہیے "

" اپنے اخبار کے اساسی اغراض و مقاصد کی اس تشریح
کو ختم کرنے سے پہلے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ راقم کی رائے
میں عظیم ترین و موثر ترین خدمت یہ ہوسکتی ہے کہ یورپ کی
اہم کتابوں کے پورے سلسلے کو سادہ اور آسان فارسی میں
ترجمہ کردیا جائے "

کاوہ دورِ جدید کے بعض دلچسپ مضامین چنانچہ مذکورہ بالا نظام العمل کی پیروی میں، پہلے ہی نمبر میں جرمنی طرقِ تعلیمی، ایرانی، جرمنی مجلس کی روداد[1] اور جرمنی میں ایرانی طلبا کے لیے تعلیمی سہولتیں پیدا کرنے پر مقالے لکھے گئے، لیکن بیشتر مضامین فارسی زبان اور ادب کے متعلق ہیں۔ مثلاً ۱۹۲۰ء میں تقی زادہ نے "محصّل" کے نام سے ایک قابل تعریف سلسلہ مضامین شروع کیا تھا جس کا موضوع "مشاہیر شعرائے متقدمین" تھا[2]۔ ان کے علاوہ کوین ہیگن کے

---

[1] اس مجلس کا پورا نام Deutsch-Persische Gesellschaft تھا۔ ۱۲ مصنف

[2] ملاحظہ ہو شمارہ ۱، ص ۲-۶؛ شمارہ ۲، ص ۱۵-۲۴؛ شمارہ ۸، ص ۱۰-۱۴؛ شمارہ ۱۰، ص ۹-۱۴؛ ۱۲ مصنف

ڈاکٹر آرتھر کرس تن سن (Arthur Christenson) کا مضمون "وجود شعر بزبان پہلوی" فرہنگ پر سلسلہ مضامین جس کا عنوان "بالشویزم (Bolshevism) ایران باستانی" ہوتا تھا[۲]۔ گزشتہ صدی عیسوی میں فارسی کا ارتقا[۳]۔ مناظرۂ روز و شب کے عنوان سے مشرقی اور مغربی تحقیق کا موازنہ، جس میں مغربی تحقیق و اجتہاد کو بہت بڑھا کر دکھایا گیا تھا[۴]۔ عربوں کی فتح کے بعد ایرانی ادبیات کے چار دور[۵]؛ "محک ذوق" کے عنوان سے اعلیٰ درجے کے جدید فارسی اشعار، نیز بقول صاحب مضمون کے "کرپلائی اشعار" کی بحث[۶]۔ شاہ نامہ کے پہلوی، عربی اور فارسی مآخذ[۷]۔ عربی زبان کے فارسی میں قدیم تراجم[۸]۔ "مآخذ فارسی فصیح و خان والدہ کی فارسی" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون جس میں ان قسطنطنیہ کے رہنے والے نوجوان ایرانیوں کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو ترکی محاورہ و طرز بیان کی کورانہ تقلید کرتے ہیں[۹]۔ ان میں سے اکثر مضامین علمیت تنقیدی نظر اور جدت

---

[۱] مطبوعہ شمارہ ۳ و ۵ ص ۲۴ - ۲۶ - ۱۲ مصنف

[۲] مطبوعہ شمارہ ۳ ص ۵ - ۱۱؛ شمارہ ۴ - ۵ ص ۸ - ۱۵ - ۱۲ مصنف

[۳] مطبوعہ شمارہ ۳ ص ۳ - ۵؛ شمارہ ۴ - ۵ ص ۳ - ۴ - ۱۲ مصنف

[۴] مطبوعہ ۴ - ۵ ص ۷ - ۸؛ ۶ ص ۳ - ۶؛ ۸ ص ۵ - ۱۰ - ۱۲ مصنف

[۵] شمارہ ۸، ص ۵ - ۸ - ۱۲ مصنف

[۶] شمارہ ۸ ص ۴ - ۱۲ مصنف

[۷] شمارہ ۱۱ ص ۷ - ۱۲؛ شمارہ ۱۲، ص ۷ - ۱۲ - ۱۲ مصنف

[۸] شمارہ ۹ ص ۴ - ۵ - ۱۲ مصنف

[۹] شمارہ ۱۲ ص ۳ - ۵ - "خان والدہ" قسطنطنیہ کا وہ نواح ہے جہاں زیادہ تر ایرانی تاجر رہتے ہیں یا ان کے دفاتر واقع ہیں ۱۲ مصنف

کے سرمایہ سے مالا مال ہیں جس کی نظیر مجھے فارسی میں کہیں اور نہیں ملتی اور اس سے کہیں زیادہ تفصیلی بحث و توجہ کے مستحق ہیں جو سطور بالا میں کی گئی ہے۔

کاوہ کا آخری سال | اپنی زندگی کے آخری سال میں بھی کاوہ نے اپنا پرانا اعلیٰ معیار قایم رکھا اور کئی ایسے تاریخی اور ادبی مضامین اس میں نکلے جو ہر حیثیت سے بہترین یورپی علمیت کے ہم پلّہ ہیں۔ سید محمد علی جمال زادہ نے "تعلقات روس و ایران من ابتدائے عہد آق قویونلو و خاندان صفویہ تا آغاز دورۂ محمد خان قاجار" کے عنوان سے اہم تاریخی مضامین کا ایک سلسلہ لکھا تھا جو ہر مہینے ضمیمہ کے طور پر نکلتا رہا اور جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب قلم نے تمام موجودہ مشرقی و مغربی مآخذ سے نہایت وسعت نظر اور قابلیت کے ساتھ استفادہ کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں اخبار کاوہ دفعتًا بند ہوگیا جسے ہم ایرانی علم و تحقیق کے لیے یقینًا ایک صدمۂ عظیم کہ سکتے ہیں۔

ایران شہر | جون ۱۹۲۲ء میں حسین کاظم زادہ کی ادارت میں برلن سے ایک نیا ادبی اور علمی رسالہ ایران شہر جاری ہوا جو اگرچہ "پندرہ روزہ رسالہ" کہا جاتا ہے، لیکن در اصل مہینے میں صرف ایک مرتبہ شایع ہوتا تھا۔ یہ کاوہ سے کم دقیق اور اس کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہے، اس میں زیادہ تر ایسے مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی ہے جو "ایران قبل اسلام" کے متعلق ہوں، یا پھر جن میں ایسے مسائل سے بحث کی گئی ہو جو آج کل کے ترقی پسند ایرانیوں کے پیش نظر ہیں۔ شمارہ ۵ بابتہ دسمبر ۱۹۲۲ء میں ایرانی طلبا کو یورپ

بھیجنے کے متعلق ایک طویل مضمون ہے جس کا عنوان " مقام و طریقۂ تعلیم " ہے۔ صاحب مضمون نے وجوہات مندرجہ ذیل کی بنا پر یہ رائے دی ہے ایرانی طلبا کو فرانس کی بجائے جرمنی یا انگلستان بھیجنا چاہیے۔

ایرانی طلبا کے لیے فرانسیسی تعلیم کے مقابلے میں جرمنی کی تعلیم کو ترجیح دی گئی۔

لکھتے ہیں:-

" ہم ایرانی، باستثنائے اہالیان آذربائجان جن کی طبائع اور سیرتیں اینگلو سیکسن قوم سے زیادہ مشابہ ہیں، اپنی سیرت، طبیعت، اخذیت اور قوائے ذہنی کے اعتبار سے فرانسیسیوں یعنی لاطینی اقوام سے زیادہ ملتے جلتے ہیں چنانچہ ایک طرف زیرکی، خود اعتمادی، جامعیت، ظرافت، تیز نظری اور ملنساری ہیں اور دوسری طرف کمزوری ارادہ، تلوّن، جلدی تھک جانا، عدم استقلال، بے خیالی اور افعال میں اعتدال نہ رکھنے کی حیثیت سے ہم اور فرانسیسی دونوں ایک سا مزاج رکھتے ہیں "

بظاہر آثار مذکورہ بالا رائے ایرانیوں میں بہت مقبول ہوئی اس لیے کہ اگست ۱۹۲۲ء میں جرمنی میں کل (۸۷) ایرانی طلبا تھے، تو اسی ماہ دسمبر میں ان کی تعداد ۱۲۰ سے کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔[1]

جنگ کے بعد ایران میں پریس کی حالت۔

اگرچہ ۱۹۱۳ء کے روسی مظالم اور دراز دستیوں کی وجہ سے ایران میں پریس کی حالت چندے معطل سی رہی، لیکن آج کل خصوصاً جنگ کے خاتمے

[1] ملاحظہ ہو ایران شہر شمارہ ۳ ص ۵۵ اور شمارہ ۷ ص ۱۵۳ ۱۲ مصنفہ

کے بعد سے اس نے پھر اپنی جد و جہد شروع کر دی ہے، مگر چونکہ خبر رسانی کے وسائل ناقص ہیں اور ڈاک میں بھی ہنوز بے ضابطگی پائی جاتی ہے، اس لیے ہمیں چار و ناچار ان ادھوری اطلاعات ہی پہ قناعت کرنی پڑتی ہے جو اس کے متعلق ہم تک پہنچی ہیں۔ کاوہ کے شمارہ ۱۲ میں ان فارسی اخبارات و رسائل کی ایک مختصر فہرست دی گئی تھی جو آغاز ۱۳۳۴ھ (نومبر ۱۹۱۵ء) کے بعد جاری ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد ۴۷ بتائی گئی تھی اور ان کی ردیف وار فہرست مرتب کرکے ہر اخبار یا رسالہ کے مقابل اس کا مقام طباعت، مدیر کا نام اور سن اجرا درج کیا گیا تھا۔ اس فہرست میں طہران کا نمبر اول ہے۔ وہاں سے اٹھارہ ۱۸ اخبارات نکلتے تھے، اس کے بعد تبریز اور رشت کی باری ہے، یعنی چار چار اخبار، پھر اصفہان، مشہد، کرمان، کرمان شاہ، خوئے، بوشہر، باکو، ہرات، کابل اور جلال آباد کا نمبر ہے (آخر الذکر تین مقامات افغانستان میں ہیں) ان سب جگہوں سے ایک ایک دو دو اخبار نکلتے تھے۔ ان سب اخبارات و رسائل میں سے نصف سے زیادہ یعنی (پچیس) سب سے پہلے ۱۳۳۸ھ (۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء) میں جاری ہوئے، لیکن مذکورہ بالا فہرست بہت کچھ تکمیل طلب ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ ان (۹) فارسی جرائد میں سے جن کے نسخے ان کے مدیروں یا میرے احباب نے مجھے بھیجے، صرف دو ہی کا ذکر اس فہرست میں کیا گیا ہے: یعنی عالم نسواں اور ارمغان۔ آخر الذکر رسالہ یعنی ارمغان ملک کے بہترین مجلوں میں سے ہے۔ اس میں کئی اچھی نظمیں ہیں جن میں بعض ادیب الممالک کے قلم سے ہیں۔ انجمن

ادبی طہران کی روداد بھی اس میں شایع ہوتی ہے۔ بقیہ رسالے یہ ہیں: بہار، جس کا لب ولہجہ اور طرزِ تحریر اگرچہ بالکل جدید اور یورپی انداز پر ہے، لیکن بعض اعلیٰ درجہ کی نظمیں بھی شایع کرتا رہتا ہے؛ فروغ تربیت؛ دانش جو مشہد سے نکلتا تھا؛ ممات و حیات جو تمام تر یورپی ایجادات اور مادّی ترقیوں سے بحث کرتا ہے؛ فردوسی، جس کے عملہ ادارت میں طہران کے امریکن کالج کے فارغ التحصیل طلبا ہیں؛ پارس جو آدھا فارسی اور آدھا فرانسیسی میں شایع ہوتا ہے اور قسطنطنیہ سے ۱۵۔ اپریل ۱۹۲۱ء کو جاری ہوا؛ گنجینۂ معارف جس کا پہلا نمبر تبریز سے ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو نکلا۔ ان میں سے کوئی رسالہ بھی باعتبار خوبیِ مواد یا حسنِ ترتیب، کاوہ تو کجا، ایران شہر کے معیار کو بھی نہیں پہنچتا۔ ایک رسالہ گلِ زرد جو طہران سے آخر اگست ۱۹۲۰ء میں شایع ہوا اور جس میں مدیر رسالہ مرزا یحییٰ خاں ریحانی اپنا کلام بھی شایع کرتے تھے، البتہ ہمارے اس کلیہ سے مستثنیٰ سمجھا جاسکتا ہے۔

چاپ خانہ کاویانی برلن برلن میں چاپ خانہ کاویانی[1] کے قیام سے ایران کے ادبی احیا کا ایک نیا اور اہم دور شروع ہوا ہے۔ اس کے مالک اور کارکن مرزا عبدالشکور اور چند دوسرے ایرانی حضرات ہیں جو سستی، صحیح اور اچھی چھپی ہوئی فارسی کتابوں کی روز افزوں ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں

[1] اس کی جملہ مطبوعات آج ہندوستان میں مطبع انجمن ترقی اردو (ہند) یا مکتبہ جامعہ ملیہ، قرول باغ، دہلی سے مل سکتی ہیں۔ ۱۲ مترجم

اور حق بات یہ ہے کہ اب تک کوئی اور مطبع ان خصوصیات میں چاپ خانہ کاویانی کی ہمسری نہیں کرسکتا۔

اس کی بیش قدر علمی خدمات | جدید ڈرامے، موسیقی اور علم الفلاحت کے رسالے نیز گلستان سعدی اور موش و گربہ عبید زاکانی کی طرح کی مشہور قدیم کتابوں کے دیدہ زیب اڈیشن چھاپنے کے علاوہ اس کے کار پردازوں اور کارکنوں نے حوصلہ اور ہمت سے کام لے کر بعض قدیم مصنفین کی نادر تصانیف بھی شایع کی ہیں مثلاً ناصر خسرو کی زاد المسافرین جس کے اب تک صرف دو نسخے دنیا میں موجود سمجھے جاتے ہیں یعنی ایک پیرس اور دوسرا کنگس کالج کیمبرج کے کتب خانے میں۔ آج کل یہ حضرات وجہ دین کو طبع کر رہے ہیں جس کے صرف ایک نسخہ کا پتہ حال میں پٹرو گراڈ میں چلا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کی پرانی کتابوں کی طباعت میں جو بڑی تعداد میں فروخت نہیں ہوسکتی ہیں اور جن کی طباعت کے مصارف بھی لامحالہ بہت زیادہ ہوتے ہیں بہت کچھ مالی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس مطبع کو مرزا محمود غنی زادہ کی خدمات میسر آگئی ہیں جو ایک بلند پایہ عالم ہیں اور فن تنقید اور صحت معلومات کی جو اعلیٰ روایات مرزا محمد خان قزوینی نے قایم کی تھیں، انھیں آج بھی زندہ رکھتے ہیں۔

تمت بالخیر

خانصاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقّیِ اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

ūman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 125.

A HISTORY OF
ERSIAN LITERATURE
IN MODERN TIMES
(A.D. 1500-1924)

By
Prof. EDWARD G. BROWN

Translated by
S. WAHHAJ-UD-DIN AHMAD
of the Osmania University

Published by
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),
DELHI.

1939